مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

عبقری شخصیت

ڈاکٹر رفعت سلطان

© ڈاکٹر رفعت سلطان

سلسلہ اشاعت باب العلم پبلیکشنز نمبر۔ ۳۰

نام کتاب : مولانا ابوالحسن علی ندویؒ: عبقری شخصیت
باراوّل : دسمبر ۲۰۱۷ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۳۹ھ
صفحات : ۵۳۶
تعداد : ۵۰۰
کمپوزر : محمد شاکر ندوی
فنکار : فیصل متین
کمپوزنگ : لاریب کمپیوٹر سینٹر، سلطانیہ روڈ، بھوپال۔فون۔2734119
ناشر : باب العلم پبلیکیشنز (رجسٹرڈ) موبائل:9826949473
شبستان اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور، سید فتح علی اسٹریٹ، عیدگاہ ہلس،
بھوپال۔۴۶۲۰۰۱
قیمت : ۴۰۰؍ روپے

Maulana Abul Hasan Ali Nadwi:
Abqari Shakhsiyat

BY : Dr. RAFAT SULTAN
Year of Publication - December 2017
Price : Rs. 400/-

Publisher

BABUL ILM PUBLICATIONS (REGD.)
6, Shabistan Apartment, Second Floor,
Syed Fateh Ali Street, Idgah Hills, Bhopal (M.P.)-462001 (INDIA)
Phones : 0755-2544100, 2738168,2734119

ISBN- 978-81-935199-4-3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ

الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی

وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا

تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ

فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

(سورہ النمل ۲۷:۱۹)

"اے میرے رب مجھے توفیق دیجیے کہ شکر ادا کروں اس احسان کا جو

آپ نے مجھ پر کیا، میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی توفیق دیجیے کہ

ایسے کام کروں جن سے آپ راضی ہوں اور اپنی رحمت سے مجھے

اپنے نیک بندوں میں داخل کیجیے"۔ (آمین)

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان
٦	مقدمہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
١٠	تقریظ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
١٦	حرف آغاز ڈاکٹر رفعت سلطان
	اعزازات
٢١	مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا خاندانی پس منظر
٨٢	مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی (١٩١٣ءتا١٩٤٦ء)
١٠٥	مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ ملت کے سفیر کبیر
	(ملک و بیرونِ ملک اسفار و مشاغل (١٩٤٧ء سے ١٩٩٩ء تک)
١٥١	مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج، عادات اور معمولات
١٥٦	دار العلوم ندوۃ العلماء میں مولانا علی میاںؒ کا دورِ نظامت (١٩٦١ءتا١٩٩٩ء)
١٧٣	مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا قلمی جہاد
	(علمی، ادبی، دینی، دعوتی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکات سے وابستگی کی روداد)
٢١٦	مفکر اسلام مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا فکر و فلسفہ
٢٥٣	مولانا علی میاںؒ کی سیرت و سوانح نگاری، تذکرہ نویسی

صفحہ نمبر	عنوان
۳۰۸	ادبِ اسلامی ایک سدا بہار درخت، مولانا علی میاںؒ کی ادبی خدمات
۳۴۶	شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کا فکروفن اور مولانا علی میاںؒ کی اقبال شناسی
۳۶۹	ذوقِ تاریخ نویسی کی آئینہ دار مولانا علی میاںؒ کی تاریخی تصانیف
۴۰۱	وسیع النظر عالمِ دین مولانا علی میاںؒ کے سفرنامے اور اُن کا منفرد اُسلوب
۴۴۶	اولوالعزم مکتوب نگار کے مکاتیب کا علمی رنگ
۴۷۸	خاندان علم اللٰہی کے چشم و چراغ مولانا علی میاںؒ کی امتیازی شان
۴۹۴	عبقری شخصیت مولانا علی میاںؒ کی علمی قدردانی
۵۰۷	مولانا علی میاںؒ کی عربی اردو تصانیف کی فہرست
۵۴۳	مولانا علی میاں رحمۃ اللہ کا شجرہ نسب

....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء

الحمدللّٰہ رب العلمین ،الصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد بن عبداللّٰہ الامین ،وعلی الہٖ وصحبۃالاجمعین ،اما بعد۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنے عہد میں عالم اسلام کی جامع کمالات کی حامل شخصیت تھے ،انھوں نے اپنے عہد کے مسائل اور امت اسلامیہ کو درپیش خطرات کو اچھی طرح سمجھا تھا اور اس کے لحاظ سے ملک وقوم کی اہم رہنمائی انجام دی تھی۔

حضرت مولاناؒ کی امتیازی اور عبقری شخصیت کے پہلو کئی تھے ،علمی رسوخ اور دین پر عمل کے ساتھ اسلام کے غلبہ کی فکر اور اس کے لیے جہد مسلسل اور تکبیر مسلسل نے انہیں معاصرین میں ممتاز کر دیا تھا ،ان کو اردو اور عربی زبان میں جو مہارت اور قدرت حاصل تھی اور دعوت اور اصلاح کے کام میں اس سے جو مدد لیتے تھے اس کے ساتھ حکمت دعوت کے اسلوب نے اور زاہدانہ شان نے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے ان کی بات تمام حلقوں میں توجہ سے سنی جاتی اور اس کا اثر لیا جاتا تھا۔

حضرت مولاناؒ پر دعوت کے کام کو اہمیت دینے کا بڑا غلبہ تھا ،اس سلسلے میں ان کا تذکرہ حکیمانہ ہوتا تھا ،جو انہوں نے قرآن مجید کی رہنمائی سے حاصل کیا تھا ،

وہ ذمہ داران حکومت سے ملتے اور بلند سطح سے ملتے اس میں مرعوبیت کا اثر نہیں ہوتا تھا، وہ دولت مندوں اور حکمرانوں سے مادّی مدد لینے یا شخصی فائدہ اٹھانے سے پورا گریز کرتے تھے، ان سے ہدیہ لینے سے بھی معذرت کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہم شخصی فائدہ اُٹھائیں گے تو ان کو غلطیوں پر ٹوکنے کا اثر باقی نہیں رہے گا، مولانا کے اس استغنائی عمل سے ان کا وقار بااثر شخصیات کے دلوں پر قائم ہوتا تھا کہ یہ بے غرض عالمِ دین ہیں اور یہ خیر خواہی کی صفت کے حامل ہیں۔

خود میرا ان کا ساتھ کئی اہم سفروں میں رہا، میں نے ان کو بعض بادشاہوں سے بات کرتے دیکھا، اور کڑوی نصیحت خوبصورت غلاف میں پیش کرتے پایا، بعض وزرائے عظمیٰ کو نصیحت کرتے دیکھا کہ تلخ بات پر بھی ان کے مخاطب کو ہاں اور جی کہتے دیکھا، اور بعض ملکوں کے رہنماؤں سے بات کرتے ہوئے میں نے یہ طرز دیکھا کہ خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ کڑوی نصیحت بھی سنادی گئی جس کو مخاطبین نے برداشت کیا، ایسی متعدد مثالیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، مولانا کے اس طرز کا میں نے بڑا فائدہ اور خاصا اثر دیکھا۔

میں نے حضرت مولانا کو شاہ فیصل شہیدؒ سے بھی بات کرتے دیکھا، شاہ فہدؒ سے بھی بات کرتے دیکھا، اور شاہ مراکشؒ سے بھی مخاطب ہوکر بات کرتے دیکھا، اور ہندوستان کے کئی وزرائے اعظموں سے بات کرتے دیکھا، خوشامد سے خالی، لیکن خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ توجہ دہانی، موثر اور ناصحانہ انداز میں بات کرتے دیکھا، شاہ بانو نان نفقہ کیس میں جو کامیابی ملی، اس میں مولانا کی اس حکمت عملی کا بھی دخل رہا، بابری مسجد کے سلسلے میں راجیو جی کو مسئلہ کے حل کے لیے بروقت توجہ کرنے، مسجد کو محفوظ رکھنے پر زور ڈالتے دیکھا، وہ ملی معاملات میں تنہا فیصلہ کرنے کے بجائے ملک کی مقتدر سیاسی شخصیات اور مذہبی رہنماؤں سے رابطہ

قائم رکھتے اور اپنے کسی موقف پر اَڑنے کے بجائے مشاورتی طریقہ کو ترجیح دیتے اور اپنے رفقاء کی رائے کو فیصلہ لینے میں پورا اختیار دیتے تھے۔

حضرت مولانا کی شخصیت آج بھی قابل تقلید نمونہ ہے، اور جن خطرات کی نشاندہی مولانا نے کی تھی، وہ مزید ابھر کر سامنے آگئے ہیں، ان کے دعوتی واصلاحی طریقہ کار کو اختیار کرنا موجودہ حالات میں بہت سودمند ہے۔

حضرت مولانا پر علمی تحقیقی کاموں کا سلسلہ ان کی حیات ہی میں شروع ہوگیا اور ان کی فکر ودعوت اور طریقہ وسطیت اور اعتدال کا اثر بڑے داعی اور مفکرین بھی محسوس کرتے تھے، ترکی اور سعودی عرب میں ان کی شخصیت اور فکر ودعوت پر اہم پروگرام بھی منعقد ہوئے، اور جو بحوث ومقالات پیش کیے گئے ان کے مجموعے بھی شائع ہوئے، مختلف لوگوں نے برصغیر ہندو پاک، بلادِ عربیہ، یورپ اور امریکہ سے پی ایچ ڈی کے مقالات اور الگ سے کتابیں لکھیں۔ ڈاکٹر رفعت سلطان نے لکھنؤ کا ایک سفر بھی کیا تھا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی یہ کاوش دکھائی تھی، اس طرح انہوں نے ان سے بھی سند حاصل کر لی تھی جیسا کہ خود انہوں نے اس تعلق سے لکھا بھی ہے۔

> ''ایک مرتبہ میرے والد سید فتح علی صاحب مرحوم حضرت نظام الدین دہلی میں منعقد کسی دینی جلسہ میں شریک محفل تھے، جو مولانا علی میاں ندویؒ کی صدارت میں منعقد کی گئی تھی، وہ اپنے سفید رومال سے آنسو خشک کرتے ہوئے یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت مولاناؒ سے شرف ملاقات پر انہوں نے عرض کیا کہ میری بڑی بیٹی ڈاکٹر رضیہ حامد نے نواب صدیق حسن خاں صاحب پر تحقیقی کام کیا ہے اور اب چھوٹی بیٹی آں محترم کی علمی خدمات پر کام کر رہی

ہے ،حضرت مولانا مسکرائے اور اپنی انکارِ ذات کی صفت کے
ساتھ برجستہ گویا ہوئے ''بڑی بیٹی نے اتنے بڑے عالم پر کام کیا
اور چھوٹی بیٹی نے مجھ جیسے خاکسار کو منتخب کیا''۔

جب وہ لکھنؤ مزید تحقیق کے لیے آئیں اور جو کچھ تحریر کیا وہ حضرت مولاناؒ کی خدمت میں پیش کیا ،تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا ''بس اس میں ایک خلا رہ گیا ہے وہ وفات کے باب کا خلا ہے'' اب مزید تحقیق اور اضافہ کے ساتھ جب کہ اس واقعہ کو بیس سال کے قریب کا عرصہ گزر رہا ہے ،یہ کتاب نظر قارئین کی جارہی ہے ،ہم مصنفہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ان کے لیے صحت وعافیت کی دعا کے ساتھ اس کام کی قبولیت کی دعا بھی کرتے ہیں۔واللہ ولی التوفیق

محمد رابع حسنی ندوی

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۷؍محرم ۱۴۳۹ھ

۲۹؍ستمبر ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

معتمد تعلیم ندوۃ العلماء

(الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمد، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین وبعد.)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت اپنے تمام معاصرین میں ایک ممتاز ومنفرد مقام رکھتی ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خاص صفت جو آپ کی زندگی کے تمام مراحل میں بہت نمایاں نظر آتی ہے، وہ آپ کی فراست ایمانی ہے، یہی وہ فراست ایمانی تھی جو آپ کو ایسے خیالات ونظریات کے اظہار پر آمادہ کرتی تھی جو بعض حالات میں دوسرے قائدین کے تصوّر کے برعکس ہوتے تھے۔ یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ ان میں نرم مزاجی وکشادہ قلبی، حلم وبردباری، دوسروں کا پاس ولحاظ، تواضع وانکساری اور اپنے بڑوں کی رائے کا احترام حد سے زیادہ موجود تھا، لیکن انسانیت اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل اور آزمائش کے وقت وہ اپنے موقف پر غیر لچکدار رویہ اختیار فرماتے اور دوسرے مفکرین کے نظریات نہ ان کو متزلزل کرتے اور نہ ہی ان کی ہمت پست کرتے، اس قسم کے واقعات ان کی حیات مستعار میں بارہا پیش آئے۔ عام قائدین اور دانشوروں نے ابتدائی مرحلہ میں ان کی بعض آراء سے شدید اختلاف کیا اور ان کی پُرزور مخالفت اور ان کے موقف کی تردید کی لیکن بعد کے واقعات نے ان کی رائے کی تصدیق کی اور ان کے موقف کی توثیق۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمتہ اللہ علیہ کے اسلاف واجداد ایک

طرف سید احمد بن عرفان شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ اور ان کی دعوت کے امین تھے، تو دوسری طرف شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان اور مجدد الف ثانی شیخ الاسلام سرہندیؒ کے خلفاء سے ان کا گہرا ربط و تعلق تھا۔ اس طرح حضرت مولاناؒ کا خانوادہ ان تینوں مکتبہائے فکر کی خصوصیات کا جامع تھا، چنانچہ حضرت مولاناؒ اس دینی اور فکری میراث کے وارث و امین ہوئے۔ خود مولانا نے اپنی تحریروں میں اس کا اظہار کیا ہے، چنانچہ حضرت مولاناؒ کی پوری زندگی ملّت اسلامیہ، عالم اسلام بلکہ پوری انسانیت کی فکر مندی سے عبارت ہے۔ حضرت مولاناؒ نے عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا، مغربی فکر اور یورپی تہذیب کا غلبہ دیکھا۔ قومیت، وطنیت، علاقائیت اور لسانی اور تہذیبی عصبیت کا دور دیکھا، مسلمانوں کی کمزوری و پسماندگی، مغرب سے ان کی مرعوبیت اور علم و فن کے میدان میں ان کے جمود اور تعطل کو دیکھا، متعدد اسلامی تحریکوں کی سرگرمیاں دیکھیں بلکہ بعض تحریکوں میں عملی شرکت بھی کی اور ان کا تجربہ کیا۔ اپنے عہد کے قائدین اور دانشوروں سے رابطہ رکھا اور اپنے بیرونی سفروں میں تعلیمی و تربیتی مراکز کو قریب سے دیکھا، نئے تعلیمی نظریات و رجحانات اور جدید تمدنی و تہذیبی افکار و خیالات کا انہوں نے باریک بینی سے مطالعہ کیا اور ان کے نتائج و اثرات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور مختلف امور پر اہل فکر و نظر سے تبادلہ خیال کیا۔

حضرت مولاناؒ نے جس زمانہ میں ''اسلام کی طرف لوٹئے'' کی صدا لگائی وہ غیر اسلامی افکار و نظریات خصوصاً مغربی فکر کے غلبہ کا زمانہ تھا، عالم اسلام مغرب کی فکری، تہذیبی اور تمدنی یلغار کے نرغہ میں تھا اور مسلمان احساس کمتری کا شکار تھے۔ حضرت مولاناؒ نے اس حملہ کا مقابلہ سنجیدہ، ٹھوس، مدلل اور موثر علمی انداز میں کیا، مغربی تمدن کو نشانہ بنایا۔ لیکن اخلاقیات کا بھرپور لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کی احساسِ کمتری کو دور کیا، انہیں تعمیر و ترقی پر اُبھارا، دشمنوں کے رعب و دبدبہ کے طلسم کو توڑا۔ اس میدان عمل میں مولاناؒ کے انداز میں اعتدال و وسطیت اور دینی عقائد و مسلمات سے غیر متزلزل وابستگی اور عصری آگہی کا حسین امتزاج تھا۔ مولاناؒ نے نہ تو مغربی تہذیب کو کلی طور پر

ترک کرنے کی دعوت دی اور نہ اس کو کلی طور پر قبول کر لینے کی بات کہی، بلکہ مولانا کا انداز قدیم وجدید دونوں کو جمع کرنے اور مسلسل غور وفکر اور بحث وتحقیق کا تھا۔ مولاناؒ نے اپنا فکری مسلک ودعوتی منہج اپنی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں واضح کر دیا ہے مولاناؒ دینی مدارس کے طلبہ کو مخاطب کرتے تو ان سے نصاب، نظام وطریقہ تعلیم میں جدت پیدا کرنے کا مطالبہ کرتے اور جب عصری درسگاہوں کے طلبہ کو مخاطب کرتے تو ان سے ایمان ویقین کے حقیقی سرچشمہ سے رشتہ مضبوط رکھنے، تزکیہ نفس اور حسن سلوک کی تلقین کرتے، علوم وفنون میں جدت اور ابتکار کی دعوت دیتے اور مغرب کی نری نقالی وتقلید سے منع کرتے۔ اسی طرح اسلامی تحریکات اور مراکز کے امیدواروں سے گفتگو فرماتے اور ان کو ان مسائل کی طرف توجہ دلاتے جن میں کمزوری پائی جاتی یا بے توجہی برتی جاتی ہے۔ حکام اور قائدین سے مولاناؒ کا رابطہ رہا اور ان کو ان کی فکر کے مطابق مشورے دیے اور باخبر کیا۔ مختلف اسفار کے دوران اور عالمی کانفرنسوں کے موقع پر اپنے عصر کی اسلامی تحریکات کے قائدین سے ملاقات کا موقع ملتا تو ان سے تبادلہ خیال کرتے اور احترام کے ساتھ ان کے سامنے اپنی بات موثر طریقہ سے رکھتے۔

اس تنوع کے اعتبار سے حضرت مولاناؒ کی شخصیت جامعیت کی حامل تھی، وہ باحث ومحقق بھی تھے اور داعی وقائد بھی۔ عملی زندگی کے میدان کے شہسوار بھی، ایک طرف ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لیتے تو دوسری طرف دنیائے انسانیت کی فکرمندی آپ کو بے چین کیے رہتی۔ دنیا کے حالات پر نظر رکھتے، خطرات کی نشاندہی کرتے، امراض کی تشخیص کرتے، مسائل کا حل پیش کرتے، دنیا کے کسی بھی حصہ میں پیش آنے والے واقعات، حوادث، آفات اور سانحوں پر تڑپ اٹھتے اور آواز بلند کرتے۔ ضمیر انسانی کو جھنجھوڑتے اسی طرح سیاسی مسائل کے حل کا مولاناؒ نے ایک خاص منہج اختیار کیا تھا۔ وہ عالم ربانی اور مرشد امت تھے زندگی بڑی سادہ اور تکلفات سے دور تھی۔ حق بات کہنے میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرتے۔

وہ ایک ہی وقت میں سماجی مصلح بھی تھے اور دینی مرشد و رہنما بھی۔ اس اعتبار سے مولاناؒ کی شخصیت ہشت پہل تھی۔ علامہ یوسف قرضاوی جو شخصی طور پر مولاناؒ سے واقف تھے اور آپ کی فکر سے پوری طرح متفق تھے انہوں نے مولانا کو ''مرشد امت''، ''محمدی قرآنی انسان'' اور ''عالمی نوازش'' جیسے اوصاف سے متصف کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مولاناؒ نے اسوہ نبوی ہی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ قرآنی اسلوب دعوت کو پیش نظر رکھا اور عرب و عجم، امریکہ و یورپ کو مخاطب کیا اور متعدد عالمی اداروں کے صدر نشیں اور رکن رکین رہے۔

حضرت مولاناؒ کی اس جامع عبقری شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولاناؒ میں یہ متعدد اور متنوع خوبیاں اور صلاحیتیں ایک ساتھ کیسے جمع ہوئیں۔ حالانکہ اگر ان میں سے ایک بھی صلاحیت کسی لیڈر میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ عظیم رہنما بن جاتا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے اس سوال کا جواب خود دے دیا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر محمد اجتبا حسینی ندوی کی کتاب "الأمیر صدیق حسن خان القنوجی جهوده و آثاره" کے مقدمہ میں مولاناؒ رقمطراز ہیں۔

> ''میری ولادت جس گھرانہ میں ہوئی اس کا محبوب ترین مشغلہ بلکہ اس کی ''ہابی'' عظمائے اسلام، شخصیات، طبقات، رجال، علماء، اہل فضل و کمال خصوصاً ہندوستانی علماء، فضلاء، صلحاء، اتقیاء اور علماء ربانیین کی سوانح عمریاں لکھنا تھا۔ میری نشو نما ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس میں ہر طرف علمی اور اخلاقی اقدار و روایات کا چرچا تھا، علمائے کبار اور ان کے علمی کارناموں، دین سے ان کی وابستگی و پختگی، اُن کی فنائیت اور مختلف صدیوں کے اصحاب فضل و کمال اور علماء کے تذکرے بڑے احترام و عظمت، ذوق و شوق، بڑے پُر اثر و دلکش لہجہ میں بیان ہوتے تھے۔ جہاد و حرارت ایمانی کا سماں بند جاتا اور دل امنڈ آتے۔ مجلسوں پر، کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا۔ ان

تذکروں اور زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ بچپن ہی سے میرے اندر صحابہ کرام وعلماء عظام اور سلف کی محبت و عظمت بیٹھ گئی۔ مکارم اخلاق، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی صفات پیدا ہو گئیں جو عام طور پر پیدا نہیں ہوتیں۔ بچوں کی طبیعتوں میں جو انسانی صلاحیتیں اور جوہر رکھے گئے ہیں، کبھی کبھی انہیں خاص تربیت، ماحول یا کوئی خاص واقعہ مہمیز کرتا ہے تو وہ اپنے فطری وقت سے پہلے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ بچپن ہی سے میری تربیت فضائل ومحاسن سے محبت، خوب سے خوب تر کی تلاش، متضاد انسانی محاسن کو جمع کرنے، علوم ومعارف میں تنوع و مہارت پیدا کرنے، اور متضاد صلاحیتوں کو خدمت دین اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے استعمال کرنے پر ہوئی۔ اسی طرح میری تربیت اس بات پر ہوئی کہ ان بندگان خدا سے محبت اور تعلق رکھا جائے جو اللہ کے فضل وتوفیق سے علمی اور عملی دونوں وجاہتوں پر فائز ہوں۔ دنیا اور آخرت دونوں خوبیوں کے جامع ہوں اور جو (عرف عام میں) ایک طرف وزارت اور امارت کے منصب پر متمکن ہوں تو دوسری طرف تصنیف وتالیف، درس وتدریس، ارشاد ودعوت اور تربیت واصلاح کے علمبردار ہوں۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کو محققین نے حضرت کی زندگی میں، ان کے اعزاز میں منعقدہ استقبالی اور تعارفی جلسوں میں، ان کی کتابوں کے رسم اجراء اور ان کے تعارف کے دوران اور ان کی وفات حسرت آیات کے بعد تعزیتی جلسوں میں پیش کردہ مقالات اور تقاریر کے دوران، حضرت کی تعلیم وتربیت، ان کی علمی قابلیت ولیاقت، ان کی فکر سازی کے عوامل وتحریکات، جماعتوں، تحریکوں اور علمی اداروں میں ان کی شمولیت وشرکت، مختلف علمی وعالمی اداروں کی طرف سے انعامات سے ان کی سرفرازی اور ان کی اور ان کی کتابوں کی

مقبولیت وافادیت جیسے بیش بہا اوصاف کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ صفات وکمالات کسی بھی شخصیت کی سیرت وترجمانی کے بنیادی عناصر ہیں اور یہی تفصیلات سیرت نگاروں اور محققین کا عام طور پر مرجع ومرکز رہتی ہیں اور یہی طریقہ کسی بھی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کی سیرت نگاری وترجمانی کا معروف ومشہور طریقہ ہے۔

پیش نظر کتاب ''مولانا ابوالحسن علی ندویؒ: عبقری شخصیت'' میں ڈاکٹر رفعت سلطان نے حضرت مولانا کی سوانح حیات کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے اور مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کا اندازہ کتاب کے مندرجات سے لگایا جاسکتا ہے مثلاً ''مولانا علی میاںؒ کا خاندانی پس منظر''، ''مولانا علی میاںؒ ملت کے سفیر کبیر''، ''دار العلوم ندوۃ العلماء میں مولانا علی میاںؒ کا دورِ نظامت''، ''مولانا علی میاںؒ کا قلمی جہاد''، ''مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ کا فکر وفلسفہ''، ''ادب اسلامی ایک سدابہار درخت، مولانا علی میاںؒ کی ادبی خدمات''، ''ذوق تاریخ نویسی کی آئینہ دار مولانا علی میاںؒ کی تاریخی تصانیف''، ''وسیع النظر عالم دین مولانا علی میاںؒ کے سفرنامے اوران کا منفرد اسلوب'' وغیرہ۔

میں ڈاکٹر رفعت سلطان کی اس کاوش پر ان کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کتاب سے مولانا کی زندگی اور شخصیت کو سمجھنے اور دعوت اور فکر وعمل کے میدان میں مولانا کے طریقہ کار سے فائدہ اٹھانے میں مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ مصنفہ کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور افادہ عام کا ذریعہ بنائے۔

۶ر محرم ۱۴۳۹ھ	محمد واضح رشید حسنی ندوی
۲۸ر ستمبر ۲۰۱۷ء	معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ

☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اَللّٰھُمَّ اٰتِنِیۡ بِفَضۡلِكَ اَفۡضَلُ تُؤۡتِیۡ مِنۡ عِبَادِكَ الصَّالِحِیۡنَ"

حرفِ آغاز

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات جامع صفات اور جامع کمالات تھی۔ وہ ایک کثیر المطالعہ، وسیع المشاہدہ عالمِ دین، عظیم مفکر اور انسانیت کے خیر خواہ تھے۔ علم و فضل، زہد و ورع، فقر و استغناء اور حکمت و دانائی کی بیش بہا دولت سے مالا مال تھے۔ علماء، داعیان، مصلحین، مجددین اور مجاہدین کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خاندان کی عالمانہ، مجاہدانہ صفات آپ کی شخصیت کا جزو بن گئی تھیں۔

علی میاںؒ کے علمی فکری سرگرمیوں کا زمانی رقبہ نصف صدی سے زیادہ پر محیط اور مکانی رقبہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔ معاصرین نے "عالمِ ربانی، مُرشدِ امت، محمدی قرآنی انسان، مردِ مومن، ممتاز مفکر، کامیاب معلّم، بااثر صاحبِ قلم، صاحبِ اسلوب ادیب، شجر سایہ دار، مینارۂ نور، محبوب خاص و عام، ہندوستان کے حجازی خطیب، "علمائے سلف کا نمونہ، ملّت کے سفیر کبیر" جیسے خطابات سے یاد کیا ہے۔

عبقری زمانہ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں بلند حوصلگی، وسعتِ نظر، علمی تنوع، قوتِ مطالعہ کے ساتھ، وسعتِ قلبی، علمی رواداری، فراخ دلی اور صبر و تحمل کی صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، وہ دلِ دردمند، فکرِ ارجمند، علم پر عمل، خیر کی تعلیم، قوم و ملت کی خیر خواہی کے جذبے سے متصف تھے۔ اپنے عہد کے تقاضوں، آزمائشوں، فتنوں اور ضرورتوں کا ادراک رکھتے تھے۔ انھوں نے لادینیت، اباحیت، مغربیت، قومی، نسلی اور جاہلی عصبیت کے خلاف علم و فکر، تقریر و تحریر اور قرطاس و قلم کی مدد سے پُر زور آواز بلند کی۔ آپ عالمِ انسانیت میں اسلام کی نشاۃ

الثانیہ کی فکر رکھنے والے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے چراغ کو روشن کرنے والے، اسلام اور اسلامی تہذیب کی برتری ثابت کرنے والے صاحبِ اسلوب ادیب تھے۔ ایسے دل آویز مضامین سپردِ قلم کیے کہ عرب وعجم لہلہا اُٹھا، ہر طرف سے صدائے تحسین آنے لگیں۔ عربی میں تین سو اور اردو میں دو سو تصانیف و تقاریر ہیں، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی، اٹالین، فرنچ، جرمن، ترکی، انڈونیشی زبانوں میں ان کی عربی کتابوں کے تراجم کیے گئے ہیں۔

نازبردار بڑے بھائی کی تربیت و رہنمائی، عالی ہمت شیوخ اور قابل اساتذہ کی شفقت و محبت اور تعلیم و تربیت، عابدہ، زاہدہ ماں کی فکر اور دعائیں، مخلص معاونین، لائق شاگردوں اور خاندان کے افراد کا قدم قدم پر تعاون، اللہ نے ایسی امتیازی شان عطا فرمائی جس کی ضو ہندوستان سے لے کر عالمِ عرب، عالمِ اسلام اور مغربی ممالک تک پھیل گئی۔ برصغیر، عالمِ اسلام، عالمِ عرب کے مشاہیر اہلِ علم، سلاطین، وزراء، سب اُن کی علمی صلاحیتوں کے معترف ہوئے، اُن کے افکار سے متاثر ہوئے۔ عرب ان کی قادرالکلامی اور عربی زبان دانی کا لوہا ماننے پر مجبور ہوئے۔ اُن کی حیاتِ مبارکہ ہی میں، برصغیر، عالمِ اسلام اور عالمِ عرب کے علمی حلقوں نے انھیں ایک باا ثر صاحبِ قلم اور صاحبِ اسلوب ادیب اور کامیاب معلّم تسلیم کر لیا تھا۔

مؤقر عالمی علمی تنظیموں کی رکنیت، شعرائے عرب کے قصائد، علماء، ادباء کے تعارفی مضامین اور قدر دانی، اعزازی مجلسوں کا انعقاد اور اعزازات، بار بار مالی تعاون کی پیش کش "ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاءُ" عبقری شخصیت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثال سادگی، تواضع، انکساری، استغنا، بے نیازی، عفاف، انسانیت کی خدمت کا مخلصانہ جذبہ، تعلیم و تعلم، دعوت و اصلاح کی فکر...... خاندانِ علم اللہی کے مومن کامل، مردِ مجاہد کا یہی اوڑھنا، بچھونا تھا۔

علی میاںؒ کی منفرد شخصیت اُن کے علمی کارنامے ان کی والدہ کے دل سے نکلی دعاؤں کا ثمرہ، اور اُن خوابوں کی تعبیر ہیں جو مرحومہ نے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھے

تھے اوراپنے نوعمر بیٹے کو دکھائے تھے۔ ''عبقری شخصیت'' کے مطالعہ سے پہلے والدہ مرحومہ خیر النساء بہتر (اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) کے یہ پُر اثر، سادہ دعائیہ اشعار ضرور پڑھیے

رہے زندہ باقی جہاں میں علی — رہے تیرے حفظ و اماں میں علی
ہو آباد کون ومکاں میں علی — ہو سر سبز باغ جہاں میں علی
علی سے ہو روشن چراغِ جہاں — علی سے ہو سر سبز باغ جہاں
تو حافظ ہے اُس کا تو ہی ہے رقیب — بلا کوئی آوے نہ اُس کے قریب
دعا سن لے میری تو رب مجیب — الٰہی علی کو تو کر خوش نصیب
علی سے بڑھے خاندانِ علی — علی سے نمایاں ہو شانِ علی

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علم وعمل سے نہ صرف خاندان کی اعلیٰ روایات کے تسلسل کو قائم رکھا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے اشاعت علوم کے ذریعہ حفاظت دین کی ایک عظیم الشان مثال قائم کردی۔

محترم المقام مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی (ناظم ندوۃ العلماء) اپنے خال معظم کے سفر وحضر میں شریک رہے ہیں، عربی واردو میں پُر اثر اسلوب کے مالک ہیں، اُن کا اشہب قلم حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی عہد ساز شخصیت کو ہر پہلو سے پیش کر چکا ہے۔ پیشِ نظر تصنیف پر آنمحترم نے مقدمہ تحریر فرما کر راقم کی ہمت افزائی فرمائی ہے جو مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے محبت ان کے وطن ثانی بھوپال اور اہلِ بھوپال سے تعلق کی علامت ہے۔ راقم السطور کے لیے عظیم الشان موضوع پر کام کرنے کی توصیفی سند بھی ہے۔ "حفظه الله ورعاه و مدّ فی عمره المبارک فی خدمة الاسلام و منحة العافية والبركة والتوفيق".

محترم مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) عربی اردو کے ماہر انشاپرداز اور صحافی ہیں۔ علی میاںؒ کی فکر، دعوت، اسلوب پر عربی میں المسحة الادبية فی کتابات شیخ ابو الحسن علی ندویؒ لکھ کر دادِ تحسین حاصل کر چکے

ہیں۔ ''حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی عبقری شخصیت'' پر آپ کی تحریر کردہ تقریظ ابرِ رحمت کی طرح محسوس ہوتی ہے شوق اور جستجو میں اضافہ کرتی ہے۔ آپ کی تحریر نے میرا حوصلہ بڑھایا ہے میری دلی دعا ہے ''متعنا اللّٰہ بہ المسلمین و ادام اللّٰہ فیوضھم و برکاتھم''

مولانا محمود حسن حسنی (نائب مدیر تعمیر حیات، لکھنؤ) علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی عزیز اور بچپن کے دوست محترم محمد مسلم حسنیؒ کے حقیقی پوتے ہیں۔ آپ کا پُرخلوص، برادرانہ سلوک مذکورہ دونوں دیرینہ دوستوں کی دوستی کی خوشبو سے تیار ہوا ہے۔ اپنے عزیز ترین اباجان (مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ) کے علمی کاموں کے فروغ کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ بیش قیمت معلومات کے سلسلہ میں ان کا تعاون فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کی اعانت کا یہ جذبہ شکریہ کے الفاظ سے بہت بالاتر ہے۔ ''اطال اللّٰہ بقائہ و نفع بہ المسلمین''۔

اس تصنیف کی اشاعت کے سلسلہ میں اپنے تمام محسنین اور معاونین بالخصوص محترم بہنوئی ڈاکٹر سید محمد حامد اور بہن محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے لیکن جو عزیز ہستیاں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں اُن کی یادیں، اُن کی باتیں یادوں کے قیمتی چراغ ہیں ایک مرتبہ میرے والد سید فتح علی صاحب مرحوم، حضرت نظام الدین دہلی میں منعقد کسی دینی جلسے میں شریک محفل تھے، جو مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد کی گئی تھی، وہ اپنے سفید رومال سے آنسو خشک کرتے ہوئے یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے شرف ملاقات پر انھوں نے عرض کیا کہ میری بڑی بیٹی ڈاکٹر رضیہ حامد نے نواب صدیق حسن خاں پر تحقیقی کام کیا ہے (اس کتاب کی اشاعت پر علی میاںؒ نے مقدمہ بھی تحریر فرمایا) اور اب چھوٹی بیٹی آنمحترم کی علمی خدمات پر کام کر رہی ہے۔ حضرت مولانا مسکرائے اور اپنی انکارِ ذات کی صفت کے ساتھ برجستہ گویا ہوئے ''بڑی بیٹی نے اتنے بڑے عالم پر کام کیا اور چھوٹی بیٹی نے مجھ جیسے خاکسار کو منتخب کیا'' حاضرین محفل علی میاںؒ کی سادگی اور کشادہ قلبی پر زیرِ لب مسکرانے لگے اور میرے والد جو

ایک نیک سیرت، خوش خصال انسان تھے حمد وشکر کے جذبہ کے ساتھ اپنے گرتے ہوئے آنسوؤں کورومال میں جذب کرتے رہے۔

بیس سال قبل تحقیقی کام کے دوران مجھے احساس ہوا کہ حضرت کی زندگی فکر اور علمی خدمات کو منصہ شہود پر لانے کا کام ابھی باقی ہے، میں نے ایسے مختصر مضامین لکھنا شروع کیے جن سے علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے کارہائے نمایاں آسان زبان میں منظرِ عام پر آئیں۔ قارئین کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کریں، معاشرے کی اصلاح ہو، علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے مجموعہ مضامین مشعل راہ ہو۔

''مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ: عبقری شخصیت'' آپ کے ہاتھ میں ہے اس کتاب میں جامع صفات، جامع کمالات، خادم ملت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کا تعارف، مختصر حالاتِ زندگی، شخصیت کی تعمیر وتشکیل، تعلیم وتربیت اور عظیم الشان علمی، دینی، اصلاحی، دعوتی، تعلیمی، تصنیفی کارناموں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

معتدل فکر، دردمند دل، محبوبیت، مقبولیت اور امتیازی شان رکھنے والی علمی خدمات سے مل کر علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت کی تشکیل ہوئی اب وہ اپنے مالک حقیقی کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ دنیا اور اس دنیا کی علمی تاریخ تاقیامت بیسویں صدی کے مردِ مومن مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بلند پایہ علمی کارناموں، مخلصانہ جدوجہد سے جگمگاتی رہے گی اور انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ اللہ ربُّ العزّت درجات بلند فرمائے، اعلیٰ علّیین میں جگہ عطا فرمائے۔

یکم محرم الحرام ۱۴۳۹ھ
۲۲ ستمبر ۲۰۱۷ء

ڈاکٹر رفعت سلطان
علی اپارٹمنٹ، عیدگاہ ہلز، بھوپال

☆☆☆

اعزازات

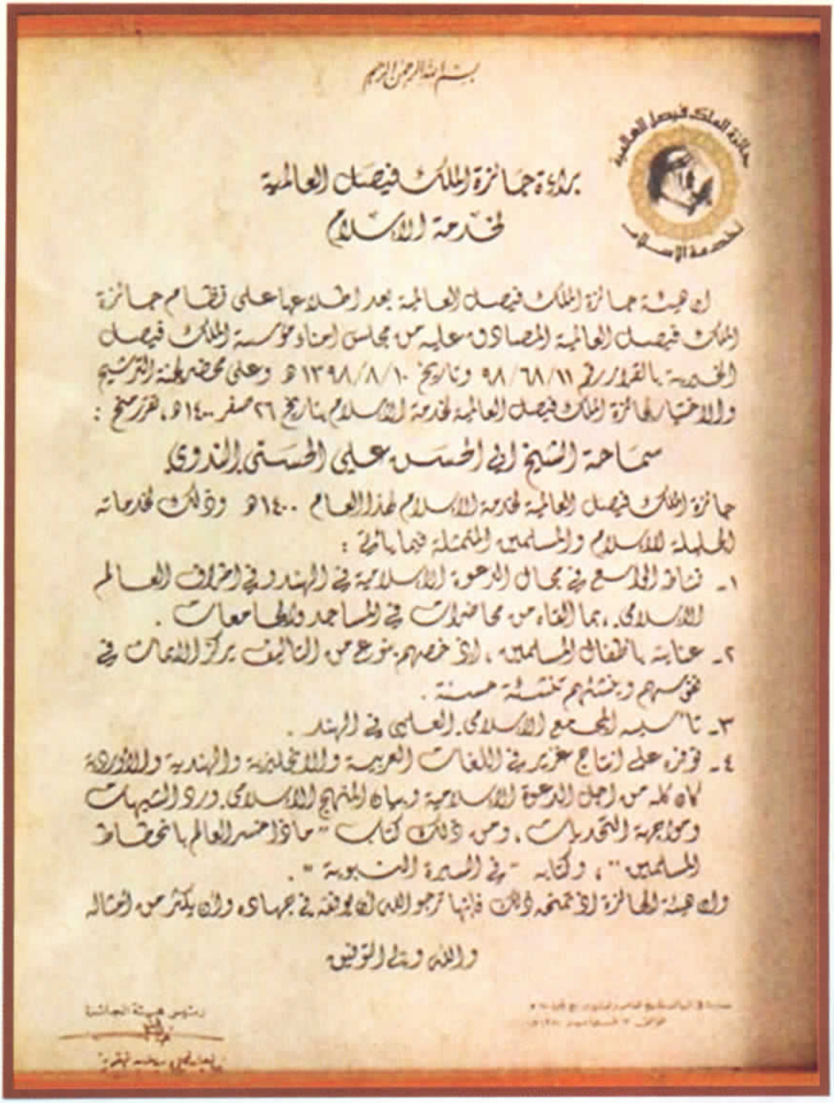

بسم الله الرحمن الرحيم

براءة جائزة الملك فيصل العالمية
لخدمة الإسلام

إن هيئة جائزة الملك فيصل العالمية بعد اطلاعها على نظام جائزة الملك فيصل العالمية المصادق عليه من مجلس أمناء مؤسسة الملك فيصل الخيرية بالقرار رقم ۱۱/٦٨/۹۸ وتاريخ ۱۰/۸/۱۳۹۸ﻫ وعلى محضر لجنة الترشيح والاختيار لجائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام بتاريخ ۲٦ صفر ۱٤۰۰ﻫ، تقرر منح:

سماحة الشيخ أبي الحسن علي الحسني الندوي

جائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام لهذا العام ۱٤۰۰ﻫ وذلك لخدماته الجليلة للإسلام والمسلمين المتمثلة فيما يأتي:

۱. نشاطه الواسع في مجال الدعوة الإسلامية في الهند وفي أطراف العالم الإسلامي، بما ألقاه من محاضرات في المساجد والجامعات.
۲. عنايته بأطفال المسلمين، إذ خصهم بنوع من التأليف يركز الإيمان في نفوسهم وينشئهم تنشئة حسنة.
۳. تأسيسه المجمع الإسلامي العلمي في الهند.
٤. توفره على إنتاج غزير في اللغات العربية والإنجليزية والهندية والأوردية كان كله من أجل الدعوة الإسلامية وبيان المنهج الإسلامي، ورد الشبهات ومواجهة التحديات، ومن ذلك كتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين"، وكتابه "في السيرة النبوية".

وإن هيئة الجائزة إذ تمنحه ذلك فإنها ترجو الله أن يوفقه في جهاده وأن يكثر من أمثاله

والله ولي التوفيق

رئيس هيئة الجائزة

اسلامی خدمات کے اعتراف میں ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں ''شاہ فیصل ایوارڈ''

۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۸ء ”جائزہ دبئی الدولیہ للقرآن الکریم“ کے
موقع پر ”ممتاز علمی واسلامی شخصیت“ کا اعزاز

آکسفورڈ اسلامک سینٹر کی جانب سے ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۹۹۹ء میں

''سلطان حسن بلقیہ انٹرنیشنل اعزاز''

آکسفورڈ اسلامک سینٹر کی طرف سے ''تمغۂ امتیاز سلطان حسن بلقیہ انٹرنیشنل پرائز''

جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کی طرف سے پیش کیا گیا

مجمع العلمی العربی دمشق کے رکن منتخب ہونے پر وزارت اوقاف،
جمہوریہ سوریہ کی جانب سے صدر جمہوریہ کے دستخط سے جاری ہوا۔

لاس انجلز (کیلی فورنیا) میں خیر مقدم

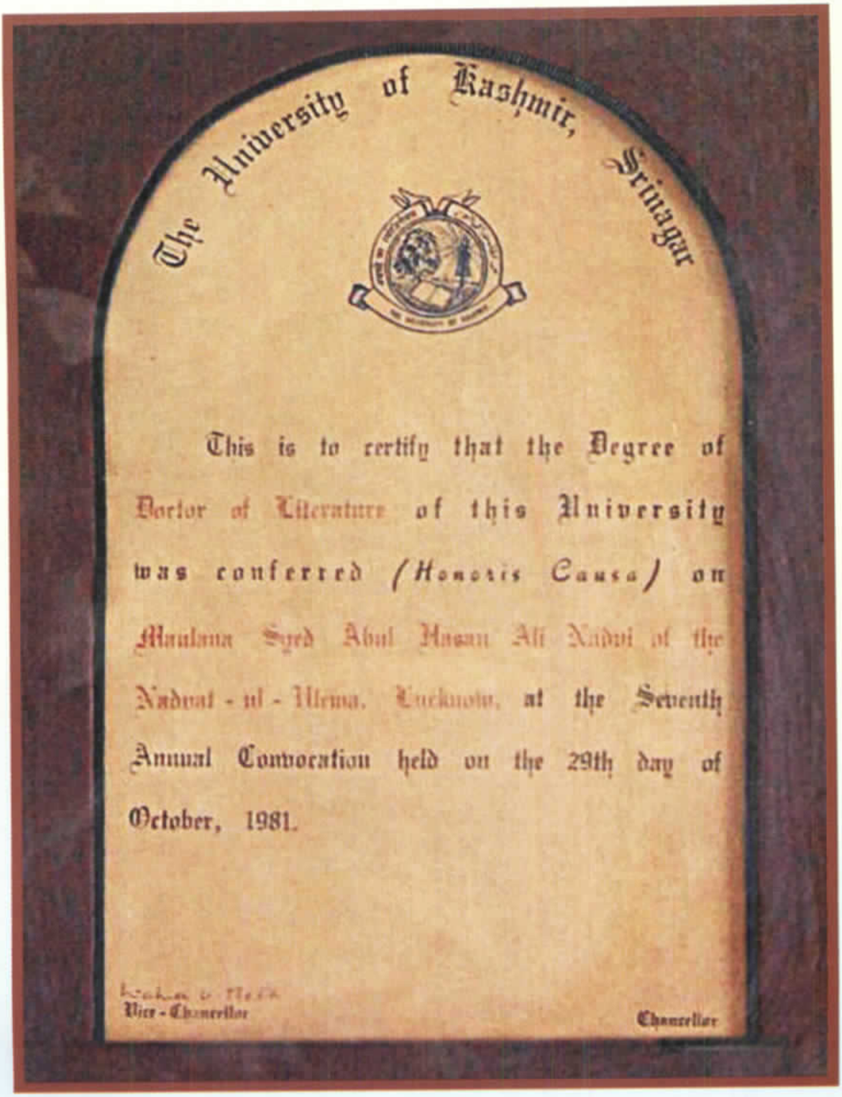

The University of Kashmir, Srinagar

This is to certify that the Degree of Doctor of Literature of this University was conferred (Honoris Causa) on Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi of the Nadwat - ul - Ulema, Lucknow, at the Seventh Annual Convocation held on the 29th day of October, 1981.

Vice - Chancellor

Chancellor

کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے ادب میں ''ڈی لٹ'' کی اعزازی ڈگری

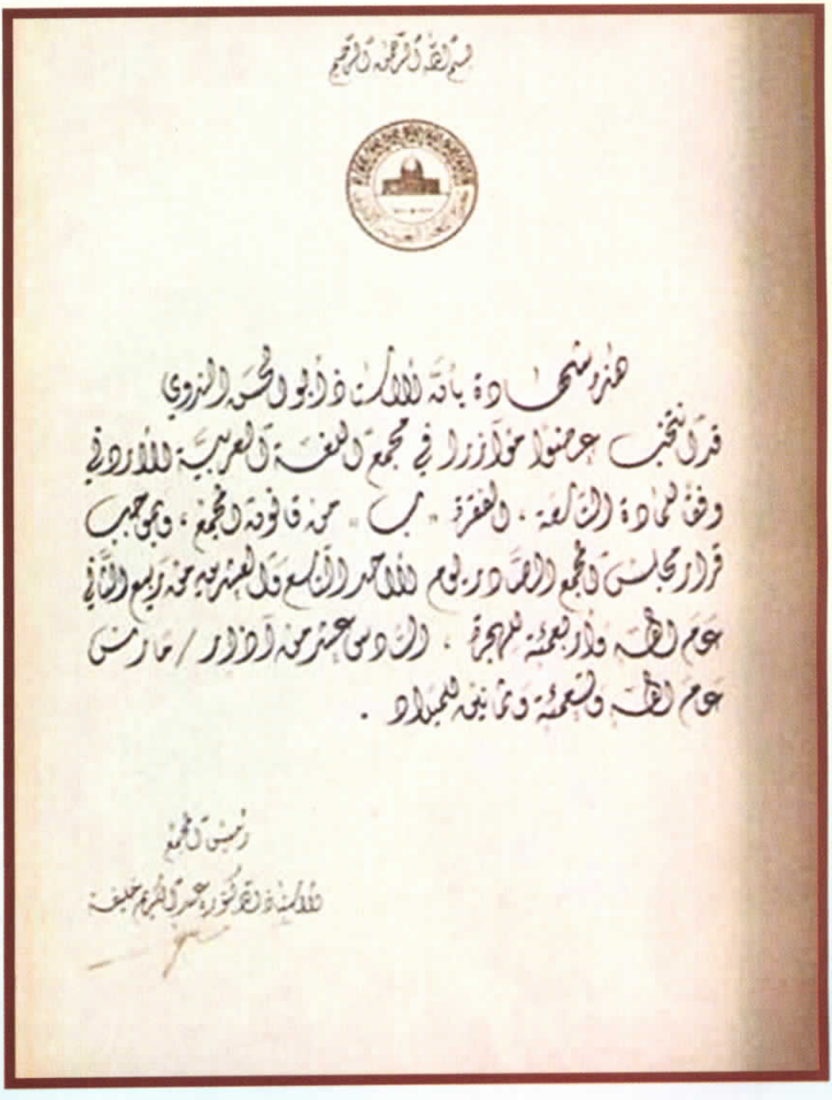

بسم الله الرحمن الرحيم

هذه شهادة بأن الأستاذ أبو الحسن الندوي
قد انتخب عضوا مؤازرا في مجمع اللغة العربية الأردني
وفق المادة الرابعة، الفقرة "ب" من قانون المجمع، وبموجب
قرار مجلس المجمع الصادر يوم الأحد التاسع والعشرين من ربيع الثاني
عام ألف وأربعمئة للهجرة، السادس عشر من آذار / مارس
عام ألف وتسعمئة وثمانين للميلاد.

رئيس المجمع

الأستاذ الدكتور عبد الكريم خليفة

مجمع اللغة العربية، اردن کے رکن نامزد کیے جانے پر صدر اکیڈمی
ڈاکٹر عبدالکریم خلیفہ کے دستخط سے جاری ہوا۔

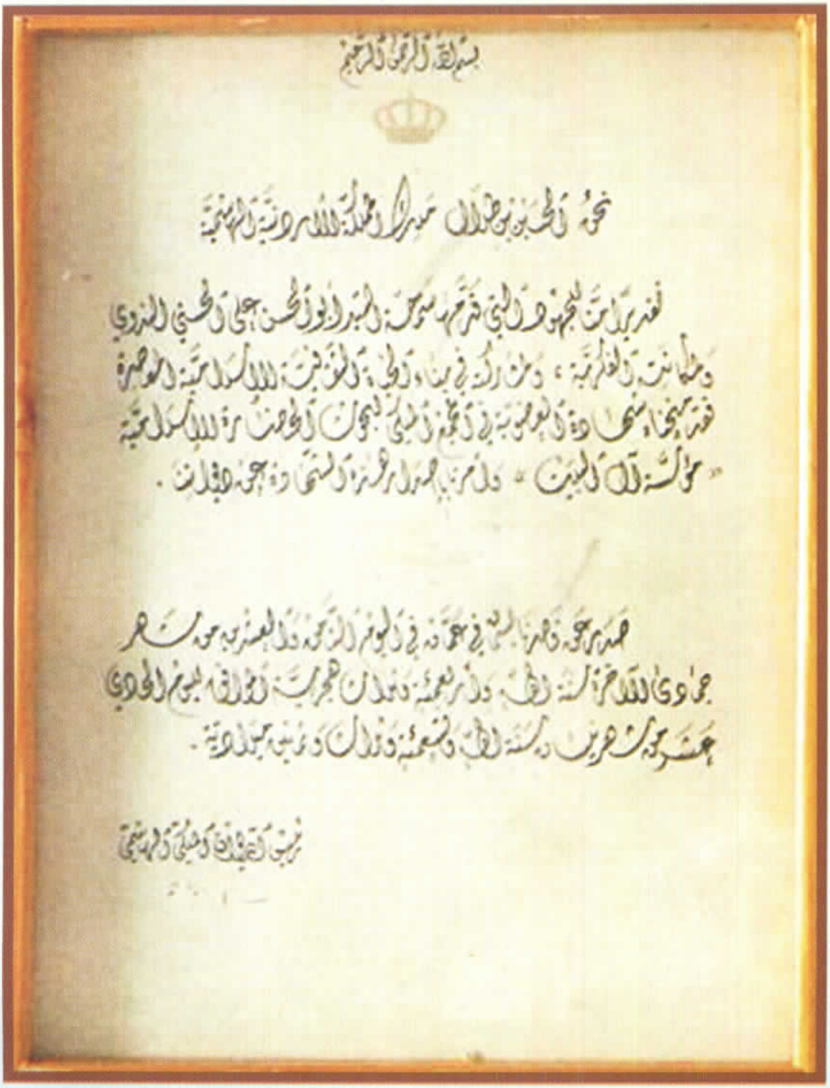
بسم الله الرحمن الرحيم

نحن الحسن بن طلال ولي عهد المملكة الأردنية الهاشمية

تقديراً منا للجهود التي قدمها سماحة الشيخ أبو الحسن علي الحسني الندوي
وطاقاته الفكرية، ومن أجل إغناء وإحياء الثقافة الإسلامية المعاصرة
فقد عيناه عضواً عاملاً في المجمع الملكي لبحوث الحضارة الإسلامية
«مؤسسة آل البيت» داعين [illegible].

صدر في قصرنا العامر في عمان في اليوم الرابع والعشرين من شهر
جمادى الآخرة لسنة ألف وأربعمائة وثمان هجرية الموافق لليوم الحادي
عشر من شهر شباط لسنة ألف وتسعمائة وثمانية وثمانين ميلادية.

رئيس الديوان الملكي الهاشمي

مجمع بحوث الحضارة الاسلامیہ "مؤسسة آلِ بیت" کا ممبر منتخب کیے جانے پر
عالی مرتبت شاہ حسین بن طلال ولی عہد سلطنت ہاشمیہ کے دستخط سے جاری ہوا۔

جامعة الیرموک عمان کے کلیة العربیة کی طرف سے
قبة الصخراء (مسجد اقصیٰ) کا مرمریں ماڈل

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نئی دہلی کی جانب سے عظیم علمی خدمات کے
اعتراف میں ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' ۱۹۹۹ء

جامعہ اسلامیہ چاٹگام، بنگلہ دیش کی جانب سے اعزاز

آل انڈیا ملی کونسل کی طرف سے ''ستارۂ ہند'' کا اعزاز

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا خاندانی پس منظر

انسان کی سیرت وشخصیت کی تشکیل میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں ان میں سب سے اہم نسب، خاندان اور خاندانی ثقافت ہے۔ وراثتاً اسے خاندان سے بہت کچھ ملتا ہے۔ اس کے بعد ماحول، وطن اور وطن سے باہر ماہرین وکاملین سے فائدہ اٹھانے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ یہ سب ہی اس کی شخصیت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ جن بلند صفات اور اعلیٰ کردار لوگوں کے حالات سنتا یا پڑھتا ہے، اس کے اثرات بھی کم وبیش ضرور پڑتے ہیں۔

علی میاںؒ کی سیرت وشخصیت کے تعارف اور حالاتِ زندگی سے قبل ان کے سلسلہ نسب، اہم افراد خاندان کا اجمالی تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

سلسلہ نسب کے اعتبار سے علی میاںؒ سادات حسنی سے ہیں آپ کا سلسلہ نسب، سبط اکبر امام حسن علیہ السّلام پر اس طرح منتہی ہوتا ہے۔

''سیّد ابو الحسن علیؒ بن سیّد عبدالحیٔ حسنیؒ بن سید فخر الدین حسنیؒ بن سید عبدالعلی حسنیؒ بن علی محمد بن اکبر شاہؒ بن محمد شاہؒ بن محمد تقیؒ بن عبدالرحیمؒ بن ہدایت اللہؒ بن محمد اسحٰقؒ بن محمد معظمؒ بن قاضی احمدؒ بن قاضی محمودؒ بن قاضی علاء الدینؒ بن امیر قطبؒ الدین محمد ثانی بن صدر الدینؒ بن زین الدینؒ بن احمدؒ بن علیؒ بن قیام الدینؒ بن صدر الدینؒ بن رکن الدینؒ بن امیر نظام الدینؒ بن امیر قطب الدینؒ محمد المدنیؒ بن رشید الدین احمدؒ بن یوسفؒ بن عیسیٰؒ بن حسنؒ بن ابوالحسنؒ بن ابو جعفرؒ بن محمد بن قاسمؒ بن ابومحمد عبداللہؒ بن حسنؒ الاعور الجواد نقیب الکوفہ بن محمد ثانیؒ بن ابی محمد عبداللہ الاشترؒ بن محمدؒ صاحب النفس الزکیہ بن عبداللہ المحضؒ بن حسن مثنیٰ بن حسن مجتبیٰ بن امیر المومنین علی مرتضیٰ بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم''

(حیات عبدالحیؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۴ تا ۷)

أنس بن يعقوب الكتبي الحسني
ANAS Y. AL-KUTEBI AL-HASANI

التاريخ ١٩ شعبان ١٤١٦هـ
المرفقات ... [illegible]

بسم الله الرحمن الرحيم

قال تعالى

﴿ ألم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة أصلها ثابت وفرعها في السماء ﴾ الآية.

نسب الشريف أبو الحسن علي الندوي

السيد الشريف أبو الحسن علي بن عبد الحي بن فخر الدين بن عبد العلي بن علي محمد بن أكبر شاه بن محمد شاه بن محمد تقي بن عبد الرحيم بن هداية الله بن إسحاق بن معظم بن أحمد بن محمود بن علاء الدين بن قطب الدين بن صدر الدين بن زين الدين بن أحمد بن علي بن قيام الدين بن صدر الدين ركن الدين بن نظام الدين بن قطب الدين محمد بن رشيد الدين أحمد بن يوسف بن عيسى بن حسن بن حسين بن جعفر بن قاسم بن عبد الله بن حسن بن محمد الكابلي بن عبد الله الأشتر بن محمد النفس الزكية بن عبد الله المحض بن الحسن المثنى بن الحسن بن علي بن أبي طالب رضوان الله عليهم أجمعين وابن فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم.

أعدها وحققها وقام بمراجعتها في مصادرها والتصديق عليها بمدينة خير الورى

راجي عفو ربه

الشريف أنس بن يعقوب الكتبي الحسني

خادم الأنساب النبوية بمدينة خير البرية

المصادر والمراجع:

[illegible]

المملكة العربية السعودية - المدينة المنورة [illegible]
KINGDOM OF SAUDI ARABIA - AL MADINA AL MUNAWARA [illegible]

مدینہ منورہ میں خادم الانساب النبویہ انس بن یعقوب الکتبی الحسنی کی جانب سے مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنیؒ کے شجرۂ نسب کی تصدیق اور سرٹیفکٹ

امام حسن علیہ السلام کے فرزند حسن مثنیٰؒ سے امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ صغریٰؒ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی تھیں اس نسبت سے اہل خاندان حسنی وحسینی کہلاتے ہیں۔

علی میاںؒ کا نانہالی سلسلہ نسب حسب ذیل ہے۔

''ابوالحسن علی ابن خیر النساء بنت شاہ ضیاء النبیؒ بن سعید الدینؒ بن غلام جیلانیؒ بن سید محمد واضحؒ بن سید محمد صابرؒ بن سید آیت اللہؒ بن شاہ علم اللہؒ بن فضیلؒ بن سید محمد معظمؒ بن قاضی احمدؒ بن قاضی محمودؒ بن قاضی رکن الدینؒ بن سید نظام الدینؒ بن امیر قطب الدینؒ بن رشید الدینؒ بن یوسفؒ بن عیسیٰؒ بن حسنؒ بن ابوالحسنؒ بن ابوجعفرؒ محمد بن قاسمؒ بن ابی محمد عبداللہؒ بن حسنؒ الاعور الجواد نقیب الکوفہ بن محمد ثانیؒ بن ابی محمد عبداللہؒ بن محمد صاحب نفس الزکیہؒ بن عبداللہ المحضؒ بن حسنؒ مثنیٰؒ بن فاطمہ زہراؓ بنت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم''

(نزهة الخواطر حکیم عبدالحیؒ حسنی جلد۔۸۔ص۔۱۹۸)

علی میاںؒ کے اسلاف خاندان نے بنی اُمیہ اور بنی عباس کے ہاتھوں اہل بیت کرام کی طرح خدا کی راہ میں تکالیف برداشت کیں۔

> ''خاندان کے ایک بزرگ محمد بن عبداللہ المحض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق مدینہ طیبہ میں شہید ہوئے۔امام محمد صاحب صاحب النفس الزکیہ کے بنی اعمام افریقہ کے مختلف حصوں میں پھیل گئے ، ان کی اولاد میں بڑے بڑے ائمہ اور خدا پرست امراء پیدا ہوئے۔سنوسی شیوخ امرائے مراکش وشرفائے مکّہ وامرائے عسیر انھیں حضرات کی اولاد میں ہیں۔''

(حیات عبدالحیؒ۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ:۔ص:۴)

اس سلسلہ کا ہر فرد اپنے معاصرین میں ممتاز رہا ہے، ہر ایک کا مختصر حال بھی تحریر میں لانا ایک مسلسل موضوع ہے لیکن خاندان کے علمی، ادبی، سماجی ، تہذیبی

اصلاحی وتجدیدی کوششوں کے پس منظر میں علی میاںؒ کے موروثی مزاج اور صفات کو نمایاں کیا جا سکے اس کے لیے خاندان کی ہندوستانی شاخ اور مشاہیر علماء اور فضلاء کا تذکرہ ضروری ہے۔

علی میاںؒ کے مورث اعلیٰ **امیر سید قطب الدین محمد مدنی**ؒ (۵۸۱ھ۔م ۶۶۷ھ) ایک عالی ہمت، بلند حوصلہ فقیہ اور صاحب ولایت بزرگ تھے۔ آپ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بھانجے تھے۔ آپ نے خواب میں حضورؐ کا اشارہ پا کر ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۰ء مدینہ طیبہ سے ہندوستان کا رخ کیا۔ امیر قطب الدینؒ کے ساتھ ان کے ہزاروں مریدین تھے۔ شمس الدین التمش کا دورِ حکومت تھا۔ حکومت نے امیر قطب الدینؒ کو شیخ الاسلام کا منصب نذر کیا۔

ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں:۔

''من کہ مؤلف تاریخ فیروز شاہیم از ثقات معمر شنیدہ ام در عصر بلبن چند بزرگ از بقایائے بزرگان شمسی ماندہ بود چند ملک از نوادر ملوک از اعوان و انصار او پیدا آمدہ کہ عہد و عصر سلطان بلبن ازاں بزرگاں وازاں ملوک آراستہ شدہ بود واعتبار تمام گرفتہ چنانکہ از سادات کہ بزرگ تر بزرگاں امت اند۔ قطب الدین شیخ الاسلام شہر حد بزرگوار قاضیان بداؤں وسیّد منتخب الدین وسیّد جلال الدین پسر سیّد مبارک وسیّد عزیز و سیّد معین الدین سامانہ وسادات کرویز، جد آں سیّد جھجو دو سادات عظام کیتھل و سادات جیحر و سادات بیانیہ و سادات بداؤں و چندیں سادات دیگر کہ از حادثہ چنگیز خاں ملعون دریں دریا آمدہ بودند و ہر یکے در صحت نسبت و بزرگی حسب عدیم المثال بودند و بکمال تقوی و تدین آراستہ ہر ہمہ برصدر حیات بودند۔''

(تاریخ فیروز شاہی۔ص۔۱۱۱ درعہد غیاث الدین بلبن)

امیر قطب الدینؒ نے دہلی سے نواح شرق کا رخ کیا کڑا مانک پور، پرتاپ

گڑھ پہونچ کر اقامت اختیار کی ہزاروں بندگان خدا کو ان سے ہدایت ملی۔ ۲ رمضان ۶۶۷ھ میں وفات ہوئی۔ امیر قطب الدین محمد المدنیؒ سے انتساب کی وجہ سے ان کی اولاد ہندوستان میں ''حسنی قطبی سادات'' کے نام سے معروف ہے۔

سادات کی یہ شاخ ایک صدی تک 'کڑا' ہی میں رہی، اس کے بعد جائس، نصیر آباد اور آخر میں تکیہ رائے بریلی میں منتقل ہوئی امیر قطب الدینؒ کے تین بیٹے امیر نظام الدینؒ، امیر قوام الدینؒ اور امیر تاج الدینؒ تھے، امیر سیّد قطب الدینؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے سیّد نظام الدینؒ علم و فضل، قوت و شجاعت اور ہمتِ عالی میں اپنے والد کے قدم بہ قدم تھے۔ وہ تمام معرکوں میں اپنے والد امیر قطب الدینؒ کے دوش بدوش بلکہ پیش پیش رہے۔ اپنے والد کے بعد کڑہ میں اُن کے جانشین ہوئے۔ امیر قطب الدینؒ کے دوسرے صاحبزادے قوام الدینؒ نامور عالم اور شیخ تھے، انھوں نے دہلی کو اپنا مستقر بنایا اور مسندِ ارشاد و سلوک کو آراستہ کیا۔

(خانوادہ علم اللّٰہی۔ مولانا محمد ثانیؒ۔ ص: ۲۳)

امیر سیّد تاج الدینؒ بڑے پائے کے عالم اور اور بدایوں کے قاضی تھے۔ ضیاء الدین برنؔی مصنف ''تاریخ فیروز شاہی'' ان کے متعلق رقم طراز ہیں۔

''یکے از سادات عظام کہ ایں دیا بوجود ہمایوں و معظم و مکرم بود سید السادات سید تاج الدین پسر شیخ الاسلام سید قطب بودہ است و سید تاج الدین مذکور پدر سید قطب الدین و جد سید اعز الدین از قاضیان بداؤں بودند و سالہا قضاء اودھ حوالت او بود سلطان علاء الدین او راز اودھ معزول کردہ و قضائے بداؤں داد۔'' ۲

(تاریخ فیروز شاہی مصنف ضیاء الدین برنی ص۔ ۳۴۸ در عہد غیاث الدین بلبن مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء)

امیر قطبؒ الدین کے پوتے سید رکنؒ الدین بن نظام الدینؒ بلند صفات کے مالک تھے۔ آپ بھی کڑا میں قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے جیسا کہ ضیاء الدیؔن برنی لکھتے ہیں۔

''سید رکن الدینؒ برادرزادہ سید تاج الدینؒ مذکور قاضی کڑا بودہ

است۔ وباری تعالیٰ سید رکن الدینؒ راجامع فضائل آفریدہ بود'۔

(تاریخ فیروز شاہی مصنف ضیاء الدین برنی ص۔ ۳۴۹ عہد سلطان علاء الدین خلجی)

حسنی قطبی سادات میں ہر دور میں علماء فضلاء، مشائخ وصوفیاء کا سلسلہ جاری رہا۔ امیر قطب الدین کی اولاد میں ہر زمانے میں سیادت، علم وفضل زہد وتقویٰ اور عہدہ قضا رہا۔ سید محمد الدین محمدؒ ثانی قصبہ جائس (ضلع رائے بریلی) کے قاضی رہے ان کے بیٹے علاء الدینؒ کے صاحبزادے سید محمودؒ اور ان کے بیٹے سید محمدؒ اور بھائی سید احمدؒ اپنے اپنے دور میں عہدہ قضا پر مامور رہے۔

'قاضی سید محمودؒ کے صاحبزادے قاضی سید احمدؒ کے سامنے دورانِ مقدمہ جب کسی فریق نے یہ جملہ کہا''از چیں حکم شرع بیزارم'' آپ کو بہت ناگواری ہوئی۔ ترک وطن کر کے رائے بریلی تشریف لے گئے ان کی اولاد نصیر آباد میں مقیم رہی'۔

(سیرت سید احمد شہید۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۸۳)

قاضی سید احمدؒ کے بیٹے سید محمد معظمؒ تھے۔ سید محمد معظمؒ کے دوفرزندوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ **سید محمد فضیلؒ اور سید محمد اسحٰقؒ** دونوں بھائی زاہد، متقی اور متبع سنت تھے۔ علی میاںؒ سید محمد اسحٰق کی اولاد میں ہیں اور ان کا مادری سلسلہ سیّد محمد فضیلؒ سے ملتا ہے جس کی نشاندہی شجرہ میں بھی کی گئی ہے۔ سید محمد فضیلؒ کی اولاد میں سے بعض بزرگوں نے اپنے زہد واتقا، علم وفضل جدوجہد، جہاد وقربانی سے پورے ماحول کو متاثر کیا اور اصلاحی وتجدیدی انقلاب برپا کیا۔

قاضی سید محمد فضیلؒ اپنے دادا کی طرح ہجرت کر کے حرمین چلے گئے، کسی مقدمے کے دوران فریق مقدمہ نے شریعت کے خلاف کوئی جملہ کہہ دیا جو انھیں ناگوار ہوا۔ انھوں نے یہ کہہ کر''در دیار بے اداباں بود و باش حرام است'' حجاز ہجرت فرمائی ۱۰۳۲ھ میں مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔''

(نزهة الخواطر۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی ج۔ ۵۔ ص۔ ۳۰۷)

قاضی سید محمد فضیلؒ کے دو بیٹے تھے شاہ داؤد اور شاہ علم اللہؒ۔ شاہ علمؒ اللہ جید عالم اور صاحب ولایت بزرگ تھے۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۲ھ میں نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔

(نزهة الخواطر۔ عبدالحیٔ حسنی ج۔ ۵۔ ص۔ ۲۴ اور تذکرہ شاہ علم اللہ از محمد الحسنیؒ ص۔ ۵۸)

خاندانی علماء سے علوم ظاہری کی تکمیل کی ،شاہجہاں کے لشکر میں ملازم ہوئے ، ایک رات دوران سفر شاہجہاں کی قیام گاہ پر تمام رات بیدار رہے صلہ میں انعامات مرحمت ہوئے لیکن یہیں سے ان کی زندگی کا رُخ پلٹ گیا۔ دنیا طلبی سے دل برداشتہ ہوکر خداطلبی کی راہ اختیار کر لی۔ حضرت مجدد سرہندیؒ کے ممتاز خلیفہ سید آدم بنوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے کسب فیض کیا خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حرمین شریفین کا ارادہ کیا راستہ میں نواب جہاں خاں نے جو آپ کے مرید تھے، موسم برسات تک اپنے یہاں قیام پر راضی کرلیا، اسی دوران ایک بزرگ شاہ عبدالشکورؒ سے آپ کی ملاقات ہوئی ، وہ شاہ علم اللہؒ کو اُس ویران مقام پر لے گئے جہاں آج تکیہ شاہ علم اللہؒ ہے۔ بزرگ نے اس جگہ قیام فرمانے کی درخواست کی اور ان کے پیر کی نصیحت کا حوالہ دیا ''جب شاہ علم اللہؒ نے حضرت آدم بنوریؒ سے ہجرت کی اجازت مانگی تھی تو انھوں نے فرمایا تھا، جاسکتے ہو لیکن اگر کوئی مرد خدا روکے تو ٹھہر جانا۔''

(سیرت سید احمد شہیدؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ جلد اوّل۔ ص: ۵۰)

شاہ علم اللہؒ نے شاہ عبدالشکورؒ کی درخواست قبول کر لی اور رائے بریلی میں قیام فرمایا۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے دوسرے حج میں کعبۃ اللہ کی پیمائش لائے ، دو چار انگل کم کر کے مع مطاف ایک مسجد کی تعمیر کی جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔ ۹ر ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ کو عہد عالمگیر میں انتقال ہوا۔ تکیہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں دفن ہیں۔ یہی جزیرہ نما بستی اب دائرہ ''شاہ علم اللہ تکیہ کلاں'' کے نام سے مشہور ہے۔

(سید احمد شہیدؒ۔ غلام رسول مہر ص: ۴۵)

شاہ علم اللہ کی اولاد واحفاد میں بڑے برگزیدہ عالم اور درویش صفت بزرگ گزرے ہیں۔ شاہ علم اللہؒ کے چاروں صاحبزادگان ، سید آیت اللہؒ ، سید ہدیٰؒ ، سید ابوحنیفہؒ ، سید محمد جیؒ (صاحب شرح کلمات نقشبندیہ) بہ لحاظ علم وتقویٰ جامع تھے، ان میں سے ہر ایک اتباعِ سنت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھا۔ ان کی اولادوں میں ان

کے خلف الصّدق پیدا ہوئے۔

علی میاںؒ سیرت سید احمد شہیدؒ میں شاہ علم اللہ کی اولاد کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''حضرت شاہ صاحبؒ کی اولاد میں اتنے جلیل القدر مشائخ اور مقبول اولیاء اللہ اس تسلسل اور کثرت سے ہوئے جس کی نظیر دوسرے خانوادوں میں مشکل سے ملے گی۔

شاہ صاحب کے چاروں صاحبزادگان سید آیت اللہؒ، سید محمد ہدیٰؒ، سید ابو حنیفہؒ اور سید محمد جیؒ آفتاب و ماہتاب تھے حضرت سید آیتؒ اللہ کے صاحبزادوں میں **سید محمد ضیاؒ**، سید محمد صابرؒ، سید محمد ضیاءؒ کے صاحبزادے **شاہ ابوسعید صاحبؒ** (خلیفہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ) جد مادری سید احمد شہیدؒ) سید محمد صابرؒ کے صاحبزادے مولانا سید محمد ظاہرؒ (خلیفہ سید احمد شہیدؒ) اور آخر میں آپ کے برادرزادے **سید شاہ ضیاء النبیؒ** اپنے اپنے وقت کے مرشد و ہادی تھے۔

اسی طرح سید محمد ہدیٰؒ کے صاحبزادے سید محمد نورؒ اور پوتے سید محمد حیاؒ بن محمد سناؒ اور سید محمد نورؒ کے صاحبزادوں میں **مولانا سید نعمانؒ**، **سید عرفانؒ**، سید عرفانؒ کے صاحبزادے سید محمد اسحٰقؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اسی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں۔

سید ابو حنیفہؒ کے صاحبزادے سید محمد باقیؒ اور حضرت سید محمدؒ کے صاحبزادے سید محمد حکمؒ اور سید محمد عدلؒ عرف شاہ لعل تھے۔''

(سیرت سید احمد شہید۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ص:۹۳)

سید محمد عدلؒ عرف شاہ لعلؒ کے متعلق مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ لکھتے ہیں۔ ''اودھ کی مشیخیت ختم تھی ان سے کاکوری کے صوفیہ اور فرنگی محل کے علماء مستفید ہوئے۔''

(نزھۃ الخواطر۔ مولانا عبدالحئی حسنیؒ ص:۳۳۱)

شاہ علم اللہؒ کے پوتے شاہ ابوسعید حسنیؒ بن سید محمد ضیاؒ (سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا) نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے کسب فیض کیا شاہ محمد عاشقؒ پھلتی سے سلوک کی تعلیم حاصل کی، اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

(کاروان ایمان وعزیمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص:۱۰۱)

علی میاںؒ لکھتے ہیں:۔ ''شاہ ابوسعید حسنیؒ نے ایک مرتبہ خود خطرے میں پڑ کر اور

رزم گاہ میں بہ نفسِ نفیس جا کر دو متقابل مسلمان طاقتوں کو مزید تصادم اور نبرد آزمائی سے بچایا۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ'' نے اس ہمّت وعزیمت پر بڑی خوشنودی کا اظہار فرمایا''۔

(کاروان زندگی حصہ اول۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۲۳)

امیر قطب الدین محمد الحسنیؒ کی اولاد میں علماء اولیا، مشائخ، مجاہد و مجدد بکثرت پیدا ہوئے۔ان میں سے اکثر اپنے معاصرین میں ممتاز رہے اور اصلاحِ عقائد، رسوم شرک و بدعت کی بیخ کنی، اسلام کی اشاعت اور احیاء کے لیے سرگرم رہے۔تیرہویں صدی ہجری میں جب سکھوں نے سر اٹھایا تو رائے بریلی اور دہلی کے خاندانوں سے ہی وہ جلیل القدر اکابر اُٹھے جنھوں نے پورے ہندوستان کو بیدار کر دیا۔ہر طرف دعوت و اصلاح، تبلیغ، جدوجہد، جہاد و قربانی کا ولولہ پیدا کر دیا۔مردانگی دینی حمیت اور جذبہ جہاد کے اوصاف نمایاں نظر آنے لگے۔

خاندان علم الہٰیؒ کی تاریخ میں مجاہد کبیر **سید احمد شہیدؒ** کا نام اور کام سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

سید احمد شہیدؒ ۱۲۰۱ھ میں تکیہ شاہ علم اللہ میں پیدا ہوئے۔والد سید محمد عرفانؒ اور دادا سید محمد نورؒ تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔بہادری اور جوانمردی کے کھیلوں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔جوان ہوئے لکھنؤ دہلی کا سفر کیا۔شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے خلیفہ و مجاز ہوئے۔سید احمد شہیدؒ کا شمار اگرچہ بادی النظر میں ظاہری علماء میں نہ تھا لیکن ان کا باطن نورالہٰی سے منور تھا۔

(تذکرہ علمائے ہند از رحمٰن علی۔ص:۲۲۵)

مردانگی، دینی حمیت، جذبہ جہاد ان کے امتیازی اوصاف تھے۔بڑے بڑے علماء آپ کے مرید ہوئے۔ساری زندگی علماء فقہا، مفسرین و مجتہدین کے ساتھ رہے۔اشاعت دین اور ترویج سنت کے لیے مختلف سفر کیے۔ہندوستان میں فریضہ حج کی ادائیگی کو از سرِ نو زندہ کیا۔آخر میں بالاکوٹ میں جہاد کرتے ہوئے ۲۴/ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو شہید ہوئے۔

(نزهة الخواطر۔مصنفہ مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ ج:۷،ص:۲۷)

''سید احمد شہیدؒ'' کے سوانح نگار غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''سید صاحب بدو شعور سے زندگی کے آخری لمحے تک جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف رہے۔ ان کی آواز برابر دین حق کی سربلندی کے لیے متحرک رہی۔ وہ جہاں پہونچے یہی آرزو لے کر پہونچے کہ اسلام صحیح شکل میں پوری عظمت وشان سے جلوہ گر ہو، انھوں نے لاکھوں گمراہوں کو طریق شریعت کا پابند بنایا۔ اوران کے سینوں میں عشق حق کے چراغ روشن کیے بعض ارکان اسلام میں گوناگوں اوہام ووساوس کی بناپر جو رخنے پیدا کردیے گئے تھے انھیں عزم وہمّت سے بند کیا۔ پھر بلاد اسلام کو اغیار کے دست برد سے بچانے کے لیے وطن چھوڑا۔ عزیزوں سے دوری گوارا کی۔ فراغت وآسائش کی زندگی کو ٹھکرا کر غربت کی مصیبتیں خوشی خوشی قبول کیں۔ زہرہ گداز صعوبتوں اور مشقتوں کے پہاڑ اس بے تکلفی سے اٹھالیے گویا مقصود حیات یہی تھا۔ آخر اس راہ میں جان عزیز قربان کردی۔ وہ ہر مسلمان کے دل میں دین حق کے لیے ایثار وقربانی کی یہی روح پیدا کردینا چاہتے تھے۔ ہر کلمہ گو کو حقیقی معنوں میں مجاہد فی سبیل اللہ بنادینے کے آرزومند تھے ان کی آغوش تربیت میں جو جماعت تیار ہوئی اس کی ممتاز ترین خصوصیت یہی تھی کہ ایک ایک فرد زندگی کی ہر شے کو قربان کردینا اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا تھا اور جب کوئی غازی شہادت پاتا تو سب کہتے کہ وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اس سر زمین کی پوی تاریخ میں شیفتگی حق کی ایسی مثال شاید ہی کوئی مل سکے، سید صاحب اس باب میں بالکل یگانہ نظر آتے ہیں۔

(سید احمد شہید۔ غلام رسول مہر ج اوّل ص۔ ۲۴۵)

۲۳ سال کی عمر میں علی میاںؒ نے پہلی تصنیف سید صاحبؒ کی سوانح حیات ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' مرتب کی تھی۔ آپؒ سیّد احمد شہیدؒ کی شخصیت اور جذبۂ جہاد

سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ یہ تاثر تاحیات قائم رہا۔

مولانا محمد حمزہ حسنی نے سیرت سید احمد شہیدؒ مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تلخیص کی ہے۔ سید صاحب کے مجاہدانہ کارناموں، آپ کے خلفاء کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''سید صاحب کا سب سے عہد آفریں کارنامہ اور کرامت آپ کی تربیت کی ہوئی وہ جماعت تھی جس کی مثال اتنی بڑی تعداد اور اس جامعیت اور کاملیت کے ساتھ خیرالقرون کے بعد نظر نہیں آتی یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ جماعت مجاہدین تیرہویں صدی میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا نمونہ تھی، یہ لوگ عقائد، اعمال واخلاق، اتباعِ سنت، شریعت کی پابندی، عبادت وتقویٰ، سادگی، ایثار، خدمتِ خلق، غیرت دینی، حمیت اسلامی، صبر واستقامت اور شوق شہادت میں مہاجرین وانصار کا نمونہ اور نقشِ قدم تھے۔

حضرت سید صاحب کا اصل کارنامہ صحیح اور کامل مسلمان پیدا کرنا اور اسلام کی دعوت کو نئے انداز سے اسی قوت اور روح کے ساتھ پیش کرنا تھا جس کی اس زمانے میں ضرورت تھی...... آپ کے ہاتھ پر لاکھوں انسانوں نے توبہ کی، خدا کا نام سیکھا، دین کا راستہ اختیار کیا، فاسق اور فاجر متقی اور پاکباز بن گئے، ہزاروں غافل اور کم ہمت، شیخ وقت اور سالکِ راہ خدا ہو گئے جدھر سے آپ کا گزر بھی ہو گیا وہاں طاعت الٰہی اور خشیت کا ماحول بن گیا گناہوں سے نفرت پیدا ہوگئی۔

سید احمد شہیدؒ نے شرک و بدعت کے استیصال کی طرف پوری توجہ کی، آپ توحید وسنت پر لوگوں سے بیعت لیتے اور سب سے زیادہ اسی پر زور دیتے، اور آپ کے متبعین میں یہی رنگ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

توحید وسنت کا یہ رنگ اتنا گہرا اور پائیدار ہوتا تھا اور آپ کی صحبت وبیعت اتنی مؤثر تھی کہ جس نے بھی آپ سے بیعت کی یا آپ کی صحبت بابرکت میں بیٹھ گیا اُس پر ایسا رنگ چڑھ جاتا کہ کسی طرح نہ اُترتا تھا۔ بچے اور عورتیں بھی اس رنگ میں اتنی

کامل تھیں کہ کوئی ان کو اس راہِ حق سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔

آپ نے اسلام کی تبلیغ اور توحید و سنت کی عالمگیر اشاعت فرمائی اور ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جہاں آپ کا فیض نہ پہونچا ہو، دہلی اور کلکتہ کے درمیان سینکڑوں مقامات کا آپ نے بہ نفس نفیس دورہ فرمایا۔ آپ کے عظیم القدر خلفاء مولانا عبدالحیؒ صاحب اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے مواعظ ہوئے۔ سندھ اور سرحد میں خود قیام فرمایا، مدراس، حیدرآباد دکن، بمبئی میں مولانا سید محمد علی رام پوریؒ اور مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ کو بھیجا جنھوں نے اصلاح عقائد و اعمال و رسوم کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ پورب میں آپ کے خلفاء مولانا ولایت علیؒ اور مولانا سخاوت علی جونپوریؒ، صوفی نور محمدؒ کی کوششوں سے لاکھوں آدمی ہدایت یاب ہوئے۔ نیپال کی ترائی میں مولانا سید جعفر علیؒ نے ہدایت کی روشنی پھیلائی، افغانستان میں آپ کے خلیفہ مولوی حبیب اللہ قندھاریؒ سے بڑی اصلاح ہوئی جن کے خلیفہ مولانا عبداللہ غزنویؒ سے پنجاب میں بڑی ہدایت و روشنی پھیلی۔ تبت میں آپ نے وہیں کے چند باشندوں کو جو آپ سے بیعت ہوئے تھے تبلیغ و ہدایت کے لیے بھیجا اور ان میں سے چند آدمی تبلیغ کے لیے چین گئے۔ جاوا، بلغار اور مراکش کے بہت سے اہلِ علم و فضل آپ سے بیعت اور خلافت سے سرفراز ہو کر اپنے اپنے ملکوں میں خدمتِ دین میں مصروف ہوئے''۔

(تذکرہ سید احمد شہیدؒ۔ مولانا محمد حمزہ حسنی۔ تلخیص۔ ص: ۲۱۷ تا ۲۲۴)

شاہ علم اللہؒ کے چچا زاد بھائی دیوان خواجہ احمدؒ سید ہدایت اللہؒ اور سید تاج الدینؒ تھے۔ دیوان خواجہ احمدؒ علوم ظاہری و باطنی پر یکساں کمال رکھتے تھے۔ سید آدم بنوریؒ سے بیعت تھے ۱۰۸۸ھ میں وفات ہوئی۔

(نزهة الخواطر۔ مولانا عبدالحی حسنیؒ، ج: ۵، ص: ۳۷)

دیوان خواجہ احمدؒ کے منجھلے بھائی **سید ہدایت اللہؒ** عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ انھوں نے کئی فقہی مسائل پر رسائل تصنیف فرمائے یہ قلمی رسائل خاندانی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہیں۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں کہ ان رسائل پر والد ماجد نے تحریر کیا ہے:

''یہ رسائل ہمارے جدّ امجد مولانا سید ہدایت اللہ صاحب کے قلم کے تحریر کیے ہوئے ہیں فرزندان سعادت مندان سے امید ہے کہ ان کی حفاظت ونگہداشت سے غفلت نہ برتیں گے۔''

(حیات عبدالحئی ۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ۔ص:۲۷)

مولانا ہدایت اللہؒ کی اولاد میں ایک بزرگ گذرے ہیں جن کا اسم گرامی سید عبدالعلیؒ ہے یہی سید عبدالعلی نصیر آبادی علی میاںؒ کے پردادا ہیں۔آپ نے سید احمد شہیدؒ کے جوش وجذبہ اور سرگرم مجاہدانہ کوششوں کی وجہ سے ان کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان کے افراد نے بالاکوٹ کے جہاد میں نہ صرف شرکت کی بلکہ جام شہادت نوش کیا۔ علی میاںؒ تحریر کرتے ہیں:

''یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس خاندان کے بزرگوں نے ہمیشہ جہاد میں حصہ لیا'' شاہ علم اللہؒ کے تین صاحبزادے جہاد میں شریک ہوئے اور دو پوتے میر عظیم الدینؒ بن سید آیت اللہؒ، سید محمد جامعؒ بن میر محمد احسنؒ بن سید آیت اللہؒ اور ایک بھتیجے اور داماد سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ شہید ہوئے۔''

(سیرت سید احمد شہید ۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ۔ص:۹۴)

تیرہویں صدی کے اواخر میں اس خانوادہ کے ممتاز بزرگوں میں **خواجہ احمد بن یاسینؒ نصیر آبادی** (۱۲۸۹ھ) کا نام بہت اہم ہے۔ خواجہ احمد کے خلیفہ و مجاز حکیم فخر الدین خیالی اپنی تصنیف **''مہر جہاں تاب''** میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اگر آنجناب کو تیرھویں صدی کے آخر کا مجدد کہا جائے تو بجا ہے کہ ملت محمدی کو زندہ اور سنت احمدی کو برپا کیا وہ قومیں جو تیرھویں صدی کے مجدد سید احمد شہیدؒ کے عہد میں فیض سے محروم رہیں اور جنھوں نے اسلام میں سے کوئی حصہ نہ پایا حضرت مخدوم زمان کے زمانے میں بہرہ ور ہوئے اور اس کام کی تکمیل ہوئی جس کا سید احمد شہیدؒ نے آغاز کیا تھا۔

(نزهة الخواطر ۔مولانا عبدالحئی حسنیؒ، ج:۵،ص:۳۸)

اس تبلیغ و ہدایت کا سب سے مؤثر ذریعہ بیعت تھا، تحصیل علم اور قطع منازل سلوک کے بعد جوق در جوق لوگوں نے آپ کی طرف رجوع کیا اس وقت اطراف و جوانب میں آپ سے بڑھ کر عالی سلسلہ، صاحب نسبت اور جامع شریعت وطریقت کوئی ہستی نہ تھی اور آپ سے بڑھ کر عزیمت پر عمل کرنے والا اور صاحب استقامت شیخ نہ تھا۔ خاندان میں بھی دور آخر میں آپ کی ذات تھی اس لیے جتنے لوگ اس خاندان سے عقیدت رکھتے تھے یا حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے سے وابستہ تھے ان سب نے آپ کی طرف توجہ کی۔ دیہاتوں اور قصبات کے ہزاروں مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ نے ان کو شرک و بدعت سے تائب کر کے سلسلہ میں داخل کیا اور اتباع شریعت اور پیروی سنت کا عہد لیا پھر ان کی نگرانی اور ان کا احتساب فرماتے رہے اور ان کی تعلیم میں کوشاں رہے ان میں سے بہتوں کو اپنی خدمت میں رکھ کر ان کی تکمیل کی اور جادۂ شریعت پر ثابت قدم اور مستقیم بنا دیا۔

(کاروان ایمان وعزیمت۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۱۴۸)

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ گل ہو جانے کے بعد نئی انگریزی حکومت کا قیام عمل میں آیا انگریزی حکومت اور اس کے جلو میں آنے والی تہذیب و معاشرت سے نبرد آزمائی کا دور شروع ہوا۔اس وقت سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے علماء اور مشائخ نے حالات کا مقابلہ کیا۔ بدلتی ہوئی صورت حال کو سخت ناگواری اور مجبوری کے ساتھ برداشت کیا۔ ہندوستان کو روحانی، اخلاقی تہذیبی و معاشرتی، ذہنی و تعلیمی غلامی سے بچانے کا عزم کیا، مختلف تعلیمی تحریکات، تربیتی مراکز اور خانقاہوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی پیدا کردہ ذہنی و ثقافتی بیداری کو سید احمد شہیدؒ نے اسلامی دعوت وعزیمت کی پر جوش تحریک میں بدل ڈالا تھا۔ ان کے بعد ان کے خلفاء نے بھی حمیت اسلامی، غیرت ملی، جاں فروشی کے جذبات کے ساتھ جد وجہد جہاد وقربانی کا راستہ اختیار کیا۔جس کے دوررس اصلاحی اثرات برصغیر ہند و پاک میں آج بھی نظر آتے ہیں۔

خاندان حسنی وحسینی میں مصلحانہ ومجاہدانہ سرگرمیوں کے ساتھ علمی ادبی شوق اور

تصنیف کا ذوق رکھنے والے افراد بھی ہیں، جنھوں نے قرطاس وقلم کا سہارا لے کر خاموش انقلاب برپا کرنے کی سعی کی، حسنی قطبی سادات نے زبان وادب کی خدمت بھی کی اور اپنے خاندان کے حالات و وقائع کو یکجا کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ خاندان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد نے خاندانی روایات آباء واجداد کے قابل فخر کارناموں ان کی سیرت وشخصیت حالات ووقائع جمع کرنے کی طرف خاص توجہ دی، سید محمد نعمانؒ (عم معظم سید احمد شہیدؒ) نے ''اعلام الھدیٰ'' ترتیب دی جس میں خاندانی حالات قریبی اجداد کی سیرت اور واقعات کو قلمبند کر کے محفوظ کر دیا۔

(نزهة الخواطر۔ مولانا عبدالحیٔ حسنی۔ ج:۲،ص:۳۸۷)

خاندانی انساب کے موضوع پر سید نعمانؒ کے بعد خاندان کے ایک اور بزرگ عبدالشکورؒ (م ۱۲۸۳ھ) نے ''گلشن محمودی'' لکھی۔ اس کے بعد علی میاںؒ کے دادا مولانا فخر الدین خیالی نے ''اعلام الھدیٰ'' میں اضافہ کیا اور اس کا نام "سیرة علمیه" رکھا، علی میاںؒ کے والد مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ نے سیرۃ علمیہ میں اضافہ کیا اور اس کا نام ''تذکرۃ الابرار'' رکھا۔ حکیم فخر الدین خیالی نے ''سیرت السادات'' کے نام سے ایک مفصل نسب نامہ مرتب کیا جس میں آنحضرتؐ سے لے کر اپنے زمانے تک خاندان کے تمام افراد کے نام ونسب، سن وحالات وکمالات جمع کیے۔

خاندانی تاریخ و انساب کے علاوہ افراد خاندان نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ان میں مذہبی، دعوتی، اصلاحی، علمی وتعلیمی رنگ غالب رہا ہے۔ حسنی حسینی سادات میں تصنیف وتالیف کا ذوق رکھنے والے افرد کی خاصی تعداد ہے۔ ان میں بعض ایسے باکمال وممتاز مصنفین ومحققین کے اسماء شامل ہیں۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی تحقیق وجستجو اور دیدہ ریزی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت میں گذار دی۔ الحمدللہ اس خانوادے کی موجودہ نسل میں بھی اسلامی فکر رکھنے والے اصحابِ قلم کا مبارک سلسلہ قائم ہے۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است ایں خانہ تمام آفتاب است

علی میاںؒ کے پردادا مولانا سید عبدالعلیؒ نصیر آبادی

علی میاںؒ کے پر دادا ''مولانا سید عبدالعلیؒ نصیر آبادی ایک درویش سیرت فاضل بزرگ تھے اور باوجود تحصیلداری کے فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے آپ سید احمد شہیدؒ کے مرید و مجاز تھے۔۔۔خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب سرکاری ڈاک آپ کے ہاتھ میں دی جاتی تو روز قیامت میں حساب وکتاب کا پرچہ یاد کر کے رو پڑتے۔آپ کو آرٹ کا بہت اچھا مذاق تھا،نقاشی، وخوش خطی کے اچھے نمونے موجود ہیں۔آپ کبھی کبھی زیور نیز لکڑی اور لوہے کا سامان شوقیہ بناتے تھے اور نہایت نفیس بناتے تھے۔ آپ بے روزگار احباب واعزہ کا ملجاو ماویٰ تھے۔آپ کے اخلاق کریمہ کا تذکرہ اکثر گھرانوں میں اب تک عزت واحترام سے کیا جاتا ہے۔آپ شاعر بھی تھے۔عربی میں علی اور ریختہ میں ہجر تخلص کرتے تھے۔

(حیات عبدالحیٔ۔ مولانا ابوالحسن ندویؒ۔ص:۸)

ان تمام صفات کے ساتھ آپ ایک اہم سرکاری عہدہ پر بھی فائز تھے یعنی ناگود (ایم پی) میں تحصیلدار تھے۔

(نزهة الخواطر۔جلد۔۷۔ص:۲۸۱، یادِایام۔ص:۵)

حضرت شاہ علم اللہؒ کی پانچویں پشت میں ایک عالم و بزرگ مولانا محمد ظاہرؒ گذرے ہیں ان کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے مولانا سید عبدالعلیؒ صاحب کو منسوب ہوئیں ''اسی تعلق کی بناء پر نصیر آباد سے دائرہ شاہ علم اللہؒ آ گئے مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی نے اپنے والد بزگوار کے بارے میں تذکرہ مہر جہاں تاب میں تحریر فرماتے ہیں:

''اپنے دور کے بہت بڑے زاہد ومتقی انسان تھے تعلقات دنیاوی اور سلسلۂ ملازمت کے باوجود باہمہ وبے ہمہ ''دل بیار ودست بکار'' کا نمونہ تھے اور ہوش دردم سفر در وطن اور نظر برقدم پر عامل تھے روزانہ نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن کریم اور دلائل الخیرات کے ورد کا معمول تھا۔اشراق پڑھنے کے بعد مصلے سے اٹھتے اور عصر

تک سرکاری کاموں میں مشغول رہتے ،ظہر کی نماز کچہری میں ادا کرتے نماز عصر کے بعد ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور زبان دعاء وتسبیح میں مشغول ،مغرب تک اسی حالت میں رہتے اور کسی سے کلام نہ فرماتے ،عشاء کی نماز کے بعد احباب واعزاہ کے ساتھ کھانا تناول فرماتے (جواکل حلال سے ہوتا) اگر کسی کا مقدمہ ان کے یہاں ہوتا تو احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی ضیافت یا نذر وتحفہ قبول نہ فرماتے منہیات شرعیہ سے غایت درجہ مجتنب تھے۔۔ جہاں تشریف لے جاتے وہاں کے لوگ بھی صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوجاتے اوران کی برکت سے دینداری کی فضا قائم ہوجاتی ۔ بیعت وخلافت حضرت سیداحمد شہیدؒ سے حاصل تھی ۔ بکمال فیاضی وسخاوت تمام مشاہرہ مستحقین اور مسافرین پرصرف کردیتے ،اپنے لیے ایک یا دوسادہ جوڑے سے زیادہ کچھ پسند نہ فرماتے ،اگر کوئی حاجت مند ان سے ملتا تو اس کو حتیٰ الامکان نوکر رکھوادیتے اوراس کے خوردونوش کی فکر رکھتے ،اکثر پیدل چلتے دوسروں سے خدمت کے روادار نہ تھے۔مجلس میں صدر نشین ہونا اور گفتگو میں اپنی بات اونچی رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔کسی معمولی آدمی پرغصہ نہ کرتے ،غلطیوں سے اکثر وبیشتر اغماض کرتے ،ان کے سامنے ان کی دینداری اور خوف الٰہی کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے کسی میں غلط کام کرنے کی جرأت نہ ہوتی ۔ غیبت اور جھوٹ سے کوئی واسطہ نہ تھا، کھانے میں کبھی عیب نہ نکالتے جو چیز سامنے آجاتی کھالیتے ، یہاں تک کہ اگر نمک نہ ہوتا تب بھی کچھ نہ کہتے ، جب دوسرے شرکائے کرام اظہار کرتے تو معلوم ہوتا،طبیعت میں سادگی اور انکساری اس درجہ تھا کہ کبھی فرشِ نفیس اور بستر نرم کے پابند نہ ہوئے ،کبھی تخت پر کبھی زمین پر پیر پھیلا لیتے اور تھوڑی دیر سولیتے ،زیرکی صناعی اور خوش نویسی میں یکتائے زمانہ اور فرید عصر تھے۔ خط نسخ ونستعلیق بہترین لکھتے اور نفیس طغریٰ بناتے ،صنعت نجاری ، ذرگری اور ترصیع سے بھی واقف تھے۔شعر گوئی کا بھی ذوق تھا عربی اور ریختہ میں اشعار کہتے تھے۔ عربی میں علی تخلص تھا اور ریختہ میں ہجر۔حاصل یہ کہ بہ تمام آگہی اتباع احکام شرعی اور فقر وزہد میں زندگی گذاردی اور دم واپسیں تک اسی حالت پر قائم رہے، وفات سے

پہلے آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ **ھوالرفیق الاعلیٰ** تھا جو ہمارے پیغمبر ﷺ کی زبان مبارک پر ارتحال کے وقت جاری تھا، انتقال مرض فالج میں ہوا۔ ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ھ میں ناگود میں انتقال فرمایا اور ظہر کے قریب مسجد عبدالسبحان میں (جو قلعہ کے نیچے واقع ہے) مدفون ہوئے۔

(حیات عبدالحیٔ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۔۱۰۔۱۱)

جدامجد مولوی حکیم سید فخرالدین خیالیؔ

حکیم فخرالدینؒ خیالی، علی میاںؒ کے جدامجد ہیں۔ ولادت تکیہ شاہ علم اللہؒ بیرون رائے بریلی ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں ہوئی۔(نزھۃ الخواطر ۔مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ جلد:۸،ص:۳۵۵) کم سنی میں اپنی والدہ کے ساتھ ناگود تشریف لے گئے جہاں ان کے والد تحصیلدار تھے۔ وہیں فارسی وعربی کی ابتدائی کتابیں مولوی سید محمد طٰہٰ نصیرآبادی اور حکیم احمد جان دہلویؒ سے پڑھیں (گل رعنا۔مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ،ص:۵۲۴) تیرہ برس کا سن تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ سرکار نے ان کی خدمات جلیلہ پر نظر کر کے کچھ وظیفہ تعلیم مقرر کردیا جو عرصہ تک انھیں ملتا رہا۔

ناگود میں اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہرؒ مرحوم کے دامن تربیت میں پرورش پائی اور شرح وقایہ تک ان سے اور مرزا رحیم اللہ صاحب سے وطن میں رہ کر تعلیم پائی۔ نانا کی وفات کے بعد لکھنؤ تشریف لائے اور مولانا محمد نعیمؒ فرنگی محل کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، طب کی کتابیں حکیم محمد یعقوب سے پڑھیں۔ شعروسخن کا ذوق حکیم احمد جان دہلوی کی صحبت میں پروان چڑھا۔ نانا محمد ظاہرؒ کی صحبت میں ترقی ہوئی۔ علمی فضل وکمال کے ساتھ فارسی اردو خاص کر بھاشا کے بہت اچھے شاعر تھے۔ لکھنؤ میں شیخ امیراللہ تسلیم کے شاگرد ہوئے اور تین برس مسلسل لکھنؤ میں رہ کر متعدد علوم وفنون کی تحصیل کی۔

(حیات عبدالحیٔ۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۱۴)

شاعری کا شوق تھا، اردو فارسی اشعار میں فخرؔ اور بھاشا میں میرؔ تخلص اختیار کیا۔

اور بعد میں خیالیؔ تخلص قرار دیا فارسی میں محمد اصفہانی حریفؔ سے اور اردو میں منشی امیر اللہ تسلیمؔ سے اصلاح لی۔ عربی میں کبھی کبھی تغزل و مناجات کے اشعار نظم فرمایا کرتے تھے۔

طبیعت سادہ، متواضع اور متین، خاموش اور عزلت پسند پائی تھی۔ حصول معاش کے لیے، اودے پور، حیدر آباد بھوپال، ٹونک کے سفر کیے آخر میں رائے بریلی میں سکونت اختیار کی۔۔۔۔ بیعت طریقت اپنے پھوپھا مولانا سید خواجہ علیہ الرحمۃ سے کی تھی۔ ان کی طرف سے نیز اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہرؒ کی جانب سے خلیفہ مجاز تھے اور ذکر و شغل خاندان نقشبندیہ کے طریقہ پر کرتے تھے، مگر پیری مریدی نہیں کرتے تھے۔

ان کے حالاتِ زندگی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ذہین نہایت ذکی تھے۔ جس طرف توجہ کرتے تھے اس کو بآسانی حاصل کر لیتے تھے، حافظہ کمزور تھا مقرر بھی نہ تھے۔ اس کے ساتھ طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا اور اظہار کمال سے سخت نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا ۱۰؍ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۰۸ء سہ شنبہ کو وفات پائی۔

حکیم فخر الدین خیالیؒ نے تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا، جن کے نام ہیں۔ مہر جہاں تاب، سیرت السادات سیرت علمیہ، تاریخ بگھیل کھنڈ اردو، چمنستان، اردو، جوش دل، پریتم راگ، دیوان فارسی، رقعات فخریہ، دیوان خیالی اور مثنویاں، سبیل النجات، وغیرہ وغیرہ۔ مولانا حکیم عبدالحئیؒ لکھتے ہیں۔

> ''والد مرحوم کی جو تصنیفات ضائع ہونے سے بچ گئیں، ان میں سب سے زیادہ عجیب کتاب ''مہر جہان تاب'' ہے فارسی زبان میں فل اسکیپ کی تقطیع میں پہلی جلد تیرہ سو صفحات پر تمام ہوئی ہے۔ دوسری جلد آدھی لکھی تھی کہ عمر نے وفا نہ کی پہلی جلد میں تین دفتر ہیں، دفتر اوّل میں علوم و فنون متعارف و غیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں جس طرح سے سیوطی نے نقایہ اور اس کی شرح میں لکھے ہیں۔ دوسرے دفتر میں انبیائے کرام، اہل بیت، صحابہ

تابعین، محدثین، علماء حکماء واور مشائخ کے حالات جدا جدا قلمبند
فرمائے ہیں۔ تیسرے دفتر میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کے
شاعروں کے تذکرے علیحدہ علیحدہ درج کیے ہیں۔ دوسری جلد
میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنا چاہی تھی جس میں ایشیا کا بڑا
حصہ ہو چکا تھا۔ یہ جلد آدھی ہو چکی تھی۔

(گل رعنا۔ مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ ضمیمہ۔ ص:۵۲۴تا۵۳۷طبع چہارم (انتخاب واختصار کے ساتھ)

علی میاںؒ نے اپنے جدامجد سید فخر الدین خیالیؒ کو خاندانی حالات اور معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ فراہم کرنے والا خاندان کا مورخ اور عالم انساب کہا ہے، لکھتے ہیں۔

''خاندانی بزرگ سید محمد نعمان'' کی کتاب ''اعلام الہدیٰ'' میں اضافہ کیا اور اس کا نام ''سیرت علمیہ'' رکھا اس کتاب میں شاہ علم اللہ ان کے خاندان کے علماء و مشائخ کے حالات درج ہیں۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔ سیرت السادات کے نام سے خاندن کا مفصل نسب نامہ مرتب کیا جس میں آنحضرت ﷺ سے لے کر اپنے زمانے تک کے اس خاندان کے تمام افراد کے نام نسب حالات اور خصوصیات مع سنین بڑی تحقیق وجستجو سے فراہم کیے۔۔۔۔۔ یہ کتاب خاندانی حالات اور خاندان کے ممتاز افراد کی سیرت وخصوصیات زندگی کا اہم ماخذ ہے۔''

(سیرت سید احمد شہیدؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۴۸)

حکیم سیّد فخر الدین خیالیؒ کی پہلی بیوی محترمہ عزیز النساء بنت سراج الدین ہنسوی اور دوسری بیوی محترمہ حکیمہ بنت مولوی عبدالقادر تھیں پہلی بیوی سے ایک صاحبزادہ مولانا سید عبدالحیٔ حسنیؒ اور ایک صاحبزادی شمس النساء تھیں، صاحبزادی کا نوجوانی میں انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی محترمہ حکیمہ بنت عبدالقادر سے ایک صاحبزادے حافظ محمد صابر جن کا عنفوان شباب میں انتقال ہو گیا اور دو صاحبزادیاں محترمہ شمس النساء زوجہ مولوی سید طلحہ حسنی اور محترمہ فاطمہ بی بی زوجہ سید محمد یوسف تھے۔

(حیات عبدالحیٔ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۲۶)

علی میاںؒ کے جدّ مادری قطب الاقطاب شیخ وقت حضرت شاہ ضیاء النبیؒ

''شاہ ضیاء النبیؒ مولوی سعید الدینؒ کے صاحبزادے قطب الاقطاب شیخ اجل حضرت سید شاہ علم اللہؒ نقشبندی کی چھٹی پشت میں ہیں۔ دنیا کی برکت، خلقت انسانی کے مقصد کامل کی سچی تصویر و عملی تفسیر اور معرفت کے لب لباب تھے۔ ان کا وجود اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ رائے بریلی میں اپنے جدامجد حضرت شاہ علم اللہؒ کے دائرہ میں ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ احتیاط و نگہداشت، عفت وطہارت اور للّٰہیت میں نشو ونما ہوا کچھ ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کی پھر پیدل دہلی کا سفر کیا بیس دن میں پہونچے۔ حضرت شاہ احمد سعید اور مولانا شاہ عبدالغنی صاحب کا زمانہ تھا ان کی خانقاہ (خانقاہ مجددیہ) میں قیام کیا۔ دو سال ٹھہر کر لکھنؤ گئے دبیر الدولہ کی مسجد میں مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادی کے پاس قیام کیا ان سے اور بعض دوسرے علماء سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں پھر وطن واپس تشریف لائے اور خواجہ احمد نصیر آبادیؒ سے طریقت کی تعلیم حاصل کی اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہے۔ خواجہ احمدؒ کے انتقال کے بعد خلیفہ خواجہ فیض اللہؒ اورنگ آبادی سے مزید تربیت حاصل کی اور ان کے مجاز طریقت ہوئے۔ ۱۲۹۳ میں جب حج سے واپس ہوئے تو بکثرت علماء مشائخ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تعلیم طریقت اور فیوض روحانی حاصل کیے۔

(نزهة الخواطر۔ مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ، ج:۸،ص:۱۹۸)

ان کے خلفاء میں ابوالخیر مکّیؒ جونپوری ابن سخاوت علی جونپوری، محمد بردوائیؒ عبدالقادر بن عبداللہؒ ساکن مئو، سید محمد امینؒ نصیر آبادی اور ان کے داماد مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ ہیں۔ علی میاںؒ اپنے نانا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ کے دینی امتیاز کو بیان کرنے کے لیے (مشہور حدیث قدسی کے الفاظ) ''قرب بالفرائض'' سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی۔ اخلاص و استقامت، فرائض ادا کرنے کا

اہتمام، عبادت میں خشوع وخضوع، نماز وتلاوت کا سچا عشق اوران میں محویت واستغراق یہ ان کا امتیاز تھا اور اسی امتیاز نے ان کو ابنائے زمانہ میں بہت ممتاز کر دیا تھا، ان کے خشوع فی الصلوٰۃ کے قصے سن کر اکابر سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں تکیہ شاہ علم اللہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

(خانوادہ حضرت شاہ علم اللہ قلمی صفحہ ۲۲ بحوالہ حیات عبدالحئی حسنی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۴۲۔۴۳)

شاہ ضیاء النبیؒ کے دو بیٹے سید احمد سعیدؒ، سید عبداللہؒ اور دو بیٹیاں سیدہ صالحہؒ اور سیّدہ خیر النساءؒ تھیں۔

علی میاںؒ کے والد مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ

مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ ۱۸ر رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۹ء دائرہ شاہ علم اللہؒ بیرون شہر رائے بریلی پیدا ہوئے۔ خاندان کے روحانی وعلمی ماحول میں پرورش ہوئی۔ آپ کے بچپن میں آپ کے داد یہال رائے بریلی اور نانہال ہنسوہ ضلع فتح پور میں رُشد وہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ علم وادب شعر وسخن کا چرچا تھا۔ ابتدائی تعلیم ہنسوہ اور رائے بریلی میں ہوئی پھر الہ آباد گئے، تقریباً دس سال الہ آباد میں مولانا محمد حسین الہ آبادی (تلمیذ رشید مولانا عبدالحئی لکھنوی وخلیفہ حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکّی) اور دوسرے علماء کی خدمت میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۳۰۱ھ میں بھوپال تشریف لے گئے دو سال قیام کیا۔ نواب صدیق حسن خاں کی توجہات سے بھوپال مرکز علم وعلماء بنا ہوا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں لکھنؤ گئے اور علمائے لکھنو سے کتب درسیہ پڑھیں۔ لکھنؤ سے دوبارہ بھوپال آئے مولانا قاضی عبدالحقؒ سے باقی کتب درسیہ، مولانا سید احمد دہلویؒ (سابق استاد اعلیٰ دارالعلوم دیوبند) سے ریاضی، مولانا شیخ محمدؒ عرب سے ادب، مولانا حسین بن محسن الیمانیؒ سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ اسی زمانے میں لکھنؤ کے نامور طبیب افسر الاطباء حکیم عبدالعلی سے طب کی کتابیں پڑھیں ۱۳۱۱ھ میں حکیم عبدالعزیز سے قانون پڑھا اور حکیم

عبدالعلی کے ساتھ مطب شروع کیا۔

تحصیل علم کے بعد ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء ہندوستان کے مشہور دینی وعلمی مرکزوں کا سفر کیا۔ اطراف دہلی اور شمالی مغربی علاقے میں سے پانی پت، سرہند، کیمپ انبالہ، دیوبند، پیران کلیر سہارنپور، گنگوہ، نگینہ اور متعدد قصبات میں گئے اور مشاہیر علماء اور مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے درس میں شریک ہوئے۔ حدیث کی اجازت حاصل کی اور علمی و باطنی استفادہ کیا۔ زمانہ طالب علمی میں مولانا فضل الرحمٰنؒ گنج مراد آبادی کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوئے ان سے بیعت ہوئے۔ سلوک منازل اپنے سسر شاہ ضیاء النبیؒ، والد حکیم سید فخر الدین خیالیؒ اور ماموں شاہ عبدالسلام ہنسوی کی خدمت میں طے کیے شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی بیعت اور توجہات کا شرف حاصل کیا۔

مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ نے خلقتاً ایک دردمند حساس طبیعت پائی تھی۔ ان کے ابتدائی شعور کا دور مسلمانان ہند کی تاریخ میں ایک عبوری دور تھا، دو تہذیبوں اور دو عہدوں (مسلمانوں کے عہد ماضی اور انگریزی سلطنت وتہذیب کا اقتدار) کی کشمکش کا عہد تھا۔ آپ کے ضمیر و مزاج میں اصلاح اور جدوجہد کا جذبہ تھا، طب کی تعلیم مکمل ہونے کے زمانے میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ عبدالحیٔ صاحب ندوۃ العلماء کے مقاصد فکر وخیال سے مناسبت رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتداء سے ہی اس کے موید اور حامی رہے۔ اس تحریک سے دلچسپی روز بہ روز بڑھتی رہی ۱۳۱۳ھ میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ کی ماتحتی میں کام کرنا شروع کیا ۱۹۱۳ء میں مددگار ناظم مقرر ہوئے۔ مولانا محمد علی مونگیری ان کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ جولائی ۱۹۱۵ء میں انھیں ناظم ندوۃ کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ تاحیات نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اخراجات کے لیے مطب بھی کرتے۔ ندوۃ اور مطب کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد تصنیف وتالیف میں منہمک ہوجاتے۔

(تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم مولوی شمس تبریز خاں۔ ص: ۱۵۷)

علی میاںؒ نے حیات عبدالحیٔ'' میں اپنے والد کی علمی، ادبی، اصلاحی سرگرمیوں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ لکھتے ہیں'' خاندان حسنی وقطبی پستی'' افسردگی، زوال وتنزل اور اضمحلال وتعطل کے آخری نقطہ پر تھا، اسی کے ساتھ (اس زمانے کے شرفاء کے خاندانوں کی طرح) خاندانی مناقشات وتنازعات چھوٹی چھوٹی باتوں پر مخالفت و مقاطعہ اور بدگمانیوں اور بداندیشیوں کی بیماری عام تھی طبیعت میں اُمنگ، نگاہوں میں بلندی اور خیالات وعزائم میں حوصلہ مندی نہیں رہی تھی۔۔۔خاندان کی اقتصادی حالت اس قدر پست ہوگئی تھی کہ بہت سے گھرانے نان جویں سے بھی محروم تھے۔۔۔ اُس کے ساتھ تعلیمی انحطاط بھی روز افزوں تھا اور جو خاندان اصلاح رسوم اور اتباع شریعت کا علمبردار رہ چکا ہو وہ خود غیر اسلامی رسوم و عادات کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی دینی اور شرعی حیثیت سے عام مسلمانوں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید نہیں رہی تھی۔''

(حیات عبدالحیٔ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۱۸۔۱۱۹)

مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ نے خاندانی اختلافات کو دور کرنے کے لیے رسالہ ''اصلاح'' تحریر فرمایا اور ۱۸۹۵ء میں خاندان کی اسی حالت کے پیش نظر ایک اصلاحی انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''انجمن اصلاح آل ہاشم'' تھا۔ رائے بریلی اور ہنسوہ کے مختلف خاندانوں کے شرفاء اس انجمن کے رکن بنے۔ انجمن کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) مسلمانوں کا نفاق باہمی دور کرنا۔

(۲) علماء کو زمانے کی ضرورت سے واقف ہونا

(۳) اصلاح وترقی شرفاء سادات (۴) عربی سلسلہ تعلیم کا استحکام

(۵) انگریزی کالجوں کے تعلیم یافتہ افراد کو مذہبی معلومات سے مستفید کرنا

مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ بہ یک وقت اردو، عربی و فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات ان تینوں زبانوں میں ہیں۔ ان کو علوم اسلامیہ کا دائرۃ المعارف کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ کی تصنیف 'نزھة الخواطر فی بهجة المسامع و النواظر' اور 'الثقافة الا سلامية في الهند کے ذریعہ اسلامی

دنیا کو ہندوستانی علماء کی سیرت اور صلاحیت کا اندازہ ہوا، مولانا عبدالحیٔ حسنیؒ نے "نزھۃ الخواطر" میں ساڑھے چار ہزار سے زائد اور چودہ سو سالہ تاریخ کی عظیم شخصیتوں کی سیرت اور علمی کارناموں کو تلاش اور تحقیق کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق پیش کیا ہے اور ادبی دنیا کو ہندوستانی علماء کے علمی، ادبی کارناموں سے روشناس کر کے عالم اسلام کے علمی نقشہ میں ہندوستان کا مقام واضح کر دیا ہے۔ مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ کے قلم سے حدیث وفقہ، تاریخ، طب، ادب عربی، اصلاح اخلاق اور مسلمان بچوں کے لیے تصانیف اور رسائل نکلے، جن کے نام ہیں۔ 'منتھی الافکار فی شرح تلخیص الاخبار'، 'کتاب الغنا'، 'قرابادین'، 'ارمغان احباب'، 'طبیب العائلہ'، 'شرح سبع معلقہ'، 'ریحانتہ الادب و شمامتہ الطرب'، 'تعلیم الاسلام'، 'نورالایمان'، رسائل در بیان سلاسل خانوادہ نقشبندیہ' 'تعلیقات علیٰ سنن ابوداؤد'، القانون فی انتفاع المرتھن بالمرھون۔

(حیات عبدالحیٔ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۲۵۷ تا ۳۴۰)

مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ کا پہلا نکاح ان کے حقیقی ماموں عبدالعزیز بن سراج الدینؒ کی صاحبزادی سے ۱۸۹۱ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں ہوا، ۱۸۹۳ء میں صاحبزادے عبدالعلی حسنی تولد ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں عبدالعلی حسنی کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۰۴ء میں حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ کا دوسرا نکاح شیخ وقت شاہ ضیاء النبیؒ کی صاحبزادی محترمہ خیر النساء بہتر سے ہوا۔ اُن سے دو صاحبزادیاں محترمہ **امۃ العزیزؒ**، **امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بیؒ** اور ایک صاحبزادے مولانا ابوالحسن علی حسنیؒ ہیں۔ ۱۶؍ جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ مطابق ۳؍ فروری ۱۹۲۳ء کو مولانا حکیم عبدالحیٔؒ کا انتقال ہو گیا۔ خاندانی قبرستان واقع رائے بریلی میں دفن ہیں۔

(حیات عبدالحیٔؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ص: ۲۳۲)

قطب الاقطاب شاہ ضیاء النبیؒ کی بیٹی، علی میاںؒ کی والدہ ماجدہ محترمہ خیر النساء بہترؒ

علی میاںؒ کی والدہ ماجدہ مرحومہ خیر النساء بہترؒ ۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۵ھ میں بمقام رائے بریلی پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد کا نام سید شاہ ضیاء النبیؒ تھا جو حضرت شاہ علم اللہؒ کی ساتویں پشت میں ہیں۔ قطب الاقطاب سید شاہ ضیاء النبیؒ کے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ خاندان میں تعلیم کا دور دورہ تھا عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی محدود پیمانہ پر توجہ دی جاتی تھی۔ یہ تعلیم عموماً مذہبی کتابوں، مسئلہ مسائل سے واقفیت اور انتظام خانہ داری تک محدود تھی۔ علماء حق کی وہ کتابیں جو خاندانی مسلک اور عقیدہ سے مطابقت رکھتی تھیں پڑھائی جاتی تھیں، جن میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی کتاب "مالابدمنہ" (عقائد و مسائل)۔ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی کتاب "راہ نجات" جو آثار قیامت پر تھی "چہل حدیث" شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ کا ترجمہ قرآن خاص ہیں۔ خیر النساءؒ نے ان کتابوں کے علاوہ فارسی بھی پڑھی۔ ان کو پڑھنے لکھنے کا غیر معمولی شوق تھا۔ اس زمانہ میں لڑکیوں کو لکھنے کی مشق کرنے پر زیادہ ہمّت افزائی نہیں کی جاتی تھی بلکہ بعض بزرگ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خیر النساء بہترؒ کے شوق کو دیکھتے ہوئے ان کے چچا زاد بھائی سید خلیل الدین صاحب جن کو پورے خاندان میں اتالیق کی حیثیت حاصل تھی، لکھنا سیکھنے کی اجازت دلوادی اس طرح انہوں نے اچھی تحریر لکھنے پر قدرت حاصل کی۔

(ذکر خیر۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۱۸ تا ۲۱)

محترمہ خیر النساء بہترؒ نے "قصص الانبیاء" مقاصد الصالحین **"مأثر الصالحین"**، **'طیّ الفراسخ الیٰ منازل البرازخ طریق النجاۃ'** کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کتب کا اثر ان کی زندگی اور ذہن پر بہت گہرا تھا۔ ان کے علاوہ نواب صدیق حسن خاں کی "الداء والدواء" محمد بن اسیرین کی **"تعبیر الرویا"** کے مطالعہ سے انہوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی مستفید کیا۔ خوابوں کی تعبیر دینے میں ان کو خداداد ملکہ حاصل ہوگیا تھا۔ آپ خاندان کی پہلی حافظ قرآن خاتون تھیں عورتوں میں حفظ

کرنے کا شوق اور خاندان میں اس کا چلن انہیں کا پیدا کردہ ہے۔ رمضان المبارک میں عورتوں کی جماعت کو تراویح پڑھانے اور دور کرنے کا سلسلہ جب تک کہ حافظہ کمزور نہ ہوا جاری رہا۔ قرآن پاک نہایت صحیح تجوید اور صحتِ مخارج کے ساتھ پڑھتی تھیں ۱۹۰۴ء ۱۳۲۲ھ کو محترمہ خیر النساءؒ کا عقد مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ سے ہوا۔ مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا ان سے ایک صاحبزادے تھے جو ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ محترمہ خیر النساءؒ کے بطن سے تین اولادیں دو بیٹیاں **محترمہ امتہ العزیزؒ، محترمہ امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بیؒ** اور بیٹے مولانا ابوالحسن علی حسنیؒ (عرف علی میاںؒ) ہیں۔

علی میاںؒ کے دادیہال میں تنگی اور عسرت کا دور تھا والد کی آمدنی برائے نام تھی جب کہ نانہال کھاتا پیتا اور خوش حال تھا ایسے حالات میں محترمہ خیر النساءؒ نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ گھر سنبھالا۔ مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ نے شادی کے بعد گھر کی ذمہ داری کے ساتھ اپنی دو چھوٹی بہنوں اور بیٹے عبدالعلی حسنیؒ کو ان کے حوالہ کر دیا تھا انھوں نے عبدالعلی حسنیؒ کو ہمیشہ اپنی اولاد پر ترجیح دی اور ان سب کی شادیاں بڑے شوق اور حسن انتظام سے کیں۔ ان کی بلند ہمتی اور حسن انتظام نے گھر کا نقشہ بدل دیا۔ محترمہ خیر النساء بہترؔ کا دینی کتابوں کو پڑھنے اور سننے، قرآن مجید کا دور اور دعا کا شغف معمولات، میں شامل تھا۔ لڑکیوں کو امور خانہ داری کی تعلیم، دینی و اخلاقی ہدایات اور اچھی خوشگوار ازدواجی زندگی کے اصول و آداب سکھاتی تھیں۔ انھیں شعر و شاعری کا ستھرا ذوق تھا۔ بہترؔ تخلص تھا۔ وہ مناجاتیں اور نظمیں لکھتی تھیں۔ ان کی تصانیف میں "باب رحمت"، "کلید باب رحمت"، "ذائقہ" اور "حسنِ معاشرت" قابلِ ذکر ہیں۔

(ذکرِ خیر۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ص: ۷۵)

اُن کی نظم و نثر کی زبان سادہ اور آسان ہوتی تھی۔ خدا کے جناب میں عرض کرتی ہیں۔

جینے کی تمنا ہے نہ مرنے کا مجھے غم　　ہے فکر تو یہ ہے کہ تجھے بھولوں نہ کسی دم
چپ ہو نہ زباں میری تری حمد و ثنا میں　　فرق آنے نہ پائے رہِ تسلیم و رضا میں

جب تک کہ رہوں زندہ تری الفت کا بھروں دم بھولوں نہ تجھے میں، مجھے رکھ یاد تو ہر دم

مولانا محمد ثانی حسنیؒ تحریر کرتے ہیں "تسلیم و رضا، محبتِ الٰہی، ذکر و عبادت ان کی خصوصیات اور امتیاز میں داخل ہوگئی تھیں، تسبیح ہر وقت ہاتھ میں رہتی، زبان ذکر میں مصروف ہوتی۔ ایک مناجات اس طرح شروع کرتی ہیں۔

ہوئی جو در تک ترے رسائی تو تجھ سے میرا سوال بھی ہے
تو دینے والا کریم بھی ہے تو قادر ذوالجلال بھی ہے
یہ شان دیکھی تری نرالی جو مانگے تجھ سے تو اس سے راضی
بُلا کے دینا کرم ہے تیرا، یہ فضل بھی ہے کمال بھی ہے

۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۶۶ھ میں حج اور اور زیارت کی سعادت حاصل ہوئی، نصف سال سے زائد حرمین شریفین میں قیام کا موقع ملا، دیارِ مقدس سے رخصتی کے وقت یوں گویا ہوتی ہیں۔

اے خدا پھر اسی دربار میں لانا مجھ کو اپنے دربار کا سائل ہی بنانا مجھ کو
زندگی میری خدایا ترے در پر گذرے ساتھ ایمان کے دنیا سے اُٹھانا مجھ کو

محترمہ خیر النساءؒ کے پوتے مولانا محمد الحسنی تحریر کرتے ہیں:

اماں بی ہمارے پورے خاندان کے لیے خیر و برکت، سکون و طمانیت اور نورانیت و للّٰہیت کا سرچشمہ تھیں...... اُن کی زندگی میں ہمارے لیے بڑے سبق ہیں......ایک دعا مناجات کی وہ عجیب کیفیت جس میں وہ بہت ممتاز، فائق بلکہ منفرد نظر آتی ہیں، دوسرے دین کی قوت و ترقی، اسلام کے غلبہ کی سچی تڑپ اور حرارت اور سوزش تیسرے تربیت اور حسنِ معاشرت۔

اُن کے بھتیجے ابوبکر حسنیؒ فرماتے ہیں کہ "وہ سراپا شفقت و رافت تھیں، اُن کے مزاج میں ترش روئی نام کو نہ تھی...... غرباء، بیکسوں، یتیموں اور مظلوموں پر خاص عنایت کی نظر رکھتی تھیں"۔

(ذکرِ خیر۔ ص: ۱۲۵۔۱۲۶)

محترمہ خیر النساء بہترؒ نے تقریباً نوے سال کی عمر پائی۔ضعف کے باوجود شب وروز عبادت، دعا اوراذکار میں گزاری۔ ۶ رجمادی الآخر ۱۳۸۹ھ مطابق ۳۱ راگست ۱۹۶۸ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ۷ رجمادی الآخر مطابق یکم ستمبر ۱۹۶۸ء رفیق سفر مولانا حکیم عبدالحیؒ حسنیؒ کے پہلو اور حضرت شاہ علم اللہؒ کی زوجہ کے پائینتی ہمیشہ کے لیے آسودۂ خاک ہوئیں۔

(حیات عبدالحیؒ۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۲۱۳)

علی میاںؒ کے برادر اکبر مولوی حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ ندوی

علی میاںؒ کے برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء ہنسوہ میں پیدا ہوئے۔ نانہال اور دادیہال کے علمی وروحانی ماحول میں پرورش ہوئی، ہنسوہ میں تسمیہ خوانی ہوئی اور قرآن پاک ناظرہ ختم کیا، اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ندوۃ کے فاضل اساتذہ سے ادب عربی، فقہ، اصول، ہیئت، اقلیدس اور درسیات کی کتابیں پڑھیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمود الحسنؒ اور انورشاہ کشمیریؒ سے دیوبند میں حدیث کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔ والد سے طب کی کتابیں پڑھیں، حکیم اجمل خاں کی خدمت میں حاضر ہوکر طب میں وسعت نظر اور مزید تجربہ حاصل کیا، اس وقت عبدالعلی حسنیؒ کی عمر ۲۰ یا ۲۱ سال تھی۔ اُن کی شادی ان کے حقیقی ماموں سید ابوالقاسم صاحب ہنسوی کی صاحبزادی سے ۳۰ رمارچ ۱۹۱۲ء کو ہوئی۔ اب انھیں انگریزی تعلیم کا شوق پیدا ہوا چنانچہ انگریزی کی ابتدائی کتابیں لکھنؤ میں بعض انگریزی جاننے والوں سے پڑھیں۔ ایک انگریزی اسکول سے ۱۹۱۵ء میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا، انٹرنس کر کے ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ کے کرسچین کالج میں **انٹرمیجیٹ** پاس کیا۔ ایف۔ ایس۔ سی کے بعد کنگ جارج کالج سے بی۔ ایس۔ سی۔ اعزاز کے ساتھ پاس کیا، کنگ جارج میڈیکل کالج سے میڈیسن کی تعلیم حاصل کی، ۱۹۲۵ء میں ایم بی بی ایس پاس کیا۔

(حیات عبدالحیؒ ۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۲۱۳)

کسبِ معاش کے لیے گوئن روڈ پر مطب قائم کیا عرصہ تک ایلو پیتھک اور یونانی علاج کرتے رہے۔۱۹۳۰ء میں ہومیو پیتھک طریقہ علاج کا مطالعہ کیا اور ہومیو پیتھک علاج بھی کیا۔۱۹۲۶ء میں آپ نے حج بیت اللہ کیا، اور سلطان ابن سعود کی مؤتمر اسلامی میں شریک ہوئے۔ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ اپنی بہت سی خصوصیات اور کمالات کی وجہ سے ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے اُن کی شخصیت میں قدیم وجدید تہذیب وثقافت اور مشرقی اور مغربی علوم کا نہایت حسین، دلآویز امتزاج نظر آتا ہے۔۱۹۲۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں نائب ناظم کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔۱۹۳۱ء میں ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے اور ۱۹۶۱ء تک ندوۃ العلماء کی نظامت کے منصب پر فائز رہے۔

علی میاںؒ ان کے دورِ نظامت کے بارے میں لکھتے ہیں۔" سیاسی حالات کی تبدیلی اور ملک میں مختلف تحریکات کی وجہ سے ان کے طویل دورِ نظامت میں ندوۃ العلماء کا کوئی سالانہ جلسہ نہیں ہوسکا جو اس کی روایت بن چکی تھی۔لیکن اس ایک پہلو کو چھوڑ کر جو حالات کی تبدیلی کا نتیجہ تھا، دارلعلوم ندوۃ العلماء نے ان کے عہد میں نمایاں ترقی کی اور بعض ایسی خوشگوار تبدیلیاں ان کے عہدِ نظامت میں رونما ہوئیں جن کی وجہ سے ان کا دور ندوۃ العلماء کی تاریخ میں ایک زرّیں عہد کہا جا سکتا ہے۔"

(حیات عبدالحیؒ ۔ص:۳۷۴)

ڈاکٹر صاحب کے دور کی سب سے بڑی خصوصیت ۔۔۔۔ندوۃ العلماء کا دینی رجحان اور روحانی میلان واضح طریقے سے سامنے آیا تھا۔۔۔۔ دوسری خصوصیت ۔۔۔۔عربی زبان وادب پر خصوصی توجہ، عالمِ عربی سے خصوصی ربط وتعلق بھی ہے۔۔۔ تیسری خصوصیت اسلامی رجحانات پر مشتمل نصاب درس تیار کیا گیا۔۔۔اور عربی زبان بطرزِ مستقیم پڑھانے کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔

(تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم مولوی شمس تبریز خاں۔ص:۴۰۲تا۴۴۵)

علی میاںؒ نے اپنے بڑے بھائی کی عادات واطوار کے بارے میں معتدل اور

جامع انداز میں قلم فرسائی کی ہے۔عبارت کا لفظ لفظ ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کی صفات کا آئینہ دار اور سچائی کی منہ بولتی تصویر ہے۔

''اجر وثواب ورضائے الٰہی کا خیال ان کے افعال واخلاق کے لیے اصل قوتِ محرکہ کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں خرچ کرنے میں ثواب سمجھتے تھے، وہاں ان سے بڑھ کر فراخ دست وعالی ہمت ملنا مشکل تھا، اور جہاں اس کی امید نہیں ہوتی تھی وہاں ان سے بڑھ کر محتاط اور مستغنی نظر نہیں آتا تھا، نیک نامی وبدنامی اور لوگوں کے کہنے سننے کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہ تھی ہر ایک کے شرعی حق اور مرتبہ کے مطابق سلوک کرتے اور جس وقت شریعت کا جو حکم اور منشا سمجھتے، اس میں تساہل اور سستی سے کام نہ لیتے۔۔۔وہ ہر چیز میں پختہ تھے، پختہ اعتقاد، پختہ دین داری، پختہ علمی استعداد، پختہ خیالات ونظریات، وہ اسلام کی ابدیت اسلامی تہذیب کی برتری و پاکیزگی اور اسلاف و متقدمین کی اخلاقی، روحانی اور انسانی عظمت کے شدّت سے قائل تھے۔مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور اس کے نظامِ تعلیم کے سایہ میں برسوں رہنے کے باوجود وہ اس کے سخت ناقد تھے، لیکن ان کی تنقید جذباتی و سطحی نہیں تھی وہ علم اور مطالعہ پر مبنی تھی، ان کی مجلسوں میں اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی اور اس پر اصولی تنقید ہوتی تھی۔۔۔۔''

وہ اپنی ذاتی زندگی میں جتنے متشقف، پختہ اور قدامت پسند تھے اپنے تعلیمی خیالات ونظریات جدید چیزوں کے مطالعہ اور دنیا سے واقفیت کے بارے میں اتنے ہی وسیع الخیال حقیقت پسند اور غیر متعصّب تھے۔ انھوں نے محبت وعقیدت میں بھی حدود قائم کر رکھے تھے، بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ ان کو جب کسی شخصیت سے عقیدت ہوئی تو

انھوں نے جوشِ عقیدت یا فرطِ محبت میں اپنے عمر بھر کے تعلیمی خیالات ونظریات یہاں تک کہ فکر ونظر اور اسلوبِ تحریر میں بھی تبدیلی کر دی لیکن ڈاکٹر صاحب کے یہاں اس بارے میں پورا اعتدال وتوازن تھا وہ کسی دور میں بھی اپنے کسی سوچے سمجھے تعلیمی نظریہ یا تحقیق سے دستبردار نہیں ہوئے، نصاب ونظامِ تعلیم، تصوّف واصلاحِ باطن، تقلید وعدمِ تقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال اور سیاسیاتِ اسلامی کے بارے میں ان کا جو مسلک جوانی میں اور مولانا مدنیؒ کے تعلق سے پہلے تھا، وہ آخر تک رہا۔"......

ان صفات وعلمی کمالات کے ماسوا، ان کی کی ایک بڑی صفت اور زندگی کا جوہر، ان کی دینی حمیت، عالمِ اسلام کی فکر اور دعوتِ اسلامی کا جذبہ وذوق ہے، میں نے گوشہ نشین زندگی اور انفرادی فرائض کی مشغولیت کے ساتھ عالم اسلام کی اتنی فکرمندی اتنی وسیع وگہری واقفیت اور اس کے حالات وتغیرات کا تتبع کا ایسا ذوق نہیں دیکھا۔۔۔۔ فلسطین کا جہاد ہو یا الجزائر کی جنگ ان کا دل اس سے متعلق تھا اور ایک بعید الوطن مسلمان پر ان کے بارے میں جو حقوق عائد ہوئے ہیں ان کو ادا کرنے کی فکر تھی۔ عالِم اسلام میں پیش آنے والے خوش کن یا رنج دہ حادثہ سے وہ اسی طرح متاثر ہوتے تھے جیسے وہاں رہنے والا دردمند وفکرمند مسلمان۔"

مولوی حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ نے مئی ۱۹۶۱ء کو اس دارفانی سے کوچ کیا۔ شاہ علم اللہؒ کے حظیرہ میں سپردخاک کیا گیا۔ پس ماندگان میں ایک فرزند مولوی محمد الحسنیؒ مدیر **البعث الاسلامی** اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں ان سب کی شادیوں سے انھوں نے اپنی زندگی میں فراغت پائی تھی اور ماشاءاللہ سب صاحبِ اولاد ہیں۔

(حیات عبدالحیؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۳۴۳ تا ۳۸۵)

مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ کی باقیات الصالحات اوران کی علمی خدمات

علی میاںؒ کی بڑی بہن محترمہ امۃ العزیزؒ صاحبہ

مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ کی بڑی صاحبزادی امۃ العزیزؒ صاحبہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم وتربیت گھر پر حاصل کی۔ نانا اور دادا کی شفقت پائی، والدہ کی تربیت ونگہداشت کا وافر حصّہ ملا۔ خاندان کے ایک فرد سید رشید احمدؒ سے منسوب ہوئیں بعمر ۹۳ سال ۲۳/رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کی شب میں انتقال ہوا۔ خاندانی قبرستان حظیرہ شاہ علم اللہ میں سپردِ خاک ہوئیں۔ علی میاںؒ اپنی بڑی ہمشیرہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے خودنوشت سوانح کاروانِ زندگی میں تحریر فرماتے ہیں۔

''ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ اپنے اسلاف اور خاندانی خصوصیات سے متصف اوران کی وارث اور نمونہ تھیں۔ شفقت، عام صلہ رحمی، حسن سلوک، ذکر وعبادت، دعا وتضرع ان کی خاص صفات تھیں غفر اللہ لھا ورفع درجاتھا۔

جہاں تک اس راقم کا تعلق ہے مرحومہ کواس کے ساتھ شفیق ماں کا سا تعلق تھا، وہ ان کو اُسی نظر سے دیکھتا اور محسوس کرتا تھا، جب اپنے مسکن رائے بریلی پہونچنا ہوتا سب سے پہلے ان کو سلام کرنے حاضر ہوتا اور وہ انتہائی مسرت کا اظہار فرماتیں، جب باہر جانا ہوتا تو اُن کی دعائیں لیتا اور سلام کرتا ہوا جاتا۔ اگر یہ مہینہ رمضان کا نہ ہوتا (وفات ۲۳/رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ) تو راقم اس کو شہر الحزن لکھتا''۔

لکھنے پڑھنے کی بہت شوقین تھیں لیکن گھریلو مصروفیات کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکیں (۱) حضرت اسماءؓ (۲) حضرت خدیجہؓ اور (۳) مناجات عزیز (۴) چند ممتاز صحابیاتؓ (۵) زندگی کیسے گزاریں، اور چند دینی مضامین جو 'رضوان' میں شائع ہوئے، اُن کی یادگار ہیں۔ مرحومہ امۃ العزیز بے حد خاموش طبیعت، صلہ رحم، خلیق، ملنسار، فیاض، ہمدرد اور غمگسار خاتون تھیں۔ دعا اور انابت الی اللہ آپ کے خاص اوصاف تھے۔ سادگی، سخاوت، تقویٰ، زہد وقناعت میں ممتاز تھیں، نماز، ذکر وشغل کا

اہتمام رکھتیں، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بیعت تھیں۔

(عائشہ بی۔مولانا محمود حسن حسنی، ص: ۶۵)

اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے محمود حسن کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا تھا، بیٹی رابعہ کا بھی بچپن میں انتقال ہو گیا، محترمہ امۃ العزیزؒ صاحبہ کو تین عالم و فاضل بیٹوں کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے تینوں صاحبزادے مولانا محمد ثانی حسنیؒ، مولانا محمد رابع حسنی مدظلہ العالی، مولانا محمد واضح رشید ندوی مدظلہ العالی عالمِ دین اور صاحبِ تصنیف ہیں۔

مولانا محمد ثانی حسنی ندوی مظاہری:

بڑے صاحبزادے **مولانا محمد ثانی حسنیؒ ندوی** مظاہری تھے۔ شاعر، مصنف، ماہنامہ رضوان کے ایڈیٹر تھے۔ رضوان میں لکھے گئے اُن کے اداریے بہت مقبول ہوئے جن میں دینی، اصلاحی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ۲؍ستمبر ۱۹۶۶ء کو مدرسہ فلاح المسلمین (نصیر آباد کے جوار میں) قائم کیا۔ جو دارالعلوم ندوۃ العلماء ملحق ہے مولانا محمد ثانیؒ اس کے بانی اور ناظم اوّل تھے۔ مولانا محمد ثانی حسنیؒ نے مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی سوانح حیات، حیات خلیل، تذکرہ محمد ہارون کاندھلوی، تذکرہ شاہ علم اللہ، سوانحی کتب تصنیف کیں۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ملّی ترانے کہنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ترانہ مولانا محمد ثانی حسنیؒ کا تحریر کردہ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے

"ہم نازشِ ملک وملت ہیں، ہم سے ہے درخشاں صبح وطن
ہم تابش دیں، ہم نورِ یقیں ہم حسن عمل ہم خلق حسن"

آپ کو تقریر پر بھی عبور حاصل تھا۔ طبیعت میں بہت سادگی تھی، نام و نمود اور شہرت سے سخت نفرت تھی۔ ۱۹۴۷ء میں پہلا حج کیا۔ ۱۹۴۹ء میں حج بدل کے لیے تشریف لے گئے۔ ۱۹۸۰ء میں تیسری مرتبہ علی میاںؒ کے رفیق سفر بن کر حجاز کا سفر کیا۔

(سوانح مولانا محمد ثانی حسنیؒ۔از مولانا محمود حسن حسنی)

علی میاںؒ نے اپنے عزیز بھانجے کے اوصافِ حمیدہ تحریر فرمائے ہیں:

''خواہرزادہ عزیز محمد ثانی حسنیؒ ہمارے خاندان کی بہترین روایات اور خصوصیات کے حامل تھے، وہ عالم، مصنف، شاعر، مؤرّخ اور ماہر انساب، ماہر فرائض (علم میراث) ذاکر، شاغل اور ایک دلآویز شخصیت کے حامل تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کاندھلوی کی ان پر خصوصی عنایت و شفقت تھی اور ان کی طرف سے ان کو اجازت حاصل تھی۔ تبلیغی و اصلاحی ذوق وجذبہ میں وہ امتیاز رکھتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدرسہ مظاہر العلوم دونوں سے استفادہ کیا تھا اور دونوں کی تعلیم وخصوصیت کے جامع تھے، مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ خاص رفاقت اور سفر وحضر میں معیت رہی تھی اور ان کا اعتماد حاصل تھا، ضلع میں دعوتی واصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے......اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑے ہردلعزیز مرنجان مرنج اور ان دینی وعلمی خصوصیات کے ساتھ بڑی انتظامی صلاحیت کے مالک، معاملہ فہم، مستعد اور کارگزار تھے''۔

(نئے پرانے چراغ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

۱۹۸۲ء میں مختصر علالت کے بعد ۵۷ سال کی عمر میں مولانا محمد ثانی حسنیؒ کا انتقال ہوگیا۔ تکیہ کلاں رائے بریلی کے خاندانی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی:

مولانا **محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی** ۶ر جمادی الاوّل ۱۳۴۸ ہجری مطابق ۱۹۲۹ء، تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ والدین کے ساتھ ساتھ تربیت و نگہداشت کے ذمہ دار مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ اور مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنیؒ بھی تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مکتب رائے بریلی میں حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیمی سلسلے کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں ندوۃ العلماء سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ درمیان میں (۱۹۴۷ء میں) دارالعلوم دیوبند میں ایک تعلیمی سال گزارا۔

آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند سے تعلیم حاصل کی۔ ادب عربی میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ ادب عربی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۱ء تک ایک سال علمی استفادہ کی غرض سے حجاز مقدس میں وقت گزارا، وہاں کے علماء، ادباء، علمی شخصیات اور کتب خانوں سے استفادہ کیا، ۱۹۵۲ء میں ندوہ کے ادیب دوم (اسسٹنٹ پروفیسر)، ۱۹۵۵ء میں صدر شعبۂ ادبِ عربی، ۱۹۷۰ء عمید کلیة اللغة العربية مقرر ہوئے، ۱۹۹۳ء میں ندوۃ العلماء کا منصبِ اہتمام آپ کے سپرد کیا گیا، ۱۹۹۸ء میں نائب ناظم ندوۃ العلماء اور جنوری ۲۰۰۰ء میں ناظم ندوۃ العلماء کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ مولانا محمد رابع حسنی مدظلہ العالی عالم، فاضل، صاحبِ تصنیف ہیں۔ عربی، اردو تقریر وتحریر پر کامل عبور حاصل ہے۔ انھوں نے دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کے لیے کتب کی تیاری میں بھرپور تعاون کیا۔ جزیرۃ العرب (عرب جغرافیہ پر)، سماج کی تعلیم وتربیت، الادب العربی بین عرض و نقد، تاریخ الادب العربی (العصر الجاهلی) الادب الاسلامی فکرته و منهاجه، الثقافة الاسلامیه، معلّم الانشـــاء (عربی ادب وانشاء پر) ندوۃ العلماء کے نصاب میں شامل ہیں۔ عربی مضامین البعث الاسلامی اور الرائد میں شائع ہوکر عرب دنیا میں مقبول ہو چکے ہیں۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی **مسلم پرسنل لا بورڈ** کے صدر ہیں، آپ رابطة العالم الاسلامی اور اسلامی ممالک کی کئی اہم تنظیموں کے رکن ہیں۔ رابطه ادب اسلامی کے صدر ہیں۔ ہندو بیرونِ ہند، متعدد علمی، ادبی اور اسلامی اِداروں و تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں، صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، صدر مجلس صحافت ونشریات لکھنؤ، صدر دینی تعلیمی کونسل اُتر پردیش لکھنؤ، صدر دارِ عرفات رائے بریلی، رکن رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، رکن دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ٹرسٹی آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز، آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ، رکن اسلامک سینٹر جنیوا (لکزمبرگ)، سرپرست مولانا محمد ثانی حسنی میموریل سوسائٹی رائے بریلی، صدر

مولانا عبدالباری سوسائٹی لکھنؤ، رکن مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی لکھنؤ، سرپرست تحریک پیامِ انسانیت، سرپرست مولانا ابوالحسن علی ندوی اکیڈمی بھٹکل کرناٹک، رکن مشاورتی بورڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند، متعدد مدارس اسلامیہ کے مشیر تعلیمی وسرپرست ہیں۔ مولانا محمد رابع حسنی کی نادرہ روزگار شخصیت قابل ذکر صحافتی خدمات کی حامل ہے۔ آپ پندرہ روزہ عربی مجلّہ 'الرائد' لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے اب اُس کے سرپرست ہیں، پندرہ روزہ اردو رسالہ 'تعمیر حیات' لکھنؤ، سہ ماہی کاروانِ ادب کے مدیر اور اب سرپرست ہیں۔ سہ ماہی انگریزی مجلّہ 'دی فریگرنس آف ایسٹ (The Fragrance of East)، ہندی ماہنامہ 'سچا راہی' کے سرپرست اور ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ کی مجلس ادارت کے رکن ہیں۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی بچپن سے علی میاںؒ کی تربیت میں رہے، سفر وحضر کے شریک، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دیگر اداروں وتحریکوں میں مشیر ومعاون ہوئے، **'مولانا ابوالحسن علی ندوی عہدساز شخصیت'** میں علی میاںؒ کی زندگی کو مشاہدات وتجربات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اپنے موضوع پر انتہائی بیش قیمت تصنیف ہے، ایک قریب ترین چشم دید گواہ کی گواہی اور زبان وادب کا بہترین مرقع ہے۔ مولانا محمد رابع حسنی مدظلہٗ نے اکثر ممالک عربیہ، بلادِ یورپ، امریکہ، مشرقِ بعید اور افریقہ، جاپان، ملیشیا، ترکی، مراکش، مصر، تیونس، الجزائر، شام، لبنان، ایران، عراق، اُردن، کویت، یمن اور متحدہ عرب امارات کے علمی سفر کیے۔ نیشنل اور انٹرنیشنل علمی وادبی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور مقالے پیش کیے۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی:

محترمہ امۃ العزیز صاحبہ کے چھوٹے صاحبزادے مولانا سیّد محمد واضح رشید حسنی ندوی ۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خاندانی مکتب تکیہ رائے بریلی میں حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تحصیل علم کا سلسلہ شروع ہوا، دینیات کے ساتھ عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کی۔ اسلامیات اور ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا، ۱۹۵۱ء میں فضیلت (التخصص فی الادب العربی) سے

فراغت ہوئی، ۱۹۵۳ء میں عصری تعلیم میں انٹر پاس کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی کے اختصاص کا میدان عربی زبان وادب، تاریخ، نقد عربی، مغربی تہذیب وتمدن، فکر اسلامی کے مسائل ہیں۔۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۳ء تک آل انڈیا ریڈیو دہلی کے شعبۂ عربی میں اناؤنسر رہے، لیکن مغرب پرست ماحول سے گھبرا کر استعفیٰ دے دیا، ۱۹۷۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ عربی میں تقرر ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں "عمید کلية اللغة العربية" اور ۲۰۰۶ء میں "معتمد تعلیم" ندوۃ العلماء کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ ندوۃ العلماء کے پندرہ روزہ عربی اخبار 'الرائد' کے چیف ایڈیٹر اور رسالہ "البعث الاسلامی" کے مشترک ایڈیٹر، المعهد العالی للدعوة والفكر الاسلامی کے ڈائریکٹر، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب جنرل سکریٹری اور رابطہ ادب اسلامی کے شعبۂ برصغیر کے جنرل سکریٹری ہیں، ندوۃ العلماء میں تعلیم وتربیت کی ذمہ داریوں کے ساتھ کئی علمی اداروں سے وابستہ ہیں۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی مدظلہٗ نے اپنے خاندان اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علمی اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی، مولوی حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ اور حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنیؒ کی نگرانی میں تعلیم وتربیت کے مراحل طے کیے۔ بیرونِ ہند جاپان، ملیشیا، ترکی، مراکش، مصر، تیونس، الجزائر، شام، لبنان، ایران، عراق، اُردن، کویت، یمن، متحدہ عرب امارات کے سفر کیے، نیشنل وانٹرنیشنل سیمیناروں میں شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔ آپ اسوۂ نبوی کا مثالی نمونہ ہیں، سنت رسول ﷺ کی سختی سے پابند، نہایت عابد، زاہد اور متقی انسان ہیں۔ تواضع اور انکساری مزاج کا حصہ ہے، ریا کاری نام ونمود سے دور رہتے ہیں۔ تصنیف وتالیف کا شوق وراثت میں ملا ہے۔ یورپی افکار، مغربی تہذیب وتمدن اور عالمی سیاست کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے مقالات اور تصانیف میں خذ ما صفا ودع ما كدر کی حکمت کو اپنایا۔ فکر اسلامی

کے اِس علمی خزانے میں، ادبی مذہبی موضوعات ہوں یا فکری اجتماعی، سیاسی مسائل، رواں اور ادیبانہ اسلوب بے ساختہ اور برجستہ جملے تحریر کی تاثیر کو دوبالا کردیتے ہیں۔آپ کی تصانیف کے نام خاندان کے مصنّفین کی فہرست میں شامل ہیں۔

علی میاںؒ کی چھوٹی بہن محترمہ امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بی

مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ کی چھوٹی بیٹی امۃ اللہ تسنیم تکیہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں ۱۲ر جمادی الاوّل ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۸رجون ۱۹۰۸ء بروز جمعرات ولادت ہوئی۔ امۃ اللہ تسنیم نام رکھا گیا عرفیت عائشہ بی تھی، ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ خیرالنساء بہترؔ اور چچا سید عزیز الرحمٰن حسنیؒ سے حاصل کی۔قرآن کریم کے ابتدائی پارے حفظ کیے۔عربی زبان اپنے بھائی علی میاںؒ اور پھوپھا سید طلحہ حسنیؒ سے سیکھی۔بچپن سے کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا، قرآن کریم، حدیث کے علاوہ ادبیات اور تاریخ میں انھیں گہری دلچسپی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیرت عائشہ اور چچا سید عبدالرزاقؒ کی صمصام الاسلام پڑھ کر زندگی میں انقلاب آ گیا۔عربی سیکھنے کا شوق اور عالمہ بننے کا جذبہ پیدا ہوا، ۲۷ رنومبر ۱۹۲۶ء کو حقیقی ماموں کے بیٹے سید ابوالخیر برق حسنیؒ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔

۱۹۴۷ء میں امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بی حج بیت اللہ سے بھی سرفراز ہوئیں۔ مولانا محمد الیاسؒ سے مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کا تعلق قائم تھا۔ وہ ایک نہایت نیک، دیندار، عبادت گزار اور دردمند دل رکھنے والی خاتون تھیں، دعاؤں کا خاص اہتمام فرماتی تھیں، دعوت الی اللہ میں خاص رغبت رکھتی تھیں۔اُن کے ہفتہ وار درس سے خواتین استفادہ کرتی تھیں۔اُن کے پوتے مولانا عبداللہ حسنیؒ نے ان کے ملفوظات مولانا شاہ قمرالزماں الٰہ آبادی کی کتاب ''اقوال سلف'' کے لیے مرتب کیے تھے چند ملفوظات بطورِ نمونہ پیش ہیں۔

(۱) ماؤں کو تاکید کرتی تھیں کہ اپنی بچیوں اور بچوں کو دین کی ہر بات سے واقف کرادو، قصے کہانیاں بھی کہو تو اس کا لحاظ رکھو کہ کوئی غلط بات نہ کہو (۲) پہلے اپنے میں

اچھائیاں پیدا کرو پھر دوسرے کو نصیحت کرو (۳) اگر آپ اپنے بچوں کو دین کی اچھی باتیں بتائیں گی تو وہ ضرور سیکھے گا (۴) جو چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہوا کرے اس سے کبھی انکار نہ کیا کرو (۵) علم حاصل کرو مجھے دیکھو کہ میں نے کس طرح عربی پڑھی اپنے شوق سے پڑھی (۶) دل مارنے کی عادت ڈالو، جو جی چاہے کر گزرو، یہ عادت ٹھیک نہیں ہے (۷) غلط بات پر تنبیہ کرنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی دعائیں یاد کرنے کی تلقین کرتیں، فرماتی تھیں دعاؤں کے ذریعہ مدد چاہو یہی دعائیں کام آئیں گی (۸) اگر غیبت کی عادت چھڑانا ہو تو غیبت کے بعد دو رکعت نفل توبہ کی بطورِ جرمانہ پڑھ لیا کرو یہ بری عادت انشاء اللہ جاتی رہے گی (۹) سوائے اللہ کے کسی سے اُمید نہ رکھو، برا بھلا نہ کہو، صبر میں بڑی بھلائی ہے صرف اللہ سے مانگو وہی دینے والا ہے (۱۰) مصیبت اور پریشانی کے وقت عذابِ الٰہی سے پناہ مانگو (۱۱) قیامت کے قریب کلام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے سوا کوئی چیز مدد نہ دے گی۔

(عائشہ بی۔ مولانا محمود حسن حسنی ندوی۔ ص: ۱۸۵۔۱۸۶)

محترمہ امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بیؒ نے علمی، تحقیقی اور تصنیفی کام کے میدان میں قدم رکھا تو کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے اردو ادب، شعر و شاعری، سیرت نگاری اور اصلاحی موضوعات پر مضامین تحریر کیے۔ امام نوویؒ کی ریاض الصالحین کا اردو ترجمہ ''زادِ سفر'' کے نام سے کیا۔ کتاب ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ مشاہیر علماء نے کتاب کی افادیت کا اعتراف کیا۔ سعودی ریڈیو جدہ کی اردو سروس نے کتاب کو نشر کیا۔ عائشہ بی کی دوسری کتاب ''قصص الانبیاء'' ہے جو علی میاںؒ کی قصص النبیّین کا اردو ترجمہ ہے۔ ہمارے حضور ﷺ، حضرت عائشہؓ، حضرت رابعہؒ، مصعب بن عمیرؓ اپنے موضوع پر اہم کتابیں ہیں۔

محترمہ امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بی بی کو لکھنے پڑھنے سے فطری لگاؤ تھا۔ ۱۹۵۶ء میں خواتین کا ترجمان رسالہ رضوان کی اشاعت عمل میں آئی۔ وہ تا حیات رسالے کی معاون مدیر رہیں۔ اُن کے مضامین خواتین میں بے حد مقبول ہوئے۔

بہت شگفتہ اردو لکھتی تھیں۔ ان کے معاشرتی، اصلاحی مضامین کا عام موضوع مسلم گھرانوں کی اصلاح، عورتوں کی دینی، علمی، اخلاقی تربیت اور مغربی تہذیب سے نفرت اور مثالی خواتین کا تذکرہ ہوتا تھا۔ عائشہ بی بی شاعری کا ذوق رکھتی تھیں۔ باب کرم، موجِ تسنیم اور دیارِ حبیب اُن کے شعری مجموعے ہیں۔

مرحومہ عائشہ بیؒ موزوں طبع، باذوق، فطری شاعرہ تھیں، ماہنامہ رضوان میں ان کی نظمیں شائع ہوکر مقبول ہوئیں۔ حمد ومناجات اور نعتیہ کلام میں سادگی اور دل آویزی ہے۔ ''باب کرم''، ''موجِ تسنیم'' اور ''دیارِ حبیب'' شعری مجموعے اُن کے پاکیزہ ذوق کے مظہر ہیں۔ محترمہ عائشہؒ نے حمد ومناجات اور نعت گوئی میں نہایت مؤثر، معنی خیز اسلوب اختیار کیا'' حدادب کا خیال رکھتے ہوئے فن کے تقدس کو برقرار رکھا ہے'' (ڈاکٹر شمس تبریز خاں رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ) بے ساختگی اور برجستگی ان کے کلام کے حسن وتاثیر کو دوبالا کردیتی ہے۔ فرماتی ہیں:

تری ذات اعلیٰ صفات ہے ترا نام آبِ حیات ہے
تری یاد وجہ نجات ہے تری شان جلِّ جلالہٗ

قدرت نے مرحومہ امۃ اللہ تسنیمؒ کو نیازمندانہ تاثرات کے اظہار کا خاص سلیقہ ودیعت کیا تھا، عشق رسول میں ان کے سوز وگداز کی کیفیت پُر کیف اور پُر اثر ہے۔ ان کے اشعار ادبِ اسلامی کا بہترین نمونہ ہیں۔

صبا جو تیرا گزر ہو تو عرض یہ کرنا
کہ حاضری کے لیے بے قرار ہم بھی ہیں

نذرانہ سلام، برجستگی، دلکشی، نغمگی اور شگفتگی کا مجموعہ ہے۔ قلب ودماغ کو فرحت بخشتا ہے اور ذات نبوی سے محبت اور تعلق میں اضافہ کرتا ہے۔

سلام اے رحمتِ عالم، سلام اے نورِ یزدانی
سلام اے فخرِ آدم اور فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے مالک کوثر، شفیع امت عاصی   سلام اے معدن لطف وکرم، محبوب سبحانی

سلام اے رونق کعبہ سلام، اے زینت طیبہ — سلام اے مظہر علم و ہدایت، شمع ایمانی
چلا رحمت کا بادل کعبہ سے اُٹھ کر مدینہ کو — مدینہ ہوگیا رشک چمن اور جنت ثانی

محترمہ امۃ اللہ تسنیم نے مختصر علالت کے بعد ۲۸ رجنوری ۱۹۷۶ء کو دارِ فانی سے دارالبقاء کوچ کیا۔ مولانا علی میاںؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، رائے بریلی میں اپنی والدہ کے پہلو میں سپردِ خاک ہوئیں۔

(پرانے چراغ حصہ دوم، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص: ۳۴۰ تا ۳۶۹۔ امۃ اللہ تسنیم نمبر۔ ماہنامہ رضوان لکھنؤ۔ ۱۹۷۶ء)

قطب الاقطاب شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی، علی میاںؒ کی شریک حیات مرحومہ طیب النساءؒ:

حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کے بڑے صاحبزادے سید احمد سعیدؒ کی بیٹی ''سیدہ طیب النساء'' علی میاںؒ کی اہلیہ تھیں۔ اپنے آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہؒ تکیہ کلاں رائے بریلی میں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ نشو و نما خالص اسلامی ماحول میں ہوا۔ پورا خاندان دینداری صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھا خاندان کی خواتین حافظ قرآن تھیں علی میاںؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء تفسیر وادب کے استاد کی حیثیت سے (اگست ۱۹۳۴ء میں) وابستہ ہوئے۔ نومبر ۱۹۳۴ء سیدہ طیّب النساء سے نکاح ہوا سیدہ طیّب النساء صوم وصلوٰۃ کی پابند، غرباء کی ہمدرد، نہایت صلہ رحم، سخی، خاندان کی ہر دلعزیز خاتون تھیں۔ ''انھوں نے ابتداء سے آخر وقت تک اپنے ایّام حیات نہایت دینی جذبہ اخلاص اور یکسوئی سے گذارے جس کو خاندان کے سب افراد محسوس کرتے تھے۔ خاندن کے لیے مرحومہ طیّب النساء عرف ننھی بی، باعث رحمت و برکت تھیں۔ اعزّہ و اقرباء کے ساتھ حسن سلوک کرتیں، مہمانوں کی خبر گیری، ضیافت کے لیے متفکر اور کوشاں رہتیں۔ غیبت جھوٹ اور لغو باتوں سے ہمیشہ احتراز کرتیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری سے بیعت وارادات کا تعلق تھا اس سے قبل مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھیں۔ محترمہ طیّب النساء نمایاں صفات کی حامل تھیں مولانا محمد رابع حسنی اپنی ممانی کی صفات عالیہ کے بارے میں لکھتے ہیں'' ان کی تواضع، غرباء پروری، عبادت گذاری اور شوق نماز بہت معروف تھا۔ فضول باتوں سے احتراز، چھوٹوں پر شفقت، ایثار و

سخاوت اُن کے نمایاں اوصاف تھے''

(یادوں کے چراغ۔مولانا محمد رابع حسنی ندوی۔ص:۴۰۷)

نواسے محمود حسن حسنی رقم طراز ہیں ''حضرت مولانا کی بڑی مدّاح تھیں اپنے آرام سے زیادہ حضرت کے آرام کی فکر رکھتیں اور خیال کرتیں۔امور خانہ داری سے واقف تھیں باریک باریک اشیاء پر نظر رکھتیں۔آپ بڑی ذہین اور پڑھی لکھی، صائب الرائے بھی تھیں۔۱۵/دسمبر ۱۹۸۹ء کوطویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔آخر وقت تک اللہ کی حمد وثنا میں رطب اللسان رہیں۔علی میاںؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔آبائی قبرستان میں اپنے جلیل القدر دادا سید شاہ ضیاء النبیؒ کے پہلو میں سپرد خاک کی گئیں۔

(رضوان لکھنؤ جنوری ۱۹۹۰ء۔ص۔۲۰۔۲۱)

مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کی باقیات الصالحات اور اُن کی علمی خدمات

سیدہ حمیرا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی سب سے بڑی بیٹی تھیں، علی میاںؒ کے بچپن کے ساتھی، خاندان کے ایک معزز فرد محمد مسلم حسنی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔دو صاحبزادیاں (زہرہ اور طاہرہ)، تین صاحبزادے (سید حسن حسنی، سید حسین حسنی اور ڈاکٹر سید احمد الحسنی ندوی) ہیں۔مولانا محمود حسن حسنی ابن سید حسن حسنیؒ (معاون مدیر تعمیر حیات) محمد مسلم حسنی کے پوتے اور مولانا محمد ثانی حسنی کے نواسے ہیں بلند پایہ علمی ذوق کے مالک، عربی اور اردو زبان میں علمی، دینی اصلاحی مضامین لکھتے ہیں، متعدد کتب کے مصنف ہیں۔تصانیف کے نام خاندان کی فہرست میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کی دوسری صاحبزادی **سیدہ فاطمہ** (اہلیہ مولانا سیّد محمد طاہر حسینی منصور پوریؒ) ہیں۔مولانا سیّد محمد طاہر منصور پوری ایک صاحبِ علم شخصیت تھے۔ آپ کے تین عالم اور نامور صاحبزادے مولانا محمد سلمان الحسینی ندوی، مولانا اسحاق حسینی ندوی اور مولانا صہیب حسینی ندوی اور ایک صاحبزادی سیّدہ مریم حسینی (اہلیہ ڈاکٹر سید احمد الحسنی ندوی) ہیں۔

مولانا سیّد محمد سلمان الحسینی:

آپ کے خاندان کا تعلق سادات بارہہ سے ہے، خاندان کے لوگ عراق، ایران سے ہوتے ہوئے ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان آئے۔ پنجاب، مغربی یو پی اور بہار کے اضلاع میں رہائش پذیر ہوئے۔ دسویں صدی ہجری سے خاندان کی شاخ منصور پور ضلع مظفر نگر میں آباد ہے۔

سیّد محمد سلمان الحسینی کی ابتدائی تعلیم و تربیت خاندان کے بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی، دو تین سال مکتبی تعلیم کے بعد دارالعلوم کے شعبہ حفظ میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں قرآن کریم حفظ کرلیا۔ ۱۹۶۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجہ سوم سے عربی تعلیم کا آغاز ہوا، بچپن سے ہی ذہین تھے، کتب بینی کا شوق وراثت میں ملا، دارالعلوم سے درجہ عالمیت میں حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فکر و فلسفہ پر مقالہ تحریر کیا۔ ۱۹۷۱ء میں آپ حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ سے بیعت ہوگئے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک جامعۃ امام محمد بن سعود سے علم حدیث میں تخصص کیا۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی نگرانی میں جرح و تعدیل کے موضوع پر ایم اے کا مقالہ تحریر کیا، جو چار جلدوں میں شائع ہوا۔

مولانا سیّد محمد سلمان الحسینی نے عربی ادیبوں میں علی طنطاوی، احمد امین، عقاد رافعی، سید قطب، محمد قطب، شیخ محمد غزالی کی تصانیف کا جم کر مطالعہ کیا۔ ہندوستان کے علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودیؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا محمد الحسنیؒ، مولانا محمد میاں دہلویؒ کا بتدریج مطالعہ کیا، جو اُن کی ذہن سازی میں معاون بنا۔ تحریر و تقریر اور تصنیف و تالیف پسندیدہ مشغلہ بن گیا، آپ نہایت ذکی اور فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں "مذکراتی" کے عنوان سے اپنی علمی و عملی زندگی کی روداد لکھنا شروع کی، اب تک اس کے ۱۲ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا سید محمد سلمان الحسینی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد حدیث

کے عہدہ پر فائز ہیں، آپ کا میدان اختصاص علم حدیث ہے۔ آپ انجمن شباب الاسلام کے بانی وصدر ہیں، اعلیٰ علمی شوق اور خطیبانہ ذوق رکھتے ہیں، ان کی علمی شہرت ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بھی ہے۔ مختلف علمی موضوعات پر عربی و اردو میں تصانیف ہیں۔ علی میاںؒ کی کئی تصانیف کے عربی واردو مترجم ہیں بالخصوص خودنوشت 'کاروانِ زندگی' (فی مسیرة الحیاة ۱، ۲، ۳) کے عربی ترجمہ نگار ہیں۔ مولانا محمد اسحاق حسینی ندوی اور مولانا محمد صہیب حسینی ندوی (برادران مولانا محمد سلمان الحسینی ندوی) دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہیں، اردو و عربی میں علمی، ادبی، فکری، اصلاحی موضوعات پر مضامین، خطبات اور تصانیف ہیں۔ تصانیف کے نام فہرست مصنفین خاندان حسنی میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعلیؒ کی تیسری صاحبزادی سیدہ خدیجہ (اہلیہ محمد ثانی حسنیؒ) نہایت نیک، خدمات گزار، خوش اخلاق، عابدہ اور زاہدہ بی بی تھیں۔ ایک صاحبزادے مولانا محمد حمزہ حسنی بدظلہ العالی اور صاحبزادی امامہ حسنیؒ ہیں۔

مولانا محمد حمزہ حسنی (ناظر عام دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدیر ماہنامہ 'رضوان'، لکھنؤ) دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ خاندان کی علمی وراثت کے امین ہیں۔ ان کے اسلامی رُخ ساز اداریے اور فکر انگیز مضامین قلب و دماغ پر دستک دیتے اور حسن عمل پر آمادہ کرتے ہیں۔ تذکرہ سید احمد شہیدؒ، تذکرہ صحابیات، سیرت امہات المؤمنین، مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن حسنی ندوی ان کی قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ مولانا محمد ثانیؒ کی صاحبزادی سیدہ اُمامہ (وفات: ۱۴؍شعبان ۱۴۲۶ھ) زوجہ سید حسن حسنی ابن محمد مسلم حسنی ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی سب سے بڑی نواسی تھیں، تین بیٹے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہیں۔ خاندان کے علمی روایات کے علمبردار مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی (استاد مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی) پندرہ روزہ تعمیرِ حیات کے شریکِ ادارت ہیں۔ ''حیات عبدالباری'' عائشہ بی اور داعی اسلام مولانا عبداللہ حسنیؒ ان کے ذوق سوانح نگاری کا بہترین نمونہ اور افرادِ خاندان کے سیرت و

حالات کا جامع مرقع ہیں۔سیّدہ امامہ کے بیٹے مولوی سید مسعود حسن حسنی ندوی اور مولوی منصور حسن حسنی ندوی ہیں، دونوں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہیں۔ بیٹیوں میں **عائشہ حسنی** ماہنامہ 'رضوان' کی معاون مدیرہ ہیں، **شامہ حسنی** حافظ قرآن ہیں۔ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کی باقیات الصالحات میں خاندان کی اعلیٰ علمی روایات کی پاسداری، دعوت واصلاح کا شوق اور تعلیم وتعلّم کا ذوق پایا جاتا ہے۔

سیدہ رقیہ (اہلیہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی) ڈاکٹر عبدالعلیؒ کی چوتھی صاحبزادی ہیں، ان کی تین نیک اور سعادت مند بیٹیاں **سیّدہ میمونہ حسنی** (اہلیہ مولانا حمزہ حسنی)، **سیّدہ آمنہ حسنی** (اہلیہ مولانا عبداللہ حسنیؒ) اور **سیّدہ ہاجرہ حسنی** (اہلیہ مولوی جعفر مسعود حسنی ندوی) ہیں۔تینوں بیٹیوں نے گھر میں بزرگوں سے تعلیم حاصل کی۔

ڈاکٹر عبدالعلیؒ صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی **سیدہ سکینہ** (اہلیہ محمد واضح رشید ندوی) ہیں۔آپ کے ایک صاحبزادے مولانا جعفر مسعود ندوی ہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالم فاضل ہیں۔اردو اور عربی میں تصانیف ہیں۔علی میاںؒ کی تصنیف کاروانِ زندگی (في مسيرة الحياة) کے عربی مترجم ہیں۔ان کے فکرانگیز مضامین عربی واردو رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔

مولانا حکیم ڈاکٹر **عبدالعلی حسنیؒ** کے بیٹے **سید محمد الحسنی** (ولادت: ۱۷/رجب ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۵ء) اولادوں میں سب سے چھوٹے تھے۔مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان کی رسم بسم اللہ ادا فرمائی۔مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ نے اپنے مجتہدانہ طریقہ پر ابتداء میں عربی زبان کی تعلیم صرف ونحو کے قواعد کی مدد کے بغیر دی۔عربی تعلیم قرآن کریم سے شروع کی سیّد محمد الحسنی کا ذہنی نشوونما دارالعلوم کے علمی دینی ماحول میں ہوا تھا۔کتب بینی کا شوق وراثت میں ملا تھا، ۱۲ سال کی عمر میں پہلا عربی مضمون لکھا اور ۱۴ سال کی عمر میں اپنے چچا علی میاںؒ کی دعوتی تقریر صورت وحقیقت کا عربی ترجمہ کیا، جو عرب ممالک میں بے حد پسند کیا گیا۔محمد میاں خاندان کی ہر دلعزیز شخصیت، بہنوں کے بے حد لاڈلے بھائی تھے۔

۱۹۵۵ء میں عربی رسالہ البعث الاسلامی جاری کیا۔ ۱۹۶۰ء میں نوجوانوں کی بین الاقوامی تنظیم جمیعۃ الرابطۃ الاسلامیہ قائم کی۔ ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم کا ترجمان تعمیرِ حیات مولانا محمد الحسنیؒ کی ادارت میں جاری ہوا۔ مولانا سیّد محمد الحسنیؒ ۱۹۶۷ء میں علی میاںؒ کے ساتھ سفرِ حجاز پر گئے، دوسری بار ۱۹۷۲ء میں الندوۃ العالمیہ للشّباب کی دعوت پر اور تیسری مرتبہ ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کے اجلاس شوریٰ کے موقع پر حجاز کا سفر کیا۔ ۱۹۷۸ء میں پہلی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان گئے۔

مولانا سیّد محمد الحسنیؒ کو اردو عربی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی لیکن عربی تحریر وانشا ان کا اصل میدان تھا۔ ''وہ بڑے اہم موضوعات پر برجستہ، قلم برداشتہ لکھ لیا کرتے تھے ان کے مضامین اور تحریر میں آمد ہی آمد تھی'' (علی میاںؒ) اُن کی عربی واُردو تصانیف میں الاسلام الممتحن، مصر تتنفس، الی القیادۃ العالمیہ، تذکرہ شاہ علم اللہ، سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، رودادِ چمن، پیامِ ندوہ ہیں۔ مولانا محمد ثانی، مولانا سید محمد الحسنیؒ کے اُسلوب اور فکر ونظر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اُنھوں نے اپنے عم مکرم کی چھوٹی بڑی، قدیم وجدید ساری کتابوں کو پوری توجہ اور انہماک سے پڑھا، اُن کے اسلوب، طرزِ تحریر، فکروذوق اور احساسات و خیالات کو اپنا کر اپنے قلم میں اُن کو سمو دیا...... محمد میاںؒ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۹ء تک تیس سال مسلسل پڑھتے رہے اور لکھتے رہے۔ یہ اُن کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ تھا اور اِس طرح جہاد بالقلم کرتے کرتے اُنھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی''۔

(سوانح مولانا محمد الحسنیؒ، مؤلف مولانا محمد ثانی حسنی، ص:۱۰۴)

۱۳رجون ۱۹۷۹ء کو مختصر علالت کے بعد ۴۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، تکیہ کلاں رائے بریلی کے خاندانی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

مولانا محمد الحسنیؒ کے تین بیٹے مولانا سیّد عبداللہ حسنیؒ، مولانا عمار عبدالعلی حسنی

اور مولانا بلال عبدالحئ حسنی ہیں۔ تینوں صاحبزادے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالم، فاضل فارغ التحصیل ہیں۔ علمی ذوق میں اہل خاندان کے سچے جانشین ہیں۔

مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ:

مولانا عبداللہ حسنی کی پیدائش ۲۹؍ رجب ۱۳۷۶ھ مطابق ۲۹؍ جنوری ۱۹۵۷ء لکھنؤ میں ہوئی، دادا مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ نے عبداللہ نام رکھا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے لکھنؤ تشریف آوری کے موقع پر تحنیک کی سنت ادا کروائی۔ آپ کی والدہ سیّدہ زکیہ حسنی سید حسن مثنیؒ کی صاحبزادی تھیں، بہت دین دار، عبادت گزار، صابر وشاکر خاتون تھیں، مولانا عبداللہ حسنیؒ کی پرورش نانہال اور دادیہال کے علمی، دینی، مذہبی ماحول میں ہوئی، ربانی علماء کے سایہ عاطفت میں بڑے ہوئے، اپنے جدمکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شفقت، محبت اور تربیت کے زرّیں مواقع حاصل ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گھر میں اور محلّہ کے اساتذہ سے حاصل کی، محلّہ کے مکتب کی تعلیم کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ فضیلت فی الشریعہ میں اختصاص فی الحدیث کی سند حاصل کی، زمانہ طالب علمی میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم فرمایا۔ آپ دارالعلوم کے عربی جریدے 'الـــرائـد' کے مدیر تھے، جلیل القدر عالمِ دین، کامیاب استاد حدیث اور ممتاز داعی اسلام تھے، فکر کا دائرہ وسیع تھا، تمام دنیا کے انسانوں کی ہدایت کی فکر رکھتے تھے۔ طریقہ دعوت واصلاح نہایت مؤثر تھا، بہت لوگ ہدایت یافتہ ہوئے، تحریک پیامِ انسانیت کے ذریعہ برادرانِ وطن کو جوڑنے کا کام کیا۔ علی میاںؒ کے مجازِ طریقت تھے۔ ارشاد باطنی کا کام بھی انجام دیا۔ عمرے وحج بیت اللہ کی سعادت ملی، قطر، ملیشیا، متحدہ عرب امارات، مصر اور افریقہ کے سفر کیے۔ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۰۱۳ء بعمر ۵۶ سال دارِ فانی سے دارِ بقاء کوچ فرمایا۔ شاہ علم اللہ کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ اپنے قرب کے اعلیٰ ترین درجات عطا فرمائے۔ آمین

(سیرت داعی اسلام حضرت مولانا سیّد عبداللہ حسنیؒ ندوی، مؤلف مولانا محمود حسن حسنی ندوی)

مولانا سیّد محمد الحسنیؒ کے بیٹے مولانا سیّد عمار عبدالعلی حسنی ندوی حافظ قرآن بھی ہیں، مدرسہ مظہر الاسلام بلوچپورہ لکھنؤ کے مہتمم ہیں۔ **مولانا سیّد بلال عبدالحی حسنی ندوی** تدریس کے فرائض کے ساتھ تصنیفی و تحقیقی ذوق، دعوت واصلاح کے کام سے مناسبت رکھتے ہیں، دارِ عرفات رائے بریلی کے مدیر، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی کے نائب ناظم ہیں۔ عربی اردو میں قلم برداشتہ لکھتے ہیں، آپ کو علی میاںؒ کی زندگی کے آخری دَور میں ان کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع ملا ''سوانح مفکر اسلام'' اور ''حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دعوت وفکر کے اہم پہلو'' اُن کی اہم اور قابل ذکر تصانیف ہیں، فکر انگیز موضوعات پر مضامین اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہے۔ "بارک اللّٰہ فی حیاتھم و نفع بہ المسلمین"۔

چند تاریخی خصائص:

علی میاںؒ نے خودنوشت سوانح کاروان زندگی میں ''چند تاریخی خصائص'' کے عنوان سے اپنے خاندان کے کچھ قابل ذکر امتیازی خاندانی خصائص اور مشترک صفات کی نشاندہی کی ہے جیسے: نسب کی حفاظت غلو کی حد تک، عقیدۂ توحید پر استحکام، شرک بدعت اور تشیع کے اثرات سے محفوظ، توحید اور اتباع سنت کی دعوت عام شعار، مردانگی دینی حمیت، جذبۂ جہاد، سادگی، سادہ دلی، بھولا پن، مشائخ و علماء کی طرف بلا تکلف رجوع، دولت اور ثروت کی کمی۔

(کاروان زندگی حصہ اوّل، ص: ۲۰ تا ۲۹)

خاندان حسنی کی محفوظ مرتب تاریخ، افراد خاندان کے حالات زندگی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان کے افراد نے اسلام کی اشاعت، اسلامی تہذیب کی حفاظت، سنت کے احیاء، تعلق مع اللہ، صحت عقائد اور پابندی فرائض کے لیے لسانی و عملی طور پر سرگرم رول ادا کیا، تاریخ کے ہر دور میں افراد خاندان نے حسب نسب کی حفاظت کی، دین کی سربلندی کے لیے کوشاں رہے ور راہِ شریعت پر ثابت

قدمی سے جمے رہے۔ افراد خاندان کی علمی بصیرت اور جذبہ جہاد نے خانوادۂ حسنی کو ایک امتیازی حیثیت عطا کی۔ ان میں ایک طرف علمائے ربانی اور مشائخ روحانی پیدا ہوئے جن کے ذریعے ہزاروں انسانوں کی زندگی میں تغیر ہوا۔ اعمال و اخلاق کی اصلاح ہوئی، شرک و بدعت کا خاتمہ ہوا۔ شریعت و سنت کا رواج ہوا، دوسری جانب خاندان حسنی و حسینی کے افراد صحیح العقیدہ اور صاحب باطن مشائخ کی طرف بلا تکلف رجوع و استفادہ کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت مجددّ الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کے بعد تقریباً پورا خاندان ان کے خلیفہ سید آدم بنوریؒ اور ان کے طریقۂ احسنیہ سے مربوط و منسلک ہوگیا۔ اس کے بعد خاندان کے لوگ وقتاً فوقتاً حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد سے علمی و باطنی استفادہ کرتے رہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانے میں شاہ علم الٰہیؒ خاندان نے ان سے اور شاہ عبدالعزیزؒ سے روحانی استفادہ کیا اور شاہ صاحب کی دعوت و اصلاح کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف رہے۔ یہ خاندان آج بھی ولی الٰہی تحریک سے متاثر اور عقائد و مسلک میں سید احمد شہیدؒ اور سید اسماعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو ہے۔ معروف مؤرّخ اور سوانح نگار غلام رسولؒ مہر لکھتے ہیں۔

> ''خاندان کے بزرگ شاہ علم اللہؒ سجّادہ نشینی کی رسم سے بے حد متنفّر تھے اور وصیّت کر گئے کہ یہ سلسلہ ان کے خاندان میں جاری نہ ہو چنانچہ اس پر عمل ہوا اور اس گھرانے کے کسی فرد نے اپنے حلقے سے باہر جا کر کسب فیض میں کبھی تامّل نہ کیا اور اگر کوئی شخص خود ان سے استفادہ کا خواہاں ہوا تو اس کی آرزو بھی پوری کی، لیکن باقاعدہ گداگری بنا کر کوئی نہ بیٹھا۔ اس طرح دنیاوی دولت کی سرگردانی کو کبھی کسی نے شیوہ نہ بنایا اگر دولت ملی بھی تو اس کو غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دینے کو ہی سعادت سمجھتے رہے۔''

(سیرت سید احمد شہیدؒ۔ غلام رسول مہر۔ ص۔ ۴۷)

راقم السطور نے لکھنؤ سفر کے دوران علی میاںؒ کی خاندان کی مستورات سے

ملاقات کی۔ ان کی سادگی، پردہ کا اہتمام، حیات کفاف اور قناعت، اسلامی معاشرت پر استقامت کے روح پرور مناظر دیکھے۔ خواتین نہایت نیک دل، عبادت گزار، کم سخن، متواضع، مہمان نواز اور بے حد مخلص ہیں۔

علی میاںؒ کا خاندان علماء مجاہدین اور مصنفین کا خاندان ہے جہاں دین وعلم کے چرچے ہیں، خاندانی کتابی ذخیرہ ان کا قیمتی اثاثہ رہا ہے۔ دینی علم نسلاً درنسل منتقل کرنے کا اہتمام پایا جاتا ہے، عالم اور صاحبِ تصنیف افراد (جن میں خواتین بھی شامل ہیں) کی کہکشاں نظر آتی ہے۔ علی میاںؒ کے بھتیجے، بھانجے، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں سب عالم فاضل، داعی، اہلِ قلم اور صاحبِ تصنیف ہیں۔ افراد خاندان کے علمی کارناموں کی فہرست اس بات کی شاہد ہے کہ علم دین کے حصول کے ساتھ تصنیف وتالیف کا شوق خاندان کا اختصاص رہا ہے۔ خاندان کے مصنفین کی علمی خدمات کی یہ فہرست اُن کے پاکیزہ علمی ذوق کی گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ خاندانِ حسنی و حسینی کے فیوض وبرکات کو تاقیامت جاری رکھے اور سارا عالم فیضیاب ہو۔ (آمین)

خاندان حسنی وحسینی کے اہلِ قلم اور ان کے علمی کارنامے

نمبر شمار	مصنف کا نام	تصنیف
(۱)	سید محمد نعمانؒ	☆ اعلام الہدیٰ
(۲)	سید عبدالشکورؒ	☆ گلشن محمودی
(۳)	سید محمد اسحاقؒ	☆ عربی وفارسی کے قادرالکلام شاعر
(۴)	سیّد ہدایت اللہؒ	☆ عالم وصاحبِ تصنیف بزرگ
(۵)	سید محمد علیؒ	☆ مخزن احمدی
(۶)	سید محمد ظاہر	☆ خیر المسالک
(۷)	سیّد قطب الہدیٰ محدث	☆ مذہبی رسائل
(۸)	سید ابوالقاسم ٹونکیؒ	☆ تمقام الاسلام

(۹) منشی عبدالرزاق کلامی ☆ صمصام الاسلام

(۱۰) سید عبدالعلی علی، ہجر بھاشا اور عربی و فارسی کے شاعر

(۱۱) سید فخر الدین خیالی ☆ تذکرہ مہر جہاں تاب (قلمی، فارسی)،

☆ تاریخ بکھیل کھنڈ ☆ اعلام الہدیٰ ☆ دیوانِ خیالی ☆ سیرت علمیہ

☆ سیرت السادات ☆ دیوانِ فارسی ☆ چمنستان اردو ☆ سبیل النجات

☆ مجربات خیالی ☆ فخر المطالب ☆ مسدس خیالی

(۱۲) مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

☆ نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر (الاعلام بمن في تاريخ الهند والاعلام) ☆ الهند في العهد الاسلامي

☆ الثقافة الاسلاميه في الهند ☆ تهذيب الأخلاق (حديث)

☆ تنوير الآفاق شرح تهذيب الاخلاق ☆ دہلی اور اس کے اطراف

☆ تذكرة الابرار ☆ الاعلام ☆ یادِ ایام

☆ الغنا في الاسلام ☆ گل رعنا ☆ الاصلاح

(۱۳) ڈاکٹر حکیم مولانا سیّد عبدالعلی حسنیؒ (ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

☆ نماز سمجھ کر پڑھیے ☆ اسلام کی تعلیم،

☆ جزیرۃ العرب کے جغرافیہ پر عربی میں کتاب (نامکمل)

(۱۴) سید محمد طلحہ حسنی ٹونکی ☆ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ (غیر مطبوعہ)

(۱۵) محترمہ سیدہ خیر النساء بہترؔ (والدہ محترمہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

☆ مناجات ☆ ذائقہ ☆ کلید باب رحمت

☆ حسن معاشرت ☆ دعا اور تقدیر

(۱۶) محترمہ سیدہ امۃ العزیزؒ (ہمشیرہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ)

☆ ☆ چند ممتاز صحابیات ☆ زندگی کیسے گزاریں

☆ اسماء بنت عمیس کے حالات (غیر مطبوعہ) ☆ دینی مضامین (ماہنامہ رضوان میں شائع ہوئے)

(۱۷) سیدہ امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بیؒ (مدیرہ ماہنامہ 'رضوان'، لکھنؤ)

☆ بچوں کی قصص الانبیاء حصہ اوّل تا چہارم قصص النبیین مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (حصہ اوّل تا چہارم کا اردو ترجمہ) ☆ ہمارے حضورؐ

☆ زادِ سفر (ریاض الصّالحین کا اردو ترجمہ) ☆ بابِ کرم (مناجات)

☆ مناجات ہاتف ☆ اخلاقی خرابیاں اور اُن کا وبال

☆ دیارِ حبیب ☆ حضرت مصعب بن عمیرؓ

☆ موجِ تسنیم (نعتوں کا مجموعہ) ☆ رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا

(۱۸) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

علی میاںؒ کی تصنیفات و خطبات کی فہرست مولانا محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) کی تصنیف ''عہد ساز شخصیت'' سے شاملِ اشاعت ہے، عربی تصانیف و خطبات کی تعداد ۳۰۰ اور اردو تصانیف و تقاریر کی تعداد ۲۰۰ ہے۔

(۱۹) مولانا سید محمد الحسنیؒ (بانی و مدیر البعث الاسلامي)

☆ تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہؒ ☆ سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ

☆ الاسلام الممتحن ☆ رودادِ چمن ☆ پیامِ ندوہ

☆ اضواء علی الطریق ☆ جادۂ فکر و عمل

☆ الاسلام بین لا و نعم

☆ المنهج الاسلامی السلیم ☆ قرآن آپ سے مخاطب ہے

☆ مع الحقیقة ☆ انسانیت آج بھی اُسی دور کی محتاج ہے

علی میاںؒ کی عربی کتابوں کا اردو ترجمہ:

☆ نبی رحمت ☆ ارکانِ اربعہ ☆ معرکہ ایمان و مادّیت

☆ دو ہفتے مغرب اقصیٰ مراکش میں ☆ تزکیہ احسان تصوف و سلوک

☆ جب ایمان کی بادِ بہاری چلی ☆ تحقیق و انصاف کی عدالت میں مظلوم مصلح کا مقدمہ

☆ عالم عربی کا المیہ

☆ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ☆ مغرب سے صاف صاف باتیں

☆ طوفان سے ساحل تک (اردو ترجمہ Road to Makkah) (محمد اسد)

☆ الصلوٰۃ و مکانتھا فی الاسلام (فضائل نماز از مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ)

(۲۰) مولانا سیّد محمد ثانی حسنیؒ ندوی، مظاہری

(ایڈیٹر ماہنامہ رضوان، بانی و ناظم مدرسہ فلاح المسلمین)

☆ سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ ☆ حیات خلیل (سوانح مولانا خلیل احمد سہارنپوری)

☆ مجدد الف ثانیؒ ☆ میزاب رحمت (مجموعہ کلام)

☆ تذکرہ مولوی محمد ہارون کاندھلوی ☆ زبان کی نیکیاں

☆ صادقین صادق پور ☆ ترانے اور نظمیں

☆ سوانح مولانا محمد الحسنیؒ ☆ خانوادہ شاہ علم اللّٰہی

☆ لبیک اللھم لبیک (سفرنامۂ حج) ☆ گلدستہ حمد وسلام

☆ حضرت سید احمد شہید تاریخ کی روشنی میں ☆ شہید بالاکوٹ (شاہنامہ)

☆ ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم (زیر طبع) ☆ ترانۂ ندوہ

(۲۱) مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

☆ دین وادب ☆ جغرافیہ جزیرۃ العرب

☆ قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل ☆ حج و مقامات حج

☆ دو مہینہ امریکہ میں ☆ حالاتِ حاضرہ ☆ غبارِ کارواں

☆ مقامات مقدسہ ☆ سماج کی تعلیم و تربیت

☆ سمرقند و بخارہ کی بازیافت ☆ احتساب زندگی (تفسیر سورۃ الانبیاء)

☆ امت مسلمہ رہبر اور مثالی امت ☆ فقہ اسلامی اور عصر جدید

☆ اسلامی شریعت ایک محکم قانون اور انسانی زندگی کی ضروریات

☆ سراجاً منیراً رہبر انسانیت ﷺ (اردو، ہندی، انگریزی)

☆ امت اسلامیہ اور اس کی ثقافت ☆ مسلم سماج: ذمے داریاں اور تقاضے

☆ سمرقند و بخارا کی بازیافت ☆ عالمِ اسلام اور سامراجی نظام

☆ نقوش سیرت ☆ خطبات رابع ☆ مسلم پرسنل لا بورڈ: مزاج اور طریقہ کار

☆ اسلامی معاشرہ (سورہ حجرات کی روشنی میں) ☆ سیرت محمدی انسانیت کے لیے اعلیٰ نمونہ

☆ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی عہد ساز شخصیت ☆ دین و ادب

عربی ترجمے:

☆ فضائل الدعوة الى الله و التبليغ لدين الله (فضائل تبلیغ مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ)

☆ المنهج الاسلامي لتربية النفس (تجدید تصوف وسلوک از مولانا عبد الباری ندویؒ)

عربی تصانیف:

☆ قيمة الأمة الاسلامية و منجزاتها ☆ مقالات فى التربية و المجتمع

☆ معلم الانشاء (الجزء الثالث) ☆ منثورات من ادب العرب

☆ الأدب العربى بين عرض و نقد ☆ تاريخ الادب العربى (العصر الاسلامى)

☆ الأدب الاسلامى فكرته و منهاجه ☆ الأدب الاسلامى و صلته بالحياة

☆ رسائل الأعلام ☆ جزيرة العرب ☆ حركة الدعوة الاصلاح

☆ جهود اصلاح العقيد ☆ من ادب الرّسول ﷺ

☆ التربية والمجتمع ☆ ندوة العلماء

☆ بين التصوف والحياة ☆ أضواء على الأدب الاسلامي

☆ في وطن الامام البخاريؒ ☆ العالم الاسلامي اليوم: قضايا و حلول

☆ في ظلال السيرة على صاحبها ألف ألف تحية و سلام

☆ أضواء على الفقه الاسلامى ☆ رسالة المناسبات الاسلامية

☆ الغزل الأردي و محاوره ☆ الهداية القرآنية سفينة نجاة للانسانية

☆ سراجاً منيراً سيرة خاتم النبيين محمد صلى الله عليه وسلم

☆ الشيخ أبو الحسن علي الحسني الندوى شخصية صنعت التاريخ

☆ الاصول الثلاثة (التوحيد، الرسالة، الآخرة) في ضوء الكتاب و السنة

☆ مختار الشّعر (الجزء الثانی) ☆ الثقافة الاسلامیه

(۲۲) مولانا سیّد محمد واضح رشید حسنی ندوی (ایڈیٹر عربی جریدہ 'الرائد'، استاد ادب عربی)

☆ تاریخ الأدب العربی (العصر الجاهلی) ☆ الیٰ نظام عالمي جدید

☆ أدب الصحوة الاسلامیه ☆ حرکة رسالة الانسانیة

☆ الدعوة الاسلامیة و منهاجها في الهند ☆ الشیخ أبوالحسن قائدا حکیما

☆ حرکة التعلیم الاسلامي في الهند و تطور المنهج

☆ ندوة العلماء حرکة ثقافیة توجیهة ☆ مختصر الشمائل النبویة

☆ المسحة الأدبیه في کتابات الشیخ ابی الحسن علي الحسني الندويؒ

☆ من صناعة الموت الی صناعة القرارات ☆ أدب أهل القلوب

☆ قضایا الفکر الاسلامی: الغزو الفکري ☆ مصادر الأدب العربي

☆ لمحات من السیرة النبویة والأدب النبوي

☆ أعلام الأدب العربي في العصر الحدیث

☆ سیدنا محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم و صحابته رضی الله عنهم

☆ الشیخ أبوالحسن علی الحسني الندوي: منابع فکره و منهجه

☆ تاریخ النقد العربي (قید طبع) ☆ شعر الغیرة الاسلامیة (قید طبع)

☆ تاریخ الأدب العربي العصر العباسي (قید طبع)

عربی ترجمے:

☆ فضائل القرآن الکریم : ترجمة کتاب الشیخ محمد زکریا الکاندهلوی

☆ فضائل الصلوٰة علی النبی ﷺ: ترجمة کتاب الشیخ محمد زکریا الکاندهلوی

☆ الدین والعلوم العقلیة : ترجمة کتاب الشیخ عبدالباری الندوی

☆ نظام التعلیم الدینی فی الهند (سروے آف مسلم ایجوکیشن آف انڈیا)

☆ الامام احمد بن عرفان شهید في محراب التاریخ

(حضرت سید احمد شہیدؒ تاریخ کی روشنی میں۔ محمد ثانی حسنیؒ)

☆ الامام احمد بن عرفان شہیدؒ (رجال الفکر والدعوۃ الجزء الخامس)

اردو تصانیف و تراجم

☆ محسن انسانیت ﷺ (ترجمہ: محمد وثیق ندوی) ☆ مسئلہ فلسطین اور عالم اسلام

☆ نظام تعلیم وتربیت (ترجمہ: محمد وثیق ندوی) ☆ مثالی حکمراں ٹیپو سلطان شہیدؒ

☆ موجودہ تہذیب وتمدن اور عالم اسلام (ترجمہ: محمد وثیق ندوی)

☆ ندوۃ العلماء ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریک اصلاح ودعوت

☆ اسلام مکمل نظامِ زندگی حدیث نبوی کی روشنی میں

(۲۳) مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی (ماہنامہ ''رضوان''، لکھنؤ کے ایڈیٹر)

☆ تذکرہ حضرت سید احمد شہیدؒ ☆ تذکرہ صحابیاتؓ ☆ سیرت امہات المومنینؓ

☆ مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی حصّہ اوّل، دوم، سوم

(۲۴) مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ (عربی جریدہ ''الرائد'' کے مدیر، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

☆ صحابہ کرام کی امتیازی خصوصیات اور ہمارا معاشرہ (غیر مطبوعہ)

☆ حقیقی محبت اور اس کے تقاضے ☆ محبت صحابہ (رضی اللہ عنہم)

☆ محبت اور اہلِ بیت (رضی اللہ عنہم)

عربی، اردو تراجم:

☆ تذکرۃ الخلیل (حیات خلیل مصنفہ مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کی تلخیص وترجمہ)

☆ نفحات الایمان (ایمان کے جھونکے) (مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی یمن کی تقاریر)

☆ المدو الجزر فی تاریخ الاسلام۔ از مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ

☆ الشیخ محمد یعقوب المجدّدی (الرائد میں ۳ قسطوں میں مضمون شائع ہوا)

☆ الشیخ وصی اللّٰہ الفتحپوری (الرائد میں ۴ قسطوں میں مضمون شائع ہوا۔)

(۲۵) مولانا سید جعفر مسعود ندوی (ماہنامہ رضوان لکھنؤ کی مجلس ادارت کے رکن)

اردو، عربی تراجم

☆ کاروانِ زندگی حصّہ چہارم پنجم، ششم فی مسیرۃ الحیاۃ.

☆ الأضواء تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اردو ترجمہ بصائر

☆ سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی مصنفہ: مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کا عربی ترجمہ

(۲۶) مولانا سید سلمان الحسینی ندوی

(بانی وامیر جمعیة شباب اسلام لکھنؤ، استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، وکیل کلیة الشریعه دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ناظم جامعہ سید احمد شہید کٹولی، لکھنؤ)

عربی تصانیف:

☆ لمحة عن علم الجرح والتعديل ☆ حياة الامام البخاري

☆ مفردات القرآن للبخاري ☆ دروس من الحديث النبوى الشريف

☆ مقدمه سنن الامام الترمذی ☆ بين أهل الرأى و أهل الحديث

☆ الاجتهاد والتقليد ☆ التعريف الوجيز

☆ العقد اللجينى ☆ الأمانة في ضوء القرآن

☆ حوار فى قضايا من الحديث النبوى الشريف

☆ الفرائض السراجية ☆ المدخل الىٰ دراسة جامع الترمذي

☆ المقدمة في أصول الحديث ☆ مشعال المصابيح (۱تا۴)

☆ العلامة الناجعة (عربی ترجمه العجالة النافعة)

☆ مواقف مشبوهة للحكومة السعودية ☆ العالم العربى فى كتابات الامام الندوى

☆ رسالة الامام ولى الله الدهلوي في المواريث

☆ المسوى من احاديث المؤطا (۱. ۲) ☆ المصفى شرح المؤطا الجزء الاول والثانى

☆ مشايخ البخاري ☆ تهذيب نورالايضاح

☆ الفاظ الجرح والتعديل (۱تا۴) مذكراتى (۱تا۲۱)

☆ دروس اللغة العربية(۱،۲،۳،۴) ☆

☆ آراء الامام ولى الله احمد بن عبدالرّحيم الدهلوى فى بيان اختلاف المذاهب

☆ التعريف الوجيز بكتب الحديث الشريف ☆ موجز حياة الامام البخارى

☆ الفوز الكبير فى اصول التفسير للامام ولى الله احمد بن عبدالرحيم الدهلوى
(نقله من الاصل الفارسى الى العربيه ووضع عناوينه الجانبية)
☆ مقدمة فى اصول الحديث للتنسيخ الحديث عبدالحق الدهلوى (تقديم و تعليق)

اردو تصانیف

☆ خطبات سیرت ☆ ہمارا نصابِ تعلیم کیا ہو؟
☆ خطبات بنگلور ☆ محدثین کی نظر میں فقہ اور فقہاء کی اہمیت
☆ ہزارۂ صوم کی قیامت صغریٰ ☆ حدیث نبوی کے چند اسباق
☆ امانت کا قرآنی تصور ☆ امام بخاری اور ان کی الجامع الصحیح
☆ چند فکری زاویئے ☆ یہودی خباثتیں
☆ دینی مدارس کا نصابِ تعلیم ☆ حج کا دعوتی نظام سیرت نبوی کے آئینہ میں
☆ آزادیٔ ہند حقیقت یا سراب ☆ ماہِ رمضان اور پیامِ قرآن
☆ اخلاق وشمائل نبوی ☆ عمل پیہم
☆ مقدمہ سنن امام ترمذی ☆ امارت شرعیہ
☆ کلیم پھلتی ☆ سفرنامہ ایک طالب علم کا
☆ تحریک ندوۃ العلماء ☆ ہندوستان میں اسلامی شریعت
☆ درسِ قرآن ☆ بزرگوں کے خطوط
☆ عصری تعلیم گاہوں میں مسلم طلباء کے مسائل اور ان کا حل
☆ سفرنامہ ترکی ☆ علماء اور سیاست
☆ عالم عربی کی صورت حال اور اس کا علاج ☆ تبویب القرآن (۱۔۲)
☆ عالم عربی کی صورت حال اور سعودی حکومت کا سازشی کردار
☆ ماوراء النہر کی سیر یا ازبکستان میں نو دن (غیر مطبوعہ)
☆ آخری وحی (ترجمۂ قرآن کا تعارف)
☆ آخری وحی (ترجمۂ قرآن) اوّل، دوم ☆ انتخاب تفاسیر (۱ سے ۶)

☆ سائنس کی خودکشی ☆ آسان منطق

عربی اردو تراجم:

☆ حضرت محمد ﷺ (تھامس کارلائل) ☆ نقوش سید احمد شہیدؒ (عبدالمعید ندوی)

☆ **حجة الله البالغة**۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، اردو شرح (غیر مطبوعہ)

☆ **العقيدة والعبادة والسلوک مصنفه** مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا اردو ترجمہ ''دستورِ حیات''

☆ تاریخ دعوت وعزیمت حصّہ چہارم کا عربی ترجمہ ☆ **''الامام السرهندی''**

☆ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم، ''الامام الدهلوی''. مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

☆ کاروانِ زندگی مولانا ابوالحسن علی ندوی حصہ اوّل دوم سوم ''فی مسيرة الحياة'' ا۔۲

☆ **الامام احمد بن عرفان (مجيب الرحمن ندوی)**

☆ **الامام ولی الله الدهلوی (مجيب الرحمن ندوی)**

☆ **جوامع الكلم (شيخ احتشام الحسن كاندهلوی)**

☆ **بدائع الحكم (شيخ احتشام الحسن كاندهلوی)**

☆ **منابع الحكم (شيخ احتشام الحسن كاندهلوی)**

(۲۷) مولانا سید اسحاق حسینی ندوی

(ماہنامہ 'بانگِ درا' لکھنؤ کی مجلس مشاورت اور ماہنامہ 'رضوان' کی مجلس ادارت کے رکن)

☆ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ (مختصر رسالہ) ☆ حضرت خالد بن ولیدؓ

(۲۸) مولانا سید صہیب حسینی ندوی

(جامعہ سید احمد شہیدؒ کٹھولی ملیح آباد لکھنؤ کے مہتمم اور مدرّس فقہ وحدیث)

☆ **تفسیر سورۂ فاتحہ** (زیرِ طبع) (تعمیر حیات میں ۴ قسطوں میں مضمون شائع ہوا)

☆ **مختار تهذيب الاخلاق** علامہ سید عبدالحئی حسنیؒ کی مرتب کردہ مجموعۂ حدیث تہذیب الاخلاق کی تلخیص وانتخاب (زیرِ طبع)

(۲۹) مولانا سید بلال عبدالحیؒ حسنی ندوی (استاذ فکر اسلامی ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
(جنرل سکریٹری کل ہند پیامِ انسانیت، مدیر دارِ عرفات رائے بریلی)

☆ آسان معانی قرآن ☆ شرح مشکوۃ شریف (زیر تالیف)
☆ اسلامی عقائد قرآن وسنت کی روشنی میں ☆ اسوۂ رحمت
☆ اصلاح معاشرہ (سورہ حجرات کی روشنی میں) ☆ حدیث کی روشنی
☆ سوانح مفکر اسلام ☆ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دعوت وفکر کے اہم پہلو
☆ تذکرہ ائمہ اہل بیت کرام (غیر مطبوعہ) ☆ تذکرہ شاہ ضیاء النبیؒ (غیر مطبوعہ)
☆ حقوق رسول اللہ ﷺ ☆ قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ
☆ اطاعت رسول ﷺ ☆ غزوات رسول ﷺ
☆ تحقیق تنویر الآفاق، شرح تہذیب الاخلاق از علامہ عبدالحیؒ حسنیؒ
☆ نظرات فی الجامع الصحیح الامام بخاری مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی تقدیم وتعلیق بلال عبدالحیؒ حسنی ندوی ☆ صحاح ستہ اور ان کے مصنفین
☆ الغنا فی الاسلام مصنفہ مولانا عبدالحیؒ حسنیؒ تقدیم و تعلیق بلال عبدالحیؒ حسنی ندوی

(۳۰) مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی (معاون مدیر تعمیر حیات، لکھنؤ)
(استاد مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی)

☆ حیات عبدالباری ندویؒ ☆ تذکرہ عبدالباری بھٹکلی ندوی
☆ عائشہ بی (سوانح حیات محترمہ امۃ اللہ تسنیم ہمشیرہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ)
☆ سیرت داعی اسلام مولانا محمد عبداللہ حسنیؒ ☆ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ
☆ تاریخ اصلاح وتربیت (یعنی عہد نبوت وخلافت راشدہ)
☆ سلاسل اربعہ ☆ سوانح مولانا محمد ثانی حسنیؒ
☆ تذکرہ مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ ☆ انسانی حقوق اور اسلام (غیر مطبوعہ)
☆ فرشتہ صفت انسان (تذکرہ ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ از مولانا عبدالباری ندوی اضافہ وتحقیق محمود حسن حسنی ندوی)

☆☆☆

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی
(۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۶ء تک)

ولادت

علی میاںؒ کی ولادت بیرون شہر رائے بریلی کے معروف علاقے دائرہ شاہ علم اللہؒ میں ۶ محرم ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ھ ہوئی۔[۱] دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی (اتر پردیش سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر سئی ندی کے کنارے ایک قدیم بستی ہے ۱۰۵۰ء میں حسنی قطبی خاندان کے ایک عارف کامل شاہ علم اللہ حسنی نقشبندیؒ نے اس جگہ کو آباد کیا تھا۔ اس بستی کی خاک سے بکثرت علماء فضلاء مجاہدین اور مصلحین پیدا ہوئے۔ ہندوستان کی علمی تاریخ میں یہ علاقہ اپنی مردم خیزی کی وجہ سے ممتاز رہا ہے۔

علی میاںؒ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں خاندان کے ایک بزرگ سید عبداللہ تحصیلدار (فرزند خواجہ احمد نصیر آبادی) کے حوالے سے اپنا تاریخی نام ظہور حیدر تحریر کیا ہے جس سے سن ولادت ۱۳۳۳ھ نکلتا ہے۔ ابوالحسن علی حسنیؒ عرف عام میں علی میاںؒ کے نام سے مشہور ہیں۔

بچپن اور خاندانی ماحول

علی میاںؒ نے خودنوشت سوانح ''کاروان زندگی'' میں ولادت سے قبل اپنے گھر کا نقشہ پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گھرانے کے اقتصادی حالات کمزور تھے۔ نانہال میں زمینداری تھی اور دادیہال کی بہ نسبت خوش حالی کا دور دورہ تھا۔

---

[۱] لکھنؤ میں اثنائے گفتگو مولانا محمود حسن حسنی نے خود مجھ سے روایت کیا کہ انھیں عامر حسن ٹونکی (کراچی) نے یہ بتایا کہ جناب محمد مسلم حسنی صاحب علی میاںؒ کی تاریخ پیدائش ۶ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء بروز جمعہ بتاتے ہیں۔ محمد مسلم حسنی مولانا محمود حسن حسنی ندوی کے دادا اور علی میاںؒ کے قریبی عزیز ہیں۔ لیکن خود علی میاںؒ نے خودنوشت کاروانِ زندگی حصہ اول ص ۳۴ پر درج بالا تاریخ تحریر کی ہے۔

دین داری کے اعتبار سے خاندان پختہ تھا۔ خاندان کی خواتین میں قرآن پاک حفظ کرنے کا خاص ذوق تھا۔علی میاںؒ کے بچپن میں پانچ مستورات حافظ قرآن تھیں۔علی میاںؒ کی والدہ خاندان کی پہلی حافظ قرآن خاتون تھیں۔علی میاںؒ نے عہد طفولیت میں خاندانی بزرگوں میں صحت عقائد، فرائض کی پابندی، اسلامی اخوت و مساوات، صلہ رحمی، سادگی، ملازمین ماتحتوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ بھی دیکھا خاندانی بزرگوں کو سید احمد شہیدؒ کے خاندانی شاخ کے اعزہ کا احترام، سید صاحب کی نسبت اور محبت وعقیدت کے جذبے کے ساتھ کرتے دیکھا۔

علی میاںؒ نے دین داری کے اس ماحول میں خاندان کے قریبی عزیزوں میں مال و جائیداد پر تنازعات (جو مقاطعہ کی شکل اختیار کر چکے تھے) اور اپنے والد حکیم عبدالحئ حسنیؒ کی اصلاحی سرگرمیوں کو دیکھا تھا، اس زمانے میں مولانا عبدالحئ حسنیؒ نے ایک رسالہ خاندان والوں کے لیے ''اصلاح'' کے نام سے لکھا اور ان کی کوشش سے تنازعہ ختم ہوا۔ قریبی اعزہ میں خاندان کے نوجوان مغربی ممالک انگلستان، امریکہ جاپان اور جرمنی بغرض تعلیم گئے اور اعلیٰ ڈگریاں لے کر واپس ہوئے تھے۔لیکن علی میاںؒ کے اپنے گھر میں علمی وروحانی ماحول برقرار تھا۔لکھنؤ میں علی میاںؒ کے والد محلّہ جھاؤلال میں رہتے تھے۔ اس محلّہ میں راسخ العقیدہ لوگ رہتے تھے۔محلّہ جھاؤلال شیعہ اثرات سے دور تھا۔لکھنؤ آنے والے علماء اس محلّے کی مسجد ''مسجد نوازی'' میں ضرور آتے جو مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ کے گھر سے بہت قریب تھی۔ علماء میں سے اکثر مولانا حکیم عبدالحئ حسنیؒ سے ملنے آتے۔لکھنؤ کے شرفاء میں مولانا حکیم عبدالحئ حسنیؒ کے قریبی دوست دین دار اور علم وادب کا ذوق رکھنے والے تھے۔ خود حکیم عبدالحئ حسنیؒ خالص علمی و تصنیفی ذوق رکھتے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ناظم تھے اور مطب بھی کرتے تھے۔مطب اور ندوہ کی نظامت کے بعد تصنیف وتالیف ان کا محبوب مشغلہ تھا۔اس علمی انہماک اور تصنیفی اشغال کی وجہ سے گھر میں پُرسکون و پُروقار فضا قائم رہتی تھی۔

والدہ ماجدہ کی تربیت

علی میاںؒ صرف نو برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ۱۶ر جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ مطابق ۳ر فروری ۱۹۲۳ کو مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ کا انتقال ہو گیا۔ علی میاںؒ اپنی والدہ کے ساتھ رائے بریلی چلے گئے۔ تقریباً دو سال رائے بریلی میں گزرے، اس پورے عرصے میں آپ کی والدہ ماجدہ نے تربیت فرمائی۔ خودنوشت سوانح میں والدہ ماجدہ کے طریقہ تربیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

گھر میں کسی بڑے فرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ میری نگرانی اور اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانے میں یاد کرائیں۔ باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی وہ میری دلداری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں ایک تو نماز کے بارے میں مطلقاً تساہل نہیں برتتی تھیں میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو گیا خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اُٹھا کر نماز پڑھواتیں اور نماز پڑھے بغیر ہرگز سونے نہ دیتیں۔ اسی طرح فجر کی نماز کی وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بٹھا دیتیں۔ دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں اُن کی غیر معمولی شفقت اور محبت حارج نہ ہوتی، یہ تھی کہ اگر میں کسی خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ زیادتی کرتا یا حقارت کے ساتھ پیش آتا تو نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جڑواتیں اس میں مجھے کتنی ہی خفت اور ذلت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بڑا فائدہ پہونچا۔ ظلم اور تکبر اور غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل و تحقیر کو گناہ کبیرہ سمجھنے لگا اور اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔

(کاروانِ زندگی ج:۱، ص:۹۴)

وہ مجھے اپنے خاندان کے بعض بزرگوں اور جلیل القدر ہستیوں کے

نام اور کام سے واقف کراتی رہتیں، ان کے نام بڑی عظمت سے لیتیں اور ان کے حالات سناتیں وہ شخصیتیں عموماً ہمارے خاندان کی وہ شخصیتیں ہوتیں جن کو دنیاوی جاہ وجلال اور کوئی خاص دولت وثروت حاصل نہ تھی، مگر دینی اور علمی حیثیت سے ان کا نام اور کام بہت روشن تھا۔ وہ اس پر زور دیتیں کہ اصل عزت اور باقی رہنے والی دولت یہی دین وعلم کی دولت ہے''۔

''والدہ صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے دعاء ومناجات کا ذوق عطا فرمایا تھا جو اس زمانے کے خاص بزرگوں ہی میں دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ اپنی اولاد کو بھی دعا کی تعلیم دیتیں اور دعاء کا شوق دلاتیں، چنانچہ ہم بھائی بہنوں کو انھوں نے بعض مختصر دعائیں یاد کرا رکھی تھیں، ان میں سے ایک دعا ابھی تک یاد ہے۔ جو اس زمانے میں ورد زبان تھی۔

اللّٰھم آتنی بفضلک افضل ماتؤتی عبادک الصالحین

(اے اللہ اپنے بندوں کو جو افضل سے افضل چیز تو عطا فرماتا ہے وہ مجھے عطا فرما۔)''

(خواتین اور دین کی خدمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۷۳ تا ۷۵)

''اُنھوں نے دل کھول کر میری اصلاح وتربیت، حصولِ علم اور قبولیت وکامیابی کے لیے دعائیں مانگنے کو اپنا وظیفہ اور ورد بنالیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان سے نظم ونثر میں جو کچھ کہلوایا اس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو دو حرف آئے اور خدا کے نیک ومقبول بندوں سے قرب کی دولت اور ان کی شفقت اور دعاؤں کی نعمت حاصل ہوئی وہ اُنھیں کی مضطربانہ دعاؤں کی برکت ہے''۔

(ذکر خیر۔ ص: ۴۷۔ ۴۸)

علی میاںؒ جب کبھی بسلسلہ تعلیم اپنی والدہ سے دور رہے، خطوط کے ذریعے برابر ہدایات اور مشورے دیتیں، اپنی تمناؤں کا اظہار کرتیں، ان کے خطوط کے چند اقتباسات

پیش ہیں جوان کے دلی جذبات کے غماز اور انداز تربیت کے آئینہ دار ہیں۔

''علی تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ اگر خدا کی رضا مندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان سبھوں پر نظر کرو جنھوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گذار دی، ان کے مرتبے کیا تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب، شاہ عبدالقادرؒ صاحب، مولوی ابراہیمؒ صاحب اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمدؒ، مولوی محمد امینؒ صاحب مرحوم جن کی زندگی اور موت قابل رشک ہوئی۔ کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی۔ یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ انگریزی مرتبے والے تمھارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے۔ مگر اس مرتبے کا کوئی نہیں۔ اس وقت بہت ضرورت ہے۔ ان کو انگریزی سے کوئی انس نہ تھا۔ یہ انگریزی میں جاہل تھے۔ یہ مرتبہ کیوں حاصل ہوا۔

علی اگر میرے سوا اولادیں ہوتیں تو سب کو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے اور سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو، نیک نام اور صاحبِ اولاد کہلاؤں'' ......

''علی ایک نصیحت اور کرتی ہوں بشرطیکہ تم عمل کرو، اپنے بزرگوں کی کتابیں کام میں لاؤ احتیاط لازم رکھو، جو کتاب نہ ہو وہ عبدالعلی کی رائے سے خریدو، باقی وہی کتابیں کافی ہیں اس میں تمھاری سعادتمندی ظاہر ہوگی اور کتابیں برباد نہ ہوں گی اور بزرگوں کو خوشی ہوگی، اس سعادت مندی کی مجھے بے حد خواہش ہے کہ تم ان کتابوں کی خدمت کرو جو روپیہ خرچ کرو انھیں ضرورتوں میں یا کھاؤ''

ایک خط میں اپنی دلی آرزو کا اظہار کرتی ہیں:

''مجھے خواہش ہے کہ تم علم میں مغرب والوں سے مرتبہ میں زیادہ نکلو، علوم دین کی طرف اعتراض کا موقع نہ ملے۔ اللہ سے ہر وقت دعا ہے کہ تمھیں وہ خوبیاں حاصل ہوں کہ تمام وہ خوبیاں جن پر سب کو فخر ہے ہیچ ہو جائیں اور علوم دین کے سب شائق ہوں''

خطوط کے ذریعہ انتہائی معتدل اور متوازن انداز سے علی میاںؒ کی رہنمائی کرتی ہیں۔

''قرض کبھی نہ لو، ہو تو خرچ کرو ورنہ صبر کرو، طالب علم یوں ہی علم حاصل کرتے ہیں، تمھارے بزرگوں نے بہت کچھ مصیبتیں جھیلی ہیں، اس وقت کی تکلیف باعث فخر سمجھو، جو ضرورت ہو ہمیں لکھو۔ جس طرح ممکن ہو گا پوری کروں گی، خدا مالک ہے مگر قرض نہ کرنا یہ عادت ہلاک کرنے والی ہے اگر وفائے وعدہ کرو تو کچھ حرج نہیں۔''

اُن کی دلی تمنا تھی کہ علی میاںؒ علومِ دین میں مہارت حاصل کریں چنانچہ ایک خط میں نصیحت کرتی ہیں:

''مجھے خدا کی رحمت سے یہ امید قوی ہے کہ تم کسی کے کوئی مرتبے اور کامیابی کا اثر نہ لوگے، کیونکہ یہ عام ہے اور فنا ہونے والی ہے، قابل رشک وہ ہے جو ہزاروں میں ایک کو ملے پھر خدا کی طرف سے ہو تمھیں اس پر فخر کرنا چاہیے۔۔۔خدا سے دعا کرتی ہوں کہ تمھیں اس سے دلچسپی پیدا کرتا رہے، تمام خوبیوں پر ترجیح دیتے رہو۔ اگر تمھیں ججی یا اور کوئی مرتبہ حاصل ہوتا جو عام ہے تو مجھے اس کے ساتھ ہزار خطرے پیش نظر رہتے''۔۔۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تم سے وہ کام کرائے جو اپنے نیک اور مقبول بندوں سے کروائے ہیں اور تکبّر، غرور، اور ریا سے بچائے اور تمھاری ترقی و کامیابی قابل رشک ہو۔''

(خواتین اور دین کی خدمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۸۷تا۸۸)

مندرجہ بالا خطوط کے اقتباسات علی میاںؒ کی والدہ کے قلبی اضطراب کے گواہ

ہیں، خطوط کی سطر سطر سے ان کے خیالات اور عزائم کی بلندی، دینی تربیت کی فکر مندی نمایاں نظر آتی ہے۔

نازبردار، بڑے بھائی کی نگہداشت

علی میاںؒ کے بڑے بھائی **مولوی عبدالعلی حسنیؒ** ندوۃ اور دیوبند سے تحصیل و تکمیل علم کے بعد میڈیکل کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے اپنے والد مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ کے دوست نواب نورالحسن خاں (صاحبزادہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی) کی کوٹھی بھوپال ہاؤس میں رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد بغرض تعلیم انھوں نے علی میاںؒ کو بھی لکھنؤ بلوالیا نواب نورالحسن خاں کی کوٹھی کے رئیسانہ ماحول میں آپ کے بھائی آپ کی سخت نگرانی رکھتے، تربیت وصحبت پر بطور خاص نظر رکھتے۔ علی میاںؒ تحریر فرماتے ہیں۔

> ''اس ماحول میں بھائی صاحب دو باتوں کا خاص خیال رکھتے۔ ایک یہ کہ نماز جماعت سے پابندی سے پڑھتا ہوں۔۔۔ کالج سے واپس آکر پوچھتے۔۔۔ کچھ شبہ ہوتا تو تینوں نمازیں دوبارہ پڑھواتے۔۔۔ دوسرے یہ کہ۔۔۔ کوٹھی کے ملازموں کے پاس نہ بیٹھوں اور بے تکلف نہ ہوں نیز یہ کہ کوئی ناول وغیرہ کسی سے لے کر نہ پڑھوں اور ہمارے ذاتی کتب خانے سے خود کتابیں انتخاب کر کے دیتے اور مطالعہ کرواتے۔''

(کاروانِ زندگی، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۸۷)

بڑے بھائی کی تربیت ونگہداشت کے بارے میں علی میاںؒ کی تحریریں گھر اور خاندان کے ماحول اور بزرگوں کے اندازِ تربیت کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔ ''نبی رحمت'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ پہلا مدرسہ جہاں سب سے پہلے مصنف کتاب کا داخلہ ہوا، وہ سیرت نبوی کا مدرسہ ہے۔ اس مبارک مدرسہ میں اس کا داخلہ اس ابتدائی عمر میں ہوا جس میں بچے عام طور پر مکتب اور مدرسہ میں داخل

نہیں کیے جاتے۔ یہ اس گھرانے اور خاندانی ماحول اور فضا کا نتیجہ تھا جو وہاں قائم تھی۔ سیرت کو اس ثقافت اور کلچر کے ایک اہم اور بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی جس سے بہرہ منداور آراستہ ہونا گھر کے بچوں کے لیے اس عہد میں ضروری خیال کیا جاتا تھا۔اس میں بچے کی چھوٹی موٹی لائبریری کو بھی بڑا دخل تھا۔ جونظم ونثر دونوں طرح کی کتابوں پر مشتمل تھی اور برابر گردش میں رہتی تھی۔ اس کے بعد اس میں سب سے بڑا حصہ اس کے برادر اکبر ڈاکٹر حکیم عبدالعلی حسنیؒ کی حکیمانہ تربیت ورہنمائی کا ہے۔اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس نے بہت کم سنی اور نوعمری میں اردو میں سیرت کی وہ بہترین کتابیں پڑھ لیں جس میں عربی زبان کے بعد سیرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔

(نبی رحمت۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۹)

ڈاکٹر عبدالعلیؒ کی دور اندیشی اور رہنمائی کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''ان کی تربیت کے انداز بڑے حکیمانہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مجھ میں عربی انشاء وتحریر کا سلیقہ پیدا ہو۔اسی زمانے میں (۱۹۲۸ء میں) مولانا محمد داؤد غزنوی نے ایک رسالہ 'توحید' امرتسر سے نکالا اس میں مولوی محی الدین قصوری کا مسلسل مضمون ''تیرھویں صدی کا مجاہد اعظم'' (حضرت سید احمد شہیدؒ) نکلنا شروع ہوا۔ بھائی صاحب نے مجھے یہ مضمون عربی میں ترجمہ کے لیے دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اہلِ دعوت وعزیمت کے حالات سے دلچسپی بھی پیدا ہو اور لکھنے کا ڈھنگ بھی آئے۔ پھر مجھ سے کہا کہ ترجمہ کا کام شروع کرنے سے پہلے کامل ابن اثیر میں حالات ومحاربات کا حصہ پڑھو، تاکہ معلوم ہو کہ ان مطالب کو کس طرح ادا کیا جاتا ہے اور ان کے لیے کیا موزوں الفاظ ہیں۔ میرے لیے یہ تصنیفی زندگی کا سنگ بنیاد رہا اور اس محنت کے نتیجے میں وہ مضمون

تیار ہوا جس کو علامہ سید رشید رضا مرحوم نے ترجمہ **السیّد امام أحمد ابن عرفان الشهيد**" کے نام سے پہلے اپنے موقر رسالہ **"المنار"** مصر میں پھر علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔"

(حیات عبدالحئ حسنیؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۳۹۱)

ایسے بے شمار واقعات گواہ ہیں کہ ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ اپنے چھوٹے بھائی میں دینی ذوق ورجحان کے ساتھ علم وادب کا شوق پیدا کرنے کا شدید جذبہ رکھتے تھے۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں۔

"ان کی ہمیشہ خواہش رہتی تھی کہ مجھے اپنے خاندانی کتب خانہ سے واقفیت اور اپنے اسلاف کے حالات اور علمی یادگاروں سے مناسبت پیدا ہو۔ اس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ گھر میں جو کتابی ذخیرہ تھا اس کو دھوپ دکھانے اور مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی۔ مشہور ہے کہ "کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے" ان کتابوں کی اٹھانے رکھنے سے کتابوں کے رکھنے کا ذوق پیدا ہوگیا اور وہ وحشت جاتی رہی جو کرم خوردہ اور قلمی کتابوں سے ابتدائے عمر میں ہوا کرتی ہے۔"

ڈاکٹر عبدالعلی حسنی کی تربیت کے منفرد حکیمانہ انداز کو پیش کرتے ہوئے علی میاںؒ نے چند واقعات تحریر کیے ہیں:

"میں ۱۹۲۹ء میں ایک امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوا۔ بھائی صاحب نے مجھے بیس روپیے دیئے کہ میں اپنے اساتذہ ورفقاء کی دعوت کروں، پھر کچھ وقفہ دے کر فرمایا کہ اس دعوت سے کوئی خاص فائدہ نہیں، لوگ ایک وقت کھانا کھالیں گے اور ذائقہ مل جائے گا، اس رقم کو مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ بھجوادو کہ ثواب ملے اور حقیقی ودیرپا فائدہ ہو، چنانچہ یہی کیا گیا۔"

یہ واقعہ بھی ڈاکٹر صاحب کے مزاج کے اعلیٰ اقدار اور تربیت کے انداز کو سمجھنے

کے لیے کافی ہے:

''لکھنؤ میں اپنے محلّہ کے قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے جو طبی سرٹیفکیٹ دینے میں فراخ دل اور غیر محتاط تھے، ایک دن ان پر تنقید ہو رہی تھی (غالبًا ان کا انتقال ہو چکا تھا) میں نے بھی اس موضوع سے دلچسپی لی اور ان کے اس طرز عمل پر تنقید کرنے لگا، بھائی صاحب نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ تم بچپن میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گئے تھے، انھوں نے بڑی ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ تمہارا علاج کیا تم کو اس کا شکر گذار ہونا چاہیے اور ان کے حق میں کلمہ خیر کہنا چاہیے، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔''

(حیات عبدالحیؒ۔ ص:۳۹۱-۳۹۲)

تربیت ونگہداشت کے سلسلے میں مذکورہ بالا تمام واقعات سے علی میاںؒ کے بزرگوں کی فراست، دوراندیشی، فکرمندی، ذہانت اور باریک بینی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔

بچپن میں گھرانے کا علمی ماحول، افراد خاندان کا روحانی و دینی ذوق، علی میاںؒ پر اثر انداز ہونا فطری تھا۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ان کی جس انداز سے تربیت کی گئی اس کا اندازہ بچپن کے مشاغل سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

''ہم بھائی بہنوں کو جو تھوڑے پیسے دست خرچ کے لیے ملتے تھے یا خاندان کے کوئی بزرگ جاتے ہوئے دے جاتے تھے اس کا ایک ہی محبوب مصرف تھا کہ اس سے کوئی کتاب خرید لی جائے۔''

(کاروان زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ج: اوّل، ص:۵۷)

علی میاںؒ بہنوں کی فرمائش پر صدیق بک ڈپو سے سیرت کی کتابیں خرید کر لاتے تھے۔ کتابوں کے خریدنے اور پڑھنے کا شوق بہت کم عمری سے پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ اپنے نامور باپ مولانا حکیم عبدالحیؒ حسنیؒ کی بے کار کتابوں سے ایک

لائبریری کی بنیاد اور اس پر کتب خانہ ابوالحسن علی کا بورڈ لگانا، کیمسٹ کی دوکان سے دواؤں کی فہرست کو کتاب سمجھ کر خوش خوش گھر لانا اور اپنی لائبریری کی زینت بنانا، سیرت کا جلسہ کرنا۔ یہ تمام واقعات انتہائی کم عمری میں ان کے رجحان، خاندان کے دینی، علمی، تصنیفی ماحول واثرات کا عکس جمیل ہیں۔

۱۹۲۵ء میں مولانا حکیم عبدالعلی حسنیؒ نے ایم بی بی ایس کی سند حاصل کرلی اور گوئن روڈ پر مطب کا آغاز کیا علی میاںؒ کو اس زمانے میں ہاکی کھیلنے کا شوق ہوا، کلب کی آمدورفت اور کھیل کود کا یہ شوق علمی ادبی شوق کے بڑھنے کے ساتھ ختم ہوگیا۔ رائے بریلی میں ماموں زاد بھائیوں کے شعری ذوق سے متاثر ہوکر طبیعت شعرگوئی کی طرف آمادہ ہوئی جس کو ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ نے سختی سے منع کیا اور مطالعہ کتب اور مضمون نویسی کی طرف متوجہ کیا۔ علی میاںؒ کے ماموں حافظ عبیداللہ صاحبؒ اور آپ کے پھوپا سید طلحہ حسنیؒ اور پھوپی نے بھی آپ کی علمی صلاحیتوں کے فروغ، ذہنی تربیت، تشکیل، ذوق آفرینی میں اہم رول ادا کیا ہے خاص طور سے پھوپا سید طلحہ حسنیؒ سے آپ نے بہت استفادہ کیا اور ان کی علمی صحبتوں میں شریک رہے۔

رائے بریلی، ہنسوہ اور لکھنؤ کے روحانی، علمی اور تصنیفی ماحول میں علی میاںؒ کی سیرت وشخصیت کی تعمیر ہوئی۔ ان کی ذاتی سعادتوں اور فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں خاندان کے افراد اور اساتذہ کا حصّہ برابر ہے۔ بلاشبہ ان کے مختلف اوصاف وکمالات، مزاجی خصوصیات کی نشوونما میں خاندان کے علمی وروحانی ماحول اور ان کے خاندان کے بزرگوں اور اساتذہ کی خصوصی توجہ بہت مبارک اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

تعلیم کا آغاز:

علی میاںؒ کی تعلیم کی ابتدا قرآن پاک سے ہوئی، تسمیہ خوانی رائے بریلی میں آپ کے چچا عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے کروائی۔ لکھنؤ میں آپ کے محلّہ میں ایک مسجد تھی جس کا نام ''مسجد نوازی'' تھا۔ قیام لکھنؤ کے دوران آپ مسجد کے مکتب میں حافظ محمد

سعید صاحبؒ سے قرآن پاک پڑھتے، اسی مکتب میں آپ کا قرآن پاک ختم ہوا۔

اس کے بعد عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے مولوی اسماعیلؒ صاحب کی سفینۂ اردو اور مولوی محمود علی صاحب سے انجمن حمایت اسلام کی فارسی کی پہلی اور دوسری کتب پڑھیں، تختی و کاغذ پر خوش خطی کی مشق بھی انھیں کی زیر نگرانی کرتے رہے۔ حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ کی تصنیف کردہ کتب نور الایمان اور تعلیم الاسلام بھی پڑھیں۔ خاندان میں فارسی تعلیم کا رواج عام تھا چنانچہ سید اسماعیلؒ صاحب سے بوستاں پڑھی۔ اس زمانے میں ماسٹر قمر الزماں صاحب سے ریاضی اور عبارت نویسی کی مشق کی۔

فروری ۱۹۲۳ء میں والد کی رحلت کے بعد والدہ اور بہنوں کے ساتھ رائے بریلی منتقل ہو گئے۔ آپ کی والدہ نے آپ کی نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت پر خاص توجہ دی۔ آپ کی والدہ نے قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتیں یاد کروائیں، تمام شفقتوں اور ناز برداریوں کے ساتھ نماز اور تلاوت کلام پاک کی پابندی کا اہتمام، دل آزاری تذلیل ظلم و تکبر سے محفوظ رہنے کی تلقین کی جب علی میاںؒ بغرض تعلیم گھر سے دور گئے تو خطوط کے ذریعہ ضروری ہدایات و مشورے دیے۔ خاندانی کتب سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔ بزرگان دین، علماء اور اسلاف کے دینی کارناموں پر نگاہ رکھ کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کی۔

اسی زمانے میں آپ کے بڑے بھائی مولانا حکیم سید عبدالعلی حسنیؒ لکھنؤ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے اور ان کا قیام لکھنؤ میں تھا، اب علی میاںؒ بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ تھے، جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا از سر نو آغاز ہوا۔ فارسی کے ساتھ عربی اور انگریزی سیکھی۔ ۱۹۲۴ء میں عربی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ شیخ خلیل عربؒ صاحب سے ان کے خانگی مدرسہ میں عربی پڑھنا شروع کی۔ عرب صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں استاد تھے۔ اپنے اجتہادی نصاب کے ذریعہ طلباء میں عربی زبان اور ادب کا ذوق پیدا کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ علی میاںؒ نے اس اجتہادی نصاب میں شامل کتب کا مطالعہ کیا۔

جب کبھی رائے بریلی آتے تو وہاں عربی تعلیم کا سلسلہ چچا عزیز الرحمٰن اور پھوپھا سید محمد طلحہ حسنیؒ کے پاس جاری رہتا عربی صرف ونحو انھوں نے اپنے پھوپا سید محمد طلحہ حسنیؒ سے پڑھی جو اس فن میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں آپ اپنے بھائی صاحب اور شیخ خلیل عربؒ صاحب کے مشورے سے لکھنؤ یونیورسٹی کے درجہ فاضل ادب میں داخل ہوئے۔ امتحان میں ناکامی کے سبب اگلے سال دوبارہ امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ فاضل ادب کی سند یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد (منعقدہ دسمبر ۱۹۲۹ء) میں سر مالکم ہیلی نے دی۔

۱۹۲۸ء میں مولانا شبلی جیراجپوریؒ سے جو دارالعلوم ندوہ میں استاد تھے۔ فقہ کے مسائل میں خصوصی درک حاصل کیا۔ جون ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم ندوہ کے مشہور استاد حدیث مولانا حیدر حسنؒ خاں ٹونکی کے درس حدیث کے باقاعدہ طالب علم بنے۔ ایک مدت تک مولانا کے کمرے میں جو دارالحدیث تھا قیام کیا۔ صحیحین، ابوداؤد، ترمذی حرف بہ حرف پڑھیں، بیضاوی کا کچھ حصہ اور منطق کے کچھ اسباق بھی مولانا نے اپنے شوق سے پڑھائے۔ شیخ نے بطور خاص سند حدیث اپنے دست مبارک سے لکھ کر دی۔ راقم السطور کے استفسار پر علی میاںؒ نے تحریر فرمایا کہ یہ سند حدیث دست بردزمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی۔

فاضل ادب میں نمایاں کامیابی کے بعد علی میاںؒ یونیورسٹی کے گولڈ میڈل نہیں مل سکا۔ تعلیمی وظیفہ کے لیے یونیورسٹی کے کسی شعبہ میں داخلہ لازم تھا۔ علی میاںؒ نے درجہ فاضل حدیث میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں فاضل حدیث کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

علی میاںؒ کے برادرِ اکبر ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ نہایت دور بین، وسیع النظر اور بلند علمی ذوق کے مالک تھے، عالمِ اسلام کے حالات سے باخبر رہتے تھے اور اس کے لیے عربی اخبارات منگواتے، اُن کا مطالعہ کرتے۔ علی میاںؒ سے بھی اُن رسائل کا

مطالعہ کرواتے۔ ڈاکٹر صاحب اُن کی رہنمائی کرتے، جدید تعبیرات اور اصطلاحات کی تشریح فرماتے۔ علی میاںؒ اپنی خودنوشت ''کاروانِ زندگی'' میں لکھتے ہیں کہ میں رفتہ رفتہ اُن (اخبارات) کو بے تکلف پڑھنے لگا اور مجھے اس سے انشاء وتحریر میں بہت مدد ملی کہ اخبارات میں تنوع بھی ہوتا ہے اور تکرار بھی۔

(کاروانِ زندگی حصہ اوّل۔ ص:۱۲۴)

۱۹۳۰ء میں عربی زبان وادب کے باکمال استاد شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی کو درس وتدریس کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدعو کیا گیا۔ علی میاںؒ کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ دارالعلوم کے نائب ناظم تھے۔ شیخ خلیل عربؒ صاحب اور بھائی صاحب کے مشورے سے علی میاںؒ نے شیخ الہلالی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔

عربی زبان کا شوق سابقہ اساتذہ کی تعلیم سے روبہ ترقی تھا، شیخ کی توجہ اور فیض صحبت نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ جدید عربی ادب اور ثقافت سے واقفیت کے ساتھ عربی زبان میں بے تکلف لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کو فروغ ملا چنانچہ اسی زمانے میں مولوی محی الدین قصوری کا مضمون ''ہندوستان کا مجدد اعظم'' رسالہ توحید امرتسر میں شائع ہوا بڑے بھائی صاحب کے مشورے سے علی میاںؒ نے اس کا عربی ترجمہ کیا۔ "السید احمد بن عرفان شهيد" عنوان رکھا۔ اپنے استاد شیخ تقی الدین الہلالی کو بغرض اصلاح پیش کیا۔ انھوں نے برائے نام تصحیح کے بعد علامہ رشید رضا ایڈیٹر ''المنار'' کے پاس مصر بھیج دیا۔ علامہ رشید رضا نے نوجوان اہل قلم کے اس مضمون کو بہت پسند کیا۔ عربی ترجمہ نگاری کا پہلا کامیاب تجربہ مذکورہ مضمون نہ صرف ''المنار'' میں شائع ہوا بلکہ ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء مصر سے رسالے کی شکل میں بھی شائع ہوا۔

عربی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ ابتداء میں خلیل الدین ہنسوی، محمد سمیع صدیقی اور سید احمد سعید صاحبان سے انگریزی پڑھی۔ میٹرک کرنے کے خیال سے لکھنؤ یونیورسٹی کے انگریزی کے استاد محمد فاروقی صاحب سے انگریزی پڑھنا شروع کی اور اچھی استعداد پیدا کر لی۔ لیکن والدہ صاحبہ نے اس کی سخت مخالفت

کی نیز دینی علوم پر پوری توجہ صرف کرنے اور کامل عبور حاصل کرنے کی تلقین کی، چنانچہ انگریزی تعلیم کا سلسلہ اور میٹرک کا خیال ترک کردیا گیا۔

اردو تعلیم اور مضمون نگاری:

علی میاںؒ تعلیم کے ابتدائی دور میں اردو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے۔ اردو زبان وادب کی چند اہم کتابوں کا انھوں نے کئی بار بغور مطالبہ کیا جس سے ان کی فکری نشوونما پر گہرا اثر پڑا۔ ان کتابوں میں مولانا شبلی نعمانی کی ''الفاروق''، مولانا محمد حسین آزاد کی ''نیرنگِ خیال'' اور ''آبِ حیات''، مولانا حکیم عبدالحیؒ حسنی کی ''گلِ رعنا'' قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حالی، شبلی، نذیر احمد سرشار جیسے باکمال ادیبوں کی تحریروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ''الہلال'' کے پرانے فائلوں کی ورق گردانی بھی کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی پرزور پر وقار تحریر نے انھیں بہت متاثر کیا۔ علی میاںؒ کو عربی اور اردو زبان پر یکساں عالمانہ، ادیبانہ قدرت حاصل ہوگئی تھی۔ اپنی اس خوش بختی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانے میں میں نے اردو زبان وادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں، دین کے جن داعیوں اور علماء کو آغازِ عمر میں اپنے ملک کی زبان وادب کے مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو دین کی مؤثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم اور تعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دینی مقاصد کو ذہن نشین کرنے میں دقت پیش آتی ہے اور اُن کی انشاء وتحریر میں وہ طاقت اور دلآویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے۔

ا (کاروانِ زندگی حصہ اوّل۔ ص: ۹۳۔۹۴)

علی میاںؒ نے ابتداء میں ''نیرنگ خیال'' اور ''آب حیات'' کے طرز پر

مضمون لکھنے کی کوشش کی، اس کے بعد اپنے والد کی تصنیف کردہ ''یادِ ایام'' کے سنجیدہ اور شگفتہ طرزِ تحریر نے متاثر کیا تو اسی انداز میں ''اندلس'' کے عنوان سے پہلا اردو مضمون قلمبند کیا۔

تحصیل علم کا سلسلہ:

شیخ احمد علیؒ صاحب لاہوری کے درسِ حدیث میں شرکت کے لیے علی میاںؒ تین بار لاہور گئے۔ پہلی بار ۱۹۳۰ء میں تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے سورۃ بقرۃ کا صرف ابتدائی حصہ پڑھ سکے اور وطن واپس آگئے۔ دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں لاہور گئے اور شیخ کے درس حجۃ اللہ البالغہ میں شریک ہوئے۔ درس کے اختتام پر امتحان دیا، کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں لاہور سے واپسی پر شیخ حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوئے اور بخاری و ترمذی کے درس میں شریک ہوئے۔ اس زمانے میں مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے "شرح نقایہ" بھی پڑھی۔

۱۹۳۳ء میں شیخ احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے طرزِ تفسیر پر قرآن پاک پڑھا۔ درس کے باقاعدہ تکمیل کے بعد خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ نے طلباء کا امتحان لیا جس میں علی میاںؒ نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ مدرسہ کے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ مارچ ۱۹۳۳ء مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنے دستِ مبارک سے سند عطا فرمائی۔ اس سند کا عربی مضمون علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا تیار کردہ ہے اور اس پر علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کے دستخط ہیں۔ سند کا عکس پیش کیا جارہا ہے۔

(کاروانِ زندگی۔ حصہ اوّل)

يا عليم

سند تفسير القرآن العزيز من مدرسة قاسم العلوم المتعلقة بجمعية خدام الدين

الحمد لله الذي خلق الانسان وعلمه البيان • ثم جعله خليفة في الارض • حاكمًا على الطول والعرض •
والذي وضع الميزان وانزل الفرقان ليحيى من حيّ عن بيّنة • ويهلك من هلك عن بيّنة •
وليفرق بين اولياء الرحمة واولياء الخذلان • الذين عدلوا عن سنّة الله وتنكبوا عن الفرض •
والصلوة والسلام على خير خلقه وخيرة خليفته • عبده ورسوله الهادي لطريقته •
نبيّ الانبياء وخطيبهم وخاتمهم وعاقبهم وحاشرهم • الذي بيده لواء الحمد ومقامه المحمود
كان اوّل النبيين وبُعث في آخرهم • متممًا لمكارم الاخلاق ومحاسن الافعال • ومختتمًا
لمظاهر الجمال والكمال • وعلى آله واصحابه كلما ذكره الذاكرون صلوةً دائمةً الى اليوم الموعود •
امّا بعد فانّ من آيات الله البيّنات في بسيط الارض كتابه المنير • ووحيه البشير النذير •
هو قرآنه المجيد • وفرقانه الحميد • الذي لا تنقضي عجائبه • ولا تنفد غرائبه • الا وهو واسطة بينه
وبين مخلوقه • ورابطة الى حضرته وحظيرة قدسه • وهو انفاسه الرحمانية من غيبه وانسه • و
كان خير الناس بنصّ خير الناس من علمه وتعلمه وخدمه • وكان من منن الله ان وفق اخانا
في دين الله المولوي على ابو الحسن ابن الفاضل السيد الحي الرائے بريلوي لاخذ ترجمته وتفسيره • في
جمعية خدام الدين التي نشأت في بلدة لاهور لخدمته • وظهرت بركاته • وبهرت ثمراته • و
وقع العزم الآن على اعطاء السند والاسناد لمن وفق لتحصيل تفسير القرآن من خيار العباد •
ووجدناه اهلاً لذلك وخليقًا له • نشرًا للمعارف وبسطًا للعوارف • ونوصيه بتقوى الله
في السرّ والعلانية • وان ينصح له وللدين ولعامّة المسلمين وللامة والملة الحنيفية • و
ان يدعو لنا في اوقاته الصالحة • والله الموفق وبه نستعين •

امضاء اساتذة العلماء
محمد انور شاه ...
شبير احمد عثمانی ...
شيخ التفسير ...
صدر مدرس ...

مؤرخه ۱۵/ ذی قعده ۱۳۵۱ھ

امضاء اساتذة العلماء
شيخ الحديث ...
احقر الانام احمد علی ...
امیر انجمن خدام الدین لاہور

"سند تفسیر" مدرسہ قاسم العلوم متعلقہ انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور،
۱۵/ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ

علی میاںؒ روحانی مراکز میں

علی میاںؒ نے طالب علمی کے زمانے میں ہی متعدد قوی النسبت عالی نسب شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوکر اکتساب فیض کیا۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے اخلاص و للّٰہیت اور پاکیزہ نفسی سے متاثر ہوکر بیعت وارادت کا شوق ظاہر کیا۔ احمد علی لاہوریؒ نے انھیں اپنے شیخ غلام محمد دین پوریؒ کے پاس بھیجا۔ علی میاںؒ ایک تعارفی خط کے ساتھ دین پور گئے اور شیخ سے بیعت ہوئے۔

مولانا احمد علی لاہوریؒ نے سلسلہ قادریہ کی اجازت مرحمت فرمائی شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ نے چاروں سلسلوں (قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ) اور سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ (محمدیہ) کی اجازت دی۔

ایمان و یقین اخلاقی و روحانی تربیت، اصلاح باطن کے سرچشموں سے سیراب ہونے کی فکرو جستجو انھیں کئی روحانی مراکز اور خانقاہوں کی طرف لے گئی۔ چنانچہ ان کی خودنوشت سوانح حیات کاروانِ زندگی میں اس سلسلہ میں مولانا وصی اللہ فتح پوریؒ حاجی عبدالغفورؒ جودھپوری، شاہ محمد یعقوبؒ مجددی بھوپالی، شاہ عبدالشکورؒ فاروقی لکھنوی اور مولانا محمد احمدؒ پھول پوری کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ علی میاںؒ نے ان بزرگوں کی خانقاہوں میں متعدد بار حاضری دے کر اکتساب فیض کیا۔

(کاروان زندگی حصہ اوّل۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۳۲۵ تا ۳۵۴)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس و تدریس اور علمی مشاغل

☆ علی میاںؒ کی باضابطہ تعلیم کی تکمیل ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور اگست ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بہ حیثیت استاد تفسیر وادب تقرر عمل میں آیا۔

☆ دارالعلوم میں درس و تدریس کے آغاز سے ہی علی میاںؒ طلباء کے اندر قرآن فہمی اور عربی زبان وادب سے گہرا شغف پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۳۹ء تک اس بات کا شدید احساس ہونے لگا کہ طلباء میں قرآنی تعلیمات اور اس کے

پیام وروح کا فقدان ہے۔ دارالعلوم سے وابستگی کے اس ابتدائی دور میں انھوں نے ایسے مضامین سپردِ قلم کیے جو فہم قرآن میں معاون ہوں، طلباء میں فہم قرآن کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔ مضامین کا مجموعہ ۱۹۸۰ء میں ''مطالعہ قرآن اوراس کے اصول ومبادی'' کے نام سے شائع ہوا۔

☆ اس کے علاوہ اپنے ساتھی اساتذہ کے تعاون سے دارالعلوم کے طلباء میں عربی زبان وادب کا والہانہ ذوق وشوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ شیخ تقی الدین الہلالی کے چھوٹے بھائی استاد محمد العربی کے ساتھ بطریق راست Direct Method عربی زبان کی تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا۔

☆ دارالعلوم میں قرآن پاک اور عربی ادب کا درس دینے کے ساتھ دیگر علمی و دعوتی مشاغل کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۳۱ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وفد کے ساتھ شریک ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں دارالعلوم کے تعارف اور مالی بحران سے چھٹکارہ دلانے کے لیے دارالعلوم کے وفد کے ساتھ بھوپال، ناگپور اور مدراس گئے۔ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا علی میاںؒ دارالعلوم ندوۃ کے نمائندہ وفد کے ساتھ اجلاس میں شریک ہوئے۔

فکرونظر میں وسعت (عالمِ اسلام کے مسائل اورتحریکات سے دلچسپی کا آغاز)

☆ زمانۂ طالب علمی میں علی میاںؒ کا علمی مطالعہ حدیث وتفسیر تک محدود تھا اور درس وتدریس سے وابستگی کے بعد بھی ان کی سرگرمیاں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندر محدود تھیں ۳۸-۱۹۳۷ء میں انھوں نے ڈاکٹر احمد امین کی 'فجر الاسلام'، 'ضحیٰ الاسلام' اور 'ظهر الاسلام' زعماء الاصلاح في العصر الحديث، امیر شکیب ارسلان کی حاضر العالم الاسلامي، عبدالرحمٰن الکواکبی کی 'مؤتمر امّ القریٰ' اور الفتح کے ولولہ انگیز مضامین پڑھے۔ اس کے بعد جہاں ان کی فکرنظر میں وسعت پیدا

ہوئی، عالم اسلام اس کے مسائل اور تحریکات سے دلچسپی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی، سیاسی تحریکات اور سیاسیات پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ کیا۔ مغربی تہذیب اور نظام حیات کو سمجھنے کے لیے مغربی تاریخ کی کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔ اس زمانے میں نو مسلم فاضل محمد اسد کی معرکۃ الآراء کتاب۔ Islam at the Cross roads کا مطالعہ کیا۔ علی میاںؒ اس کتاب کے طرز تحریر، پر اثر اسلوب نیز مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے تقابل اور سنت کی حمایت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کتابوں کے علاوہ گاندھی جی کی ''تلاش حق'' جواہر لال نہرو کی سرگذشت ''میری کہانی'' اور طفیل احمد کی ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' بھی زیر مطالعہ رہیں۔

☆ ۱۹۴۰ء میں سید سلیمان ندویؒ کی تحریک و تجویز پر تیسری مرتبہ رسالۃ الندوۃ کا اجراء عمل میں آیا۔ علی میاںؒ اور مولانا عبد السلام قدوائی ندویؒ اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ اس سے قبل ۱۹۰۴ء میں شروع ہو کر ۱۹۱۲ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۱۴ء میں شروع ہو کر ۱۹۱۶ء میں بند ہو چکا تھا۔ اس مرتبہ بھی خریداروں کی کمی اور اشاعت کی دشواریوں کے سبب سے ۱۹۴۲ء میں اس کی اشاعت روک دی گئی۔

☆ ۱۹۴۲ء سے علی میاںؒ کے فکر ورجحان میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی وہ دعوتان متنافسان اور المدو الجزر فی الاسلام کی شکل میں سامنے آئی۔ اول الذکر مضمون اس سلسلہ میں منظر عام پر آنے والا پہلا مضمون تھا۔ اسی کے بعد ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین لکھنا شروع کی۔

☆ علی میاںؒ نے درس و تدریس کے دوران بانیانِ ندوۃ العلماء کے تخیلات میں رنگ بھرنے کی بھرپور سعی کی اور دار العلوم کے تعلیمی نقطۂ نظر اور مقاصد کے مطابق نصابِ تعلیم کی تشنگی کو دور کرنے کا کام انجام دیا۔ مختارات من ادب العربی حصہ اوّل، دوم قصص النبیین حصہ اوّل، دوم، سوم، چہارم اور القراۃ الراشدہ حصہ اوّل، دوم اس سلسلہ کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ یہ تینوں

کتابیں زمانہ شناسی اور عصری تقاضوں کے ساتھ تعلیمی اور ثقافتی میدان میں فاضل مصنف کا ایک اہم کارنامہ ہیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے ہی نہیں عربی زبان وادب کے قدردانوں کے لیے نایاب تحفے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دینی تحریکات سے وابستگی اور عملی جدوجہد

☆ دارالعلوم میں درس و تدریس کے دوران علی میاںؒ کو طلبائے ندوہ کی خارجی مشغولیت کی فکر دامن گیر ہوئی، کسی صالح تحریک صحت مند لٹریچر کی تلاش تھی۔ رسالہ ''ترجمان'' امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ادارت میں لاہور سے نکل رہا تھا، اس میں شائع ہونے والے مضامین نے علی میاںؒ کے قلب اور دماغ کو متاثر کیا، رسالے میں اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی پاکر مولانا مودودیؒ سے سلسلہ مراسلت قائم کیا۔ ۱۹۴۰ء میں مولانا مودودیؒ سے پہلی ملاقات ہوئی اور ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن بن گئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کو جماعت اسلامی کے لٹریچر سے متعارف کیا۔ کم وبیش تین سال تک شہر لکھنؤ میں جماعت اسلامی کے ذمہ دار بنے رہے۔ جماعت اسلامی سے تعلق کے دوران جماعت کے طرز فکر کے بارے میں چند اشکالات پیدا ہوئے اور ان اشکالات کے خاطر خواہ حل نہ ملنے کے سبب یہ اشکالات اختلافات میں تبدیل ہوگئے۔ بالآخر انھوں نے جماعت اسلامی سے خاموشی کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لی۔ علی میاںؒ کسی مناسب فعال دینی تحریک کی تلاش کر رہے تھے۔

☆ ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ایک مضمون ''ایک اہم دینی دعوت'' (شائع کردہ ترجمان القرآن ۱۳۵۸ھ) کے مطالعہ کے بعد علی میاںؒ نے میوات جانے کا ارادہ کیا۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں اپنے دو دوستوں مولانا منظور نعمانیؒ اور مولانا عبدالواحدؒ کے ساتھ دینی مراکز کی تلاش اور مشاہدے کے لیے نکلے۔ مختلف دینی مراکز کا مشاہدہ

کیا۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں نظام الدین (دہلی) کے تبلیغی مرکز میں مولانا الیاسؒ سے ملاقات ہوئی۔ علی میاںؒ مولانا الیاسؒ کے طریق دعوت و تبلیغ سے بہت متاثر ہوئے۔ لکھنؤ واپس آکر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کی ایک جماعت کے ساتھ قرب و جوار میں دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس تحریک کے بارے میں مختلف نوعیت کے مشورے مولانا الیاسؒ سے خطوط کے ذریعہ بھی کرتے رہے اور ذاتی ملاقاتوں کے دوران بھی تبادلہ خیال کیا۔

اس کے بعد مولانا الیاسؒ کی دینی دعوت کی تحریک سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے۔ علی میاںؒ کی رہبری میں ندوۃ کے طلباء تبلیغ دین کا کام لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں کرتے رہے۔ مولانا الیاسؒ کی دینی دعوتی تحریک سے وابستگی دارالعلوم کے طلبہ کے لیے مدرسہ سے باہر کسی دینی مصروفیت اور مذہبی انہماک کے لیے کی گئی تھی۔ اس سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا اور علی میاںؒ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ علی میاںؒ کو اصلاح و تبلیغ کے کام سے طبعی مناسبت اور خاص دلچسپی تھی، اس کام کے لیے انھوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے کے سفر کیے۔

☆ مولانا الیاسؒ آپ سے بہت شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ بارہا علی میاںؒ کو مولانا الیاسؒ کی ترجمانی کا بھی موقع ملا۔ مرکز دعوت و تبلیغ واقع نظام الدین دہلی میں شیخ مولانا محمد زکریاؒ سہارنپوری سے علی میاںؒ کی ملاقات ہوئی۔ حضرت شیخ سے تعلق اور روحانی علمی اکتساب فیض کا سلسلہ حضرت شیخؒ کی وفات تک برابر قائم رہا۔ مولانا الیاسؒ کے زیر ہدایت دعوت و تبلیغ کے کاموں میں انہماک برابر بڑھتا رہا۔ چنانچہ علی میاںؒ نے ۱۹۴۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ملازمت بھی ترک کر دی۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پورے ذوق و شوق سے دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کا سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ اسی دوران علی میاںؒ نے تبلیغی و اصلاحی تحریک سے متعلق ایک رسالہ ۱۹۴۴ء میں یعنی مولانا الیاسؒ کی حیات میں یہ رسالہ "الفرقان" لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ رسالہ مولانا الیاسؒ کی ہدایت و ایماء پر لکھا گیا

تھا۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان مشہور تصنیف 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' کی تالیف میں مصروف رہے۔ ۱۹۴۷ء کے پہلے سفر حج کے موقع پر کتاب کا عربی مسودہ ساتھ تھا جسے علمائے حرم نے بنظر استحسان دیکھا اور ہمت افزائی کی جب کہ کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا تھا۔

اسی زمانے میں علی میاںؒ نے ادارہ تعلیمات الاسلامیہ لکھنؤ میں ہر ہفتہ حدیث کا درس بھی دیا۔ یہ ادارہ لکھنؤ کے چند بااثر افراد نے قائم کیا تھا۔ جس میں لکھنؤ کے تعلیم یافتہ افراد کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ اس ادارے کی طرف سے ایک رسالہ ''تعمیر'' کے نام سے جاری ہوا۔ اس کے مدیران میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور مولانا علی میاںؒ تھے۔ اس رسالے کے ذریعہ مسلمانوں کی دینی ناواقفیت کو دور کرنے اور ان میں دینی اور سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، یہ رسالہ ۱۹۵۱ء تک جاری رہا۔

☆☆☆

''میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی اُس کو قدیم و جدید مشرقی و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں۔ میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں جو خدا کی وہ دین ہے جو کسی ملک و قوم کی مِلک نہیں اور نہ ہونی چاہیے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے وہ وحدت سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے اور اُس کو پانے کی خوشی ہے''۔

(مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ ملّت کے سفیر کبیر

ملک اور بیرونِ ملک اسفار اور مشاغل (۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۹ء تک)

(سفرِ آخرت اور عادات و معمولات)

علمی، دینی، اصلاحی، دعوتی مزاج اور تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والے ملّت کے سفیر کبیر علی میاںؒ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں ہندوستان اور بیرونِ ہند کئی سفر کیے، اُن کے سفروں کا مقصد دنیا کے مسلمانوں کی دینی ناواقفیت دور کرنا، انسانیت کی بے لوث خدمت کرنا اور اسلام کی دعوت و تبلیغ ہوتا تھا۔ مکۃ المکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض، طائف، مصر، شام، دمشق، مغرب اقصیٰ (مراکش) امارات عربیہ، کویت، عراق، ایران، افغانستان، ملیشیا، انڈونیشیا، ترکی، بنگلہ دیش، پاکستان، امریکہ، برطانیہ وغیرہ وہ ممالک ہیں جہاں انھوں نے اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا پیغام سنایا۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعلیم و تربیت، دعوت و اصلاح اور ادبِ اسلامی کا پیغام لے کر گئے بلا تفریق مذہب و ملّت انسانیت کو محبت اور اخوت کا درس دیا، دینی تعلیم کو عام کرنے کی فکر رکھتے تھے۔ قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبوی پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔ ملک و بیرونِ ملک علمی تحریکات اور اداروں سے وابستگی ان کی علمی اور عملی جدوجہد کی مبارک داستان ہے[1]

☆ علی میاںؒ نے بیرونِ ہند پہلا سفر ۱۹۴۷ء میں کیا۔ مولانا الیاسؒ کے ایماء پر وہ حج اور دعوت و تبلیغ کی نیت سے حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ ان کے دعوتی رسالے "الیٰ ممثل البلاد الاسلامیہ" نے اس سفر میں اہم رول ادا کیا۔ مکہ معظّمہ قیام کے دوران شاہ سعود کے معتمد و مشیر خاص سے مراسم پیدا

---

[1] سفروں کی تفصیلات اور مشاغل باعتبار سن عیسوی کاروانِ زندگی ج: اوّل تا ہفتم سے ماخوذ ہیں۔

ہوئے تو علی میاںؒ نے شاہ سعود کے نام ایک خط تحریر کیا، جس میں عرب معاشرے کی رفتار اور طریق کار پر تنقید کرتے ہوئے خطرات کی نشاندہی کی اور عرب مملکت سے مسلمانوں کے توقعات کا ذکر کیا۔ یہ رسالہ "بین الجبایۃ والھدایۃ" کے عنوان سے شائع ہوا بعد میں مجموعہ "الی الاسلام من جدید" میں شامل کر لیا گیا۔ اس سفرِ حج میں علی میاںؒ کی والدہ، شریکِ حیات، چھوٹی بہن اور بھانجے مولانا محمد ثانی حسنیؒ شریکِ سفر تھے۔ "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" سفرِ حج کا سفرنامہ ہے۔

☆ ۱۹۵۰ء میں علی میاںؒ نے مولانا عبدالقادر رائے پوری کے ساتھ حج بدل کی نیت سے حجاز کا دوسرا سفر کیا۔ حجاز اور نجد کے علماء، ادباء، مفکرین سے رسائل و خطوط کے ذریعہ رابطہ قائم تھا۔ اس سفر میں حجازی ادباء اور اہل قلم سے ملنے کے زیادہ مواقع میسر آئے اور سعودی ریڈیو سے 'بین العالم والجزیرۃ العرب' کے عنوان سے دو تقریریں بھی ہوئیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مصری رسائل آتے تھے جو علی میاںؒ کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے وہ عالم عربی میں مصر کی علمی ادبی مرکزیت و قیادت سے خوب واقف تھے۔ ۱۹۵۱ء میں حجاز سے مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا۔ مولوی معین اللہ ندوی اور مولوی عبدالرشید ندوی شریکِ سفر تھے۔ یہ ایک علمی، ادبی اور دعوتی سفر تھا اس کے بعد تقریباً تین برس تک بیرونِ ملک کوئی سفر نہیں ہوا، آپ ہندوستان میں ہی علمی ادبی کاموں میں منہمک رہے۔

☆ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے دو سفر کیے اوّل شیخ عبدالقادر رائے پوری سے ملاقات کے لیے اور دوسرا تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ کے لیے کیا گیا۔ اس زمانے میں علی میاںؒ نے محسوس کیا کہ مسلمان نوجوان تعلیم یافتہ طبقوں اور دینی جذبہ رکھنے والے سنجیدہ حلقوں میں یہ بات سرایت کر چکی ہے کہ اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید میں تسلسل نہیں بلکہ طویل وقفے ہیں جو صدیوں پر محیط ہیں۔ علی میاںؒ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اسلام کی تاریخ اصلاح اور تجدید کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ ۱۹۵۵ء میں "رجال الفکر والدعوۃ الی الاسلام" کی شکل میں ان کی یہ کوشش منظر عام پر آئی۔

☆ ۱۹۵۵ء میں جامعہ دمشق کا قیام عمل میں آیا تو علی میاںؒ کو اس کے شعبۂ کلیۃ الشریعۃ میں درس وتدریس کے لیے مدعو کیا گیا، آپ نے بحیثیت استاد الزائر اس پیش کش کو قبول کیا۔ ۱۹۵۶ء میں دمشق تشریف لے گئے اور ''رجال الفکر والدعوۃ الیٰ الاسلام'' کے عنوان سے آٹھ محاضرات دیے۔ قیام دمشق کے دوران دمشق کے عالموں، ادیبوں، اسلامی تنظیموں کے قائدین اور سربراہوں سے ملاقات کی۔ اس دوران طرابلس اور بیروت کا سفر کیا۔ تاریخی مقامات کی سیر کی، نیز دینی، علمی تحریکوں کے قائدین سے ملاقات کی۔ ۱۲/جون ۱۹۵۶ء کو دمشق سے ترکی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ قسطنطنیہ، انگورہ، قونیہ شہروں کی سیاحت کی۔ ملک کی دینی اجتماعی، اخلاق، علمی اور تاریخی حیثیت سے دیکھا مختلف طبقات کے ممتاز لوگوں سے ملاقات کی، ترکی، عراقی، شامی نوجوانوں کو ناصحانہ خطاب کیا۔ ثقہ اور مستند لوگوں سے معلومات حاصل کیں سفر کے تاثرات نہایت آسان اور دلنشیں زبان میں تحریر کیے۔ اس سفر کی روداد ''دو ہفتے ترکی میں'' شائع ہوئی۔

☆ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء کا زیادہ وقت دعوت وتبلیغ کے کاموں اور تحریک پیامِ انسانیت کے جلسوں میں گذرا۔ ۱۹۵۷ء میں علی میاںؒ کو المجمع العلمی دمشق کا رکن منتخب کیا گیا۔

☆ تصنیفی سفر کا اگلا قدم کتاب ''القادیانی والقادیانیۃ'' ہے، لاہور پاکستان سے منظر عام پر آئی۔ شیخ عبدالقادر رائے پوری کے حکم وایماء پر علی میاںؒ نے کتاب عربی میں لکھی، اپنے موضوع کے اعتبار سے علی میاںؒ کی یہ کتاب مشہور ومقبول کتابوں میں سے ایک ہے۔

☆ ۱۹۶۱ء میں علی میاںؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وفد کے ساتھ دینی اور دعوتی مقصد سے کویت کا سفر کیا۔ مصر، سوڈان، فلسطین کے علمی ادبی حلقوں میں شریک ہوئے۔ علماء فضلاء کے علاوہ عام لوگوں سے بھی ملاقات کی۔ اس سفر کا مفصل سفرنامہ مرتب کیا۔ جو روزنامچے کی شکل میں ''مذاکرات

السائح في الشرق العربي" (شرق اوسط کی ڈائری) کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس روزنامچے میں ملاقاتوں کی کیفیت تقریروں کے خلاصے، مختلف حلقوں سے تعلق وارتباط دینی دعوت کی روداد کو محفوظ کر دیا ہے۔

☆ ۱۹۶۲ء میں "جامعه اسلامیه مدینه منوّرة" کا قیام عمل میں آیا۔ علی میاںؒ کو اس کی مجلس استشاری کا رکن منتخب کیا گیا۔ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی، وہ اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے مدینہ منورہ میں ہی تھے کہ مکہ مکرمہ میں اسلامی مؤتمر کا انعقاد ہوا اور انھیں اس میں شرکت کی بھی دعوت دی گئی۔ اسی مؤتمر میں ایک عالمی تنظیم "رابطة العالم الاسلامی" کا قیام عمل میں آیا اور علی میاںؒ اس کے بنیادی حیاتی رکن منتخب کیے گئے۔

☆ ۱۹۶۳ء میں علی میاںؒ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منوہ میں درس وتدریس کے لیے بلایا گیا۔ اس مرتبہ بھی آپ نے استاد الزائر کی حیثیت سے اس پیش کش کو قبول کیا اور "النبوة والانبياء في ضوء القرآن" کے عنوان سے محاضرات دیے۔ اس قیام حجاز میں شاہ فیصل سے مراسلت اور ملاقاتوں کا سلسلہ بھی رہا۔ ☆ اسی سال علی میاںؒ اپنے دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی دعوت پر پہلی بار یورپ گئے۔ یہ دعوت جینوا کے اسلامک سینٹر کی طرف سے تھی جس کے آپ رکن انتظامی بھی تھے۔ اس سینٹر کی طرف سے یورپ میں مقیم طلباء کے دینی استفادہ اور تربیت کے لیے اجتماعات کا انعقاد کیا گیا۔ اس سفر کے تاثرات کی تفصیل مجموعہ مکاتیب یورپ (اردو) میں موجود ہے۔

☆ ۱۹۶۴ء میں دوسری بار مرکز اسلامی (Islamic Centre) جینوا کی طرف سے آپ کو مدعو کیا گیا۔ علی میاںؒ نے اپنے بھانجے مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے ہمراہ یورپ کا یہ دوسرا سفر کیا۔ جرمنی، برلن، لندن میں کئی یونیورسٹیز میں تقاریر ہوئیں، یہ تقریریں "احاديث صريحة مع الغرب" کے عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ لندن سے واپسی میں استنبول گئے، تین روز دمشق میں قیام کیا اور کراچی میں "رابطة العالم الاسلامی" کی ایشیائی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ☆ ۱۹۶۵ء

میں حجاز گئے اور "رابطة العالم الاسلامی" کی پہلی موتمر میں بحیثیت رکن شریک ہوئے اور ۱۹۶۷ء کے بعد تقریباً ہر سال "رابطة العالم الاسلامی" کے موتمر میں شرکت کی غرض سے حجاز مقدس کا سفر کیا۔

(کاروانِ زندگی ج:اوّل۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

☆ ۱۹۶۹ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورۃ کی مجلس الاستشاری میں شرکت کے بعد مرکز اسلامی (Islamic Centre) جینوا کی مجلس انتظامی میں شرکت کے لیے جینوا اور پھر انگلستان کا سفر کیا۔ انگلستان کے سفر کے دوران علی میاںؒ نے برمنگھم، مانچسٹر، بلیک برن، شیفیلڈ، ڈیوز بری اور لیڈس کے دعوتی دورے کیے۔

☆ ۱۹۷۳ء میں رابطة العالم الاسلامی کے سکریٹری کے ایماء پر مشرق وسطیٰ کے چھ مسلم ممالک افغانستان، ایران، شام، عراق اور شرق اردن کا سفر کیا۔ اس دورے کا مقصد ان ممالک کے مسلمانوں کے حالات و کیفیات سے آگہی حاصل کرنا، ان کے علمی تہذیبی اداروں اور ان کی ضرورتوں سے واقفیت حاصل کرنا تھا۔ نیز ان ممالک کے باشندوں کو رابطة العالم الاسلامی کے مقاصد اور پیغام سے آگاہ کرانا تھا۔ علی میاںؒ اس سہ رکنی وفد کے سربراہ تھے۔ یہ سفر ۴/جون ۱۹۷۳ء سے ۲۰/اگست ۱۹۷۳ء کے درمیان ہوا۔ اس کی روئداد "من نهر الكابل الىٰ نهر يرموك" (نہر کابل سے نہر یرموک تک) میں محفوظ ہے۔ اس سفر کے بعد علی میاںؒ حجاز گئے، قیام حجاز کے دوران ۱۹/اگست ۱۹۷۳ء کو سعودی فوجی مرکز کا معائنہ کیا۔ اس کے علاوہ موتہ اور تبرا کا سفر کیا۔

☆ جنوری ۱۹۷۴ء میں علی میاںؒ "رابطة العالم الاسلامی" کے اجلاس کے سلسلہ میں مکہ مکرمہ گئے، واپسی میں شارقہ، دبئی، ابوظہبی بھی گئے۔ شارقہ میں ۲۷/جنوری ۱۹۷۴ء کو مسجد علی ابن ابی طالب میں "خليج بين الاسلام والمسلمين" کے عنوان سے تقریر کی۔

☆ ۱۹۷۶ء میں علی میاںؒ نے سعودی عرب اور مراکش کا سفر کیا۔ ۱۱، ۱۲، ۱۳/مئی

۱۹۷۶ء کو رباط کی "رابطة الجامعات الاسلامیه" (Islamic Universities Feadration) کے اجلاس میں شرکت کی۔ علماء اور مندوبین اجلاس سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جلسہ میں علی میاںؒ کی تقریر ہوئی۔ ۱۴ رمئی کو وزارۃ الثقافۃ میں تقریر ہوئی جس کا عنوان "ازمة العالم الاسلامی في الحقيقة" (عالم اسلامی کا حقیقی بحران) تھا۔ اس سفر کی روئداد "السبوعان في المغرب الاقصیٰ" (دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں) کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔

☆ علی میاںؒ کو اپریل ۱۹۷۷ء میں امریکہ کی مشہور مسلم تنظیم (Muslims Students Association- MSA of America & Canada) کی طرف سے سالانہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ کانفرنس ۲۷ رمئی ۱۹۷۷ء Idana(Bloominston) میں ہوئی۔ دوسرے دن علی میاںؒ کی تقریر ہوئی جس کا موضوع "اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کے مابین تعلقات کی نوعیت" تھا۔ کانفرنس کے بعد امریکہ کے مختلف علاقوں کے دورہ کا پروگرام بنا جو تین ہفتوں پر مشتمل تھا۔ اس سلسلہ میں ہٹن، نیویارک، جرسی فلارڈلفیا، بالٹی مور، بوسٹن، شکاگو، ڈٹرائٹ، سالٹ لیک سٹی، سان فرانسسکو، سان جرابے، لاس اینجلس، مانٹریال، ٹورنٹو شامل تھے۔ اس سفر کے دوران اردو، عربی میں تقریباً بیس تقاریر ہوئیں، جس میں ہندوستان، پاکستان اور عرب مسلمانوں کو خطاب کیا۔ امریکہ کی پانچ یونیورسٹیوں میں خطاب کا موقع ملا۔ یونائیٹڈ نیشنز، نیویارک کی عمارت میں مسجد نما ہال اور ٹورنٹو ڈٹرائٹ کی جامع مسجدوں میں جمعہ کے خطبات بھی دیے۔ اس سفر کی تفصیل مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی کتاب "دو مہینے امریکہ میں" میں ملتی ہے۔ اور علی میاںؒ کی تقاریر کا مجموعہ "نئی دنیا امریکہ سے صاف صاف باتیں" کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔

امریکہ کے قیام کے دوران علی میاںؒ کی دائیں آنکھ کا آپریشن یکم جولائی ۱۹۷۷ء ڈاکٹر شے نے فلارڈلفیا میں کیا۔ تقریباً ایک ماہ زیر علاج رہے اور

۹/اگست ۱۹۷۷ء کو لکھنؤ واپس آئے۔اس آپریشن کے بعد ان کی آنکھ کی تکلیف میں بہت افاقہ ہوا اور وہ براہِ راست مطالعہ اور تحریر کے قابل ہو گئے۔

☆ ۶/جولائی ۱۹۷۸ء کو "رابطة العالم الاسلامی" کی ایشیائی کانفرنس کراچی میں ہوئی،علی میاںؒ جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کی مجلس الاستشاری میں شرکت کے بعد براہِ راست کراچی پہونچے۔انہیں رابطہ کے سکریٹریٹ کی طرف سے کانفرنس میں صدر مقرر کیا گیا۔انھوں نے آخری جلسہ کی آخری تقریر کی جس میں شرکاء کو اپنے ملک کی سیاست میں قائدانہ ذمہ داری اور رسولؐ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض یاد دلایا۔☆ پاکستان میں علی میاںؒ نے رابطہ کی مجلس کے بعد رشتہ داروں سے ملاقاتیں کیں اور مختلف مجالس میں شرکت کی متعدد جگہ خطاب بھی کیا۔ان تقاریر کا مجموعہ "حدیث پاکستان" کے نام سے مجلس نشریات اسلام کراچی سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔پاکستان کے قیام کے دوران متعدد علماء،ممتاز شہریوں،دانشوروں،ماہرین تعلیم،صحافیوں،افسران وغیرہ نے علی میاںؒ سے ملاقات کی۔

☆ ۱۹۷۹ء میں علی میاںؒ کو حجاز میں طویل قیام کا موقع ملا۔انھوں نے عرب کے اس اہم خطہ میں وسائل دولت کی فراوانی دیکھی اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا براہِ راست مطالعہ کیا۔اور شاہ خالد کے نام ایک تحریر لکھی جس میں مذکورہ تبدیلیوں کے پس پشت آنے والے خطرات سے آگاہ کیا اور ان کے سدّباب کے لیے مشورے دیے۔☆ ۲۰/نومبر ۱۹۷۹ء کو علی میاںؒ جدہ پہونچے،۲۱/نومبر سے وزارائے اوقاف کی میٹنگ مکہ میں ہوئی۔ ۲۶/نومبر سے ۳۰/نومبر ۱۹۷۹ء تک قطر کے دارالحکومت دوحہ میں تیسری عالمی سیرت کانفرنس ہوئی۔علی میاںؒ اس کی مجلس انتظامی وانتخابی کے رکن تھے کانفرنس میں شریک ہوئے عالم اسلام کے وفود کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر فرمائی۔

☆ خدمتِ اسلام کا شاہ فیصل اعزاز

۱۹۸۰ء میں علی میاںؒ کو مملکۃ السعودیۃ العربیۃ کی طرف سے اُن کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں بطورِ اعزاز شاہ فیصل ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس اعزاز میں طلائی تمغہ اور سندِ توصیف کے ساتھ ایک لاکھ ریال کی رقم بھی پیش کی جاتی ہے۔ علی میاںؒ نے اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ کو جلسہ میں اپنا قائم مقام بنا کر بھیجا، اُنھوں نے اعزازی جلسہ میں علی میاںؒ کے حکم کے مطابق ایوارڈ کی نصف رقم افغان پناہ گزینوں کو ایک ربع جماعت تحفیظ القرآن کو اور دوسرا ربع مدرسۃ صولتیہ مکۃ المکرمۃ کو دینے کا اعلان پڑھ کر سنایا۔

☆ ستمبر ۱۹۸۱ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ اور رابطۃ العالم الاسلامی مکہ معظّمہ کے جلسوں میں شرکت کے لیے حجاز تشریف لے گئے۔ رابطہ کے دورۂ محاضرات میں ' دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی و صیانتہ ' (اسلامی مزاج اور ماحول کی تشکیل اور حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار) کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ☆ علی میاںؒ کو کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری اکتوبر ۱۹۸۱ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پیش کی گئی۔

☆ جولائی ۱۹۸۲ء میں الجزائر میں ہر سال کی طرح اسلامی موضوع پر سیمینار ہوا۔ اس سال کا موضوع حدیث اور سنت تھا۔ علی میاںؒ نے اپنا مقالہ "وطبیعۃ ھٰذا الدین و سماحۃ المبارزۃ" (دین اسلام کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات) کے عنوان سے پیش کیا۔ ☆ ۷ رمئی ۱۹۸۲ء کو سری لنکا تشریف لے گئے جہاں جامعۃ النظمیۃ سلون کے جلسہ اسناد میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ☆ جولائی ۱۹۸۳ء میں علی میاںؒ لندن گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر کے قیام، تاسیس، مقاصد اور دستور العمل کی ترتیب میں ضروری مشوروں میں شامل ہوئے۔ ''اسلام اور مغرب'' کے عنوان سے

مقالہ پیش کیا۔ اس پروگرام کے بعد قیام انگلستان کے دوران مڈلینڈ کے اہم اسلامی سینٹرز، مساجد اور دیگر مقامات کا دورہ کیا۔

☆ ۱۶ ؍نومبر ۱۹۸۳ء کو علی میاںؒ امارت عربیہ کے دورے پر گئے۔ یہ سفر ڈاکٹر سالم عبداللہ کی دعوت پر کیا گیا جو اپنے والد شیخ عبداللہ العلی المحمود (المتوفی ۱۹۸۲ء) کے ذاتی کتب خانے کو پبلک لائبریری میں تبدیل کر کے اس کا افتتاح کرنا چاہتے تھے۔ علی میاںؒ نے شارقہ کی بزرگ ہستی سے منسوب اس لائبریری کا افتتاح کیا۔ امارات خلیج میں ہفتہ بھر قیام رہا جس میں کئی اہم جلسے ہوئے تقاریر ہوئیں۔ "جامعة العين" میں "ازفه هذا العصر الحقيقه" (عہد حاضر کا حقیقی خلا) کے عنوان سے تقریر کی اور کویت یونیورسٹی کے سائنس کالج میں "الاسلام والحضارة الانسانيه" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ کویت سے حجاز مقدس زیارت و عمرہ کرتے ہوئے دسمبر ۱۹۸۳ء میں ہندوستان تشریف لائے۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ج: دوم)

☆ مارچ ۱۹۸۴ء میں بنگلہ دیش کے مدارس و تنظیموں کی دعوت پر دس روز کے لیے بنگلہ دیش گئے، کئی مجالس منعقد ہوئیں اور بنگلہ عوام سے خطابات ہوئے، اس سفر کی تقاریر کا مجموعہ "تحفۂ مشرق" کے عنوان سے شائع ہوا۔

☆ کئی سال سے علی میاںؒ شرق اردن کے علمی و تحقیقی ادارے اور اکیڈمی "مؤسسة أل بيت" کے رکن تھے۔ ۱۹۸۴ھ میں پہلی بار مؤتمر میں شرکت کے لیے شرق اردن کا سفر کیا۔ شاہی اکیڈمی: مجمع البحوث الحضارة الاسلاميه کی تیسری سالانہ کانفرنس میں شریک ہوئے اور امیر سلطنت اردن کی خواہش پر "تمدن اور علوم اور ان میں ہندوستانی مسلمانوں کی خدمات و خصوصیات" کے عنوان سے مقالہ کا مجمل خاکہ زبانی پیش کیا۔ اس سیمینار میں فلسطین بیت المقدس کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ علی میاںؒ زیادہ تر سیمینار کی نشستوں میں چھائے رہے۔ اردن کے معززین شہر،

علماء، اد باء سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ☆ ۱۹۸۴ء میں اردن سے زیارت مدینہ اور عمرہ کی ادائیگی کے لیے حجاز آئے۔ مکہ قیام کے دوران ان کے پاس ریاض یونیورسٹی اور مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ پر مشتمل عربی ادب کے ممتاز علماء کا وفد آیا۔ جس نے حجاز میں "رابطہ الادب الاسلامی" کے قیام کی تجویز پیش کی اور علی میاںؒ کو اس کی سربراہی قبول کرنے کی پیش کش کی گئی۔ ☆ مئی ۱۹۸۴ء میں حجاز سے صنعا کا سفر کیا۔ جہاں صنعا یونیورسٹی کے کلیلة الطیران (Airforce Training College) ایرفورس (Artillery centre) اور جامع مشہد میں تقاریر ہوئیں۔ علماء قائدین نیز ذمہ داران حکومت میں صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، وزیر اوقاف اور ارکان پارلیمنٹ سے ملاقات ہوئی۔ یمن کے مرکزی تاریخی مقامات کا دورہ کیا۔ "نفحات الایمان بین صنعا و عمان" اس سفر کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ صنعا سے واپسی پر کراچی اپنے اعزہ سے ملاقات کے لیے گئے۔

☆ ۱۹۸۴ء میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے کراچی آکر سیرت النبی جلد ہفتم کے مقدمہ پر ایک لاکھ روپے کا انعام پیش کیا۔ علی میاںؒ نے انعام کی نصف رقم دارالمصنّفین اعظم گڑھ اور نصف علامہ سیّد سلیمان ندویؒ کی اہلیہ کو پیش کردی۔

☆ دسمبر ۱۹۸۴ء میں "رابطه العالم الاسلامی" کی مجلس تاسیسی کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے حجاز گئے۔ مکہ، مدینہ اور جدہ کے طلباء، اہل علم واہل قلم کو خطاب کیا۔ حرمین سے واپسی پر ریاض میں جامعہ امام محمد بن سعود کے وائس چانسلر کی دعوت پر چند روز ریاض میں قیام کیا۔

☆ "رابطة الادب الاسلامی" کی مجلس تاسیسی کی نشست حجاز میں جنوری ۱۹۸۵ء میں منعقد ہوئی۔ علی میاںؒ نے بحیثیت صدر شریک ہوکر "ادب اسلامی کے خطوط" پر تقریر کی، اس کی ضرورت واہمیت سے آگاہ کیا۔

☆ گذشتہ اوراق میں تحریر کیا جاچکا ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سینٹر کا قیام عمل میں آیا اور علی میاںؒ کو "المجمع العلمی البحوث الاسلامیة

لکزمبرگ" کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں سینٹر کا خاکہ تیار کرنے کے لیے مدعو کیا گیا اور مرکز کے ٹرسٹ کا چیئرمین بھی بنایا گیا۔ ☆ ۱۹۸۷ء میں رابطہ الادب الاسلامی العالمیہ کا جلسہ ترکی میں ہوا۔ علی میاںؒ نے افتتاحی نشست میں صدارتی تقریر کی، جس میں اسلامی ادب میں انقلابی کردار ادا کرنے والے ادیبوں، شاعروں کے کارنامے بیان کرتے ہوئے اس کے اثرات پر روشنی ڈالی۔ رابطہ کے جلسوں کے علاوہ شہر کے علمی ادبی حلقوں میں کئی تقاریر ہوئیں۔ استنبول کے جنوب میں واقع "بورصہ" کا تفریحی و معلوماتی سفر کیا۔ استنبول سے براہ کراچی واپس ہوئے، ڈھائی دن قیام کے دوران عزیز واقارب سے ملاقات کی۔ ☆ اگست ۱۹۸۷ء میں اسلامک سینٹر آکسفورڈ کے مجلس انتظامی کے جلسہ میں شرکت کے لیے لندن گئے۔ لندن سے واپسی میں الجزائر گئے۔ "ملتقى الفكر الاسلامى" میں شرکت کی۔ "دور الاسلام فى مجال العلوم الانسانية" (انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار) کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ الجزائر سے واپسی میں حجاز مقدس گئے چند روز مدینہ میں قیام رہا، عمرہ کی ادائیگی کے بعد ستمبر ۱۹۸۷ء میں ہندوستان واپس آئے۔

☆ ۱۹۸۷ء میں ہی ملیشیا کی سرگرم اسلامی تنظیم ABIM کی دعوت پر ملیشیا گئے، دعوتی حلقوں سے رابطہ قائم ہوا۔ کوالالمپور، ترنگانو قدح میں دانشور اور تعلیم یافتہ حاضرین کے سامنے اہم خطبات ہوئے۔

☆ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں "رابطة العالم الاسلامى" کی تیسری سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں عالم اسلام کے حالات، مشکلات اور نظریات کا جائزہ لے کر تدابیر اور مساعی پر غور کیا گیا۔ علی میاںؒ "المجمع الفقهى" کی ایک نشست میں شریک ہوئے۔ "عصر حاضر میں دعوت اسلامی کے فیصلہ کن محاذ اور مرکزی میدان" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ مکہ میں قیام کے دوران عرب و

ہندوستانی سامعین کو خطاب کیا۔☆ ۲۱،۲۲؍اکتوبر ۱۹۸۷ء کو مدینہ طیبہ میں رابطة الادب الاسلامی کی مجلس امناء کی نشستیں ہوئیں۔علی میاںؒ بھی شریک ہوئے اور واپسی میں ایک روزہ جدہ قیام میں ''اسلام کی اکملیت اور مرکزِ اسلام میں اس کے عملی نمونے کی ضرورت'' پر تقریر کی۔

(کاروانِ زندگی۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ج:سوم)

۷؍اکتوبر ۱۹۸۸ء سے اورنگ آباد میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی ہندوستانی شاخ نے نعتیہ شاعری کے موضوع پر ایک عالمی سیمینار کیا۔ ہندو بیرونِ ہند سے ممتاز علماء وادباء وشعراء نے اس میں شرکت کی۔علی میاںؒ نے افتتاحی کلمات کے علاوہ ایک مقالہ ''فارسی واردو زبان کی نعتیہ شاعری میں سیرت نبوی ﷺ کی کچھ روشن جھلکیاں'' پڑھا۔☆ مارچ ۱۹۸۸ء میں علی میاںؒ نے حضرت علیؓ کی سوانح،خصائص اور کمالات پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔یکم مارچ ۱۹۸۸ء سے ۳۱؍مئی ۱۹۸۸ء تک کے مختصر عرصہ میں اس سوانحی کتاب ''المرتضیٰ'' کو مکمل کیا۔۶؍نومبر ۱۹۸۸ء کو اس کتاب کا رسم اجراء گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ہوا۔☆ ۱۲؍نومبر ۱۹۸۸ء سے رابطہ العالم الاسلامی کی سالانہ مجلس تاسیسی کا اجلاس مکہ مکرمہ میں منعقد ہوا۔علی میاںؒ اس اجلاس میں بنفس نفیس شریک ہوئے اور ۱۵؍نومبر کو اراکین رابطہ کی طرف سے بطور نمائندہ خطاب کیا۔ تین دن مکہ معظّمہ میں قیام رہا،دورانِ قیام علی میاںؒ کے شاگرد رشید ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی) کے گھر میں علمی مجلس کا اہتمام کیا گیا، جس میں عرب کے ممتاز ادیبوں اور عالموں نے شرکت کی۔☆ ۱۹؍نومبر ۱۹۸۸ء کو مدینہ طیبہ جاکر مسجد نبوی کی حاضری کی سعادت حاصل کی،ڈاکٹر عبدالباسط بدر استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منوہ کے مکان پر رابطہ الادب الاسلامی کی مجلس امناء کی نشست کا انعقاد کیا گیا۔اس نشست میں رابطہ الادب الاسلامی کے مقاصد اور اس کے پیام کو عام اور وسیع کرنے کے لیے تجاویز اور قراردادیں بھی

پاس کی گئیں۔ ۲۶ر نومبر کو علی میاںؒ جدہ گئے، ایک روز قیام کے دوران عزیزیہ کی مسجد الجوہرۃ میں ہندوستانی پاکستانی مسلمانوں کو خطاب کیا، جس میں ریڈیو ٹیلی ویژن کے مضر اثرات کی نشاندہی کی۔ ☆ ۲۸ر نومبر ۱۹۸۸ء کو ابوظہبی کے لیے روانہ ہوئے، ۲۹ر نومبر کو المجمع الثقافی میں "ترشید الصحوۃ الاسلامیہ" "اسلامی بیداری کی لہر" کے عنوان پر محاضرہ پیش کیا۔ ۳۰ر نومبر کو شارقہ میں شیخ سلطان قاسمی اور ان کے ساتھ ابوظہبی کے فضلاء، علماء، ائمہ وقضایا کی جماعت سے ملاقات ہوئی۔ کلیۃ الدراسات الاسلامیہ دبئ میں تقریر کی، جس میں سورہ کہف کی تفسیر کی روشنی میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو خطاب کیا۔ متحدہ عرب امارات وسعودی عرب کی چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ کا مشاہدہ کر کے شارقہ کے "قاعۃ المحاضرات" میں ایک تقریر کی، جس میں رومی، ایرانی تہذیب کے عروج وزوال کی داستان سنا کر عرب مسلمانوں کو اپنے اسلامی تشخص پر مضبوطی سے قائم رہنے اور اس کی حفاظت کرنے کی تلقین کی۔ موجودہ تہذیب کو اسلامی شخصیت کے تابع بنانے پر زور دیا۔ ۲ر دسمبر کو ہندوستان واپس آئے۔

☆ ۲۹ر دسمبر کو حیدرآباد میں پیامِ انسانیت کی کانفرنس میں شرکت کی اور ہر ہندوستانی کو اپنے چھوٹے سے گھر کے ساتھ اپنے بڑے گھر یعنی ملک ہندوستان میں محبت، امن، سلامتی، باہمی اعتماد واحترام کی فضا کے ساتھ رہنے کا پیغام دیا اور انسانی اخلاقی تعمیر کے ساتھ اپنے بڑے گھر کی فکر کی ضرورت پر زور دیا۔ کانفرنس کے علاوہ ایک جلسہ عام میں علی میاںؒ نے شرکاء سے خطاب کیا۔ ☆ مارچ ۱۹۸۹ء میں حلیم مسلم ڈگری کالج کانپور میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا، علی میاںؒ اس اجلاس میں شریک ہوئے اور خطبہ صدارت پیش کیا، جس میں اسلامی قانون کی بہتری اور قرآنی شرعی تعلیمات کی برتری کے بارے میں بتایا۔

☆ ۲۱ر جون ۱۹۸۹ء کو کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں دینی تعلیمی کنونشن ہوا، جس میں ملک کے مختلف دینی حلقوں اور ملی

تنظیموں کے نمائندے شریک ہوئے۔علی میاںؒ نے خطبہ صدارت دیا،جس میں قرآن پاک،اسلامی تاریخ کے حوالے اور اپنے تجربات کی روشنی میں حکومت کی پابندیوں سے آزاد دینی تعلیم کے فوائد بتائے۔

☆ اگست ۱۹۸۹ء میں استنبول قسطنطنیہ میں رابطة الادب الاسلامی کی عالمی کانفرنس میں شریک ہوئے۔صدر تنظیم اور صدر اجلاس کی حیثیت سے ''ترکی کی مجاہد ملت اسلامی'' کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز، مؤثر، دعوتی تقریر کی۔ ☆ ۷، ۸، ۹ / اکتوبر ۱۹۸۹ء کی تاریخوں میں حیدرآباد میں رابطہ ادب اسلامی کا پانچواں مذاکرہ علمی منعقد کیا گیا، جس کا عنوان ''تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ'' تھا، علی میاںؒ نے صدارتی خطبہ دیا جس میں یہ ثابت کیا کہ ہندوستان میں تحریک آزادی کا سب سے پہلے خیال یہاں کے طبقہ علماء، داعیان دین اور مصلحین کے ذہن ودماغ میں موجزن ہوا تھا۔ ☆ ۴ / نومبر ۱۹۸۹ء کو رائے بریلی کے فیروز گاندھی ڈگری کالج کے آڈیٹوریم میں پیام انسانیت کے جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ ہندوستان کے ماحول میں ہندو مسلم کشیدگی کے بڑھتے ہوئے اثرات اور باہمی تصادم کے اندیشے کے پیش نظر اس جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔علی میاںؒ نے قیام امن کے لیے انسانی ضمیر کی بیداری پر زور دیا، ظلم کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ حکومت سے زیادہ رعایا کو امن وامان کا ذمہ دار قرار دیا۔ ☆ نومبر ۱۹۸۹ء کو بھاگلپور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، شیلانیاس اور رام جنم بھومی کی تحریک شدت کے ساتھ سامنے آئی، ہندوستان کی سیاست کے میدان میں کانگریس پارٹی مرکزی حکومت سے بے دخل کردی گئی۔وی۔پی۔ سنگھ وزیراعظم ہوئے،علی میاںؒ نے الیکشن کے نتائج کے چند دن بعد ایک مضمون ''حکومت کی تبدیلی سے سبق اور آئندہ کے لیے طریق کار'' کے عنوان سے لکھا جو مختلف انگریزی، اردو اخبارات میں شائع ہوا۔

☆ جنوری ۱۹۹۰ء میں رابطة العالم الاسلامی العلمی کی مجلس تاسیسی کا اجلاس مکۃ المکرمہ میں منعقد ہوا، علی میاںؒ نے مجلس کے تاسیسی جلسے میں شرکت

کی، اس کے بعد المجلس العالمی للمساجد کی نشستوں میں شرکت کی۔ سات دن مدینہ طیبہ میں قیام رہا، حجاز مقدس کے ۲۲ روزہ قیام کے دوران تین استقبالیہ جلسوں میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ یہ جلسے سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز اوکسفورڈ یونیورسٹی کے تعارف کے لیے کیے گئے تھے۔ "حاجة العالم الیٰ مجتمع اسلامی مثالی افضل"''مثالی اسلامی معاشرہ وماحول'' کے عنوان سے عرب کے ممتاز اہل علم اور دعوتی واصلاحی کام کرنے والوں کو خطاب کیا گیا۔
☆ ۴؍ مارچ ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں مولانا آزاد کی یاد میں صد سالہ جشن منایا گیا، علی میاںؒ نے جلسہ کی صدارتی تقریر کی، جس میں مولانا آزاد کی شخصیت کے روشن پہلوؤں اور امتیازی صفات کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

۱۹۸۹ء میں ہندوستان کے سیاسی حالات میں بھی تبدیلی رونما ہوئی، کانگریس کی شکست ہو چکی تھی، امیر شریعت منت اللہ رحمانی کے خط میں بھاگلپور کے فساد کے سلسلہ کی ہولناک اور روح فرسا مناظر کی تصویر پڑھ کر انھوں نے ہندوستان کے ممتاز دانشوروں کے نام ایک پُر اثر خط لکھا، اس خط میں علی میاںؒ کے حساس دل، دردمند ضمیر کی آواز صاف سنائی دیتی ہے، اس میں ہندوستان کے مورّخ کے لیے صورت حال کی عکاسی ہے، حقائق کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ☆ ۱۵؍ مارچ ۱۹۹۰ء کو اجراڑہ ضلع میرٹھ کے دینی مدرسہ کے اجتماع میں شریک ہو کر دہلی آئے اور ۱۷؍ مارچ کو پیام انسانیت کے تاریخی کنونشن میں شریک ہوئے۔ ہندوستان کی فرقہ پرستی کے وجوہات کی جانچ کرنا اور ان کا حل تلاش کرنا اس اجلاس کا خاص مقصد تھا۔ علی میاںؒ نے اجلاس کو خطاب کیا، فرقہ واریت سے نفرت کا سبق دیا اور انسان کی عظمت کو واضح کیا۔
☆ مارچ ۱۹۹۰ء میں علی میاںؒ مدراس گئے جہاں بابری مسجد رام جنم بھومی کے سلسلہ میں کانچی پورم کے شری اچاریہ اور دوسرے شری وجیندر اچاریہ سے ملاقات کا بندوبست گورنر بہار یونس سلیم و گورنر آندھرا پردیش کرشن کانت جی نے کیا تھا۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ اور عبدالرزاق صاحب کے ساتھ علی میاںؒ نے ثانی الذکر اچاریہ سے

ملاقات کی، بابری مسجد کے مسئلہ پر اچھی فضا سنجیدگی اور احترام کے ساتھ گفتگو ہوئی۔
☆ یکم مئی ۱۹۹۰ء کو علی میاںؒ نے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے سلسلہ میں پرسنل لا بورڈ کے وفد کے ساتھ وزیر اعظم وی. پی. سنگھ سے ملاقات کی۔ علی میاںؒ ان کو اس سلسلہ میں بحیثیت صدر پرسنل لا ایک خط بھی تحریر کر چکے تھے وزیر اعظم سے آزادانہ فضا میں ملاقات ہوئی اور وفد نے اپنے مطالبات سامنے رکھے۔ وزیر اعظم نے تکمیل کا وعدہ کیا۔ علی میاںؒ اپنی تقریر و تحریر میں اس بات کو بار بار دُہراتے رہے کہ ''ہندوستان کی ملت اسلامی کو حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور ملت کے مسائل اہل ملک کے رجحانات اور مستقبل کے خطرات کے بارے میں چوکنا رہنا چاہیے''۔
☆ جون ۱۹۹۰ء میں مجمع الفقہ الاسلامی الھند (آل انڈیا فقہ اکیڈمی) کا تیسرا عالمی مذاکرۂ علمی بنگلور کے دار العلوم سبیل الرشاد میں منعقد ہوا، دار العلوم کے فضلاء کی دستار بندی ہوئی، علی میاںؒ نے گرونانک ہال بنگلور میں ایک تقریر کی، جس میں تقریبات میں سادگی، سنت نبوی اور اسوۂ صحابہ پر عمل کرنے کا مشورہ دیا۔ ☆ ۱۲/جون ۱۹۹۰ء کو بنگلور میں پیام انسانیت کا جلسہ ہوا۔ علی میاںؒ نے تقریر کی، جس میں بتایا کہ غیرت و رحمت الٰہی کائنات کے بگاڑ کو پسند نہیں کرتی۔ ۲/جولائی ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا، سرکاری طور پر منعقد اس جلسہ کا مقصد لکھنؤ میں فرقہ وارانہ اتحاد و اعتماد کو بحال کرنا اور صلح آشتی کی تحریک میں زور پیدا کرنا تھا۔ اتر پردیش کے وزراء سیاسی و سماجی رہنماؤں نے جلسہ میں شرکت کی۔ علی میاںؒ نے اپنی تقریر میں فرقہ وارانہ میل جول اور باہمی ربط وضبط پر زور دیا۔ ☆ اگست ۱۹۹۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء شرکت کی اور سال رواں کی روداد پیش کی۔ لکھنؤ میں منعقد دینی تعلیمی کونسل، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، مجلس مشاورت کے جلسوں میں بھی شرکت کی۔ ۱۹/، ۲۰/اگست کو گورنر بہار اور گورنر آندھرا پردیش نے دار العلوم ندوۃ العلماء آکر علی میاںؒ سے ملاقات کی، مولانا

عبدالکریم پاریکھ کی موجودگی میں علی میاںؒ کو بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنا تیار کردہ فارمولا بتایا۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے تین اہم کارکن جو اُن دنوں لکھنؤ میں ہی موجود تھے ان مصروفیتوں کے دنوں میں گورنر صاحبان کی درخواست پر علی میاںؒ نے متعلقہ لوگوں سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کی اور بابری مسجد قضیہ کا حل تلاش کرنے کی سعی کی لیکن مسئلہ کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاسکا۔

☆ اگست ۱۹۹۰ء میں مغرب اقصیٰ کے مشہور شہر الدار البیضاء میں رابطة الادب الاسلامی کی نشست، انگلستان میں اوکسفورڈ کے اسلامی سینٹر کے سالانہ جلسہ اور مدینہ طیبہ میں رابطة الادب الاسلامی کی عالم عربی کی شاخ کا انتظامی ومشاورتی جلسہ تھا، علی میاںؒ کو ان تینوں علمی مجالس میں مدعو کیا گیا لیکن اپنے قدیم مرض نقرس میں اضافہ اور شدت کی بناء پر شرکت سے معذرت کرلی۔

☆ ستمبر ۱۹۹۰ء میں رابطة العالم الاسلامی کی سالانہ مؤتمر میں شرکت کے لیے حجاز کا سفر کیا۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو مکہ میں موتمر کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ کثیر تعداد میں عالم اسلامی کی برگزیدہ شخصیتیں شریک ہوئیں۔ علی میاںؒ نے مقالہ پڑھا، جن میں عراق کے کویت پر حملہ کی مذمت کی اور کہا کہ "اس مجرمانہ اقدام نے اسلام کے دعوتی واخلاقی پہلو کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے وہ نہ صرف بدنامی بلکہ بدنمائی کا باعث ہوا ہے۔ مؤتمر کی آخری نشست میں علی میاںؒ نے ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے حملہ اور ان کے قبول اسلام کے واقعہ کو پیش کرکے مغربی نظامِ تعلیم کے مضر اثرات سے بچنے اور مسلمانوں میں نیا دینی جذبہ پیدا کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اب امت مسلمہ کی ایمان کی بیٹری کو پھر چارج کرنا چاہیے۔

☆ ۱۶ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو مدینہ طیبہ مسجد نبویؐ میں حاضری کے بعد ڈاکٹر عبدالباسط بدر استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی قیام گاہ پر مدینہ طیبہ کے عرب فضلاء واساتذہ واحباب سے ملاقات کی۔ ۲۲ر ستمبر تک مدینہ طیبہ میں قیام رہا،

اس سفر میں علی میاںؒ نے حالات حاضرہ کے پیش نظر عرب ممالک کو مشورے دیے اور جدہ قیام کے دوران اسلامی ممالک کے معاشرہ و ماحول میں مادّہ پرستی کے بڑھتے ہوئے اثرات سے بے حد متفکر ہوئے اور لکھنؤ واپس آکر ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے آخری باب ''عالم عربی کی قیادت'' کو مختصر تمہید کے ساتھ شائع کروایا۔ اس عربی رسالے کو کیف یتعبد العرب مکانتھم الائقہ بھم و یحافظون علیھا؟ (عرب اپنے شایان شان منصب قیادت کیسے واپس لے سکتے ہیں اور کیسے اس کو باقی رکھ سکتے ہیں؟) کا عنوان دیا گیا۔ اس رسالے کو مملکت سعودیہ اور عربی حلقوں میں بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ ☆ ۶ / اکتوبر ۱۹۹۰ء کو مسلم انٹلکچول فورم لکھنؤ کی طرف سے ''مقامات مقدسہ خطرات اور اندیشے'' کے موضوع پر ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ علی میاںؒ نے جلسہ کی صدارت کی، صدارتی تقریر میں ''برصغیر کے مسلمانوں کی حجاز مقدس اور حرمین سے قلبی وابستگی اور دائمی تعلق'' کا ذکر کیا۔

☆ ۷، ۸، ۹ / اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ''حمد و مناجات'' کے موضوع پر رائے بریلی میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ یہ سیمینار مولانا محمد ثانی حسنی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کی دعوت پر کیا گیا۔ یہ رابطۃ الادب الاسلامی کا چھٹا سیمینار تھا۔ علی میاںؒ نے ''حمد و مناجات اور ان کی دینی و ادبی قدر و قیمت'' کے عنوان سے مقالہ سپرد قلم کیا جو خطبۂ صدارت کی طرح دیا گیا۔ ☆ ۱۱ / اکتوبر ۱۹۹۰ء کو علی میاںؒ نے اپنے اعزہ کے ساتھ کٹرہ مانک پور کا سفر کیا، ایک جلسہ سیرت میں خطاب کیا اور خاندانی بزرگ شیخ الاسلام قطب الدین محمد الحسنیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔

☆ بابری مسجد رام جنم بھومی کے قضیہ کے حل کے لیے کوششیں جاری تھیں، علی میاںؒ حجاز سے واپس آئے، بابری مسجد رام جنم بھومی کی مصالحتی میٹنگ کی نمائندگی کے لیے ایک روز قبل وزیر اعظم چندر شیکھر علی میاںؒ کا نام تجویز کر چکے تھے۔ ہندوستان سیاسی حلقوں اور اس قضیہ سے دلچسپی رکھنے والوں پر یہ

خبر بجلی بن کر گری۔ بعض نے مسرت کا اظہار کیا اور بعض لوگوں نے اس مسئلہ کے حل کے لیے علی میاںؒ کے انتخاب کو غلط بتایا اور ان پر الزامات لگانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانے میں علی میاںؒ کا ایک بیان قومی آواز لکھنؤ میں ۱۴/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو شائع ہوا، جس میں اس بے بنیاد الزام کی تردید کی گئی تھی کہ "انھوں نے یا ان کے والد نے کسی کتاب میں مندر توڑ کر مسجد بنانے کی بات لکھی، اس مسئلہ پر تحقیق کے ساتھ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ایسا تاریخی مواد اکھٹا کیا جس کے بعد اس مسئلہ پر اب علمی انداز میں شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے"۔

علی میاںؒ کے سفر حجاز سے واپسی پر یونس سلیم گورنر بہار اور کرشن کانت جی گورنر آندھرا پردیش نے علی میاںؒ سے دوبارہ کانچی پورم چلنے کی درخواست کی۔ صحت کی کمزوری کی وجہ سے علی میاںؒ نے معذرت کی۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب اور دونوں صاحبان اس مسئلہ کے حل کے لیے کانچی پورم گئے لیکن ناکام واپس ہوئے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے علی میاںؒ کے مشورے سے ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ہندوستان کے ممتاز علماء دہلی میں جمع ہوئے۔ علی میاںؒ نے اپنی تقریر میں بابری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعہ سے ملک کو پہنچنے والے نقصانات سے آگاہ کیا اور اس کو حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ علی میاںؒ نے اس پیچیدہ مسئلہ کے حل کے لیے نظام الدین، سہارنپور اور رائے پور کی خانقاہوں میں دعا و ختم کے اہتمام کی درخواست کی۔

☆ ۱۷/اکتوبر کو علی میاںؒ کی علماء کے وفد کے ساتھ ہندو مذہبی پیشواؤں اور وزیراعظم وی۔ پی۔ سنگھ سے ملاقات ہوئی اور ملک کی بقاء و سالمیت کے لیے تین بنیادی چیزوں کا پُر زور انداز میں ذکر کیا اور کہا کہ اس ملک کی بقاء اور تحفظ کے لیے جمہوریت، لامذہبیت اور عدم تشدد بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ چپکے چپکے اجودھیا میں کارسیوا انجام دینے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب اور گورنر بہار و گورنر آندھرا پردیش کی

کوششوں کے باوجود نفرت دہشت خوف وخطرہ کی فضا پیدا کردی گئی لیکن حکومت کی کوشش سے کارسیوا کی مہم کوناکام بنایا گیا، ملک میں بے یقینی اور قیاس آرائی کی فضا چھائی رہی۔ وزیراعظم وی. پی سنگھ نے استعفیٰ دے دیا۔ بابری مسجد کے مسئلہ کو باہمی بات چیت سے حل کیے جانے پر زور دیا جاتا رہا۔ شری چندر شیکھر نے وزارت عظمیٰ کے لیے اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا۔ ملائم سنگھ یادو یوپی کے وزیراعلیٰ منتخب ہوئے۔ مسلمان عام طور پر اس انتخاب سے بے حد خوش ہوئے، مسجد کو مندر کی شکل میں تبدیل ہوجانے سے بچالیا گیا۔ اجودھیا میں خوں ریزی اور تصادم کے واقعات پیش نہیں آئے لیکن رام جنم بھومی تحریک کے حامیوں کا غصہ دوسرے اضلاع کے پُرامن اور بے قصور مسلمانوں پر گرا، تیرتھ یاترائیں نکالی گئیں اور ہندوستان کی فضا کو آتش گیر اور ہنگامہ خیز بنادیا گیا۔ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے، کھلی ہوئی جارحیت سے عمومی خوف وہراس کا ماحول بن گیا۔ علی میاںؒ نے ملک کے تحفظ و بقاء کے لیے مذہبی جنون، ناعاقبت اندیش خانہ جنگی پر قابو پانے کو ضروری قرار دیا، تحریک پیامِ انسانیت کو ملک گیر پیمانہ پر عام اور مؤثر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

☆ ۱۸ر نومبر ۱۹۹۰ء کو کانپور کے علماء اور فکر منداصحاب کا وفد مولانا منظور احمد مظاہری کے ساتھ علی میاںؒ سے ملا، جس نے یہ تجویز رکھی کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو مسلم پرسنل لابورڈ کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے اور نفقہ مطلقہ کی طرح اس مسئلہ کا حل بھی مثبت تعمیری انداز، گفت وشنید سے کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے ملک اور مسلمانوں دونوں بڑی آزمائش سے بچ جائیں گے۔ علی میاںؒ بورڈ کے ممتاز رکن اور صدر تھے مولانا نے مشورہ دیا کہ اس مسئلہ پر ایسا فارمولا مرتب کیا جائے جو شرعاً قابل قبول ہو، انتظاماً قابلِ عمل ہو کسی کی اس پر شرعی یا دینی حیثیت سے اعتراض کی گنجائش نہ ہو، علی میاںؒ نے وفد کو امیر شریعت منت اللہ رحمانیؒ کے پاس بھیجا کہ وہ بورڈ کے جنرل سکریٹری تھے ان کی منظوری کے بعد ہی

بورڈ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔☆ ۳/دسمبر ۱۹۹۰ء کو دہلی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا جلسہ منعقد کیا گیا لیکن علی میاںؒ ہوائی جہاز کے ملتوی ہو جانے کی وجہ سے اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے۔ ۲/دسمبر ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں اُتر پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک جلسہ ''دعوت امن واتحاد'' کے موضوع پر ہوا۔ علی میاںؒ نے افتتاحی مقالہ پڑھا، جس میں تشدد ظلم، ناانصافی کے مضر اثرات کو تاریخی اور اخلاقی اقدار کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا۔

☆ پیامِ انسانیت کے نام سے آنکھ کے آپریشن کا ایک مشترک کیمپ جگدیش پور ضلع سلطان پور میں لگایا گیا۔ اس کیمپ کا اہتمام مدرسہ تعلیم القرآن کے بانی و ذمہ دار ماسٹر اشفاق احمد نے کیا تھا۔ اس میں بلاتفریق مذہب وملت کے طبقات اور برادریوں کے آنکھ کی عملی جراحی کی خدمت انجام دی گئی تھی۔ علی میاںؒ نے مختصر خطاب کیا، جس میں بصارت کی نعمت اور آنکھ کی قدر و منزلت پر روشنی ڈالی۔ اسی زمانہ میں علی میاںؒ نے ایک طویل مضمون لکھا جس میں فرقہ وارانہ فسادات خوف و دہشت کی فضا میں موجودہ دور کے ہندوستانی مسلمانوں کو راہِ عمل کی نشاندہی کی۔

☆ ۱۳/دسمبر ۱۹۹۰ء کو روس ترکستان کا مؤقر وفد دارالعلوم آیا جن میں نو ترکستانی عالم تھے۔ دارالعلوم کی مسجد میں علی میاںؒ نے عربی میں تقریر کی۔ دوسرے دن دارالعلوم کے عباسیہ ہال میں علماء کا خیر مقدم کیا گیا۔ علی میاںؒ نے مفصل تقریر کی، جس میں دو باتوں پر زور دیا، ایک عوام میں دینداری اور دینی شعور پیدا کرنے کی جدوجہد (جو کسی ملک میں اسلام کے محفوظ رہنے کے لیے ایک مضبوط فصیل ہے) دوسری جدید نسل کا اسلام پر عملی و عقلی طور پر مطمئن ہونا (اور یہ عقیدہ کہ اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے قیادت کر سکتا ہے) ☆ دسمبر ۱۹۹۰ء میں علی میاںؒ نے وزیراعظم چندر شیکھر کو خط لکھا، جس میں رام جنم بھومی بابری مسجد کے بارے میں فارمولہ اور مسئلہ کا حل پیش کیا، جس میں ملک کی خیر خواہی اور اس کی ترقی کی آرزومندی کا جذبہ شامل تھا۔

۱۹۹۰ء میں ہندوستان سے باہر ایسے واقعات وحوادث مسائل ومصائب سامنے آئے جس نے دین وملت کی حفاظت کرنے والوں اور اس کے لیے کوشش کرنے والوں کو بے چین ومضطرب کردیا۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت، ظلم وسفاکی، حکومت واقتدار کی ہوس، بیرونِ ملک عراق کا اپنے ہمسایہ ملک کویت پر قبضہ، قومیت عربیہ کا نظریہ ایسے بے شمار مسائل تھے جن سے مسلمان نبرد آزما رہے۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ج: چہارم)

☆ خلیجی جنگ کے بعد قاہرہ میں ایک کانفرنس مصر کی وزارت اوقاف و شئون الاسلامیہ کی طرف سے ۲۵/ سے ۲۷/ اپریل ۱۹۹۱ء کی گئی۔ علی میاںؒ اس میں شریک نہیں ہوسکے بلکہ ایک طویل مقالہ "خلیجی جنگ کے بعد امت اسلامیہ کا مستقبل" کے عنوان سے بھیجا۔ ☆ جون ۱۹۹۱ء میں نرسمہا راؤ ہندوستان کے وزیراعظم بنائے گئے تو علی میاںؒ نے معمول کے مطابق ان کو ایک خط تحریر کیا، جس میں ملک کی موجودہ تصویر اور اندیشوں کا اظہار کیا۔ ☆ ستمبر ۱۹۹۱ء میں علی میاںؒ اور رفیق سفر مولانا محمد رابع حسنی ندوی سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز (آکسفورڈ یونیورسٹی) کی میٹنگ میں شریک ہوئے۔ علی میاںؒ اس سینٹر کے صدر اور مولانا محمد رابع حسنی رکن انتظامی ہیں۔ اسی دوران اسلامک فاؤنڈیشن واقع لیسٹر میں دعوتی وتحقیقی کام کرنے والوں کے وقیع جلسے میں خطاب بھی کیا۔ جس کا عنوان "دین حق ودعوت اسلام ایک فلک بوس سدابہار درخت ہے"، یہ خطاب مجلس تحقیقات سے رسالے کی شکل میں شائع ہوا۔

☆ ۶/ اکتوبر کو آل انڈیا مسلم انٹلکچول فورم نے لکھنؤ میں علی میاںؒ کی صدارت میں ایک جلسہ کیا، صدارتی تقریر میں علی میاںؒ نے اس بات پر زور دیا کہ "ہندوستان کی سالمیت سیکولرازم پر قائم رہ سکتی ہے۔ "دارالمبلغین" لکھنؤ کی طرف سے ۲۸/ جولائی ۱۹۹۱ء کو "شہدائے اسلام" کے عنوان سے جلسے کا انعقاد کیا گیا، علی میاںؒ

نے اس جلسہ میں خطاب کیا اور بتایا کہ خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں حکمت وقدرتِ الٰہی کی کارفرمائی ہے اور حضرات حسنینؓ کے اقدام میں امت کی رہنمائی ہے۔ یہ تقریر بھی مجلس تحقیقات سے شائع کی گئی۔

☆ ۱۵/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو دارالعلوم تاج المساجد میں رابطہ ادب اسلامی کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ علی میاںؒ نے اس میں شرکت کی۔ دعوتی واصلاحی ادب پر تقاریر میں کلمةً طيبةً كشجرةٍ طيبةٍ أصلها ثابت و فرعها في السّماء سے استدلال کرتے ہوئے ادب کی انقلاب آفرینی غیر معمولی تاثیر اور بقائے دوام کے لیے سوز وساز کو ضروری قرار دیا۔ علی میاںؒ نے صدارتی تقریر بھی کی۔ ☆ ۲۷، ۲۸/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو سیرت طیبہ پر جامعہ سلفیہ بنارس میں کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، علی میاںؒ نے ''شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا سب سے بڑا کارنامہ'' کے عنوان سے خطبہ پڑھا اور بتایا کہ ابن تیمیہؒ ان کی خصوصی علمی انقلابی کوشش یہ ہے کہ ذات صفات الٰہی کی، معرفت حقائق دین کے علم کا ذریعہ صرف نبوت ہے''۔

☆ ۲۲، ۲۳/نومبر ۱۹۹۱ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس منعقد کیا گیا، علی میاںؒ نے اس میں شرکت کی، خطبہ صدارت دیا جس میں ''عائلی قانون کی وحدت کی ضرورت پر جو مبلغانہ اور غیر دانشمندانہ زور دیا جارہا ہے اس پر تنقید اور جرح کی۔ ☆ ۲۹/نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۹۱ء کو بھٹکل اور بنگلور میں پیامِ انسانیت کے سلسلہ میں دو اہم جلسے ہوئے۔ علی میاںؒ نے دونوں جلسوں میں تقریر کی۔ مسلمانوں کے تعلق سے ۱۹۹۲ء میں ہندوستان میں ایسے واقعات پیش آئے کہ علی میاںؒ نے ۱۹۹۲ء کو ہندوستانی تاریخ میں ۱۸۵۷ء سے مشابہت اور مماثلت والا سال قرار دیا۔

☆ دینی تعلیمی کونسل کے صدر کی حیثیت سے ۱۲/جنوری کو مراد آباد میں منعقد کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مفصل خطبۂ صدارت دیا۔ یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو امارتِ شرعیہ بہار اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسوں کے لیے بہار اور نیپال کا سفر

کیا۔ بہار میں پٹنہ، آسنسول بھاگلپور مونگیر میں اصلاح معاشرہ اور پیامِ انسانیت پر تقریریں کیں۔ دارالعلوم نورالاسلام جلپا پور سنسری نیپال میں خواص وعوام کے بڑے مجمع کو خطاب کیا۔ ۲۲ رمئی سے ۲۴ رمئی ۱۹۹۲ء تک بمبئی میں اتحادِ ملت کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ علی میاںؒ نے ''ملک وملت دونوں خطرہ میں'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ☆ ستمبر ۱۹۹۲ء میں سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی کے جلسۂ انتظامی میں لندن گئے، مولانا محمد رابع حسنی ندوی سفر میں ہمراہ تھے، ۱۰ ر ستمبر کو مجلس انتظامی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ۱۸ ر ستمبر کو اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر میں منتخب لوگوں کے مجمع کو خطاب کیا، جس کا عنوان ''امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کے انقلابی اثرات'' تھا۔ اسلامک سینٹر لندن میں عرب نوجوان وفضلاء کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے غیر اسلامی تہذیب واقتدار کے مرکزوں میں مقیم مسلمانوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ ☆ ۱۴، ۱۵، ۱۶ ر نومبر ۱۹۹۲ء کو رائے بریلی میں محمد ثانی حسنی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی نے دعوت فکر اسلامی کے عنوان سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا۔ علی میاںؒ نے اس میں بطور میزبان شرکت کی۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رابطۃ الادب الاسلامی کی آٹھویں کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا موضوع ''خطوط اور مراسلت کا ادب'' تھا۔ ہندوستان اور عالمِ اسلام کے متعدد دانشوروں نے کانفرنس میں شرکت کی، مقالات پڑھے، مندوبین کو ایک پیغام کے ذریعہ آنے والے خطرات سے آگاہ کیا اور راہِ عمل کا پیغام دیا۔ ۱۱ ر نومبر ۱۹۹۲ء کو دارالعلوم میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا جلسہ تھا، اسی دوران وزیر اعظم نرسمہا راؤ کا ذاتی مکتوب علی میاںؒ کے نام آیا۔ یہ خط بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں تھا۔ علی میاںؒ سے ملاقات اور گفت وشنید کی خواہش کا اظہار تھا۔ علی میاںؒ نے خط کا جواب ارسال کیا۔ ۱۵ ر اگست علی میاںؒ نے بورڈ کے اراکین کے ساتھ وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے دو بار ملاقات کی اور اس مسئلہ پر عرب اسلامی وہندوستانی علماء کی قابل احترام رائے بھی پیش کر دی گئی۔ اس ملاقات کے دوسرے

دن دوبارہ وزیراعظم نے خصوصی ملاقات کی۔علی میاںؒ کی معذرت کے باوجود وزارت عظمٰی کی طرف سے اصرار ہوتا رہا۔علی میاںؒ نے اس مختصر ملاقات میں محتاط گفتگو کی۔اس دوبارہ ملاقات کے بعد اخبارات نے بے بنیاد خبریں شائع کیں اور علی میاںؒ پر الزامات لگائے، جس میں کہا گیا کہ علی میاںؒ خود دوبارہ کوشش سے وزیراعظم سے ملے اور انھوں نے مسجد کے انہدام کی اجازت دے دی۔علی میاںؒ نے خط کے ذریعہ الزامات کی تردید بھی کی۔ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک میں ہولناک فسادات اور ہوش ربا جانی مالی نقصان ہوا۔علی میاںؒ نے اپنی تقاریر اور مضامین مسجد کی شکست وریخت کو ہندوستان کی تاریخ کا عظیم سانحہ قرار دیا۔

☆ ۱۰ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو حکومت ہند کی طرف سے چند کھلی ہوئی فرقہ پرست جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا، جماعت اسلامی کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا، علی میاںؒ نے اس کے خلاف اخبارات میں بیان دیا اور بتایا کہ یہ ایک اصلاحی تربیتی دینی وفکری جماعت ہے۔اسی زمانے میں علی میاںؒ نے ۸ر جنوری ۱۹۹۳ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں ’ملک ومعاشرہ کا سب سے خطرناک مرض سفاکی‘‘ کے عنوان سے تقریر کی۔دوسری تقریر ۸ر فروری کو شہر رائے بریلی کے گورنمنٹ کالج کے میدان میں منعقد عظیم جلسہ میں کی گئی، جس کا موضوع ’’ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ‘‘ تھا۔ اس تقریر میں ملک کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان اور عالمی تاریخ کے آئینہ میں مسائل کا تجزیہ وتقابل کیا گیا اور نتائج اخذ کیے گئے۔۸ر جنوری کو محمد یونس سلیم سابق گورنر بہار اور شری کانت جی گورنر آندھرا پردیش کے ہمراہ علی میاںؒ نے وزیراعظم نرسمہاراؤ سے ملاقات کی۔ ملک کی صورت حال مہاراشٹر اور گجرات فسادات موضوع گفتگو رہے۔ ۱۵ر اپریل ۱۹۹۳ء کو مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد کے ساتھ دوبارہ وزیراعظم سے ملاقات کی میمورنڈم پیش کیا، جس میں نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں شرعی قانون کی بقاء وحفاظت کا موقف تھا۔ ۱۵ر مئی ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسلم پرسنل لا بورڈ برائے بازیابی بابری مسجد کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ۲۴ر مئی

۳ ۱۹۹۳ءکو علی میاںؒ نے انجمن الاصلاح میں ''ایک نیا چیلنج اور اس کا مقابلہ'' کے عنوان سے تقریر کی، تقریر میں بنیاد پرستی سے مقابلہ کے لیے یہودیوں وعیسائیوں کی متحدانہ کوششوں پر روشنی ڈالی اور وقت کا اہم خطرہ اور سازش قرار دیا۔ ☆ ۳۰؍جون ۱۹۹۳ء کو پٹنہ میں پیامِ انسانیت کا جلسہ منعقد کیا گیا، علی میاںؒ نے ہندوستان میں عدم تشدد، نامذہبیت اور جمہوریت کے تین پودوں کی سرسبزی، بقاء اور ضرورت پر زور دیا۔ پٹنہ قیام کے دوران امارت شرعیہ اور پھلواری شریف کے بزرگوں سے ملاقات کی۔ محرم کے مہینہ میں دارالمبلغین سے شہدائے اسلام کی یاد میں جلسہ ہوا، علی میاںؒ نے اس میں تقریر کی اور حالات حاضرہ پر فکر مندی کے اظہار کے ساتھ دین کی بقاء وتحفظ کی ذمہ داری یاد دلائی۔

☆ اگست ۱۹۹۳ء میں رابطۃ الادب الاسلامی کی مجلس امناء اور مؤتمر عام کا جلسہ استنبول میں کیا گیا۔ علی میاںؒ نے جلسہ کی صدارت کی اور صدارتی خطبہ دیا، جس میں ادب کی خاصیت اور قومیت کی ترجمانی اقبال کے اشعار کے حوالے کے ساتھ کی۔ ☆ ۲۸؍اگست ۱۹۹۳ء کو علی میاںؒ لندن میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس میں شرکت کے لیے آکسفورڈ گئے پانچ دن قیام رہا۔ اجتماعات میں شرکت کی، علماء اور اہل قلم سے خطاب کیا۔

☆ ۴؍ستمبر ۱۹۹۳ء کو علی میاںؒ شکاگو امریکہ تشریف لے گئے جہاں مذاہب کی ایک عام بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا لیکن جلسہ میں مردوں سے زیادہ عورتوں کی موجودگی مشکوک ذکر جہری دیکھ کر جلسہ میں شرکت پر متردد ہوئے اور بغیر شرکت کیے قیام گاہ واپس آگئے۔ شکاگو قیام کے دوران ۵؍ستمبر کو مالکم ایکس کالج کے ہال میں جلسہ منعقد کیا گیا۔ یہ جلسہ مسلمانوں کی ایک کانفرنس ''اسٹیٹ آف اُمہ کانفرنس'' کی طرف سے تھا، اس موقع پر علی میاںؒ نے ''اسلام اور مغرب'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ مغربی تہذیب کی تنقید اور اس سے مایوسی اور شکایت پر مبنی تھا۔ اسی روز شام کو اسی ہال میں علی میاںؒ کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا، جس میں ''دیارِ مغرب میں مقیم مسلمان نوجوانوں کے نام ایک

ضروری پیغام‘‘ کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ ۶ر ستمبر ۱۹۹۳ء کو تبلیغی مرکز کے دار الحفظ بھی گئے اور حسب حال، حسب ضرورت تقریر کی۔ شکاگو سے واپسی پر دو دن نیویارک میں قیام رہا، شکاگو و نیویارک کے قیام میں متعدد قدیم احباب و فضلاء سے ملاقات کی، نیویارک کی مکی مسجد میں علی میاںؒ کا خطاب ہوا، جس میں مسلمانوں کو اعتقاداً، عملاً اور اخلاقاً اور تہذیب و معاشرہ کے لحاظ سے صاحبِ استقامت مسلمان رہنے کی تلقین کی اور امتیازی اسلامی زندگی گزارنے کا مشورہ دیا۔ ۸ر ستمبر ۱۹۹۳ء کی شام جدہ گئے اور زیارت حرمین شریفین کے بعد ہندوستان واپس آ گئے۔

☆ ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۳ء کو جے پور راجستھان میں آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کا سالانہ اجلاس منعقد کیا گیا، جس میں خاصا وقیع خطبہ صدارت دیا، اس میں اسلامی عائلی شرعی قانون کے تحفظ کی سعی وجدوجہد کی قابل حفاظت تاریخ پیش کی گئی۔ علی میاںؒ نے اس خطبہ صدارت کو کاروانِ زندگی حصہ پنجم میں شامل کیا ہے۔ ☆ سینٹر اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ نے سمرقند و بخارا میں امام بخاری کی یاد میں تحقیقی علمی مرکز کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ علی میاںؒ کو اس مرکز کے تعمیری منصوبوں کے معائنہ کے لیے مدعو کیا گیا، علی میاںؒ سمرقند و بخارا تشریف لے گئے تعمیرات کے منصوبوں کا معائنہ کیا، سمرقند کے تاریخی آثار اور ائمہ دین کے قبور پر فاتحہ پڑھی اور ۲۷ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ہندوستان واپس آئے۔

نومبر ۱۹۹۳ء میں علی میاںؒ اپنے تحریری و تصنیفی کاموں کی تکمیل کے لیے بمبئی گئے، دو ہفتے قیام کیا۔ متعدد اصحاب علم و دین اور قابل اعتماد احباب سے ملاقات کی۔ ☆ ۲ر نومبر ۱۹۹۳ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں دینی تعلیمی کنونشن منعقد کیا گیا۔ علی میاںؒ نے خطبہ صدارت دیا، جس میں تعلیم کے مسائل کو ایمان و یقین عزم و حوصلہ، جوش عمل و ولولہ کار سے حل کرنے کی کوشش پر زور دیا۔ ☆ ۱۱ر نومبر ۱۹۹۳ء کو تحریر و تصنیفی کام کے تکمیل کے سلسلہ میں بمبئی چلے گئے جہاں اپنے مخلص دوست و میزبان محمد بھائی کے گھر دو ہفتے قیام کیا۔

☆ مسلم پرسنل لابورڈ کے جے پور اجلاس میں ۳ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو جمعہ کے دن یوم ودعا منانے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو بابری مسجد کی بازیافت کے لیے تعمیری کوشش کرنے پر آمادہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ۶ر دسمبر کو ارکان بورڈ کی بڑی تعداد تقریباً ۱۵۰ افراد نے دہلی میں وزیراعظم نرسمہاراؤ سے ملاقات کی اور انھیں ان کا وعدہ یاد دلایا اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی بے چینی اور اس مسئلہ پر متفق ہونے کا ذکر کیا لیکن نرسمہاراؤ کی طرف سے مایوسی کا تاثر لے کر وفد واپس آ گیا۔ وزیراعظم سے اس ملاقات کو ٹی.وی پر بھی دکھایا گیا اور ریڈیو پر بھی بتایا گیا لیکن مسئلہ کے حل کی کوئی تدبیر یا کاروائی نہیں کی گئی۔
(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ج: پنجم)

☆ ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک علی میاںؒ نے ہندوستان اور بیرون ہند طویل سفر کیے۔ تعلیمی تحریکی اور تصنیفی کام جاری رہا۔ اپریل ۱۹۹۴ء میں دینی تعلیمی کونسل کا سالانہ اجلاس نجیب آباد میں منعقد کیا گیا۔ علی میاںؒ نے ملّی عزیمت اور اجتماعی فیصلہ کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ اپریل میں ہی رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ کا اجلاس جامعہ سلفیہ بنارس میں ہوا، جس میں حدیث نبوی کے ادبی مقام اور امتیازات کے عنوان کے تحت مقالے پڑھے گئے۔ علی میاںؒ مولانا عبیدالرحمٰن خاں شروانی کے نام سے تعمیر شدہ ہوسٹل کا سنگ بنیاد رکھنے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ سر سیّد ہاؤس میں تقریر کی، میرٹھ میں اصلاح معاشرہ کی تحریک میں شریک ہوئے۔ ☆ اگست ۱۹۹۴ء میں آکسفورڈ لندن، حجاز مقدس مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ ☆ نومبر ۱۹۹۴ء میں دارالعلوم ندوہ پر پولیس نے بغیر کسی اطلاع کے چھاپہ مارا۔ اساتذہ وطلباء کو دھمکایا، حراست میں لیا، دوسرے دن علی میاںؒ نے پریس کانفرنس بلائی۔ پولیس کے اس اقدام پر ہندوستان عرب و دیگر بیرونی ممالک میں ردّعمل ہوا۔

☆ جنوری ۱۹۹۵ء میں جنوبی ہند کے دو سفر کیے۔ ایک بمبئی سے بھٹکل جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں جلسہ عام کو خطاب کرنے کے لیے دوسرا کوچین کا۔ سید

قطب شہید کی کتاب "فی ظلال القرآن" کے تامل ترجمے کے رسم اجراء کی تقریب میں شریک ہونے کے لیے کیا گیا تھا۔ ☆ ۱۹۹۵ء میں سوڈان میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ آیا۔ علی میاںؒ نے مولانا سید سلمان الحسینی کو اپنا نمائندہ اور ترجمان بنا کر بھیجا۔ مولانا سلمان الحسینی نے علی میاںؒ کا مضمون "واقع العالم الاسلامي وما هو الطريق السديد تواجهه واصلاحه" پڑھ کر سنایا۔ ☆ ۱۹۹۵ء میں بستی میں اصلاح معاشرہ کانفرنس، حیدرآباد میں رابطة العالم الاسلامي، گیارہواں علمی مذاکرہ پیامِ انسانیت کے جلسے، مدرسہ کاشف العلوم میں اصلاح معاشرہ کا جلسہ ہوا۔ علی میاںؒ نے سنت کے مطابق زندگی گزارنے کے پیغام کو دوہرایا۔ ☆ ۱۹۹۵ء میں ہی علی میاںؒ نے وزارت اوقاف دوحہ کی دعوت پر دوحہ کا سفر کیا۔ جلسہ میں قيمة الامة الاسلامية بين الامم و دورها في العالم کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ جس میں غزوۂ بدر کو سامنے رکھ کر بتایا کہ آج دنیا میں اسلامی اقتدار شان وشوکت، علمی وتہذیبی ترقی اُسی فتح کا نتیجہ و صدقہ ہے اس لیے تمام مسلمانوں کو امتیاز عقیدہ، توحید پر استقامت اور دعوت الی اللہ اور نفاذ شریعت کے لیے جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ خواتین اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے علیحدہ علیحدہ خطاب کا انتظام کیا گیا، جس میں علی میاںؒ نے سادگی، قناعت، پردہ، حیات کفاف کا پیغام عالمِ اسلام کے حقیقت پسندانہ جائزے کے ساتھ مغربی تہذیب وافکار سے مرعوبیت کے خاتمہ کا درس دیا۔

☆ جون ۱۹۹۵ء میں دہلی میں مسلم پرسنل لابورڈ کے اجلاس میں شریک ہوئے، مرکز نظام الدین گئے، مولانا انعام الحسن صاحب کی تعزیت کی۔ ☆ دارالعلوم کے جلسہ انتظامیہ منعقدہ جولائی ۱۹۹۵ء میں علی میاںؒ نے مبسوط مقالہ پڑھا، علی میاںؒ نے کہا کہ مدارس اور علماء کو حالات اور مسائل سمجھ کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ ☆ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو احمد آباد میں پرسنل لابورڈ کا بارہواں اجلاس

ہوا، جس میں آئندہ میقات کے لیے علی میاںؒ کو بالاتفاق بورڈ کا صدر منظور کیا گیا۔ علی میاںؒ نے اپنی تقریر میں سو فیصد مسلمانوں سے سو فیصد اسلام پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا۔ اصلاح معاشرہ کے کام اور دارالقضاء کے قیام کی اہمیت بیان کی گئی۔ ☆ غازی پور میں تحفظ مدارس کانفرنس، اعظم گڑھ میں رابطة الادب الاسلامی کا جلسہ ہوا، علی میاںؒ نے سوانح و تذکرہ نگاری کے شرائط و آداب پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ☆ ۲۸/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو حجاز مقدس گئے۔ رابطة العالم الاسلامی کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ اس سفر میں عالم اسلام اور عالم عربی میں دعوتی و تحریکی خلا کو شدت سے محسوس کیا۔ اس موقع پر آخری تقریر میں اس خطرناک سازش کی طرف متوجہ کیا جو عالمی پیمانہ پر خود اسلامی ممالک سے اسلام کے اثر کو دور کرنے اور مغرب کا ہمنوا بنانے کے لیے کی جارہی ہے۔

☆ ۱۶/ جنوری ۱۹۹۶ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں علی میاںؒ نے شرکت کی۔ ائمہ مساجد سے جمعہ کے خطبہ میں اصلاح معاشرہ کے عنوان پر بات کرنے کی اپیل کی گئی۔ ☆ دارالعلوم میں رواق عبدالحیٰ کے نام سے دارالاقامہ کا افتتاح کیا۔ مئی ۱۹۹۶ء میں علی میاںؒ بمبئی گئے، دو ہفتے قیام کے دوران تصنیف و تالیف میں مصروف رہے، عربی کی السيرة النبويه کے دسویں ایڈیشن کے وقت جو اضافے کیے گئے تھے انھیں اردو کتاب ''نبی رحمت'' میں منتقل کیا۔ ''کاروانِ زندگی'' کی جلد ششم کی تکمیل میں مصروف رہے۔ ☆ ۳/ جولائی ۱۹۹۶ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ندوۃ العلماء کا جلسہ انتظامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

☆ ۵/ اگست کو علی میاںؒ اپنے رفیق سفر مولانا محمد رابع حسنی اور حاجی عبدالرزاق صاحب کے ہمراہ استنبول ترکی گئے۔ علی میاںؒ کی دینی، دعوتی، ادبی تدریسی کارناموں نیز ان کی شخصیت کے امتیازی پہلوؤں پر ایک علمی مذاکرہ ہوا۔ جس میں عالم اسلام کے چنیدہ محققین ادیب، اہل علم شریک ہوئے۔ سولہ گرانقدر مقالے پڑھے گئے۔ ☆ استنبول سے واپسی میں علی میاںؒ لندن گئے، آکسفورڈ

اسلامک سینٹر کی مرکزی عمارت کا معائنہ کیا۔ نزھۃ الخواطر کے کمپیوٹر میں محفوظ کرنے کا عمل ملاحظہ کیا، نوٹنگھم میں لڑکیوں کے دینی تعلیمی مدرسہ جامعۃ الھدیٰ (جو ندوۃ العلماء کے تعلیمی نصاب کے مطابق کھولا گیا ہے) کی تقریب افتتاح کے بعد حجاز سے عمرہ وزیارت کے بعد ہندوستان آئے۔ ☆ اسی سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شیخ یوسف القرضاوی کے خطاب ہوئے۔ ☆ حیدرآباد میں رابطۃ العالم الاسلامی کا تاریخی سیمینار، اس کے علاوہ جامعۃ الرّشاد، اعظم گڑھ میں سید سلیمان ندویؒ پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا، علی میاںؒ شریک محفل ہوئے مقالات پڑھے۔ ☆ دسمبر ۱۹۹۶ء میں علی میاںؒ رابطۃ العالم الاسلامی کی شاخ اور ذیلی کمیٹی مجلس الاعلیٰ العالمی للمساجد لرابطۃ العالم الاسلامی کی دعوت پر مولانا عبداللہ الحسنیؒ اور حاجی عبدالرزاق (مستقل رفیق سفر اور معاون) کے ساتھ حجاز مقدس گئے۔ ۱۶/ دسمبر کو رابطۃ کے اجلاس میں شرکت کی۔ علی میاںؒ نے مؤتمر میں مساجد کے مقام و مقصد رعایت اور دوسرے مذاہب کے معابد کے مقابلے میں ان کے امتیاز پر روشنی ڈالی۔

☆ بیت اللہ شریف کی صفائی اور تعمیری کاموں کے بعد اس کے عمومی داخلے کا انتظام کیا گیا تھا۔ رابطہ کے ارکان کو بھی مدعو کیا گیا۔ ۸/ شعبان ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۸/ دسمبر ۱۹۹۶ء کو فجر بعد صبح ساڑھے چھ بجے کا وقت مقرر ہوا۔ علی میاںؒ شدید ضعف اور پیروں کی تکلیف کی وجہ سے وہیل چیئر پر بیت اللہ کے قریب پہنچ گئے۔ علی میاںؒ کو کلید بردارِ کعبہ جناب شیبی صاحب نے زینہ چڑھ کر باب کعبہ تک آنے کی دعوت دی۔ شاہ سعود کے پوتے امیر مشعل محمد بن سعود، علی میاںؒ کو سہارا دے کر سیڑھیوں سے اوپر لے گئے۔ شیبی صاحب نے کلید کعبہ، درِ کعبہ پر رکھ کر اشارہ کیا کہ علی میاںؒ اپنے دست مبارک سے دروازہ کھولیں اور بیت اللہ میں داخل ہوں۔ علی میاںؒ نے اندر تشریف لے جا کر رکنِ یمانی پر دوگانہ ادا فرمایا۔ امیر مشعل نے دعا کی درخواست کی۔ علی میاںؒ نے پوری ملت اسلامیہ

کے لیے اور خاص طور پر حرمین شریفین کے تحفظ کے لیے دعا فرمائی۔

(مفکر اسلام۔ مولانا بلال عبدالحی حسنی۔ ص: ۴۵۰)

علی میاںؒ پہلے ہندوستانی ہیں جن کو یہ اعزاز نصیب ہوا۔ خبر عالمِ اسلام میں پھیل گئی، ہندوستانی مسلمانوں نے بہت فخر محسوس کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ علی میاںؒ نے اِس اعزاز کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز کہا۔

☆ ۱۹ر دسمبر کو علی میاںؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے، ۵ دن قیام فرمایا۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو جدہ گئے۔ رابطہ ادبِ اسلامی کی نشستوں میں شرکت فرمائی۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ج: ششم)

☆ علی میاںؒ اتحادِ ملت کے لیے بڑی فکرمندی رکھتے تھے۔ سلفیوں کے ذریعہ مذاہب اربعہ کے خلاف مہم شروع ہوئی تو آپ نے اُسے وقت کا سب سے بڑا فتنہ قرار دیا۔ علی میاںؒ نے ایک مفصل خط تحریر فرمایا جو اہل حدیث علماء اور قائدین کو ارسال کیا گیا۔ عرب کے مفتی اعظم علامہ عبدالعزیز بن بازؒ نے خصوصیت سے اس کا جواب دیا اور اپنے معتدل نظریے کی وضاحت کی۔

☆ ۱۶، ۱۷ر مارچ ۱۹۹۷ء کو اردو اکیڈمی لکھنؤ کے زیر اہتمام ایک سیمینار ''مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ کی علمی تصنیفی کارناموں'' پر منعقد کیا گیا۔ علی میاںؒ نے خطبہ صدارت میں والد ماجد کی تصنیفات کی خصوصیات بیان کیں، علماء فضلاء نے مقالات پڑھے۔

☆ ۴، ۵، ۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو پٹنہ میں خدابخش لائبریری اور مدرسہ شمس الہدیٰ کے زیر انتظام رابطہ ادب اسلامی کا جلسہ ہوا جس کا موضوع تھا ''اسلامی نشاۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ''۔ علی میاںؒ نے صدارت فرمائی، خطبہ صدارت میں ادب کے تعمیری پہلو کو اُجاگر کرنے پر زور دیا۔

☆ ۲۴، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو لاہور میں رابطہ کا اجلاس ہوا، جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت، صدر پاکستان فاروق احمد لغاری نے کی۔ علی میاںؒ نے افتتاحی تقریر فرمائی۔ ''حرمین شریفین کے سفرنامے'' اس سیمینار کا موضوع تھا۔ اس سفر میں ضعف و

نقاہت کے باوجود علی میاںؒ رائے ونڈ کے تبلیغی مرکز، لاہور کی شاہی مسجد (جہاں سلوک و ریاضت کے ایام گزارے تھے) شیر انوالہ (جہاں احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا تھا) تشریف لے گئے۔ یہ علی میاںؒ کا پاکستان کا آخری سفر تھا۔

☆ ۶ ردسمبر ۱۹۹۷ء کو علی میاںؒ رابطۃ العالم الاسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ علی میاںؒ نے احرام کی حالت میں جلسہ میں شرکت فرمائی۔ اختتامی جلسہ کو خطاب فرمایا۔ چند روز مکہ مکرمہ میں قیام کے بعد مدینہ منورہ حاضری ہوئی۔

☆ ۵ر مارچ ۱۹۹۸ء علی میاںؒ نے جودھپور کا سفر کیا اور حاجی عبدالغفور صاحب نقشبندی کے پوتے محمد حسن غوری کی دعوت پر ان کے مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ایک جلسہ کو خطاب کیا۔ اس کے علاوہ پیامِ انسانیت کے جلسہ میں شرکت فرمائی اور خطاب فرمایا۔

☆ ۲۵ راپریل ۱۹۹۸ء کو شدید ضعف کے باوجود علی میاںؒ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مجلس عاملہ کے جلسے میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لے گئے، وہاں سے دوسرے دن بذریعہ کار علی گڑھ گئے۔ دینی تعلیمی کونسل کے جلسہ کی صدارت فرمائی، خطاب کیا۔ یونیورسٹی کے اسٹاف اور اونچے درجے کے طلباء سے خصوصی خطاب فرمایا۔

☆ ۱۸ رمئی کو بنگلور میں میڈیا سینٹر کا افتتاح فرمایا، اجلاس کی صدارت کی خطاب فرمایا۔ بنگلور سے بھٹکل تشریف لے گئے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں پانچ روز قیام فرمایا، مختلف مقامات پر تقریریں بھی ہوئیں۔

☆ ۶ رجون ۱۹۹۸ء سے پونہ میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار شروع ہو رہا تھا۔ علی میاںؒ بھٹکل سے پونہ تشریف لے گئے۔ سیمینار کا موضوع تھا ''تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں'' علی میاںؒ نے صدارت فرمائی۔ پونہ کے مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے عرب طالب علموں سے خصوصی خطاب فرمایا۔ پونہ میں پیامِ انسانیت کا جلسہ ہوا، جس میں علی میاںؒ نے تقریر فرمائی۔ پونہ سے واپسی میں اندور مولانا معین اللہ صاحب ندوی کی عیادت کے لیے گئے۔ اندور

سے دہلی جا کر قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی عیادت کی اور لکھنؤ واپس تشریف لائے۔

☆ ۲۰۔۲۵ اگست ۱۹۹۸ء کو عمان میں "رابطہ ادب اسلامی" کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ رابطہ کا صدر دفتر ریاض سے عمان منتقل کیا گیا۔ علی میاںؒ نے رابطہ کے جلسوں میں شرکت کی اس کے صدر دفتر کا افتتاح کیا۔ اس سفر میں مولانا محمد رابع ندوی، مولانا محمد واضح رشید ندوی، مولانا سعید الرحمٰن ندوی، ڈاکٹر اجتباء ندوی، بھائی عثمان حیدر آبادی اور حاجی عبدالرزاق شریک سفر تھے۔

☆ ۲۳ راگست کو شاہی محل میں خصوصی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں عمان کے امیر حسن جن کو علی میاںؒ سے گہری عقیدت تھی، دعوت کے میزبان تھے۔ رسالہ "اسمعوها منی صریحة ایها العرب" (اے عربو! میری بات صاف صاف سنو!) بڑے جوش کے ساتھ پڑھا جس کو بہت پسند کیا گیا۔ وزارۃ الاوقاف، جامعۃ الزرقاء اور جامعہ اہل بیت میں علی میاںؒ کے اعزاز میں جلسے ہوئے۔ ☆ ۲۶ راگست کو براہ جدہ، مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ چار روز قیام میں طواف وعمرہ اور زیارت کے علاوہ بعض خصوصی دعوتوں میں شرکت فرمائی۔ یکم ستمبر ۱۹۹۸ء کو مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، پانچ روز قیام فرمایا۔

☆ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ء قاری محمد قاسمؒ (جو علی میاںؒ کے مجاز طریقت تھے) کا درس قرآن کا ختم تھا ان کی خواہش پر علی میاںؒ مدراس تشریف لے گئے۔ تقریب میں شرکت فرمائی اور ایک بڑے مجمع کو خطاب کیا۔ دوسرے دن تبلیغی مرکز میں خطاب فرمایا۔

☆ ۱۱ را کتوبر ۱۹۹۸ء کو کانپور میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام "تحفظ ختم نبوت کانفرنس" کے افتتاح کے لیے تشریف لے گئے۔ قرآن کریم کی آیت "الیوم اکملت لکم دینکم" کی روشنی میں مفصل اور مؤثر خطاب فرمایا۔ ☆ ۱۴ رنومبر ۱۹۹۸ء کو پیام انسانیت کا جلسہ گیا میں منعقد ہوا۔ علی میاںؒ نے جلسے کی صدارت فرمائی اور خطاب کیا۔

☆ نومبر ۱۹۹۸ء میں سرکاری اسکولوں میں یہ سرکلر جاری کیا گیا کہ وندے ماترم کا گیت پڑھنا ہر ایک پر لازم اور ضروری ہے۔ یہ ایک مشرکانہ منافقانہ اور عقیدہ توحید کے خلاف گیت ہے۔ مسلمانوں کو اس سرکاری حکم نے

سخت پریشانی میں مبتلا کردیا، دینی تعلیمی کونسل کے کئی جلسے علی میاںؒ کی صدارت میں ہوئے۔ مسئلہ پر تشویش ظاہر کی گئی، قانونی احتجاج کیا گیا۔ میڈیا اور اخبارات کے نمائندوں کے سامنے علی میاںؒ نے فرمایا:

"مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ اہمیت ان کے عقیدۂ توحید، کی ہے اور وہ اس کی حفاظت کو ایمان کی شرط سمجھتے ہیں۔ ہماری مخالفت صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہے، یہ خالص دینی اور شرعی مسئلہ ہے...... اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میرا مشورہ ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹالیں"۔

☆ دبئی کے بین الاقوامی جائزۂ قرآن کا عالمی دینی علمی اعزاز

☆ دبئی کے بین الاقوامی جائزہ قرآن کے سرکاری ادارہ نے ۱۹۹۸ء کی ممتاز علمی و اسلامی شخصیت کی حیثیت سے علی میاںؒ کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا۔ حکومت نے علی میاںؒ کے لیے دبئی کا ایک مخصوص جہاز لکھنؤ ایرپورٹ بھیجا۔ علی میاںؒ اپنے رفقاء مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید سلمان الحسینی، مولانا عبداللہ حسنیؒ، بھائی عثمان حیدرآبادی اور حاجی عبدالرزاق کے ہمراہ ۶ رجنوری کو لکھنؤ سے دبئی گئے، ایوارڈ کے ساتھ تقریباً سوا کروڑ روپیہ کی رقم تھی جس کو علی میاںؒ نے دینی تعلیمی اداروں کی اعانت اور عطیہ کرنے کا اعلان کیا۔ ۹ رجنوری ۱۹۹۹ء کو خصوصی جہاز سے اپنے رفقاء کے ساتھ لکھنؤ واپس تشریف لائے۔ اسی دن ۲۰ ررمضان المبارک کو رائے بریلی تشریف لے گئے۔

۲۷، ۲۸ رفروری ۱۹۹۹ء کو سبیل الرشاد بنگلور میں رابطہ ادب اسلامی کا اجلاس ہوا۔ علی میاںؒ نے افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی۔ ادب کے صحیح استعمال پر زور دیا اور دین سے اس کے تعلق کا تذکرہ فرمایا۔ ۲۸ رفروری ۱۹۹۹ء کو علی میاںؒ نے عربی مقالات کی نشست میں اپنا مقالہ پیش فرمایا جو حضرت یوسفؑ کے قصہ کے تقابلی مطالعہ سے متعلق تھا۔ اختتامی نشست میں علی میاںؒ کی آخری تقریر ہوئی۔ ۲۸ رفروری

کو سبیل الرشاد کے جلسہ میں فارغ ہونے والوں کو سندیں تقسیم فرمائیں۔

☆ یکم مارچ کو کئی مدارس کے جلسوں میں خطاب اور پیامِ انسانیت کے جلسے میں تقریر فرمائی۔ ۲/مارچ کو علی میاںؒ جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے ذمہ داروں کے ساتھ بھٹکل تشریف لے گئے، دو روز قیام رہا۔ ۳/مارچ کو جامعہ بھٹکل میں جلسہ میں شرکت فرمائی۔ محمد الیاس بھٹکلی نے سپاس نامہ پیش کیا۔ علی میاںؒ نے خطاب فرمایا۔ ۴/مارچ کو جامع مسجد بھٹکل میں عبدالباری ندوی بھٹکلی کے درسِ قرآن کے ختم میں شرکت فرما کر دعا فرمائی۔

☆ اس سفر سے واپسی کے چند ہی روز بعد ۱۷/مارچ کو علی میاںؒ پر فالج کا حملہ ہوا۔ جسم کا داہنا حصہ اور زبان متاثر ہوئی۔ فوری تدابیر اور علاج کیا جانے لگا...... علی میاںؒ کی علالت کی خبر عام ہوتے ہی ملک و بیرونِ ملک عیادت کرنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دعاؤں کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ طبیعت اصلاح کی طرف مائل ہوئی۔

☆ ۱۲/تا ۱۴/جون ۱۹۹۹ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تبلیغی جماعت کا اجتماع منعقد ہوا، جس میں اجتماع کے دوسرے دن علی میاںؒ نے علالت کے باوجود عظیم مجمع کے سامنے سورۃ انفال کی آیت یٰـاَیُّهَـا الَّـذِیْنَ آمنوا ان تتّقوا اللّٰـہَ یَجْعَلْ لکم فرقانا (اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے (تقویٰ اختیار کرو گے) تو اللہ تمہیں ایک شانِ امتیازی عطا فرمائے گا) کی روشنی میں تیس منٹ تقریر فرمائی۔

☆ خودنوشت کاروانِ زندگی کی ساتویں جلد اسی بیماری کے دوران مکمل فرمائی۔ جولائی ۱۹۹۹ء میں کتاب شائع ہوئی۔ یہ علی میاںؒ کی آخری تصنیف ہے۔

☆ ۲۹/نومبر کو "دارِ عرفات" رائے بریلی میں علی میاںؒ کی آخری تقریر ہوئی۔ علی میاںؒ نے مؤثر انداز میں خطاب فرمایا۔

☆ ۲۹/نومبر کو اچانک تنفس کا شدید دورہ پڑا۔ اللہ سے دعا اور دوا علاج کا اہتمام کیا گیا۔ فجر ہوتے ہوتے صحت بحال ہوگئی۔ علی میاںؒ نے فجر کی نماز

جماعت سے ادا فرمائی۔

☆ ''سلطان برونائی ایوارڈ'' سلطان برونائی کی جانب سے ایک ایوارڈ علوم اسلامیہ کے کسی شعبہ میں امتیاز پر عالم اسلام کی کسی شخصیت کو آکسفورڈ کے اسلامک سینٹر کے توسط سے دیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۹ء کے لیے اسلامی شخصیات کی تاریخ و تذکرہ نویسی کے موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے علی میاںؒ کا انتخاب کیا گیا۔ علی میاںؒ کی علالت کے پیش نظر یہ طے کیا گیا کہ یہ اعزاز دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہی ایک تقریب میں علی میاںؒ کو پیش کر دیا جائے۔ ۲۰؍جولائی کی تاریخ طے کی گئی۔ سلطان حسن بلقیہ کے نمائندے اپنے رفقاء کے ساتھ دہلی پہونچ گئے۔ لیکن حکومت نے سیکورٹی کی دشواری کا عذر کر دیا۔ اِن حضرات کو لکھنؤ جانے کی اجازت نہیں دی۔ علی میاںؒ نے مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کو اپنا نمائندہ بنا دیا۔ انھوں نے دہلی جا کر یہ ایوارڈ وصول کیا۔ علی میاںؒ نے اس ایوارڈ کی رقم سے (جو تقریباً بیس لاکھ روپے تھی) مدارس، مکاتب کے علاوہ دین کے خدمت گزاروں اور اہل تعلق کو حسب مراتب عنایت فرمائی۔

☆ والد ماجد مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ کی تصنیف ''نزھة الخواطر'' دار عرفات لکھنؤ نے ''الاعلام بمن في تاريخ الهند من الاعلام'' کے نام سے نہایت اہتمام سے شائع کی جس پر آپ نے دلی مسرت کا اظہار فرمایا۔

☆ معمول کے مطابق ستمبر ۱۹۹۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری درجات کے طلباء کی ذہنی تربیت کے لیے دار عرفات رائے بریلی میں خصوصی درس کا اہتمام کیا گیا۔ علی میاںؒ نے اپنی چار منتخب کتابوں کے مقدمات کا درس دیا، ان کی یہ اہم دعوتی و فکری کتابیں یہ تھیں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين''، ''رجال الفكر والدعوة''، ''الأركان الأربعة''، الصراع بين الفكرة الاسلاميه والفكرة العوبية اور آخری روز ''اوائل الصحاح والسنن'' کا درس دیا۔

☆ ادارہ دارِ عرفات کی طرف سے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب اور تحریک سید احمد شہیدؒ کے موضوع پر تحریری مقابلہ ہوا۔ شرکت کرنے والے طلبا کو علی میاںؒ کے دستِ

مبارک سے انعامات سے سرفراز کیا گیا۔

۳۰ رستمبر کو علی میاںؒ نے اپنے خطاب میں طلباء کو داعیانہ کردار اختیار کرنے، حالات سے واقفیت اور اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کام کرنے کی نصیحت کی۔ نئی نسل کے ایمان وعقیدے کی حفاظت اور بقاء پر خصوصی زور دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی قرآنی وصیت ''ماتعبدون من بعدي'' کی تذکیر فرمائی۔

☆ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تیرہواں کل ہند اجلاس ۲۸ ؍تا ۳۰ ؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ممبئی میں منعقد ہوا۔ علی میاںؒ اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی (معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء) نے آپ کا صدارتی خطبہ پڑھ کر سنایا۔ جس میں علی میاںؒ نے آگاہ کیا کہ مسلمان اگر پرسنل لا یعنی شرعی عائلی قانون میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو بس آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ یہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہ جائیں، فلسفہ اخلاق، فلسفہ نفسیات اور فلسفہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت اور تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا''۔

اِس اجلاس میں جو انتخابی اجلاس تھا ممبران کا انتخاب عمل میں آیا، علی میاںؒ کو آئندہ مدت کے لیے بالاتفاق صدر منتخب کیا گیا۔

☆ ۲۹ ؍نومبر ۱۹۹۹ء کو دینی تعلیمی کونسل کے لکھنؤ اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، علی میاںؒ نے باوجود علالت نہ صرف اجلاس میں شرکت فرمائی بلکہ مختصر خطاب بھی فرمایا۔

☆ آخری ہفتہ شعبان میں (علی میاںؒ) رائے بریلی تشریف لے گئے۔ وہ اس بستی سے گہرا قلبی تعلق رکھتے تھے...... یہ ان کا وطن بھی ہے...... اپنے سفروں اور علمی دعوتی کاموں کے سلسلہ میں بکثرت باہر رہنے کے باوجود جب بھی موقع ملتا یہاں پہنچ جاتے اور چند دن مسجد دائرہ شاہ علم اللہ اور اس سے متعلق فضاؤں سے تقویت حاصل کرتے۔ اپنی علالت کے زمانے میں طویل مدت سے لکھنؤ میں زیر علاج تھے، دو تین

دن کے لیے رائے بریلی تشریف لے گئے۔ معالج حضرات بھی ساتھ تھے، باہری حصہ بنگلہ میں قیام فرمایا گھر کے اندر بھی تشریف لے جاتے تاکہ خاندان کی خواتین کو زحمت نہ اُٹھانی پڑے...... مسجد اور قبرستان بھی گئے، مسجد میں تحیۃ المسجد پڑھی (دو رکعت مسجد کے حجرے میں دو رکعت مسجد کے صحن میں) اس کے بعد تکیہ شاہ علم اللہ کے اپنے خاندانی قبرستان، علماء اور مشائخ وقت کی قبروں پر جاکر دعا فرمائی۔ لکھنؤ واپس آگئے۔

☆ رمضان المبارک کا مہینہ ہر سال رائے بریلی میں گزارنے کا معمول تھا۔ اطباء اور معالجین نے لکھنؤ سے باہر جانے کو احتیاط کے خلاف قرار دیا، لکھنؤ رہنے پر اصرار کیا، روزہ رکھنے، تراویح بیس رکعت کا معمول جاری رہا۔ معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ رمضان المبارک میں اپنے دوسرے معمولات (بارہ مرتبہ سورہ یٰسین، ارشاد و توجیہ، وعظ و تذکیر، خطوط کے جواب، استفادہ اور بیعت کا سلسلہ) بھی جاری رہے...... قیام گاہ پر ہی باجماعت نماز ادا فرماتے رہے...... علالت کا دسواں مہینہ چل رہا تھا...... اطباء علالت کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ علالت کی شہرت کے سبب دور دور سے اہل تعلق عیادت کرنے آرہے تھے۔ رمضان کا دوسرا عشرہ ختم ہونے پر رائے بریلی جانے کا تقاضا بہت بڑھ گیا۔ تکیہ رائے بریلی میں آخری عشرہ گزارنے کی اطباء سے اصرار کیا، انھوں نے منع کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نظر احمد، ڈاکٹر عبدالمعبود خاں (گرین کراس ہاسپٹل) اور ڈاکٹر محسن جلیل شمسی نے آپس میں مشورہ کرکے پورے طبی سامان کے ساتھ رائے بریلی جانے کی اجازت دے دی، جس کا نظم ڈاکٹر عبدالمعبود نے کیا۔

☆ رائے بریلی کے سفر سے دو روز قبل علی میاںؒ کے شاگرد اور محبین نے ان

علی میاںؒ نے خودنوشت کاروانِ زندگی کی حصہ ہفتم میں (جنوری ۱۹۹۷ء سے جولائی ۱۹۹۹ء) تک حالات اور تاثرات قلمبند کیے تھے۔ یہ علی میاںؒ کی آخری تصنیف تھی آپ اس کے بعد پانچ ماہ حیات رہے اس عرصہ میں پیش آنے والے حالات و تاثرات خواہرزادہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے تحریر فرمائے جو "تتمہ" کے عنوان سے کتاب کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔

کی تقریر کا موثر اور طاقتور ٹکڑا منتخب کر کے پوسٹر کی شکل میں فریم کروا کر پیش کیا۔ جس میں ارتداد کے خطرہ کو محسوس کرنے اور اپنی اولاد کو اسلام پر قائم رہنے کی تلقین ہے۔ ملت اسلامیہ کے نام یہ وصیت و پیغام جب ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وصیت و پیغام کا یہ اقتباس علی میاںؒ کے فکر و فلسفہ کا بنیادی حصہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اَمْ کُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ

(بھلا اس وقت تم کیا موجود تھے جب یعقوب کو موت آ پہنچی اور اس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا" مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ (تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے) قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ آبَائِکَ اِبْرَاهِیْمَ وَ اِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهاً وَّاحِداً وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. (وہ بولے ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ، اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی (اسی) خدائے واحد کی، اور ہم تو اُسی کے فرمانبردار ہیں)

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں اور یہ سوال افراد کے پیمانے پر، خاندان کے پیمانے پر، برادری کے پیمانہ پر، معاشرے کے پیمانہ پر، محلّہ کے پیمانہ پر، قصبہ کے پیمانہ پر اور آخر میں کہتا ہوں کہ ملت کے پیمانے پر اور ملت ہندیہ اسلامیہ کے پیمانہ پر ہمارے دلوں پر نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستے پر چلے گی؟ وہ کس گروہ اور ملت کی پیرو ہوگی؟ کس کی پرستش کرے گی، کن عقائد کو مانے گی...... یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی یا سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں خداؤں اور دیوتاؤں کی۔ یہ اس وسیع کائنات میں اور اپنی محدود زندگی میں کس کے دست قدرت کو کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی"۔

(تقریر: آئندہ نسلوں کے اسلام کی ضمانت اور ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

☆ ۲۰ رمضان المبارک روزنامہ ہندوستان لکھنؤ کے نمائندے کو آنے والی

صدی کے تعلق سے یہ پیغام درج کروایا:

''جب لوگ اس شہر (لکھنؤ) کو چھوڑ کر اپنے وطن واپس جاتے تھے تو اس کو یاد کرتے اور تعریف کرتے تھے یہاں کی تہذیب کی شہرت دور دور تک تھی، میں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اس شہر میں بسر کیا ہے، کسی شہر کی پہچان اس کی تہذیب سے ہوا کرتی ہے لکھنؤ کی اپنی ایک خاص پہچان اور تہذیب ہے اس پہچان کو برقرار رکھنا چاہیے......آنے والی صدی میں اس صدی کی اختلافی باتوں کو نہ دہرایا جائے کیوں کہ اس سے اختلاف بڑھتا ہے ہمارا فرض لڑتے ہوؤں کو روکنا ہے شہر بھلے ہی اب سنہرا نہ رہا ہو لیکن اس کے مستقبل کو سنہرا بنانا ہوگا''۔

☆ حکومت ہند کے مسافر بردار جہاز کو کشمیری شدت پسند اغوا کر کے کابل لے گئے۔ اس افسوس ناک واقعہ پر علی میاںؒ نے مذمتی بیان دیا۔ جو اخبارات میں شائع ہوا۔

۲۰ ررمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۹ ردسمبر ۱۹۹۹ء آخری عشرہ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں گزارنے کے لیے ایک بڑے قافلے کے ساتھ رائے بریلی تشریف لے گئے۔ دو دن بعد ہی ۲۳ ررمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز جمعہ دارِ فانی سے دارِ بقاء کوچ کیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

(کاروانِ زندگی حصہ ہفتم تتمہ بقلم مولانا محمد رابع حسنی: تلخیص، ص: ۳۱۳ تا ۳۷۹)

خود نوشت سوانح کاروانِ زندگی میں علی میاںؒ نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے 155 سے زیادہ اور بیرونِ ہند 62 سفروں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے سفر اعلیٰ علمی، دینی، تعلیمی، دعوتی اور اصلاحی مقاصد کے لیے ہوتے تھے۔

وہ ایک بلند پایہ مفکر، خیر خواہ مصلح تھے۔ ملکوں کے دینی تعلیمی اور معاشرتی حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیتے تھے۔ ملک اور بیرونِ ملک مختلف دینی تعلیمی اصلاحی تحریکات، علمی اداروں اور جامعات کے رکن یا صدر تھے ان کی زندگی اشاعتِ خیر کے لیے وقف تھی۔ عالمِ عربی کے مسائل ہوں یا برصغیر کے عصری سیاسی مسائل، وہ

اپنے وسیع علم ومطالعہ، دور بینی اور دور اندیشی سے مفید اور مثبت حل تلاش کرلیا کرتے تھے۔

ان کی جدوجہد کے محاذ دعوتِ دین، اتحادِ ملت، تعلیم اور اصلاح انسانیت رہے ہیں۔ اُن کی تصانیف اور خطابات دعوتِ اسلامی اور فکر اسلامی کا عظیم سرمایہ ہیں۔ انھوں نے ''سیرت سید احمد شہیدؒ''، قصص النبیین للأطفال، اور انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' سے جس سیرت سازی اور کردار سازی کا آغاز کیا تھا ان کی تمام تر مساعی اس اہم پہلو کے اردگرد گردش کرتی ہیں۔ مجلسی گفتگو ہو یا تقاریر و تصانیف سیرت و کردار سازی کا پہلو ہر جگہ نمایاں ہے ان کا عالمانہ طرزِ اسلوب، مجاہدانہ فکر و فلسفہ جس کے ساتھ انھوں نے دور دراز مقامات ملک و بیرونِ ملک سفر کیا ان کی علمی اور فکری میراث ہے، جس میں فہم وفراست، ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ کیے گئے نادر فیصلے اور مفید مشورے شامل ہیں۔ ملک وملت بلکہ تمام انسانیت کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ ذہنوں کو صحیح رُخ پر لانے کی دعوت ہے، ہندوستان اور بیرونِ ہند کے دانشور اور رہبر ان کے فکر وعمل سے متاثر ہوئے۔ انھیں شہرت وعزت کا بلند مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کی عبقری شخصیت، علی میاںؒ کی مخلصانہ جدوجہد کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔

> ''اسلام کے اعلیٰ اصولوں میں دنیا اُس وقت کشش محسوس کرے گی جب اُن کا مظاہرہ ہم اپنی عملی زندگی میں کریں گے''۔
>
> (مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ)

حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام اور سفرِ آخرت کی مبارک ساعتیں

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت بلند عزائم کے ساتھ، ہمت و استقامت سے اسلام کی خدمت، انسانیت کی اصلاح و تعمیر کا عظیم الشان کام انجام دیا۔ اُن کی حیاتِ مبارکہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے انتظام و انصرام سے لے کر ملکی و ملّی خدمات پیش نظر تھیں۔ تصنیف و تالیف کے مشاغل، ملک و بیرونِ ملک اسفار کا طویل سلسلہ ہے۔ تقریباً ۸۷ سال عمر پائی اور بڑی مبارک، با مقصد، منظم اور مصروف زندگی گذاری۔ ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۹۹۹ء علی میاںؒ کی ضعف اور علالت کا سال ثابت ہوا۔ ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

مولانا بلال عبدالحیّ حسنی، علی میاںؒ کی علالت ضعف اور حادثہ وفات کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

☆ ضعف و علالت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ عیادت کرنے والوں کا سلسلہ جاری تھا جن سے علی میاںؒ حسب مراتب معاملہ فرماتے اور خدام کو خیال رکھنے کی تاکید فرماتے، گفتگو کم کرتے، ذکر میں مشغول رہتے، کسی بزرگ سے تعلق رکھنے والا یا نسبت رکھنے والا آجاتا تو اس کا اکرام فرماتے اور خوش ہوتے۔

☆ رمضان المبارک قریب آیا، علی میاںؒ کی خواہش تھی کہ رمضان رائے بریلی میں گذاریں ضعف و علالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ لکھنؤ میں رہنا مناسب ہے۔ رمضان سے تین روز پہلے تکیہ شاہ علم اللہؒ تشریف لے گئے مسجد جا کر دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کی۔ مسجد کی چہار دیواری کے سہارے کھڑے ہو کر فاتحہ اور مراقبہ میں مشغول رہے۔ مسجد سے گھر آئے سب سے ملاقات کر کے اسی دن

''آخری ایام'' مولانا سید بلال عبدالحیّ حسنی کی تصنیف ''مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ'' (تلخیص۔ ص: ۴۶۷ تا ۴۹۱)

۲۹؍شعبان کولکھنؤ تشریف لے گئے۔ رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے ساتھ نوافل کا بھی اہتمام رہا۔ عصر بعد مجلس میں شہر کے لوگ آجاتے، علی میاںؒ تسبیحات میں مشغول رہتے درمیان میں کلام بھی فرماتے تراویح کے بعد بھی مجلس ہوتی۔

☆ ۲۰؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۰؍دسمبر ۱۹۹۹ء علی میاںؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء پر الوداعی نگاہ ڈالی اور پورے قافلے کے ساتھ لکھنؤ سے رائے بریلی کے لیے روانہ ہوئے۔ صحت پوری طرح بحال تھی نمازیں اور تراویح اپنی قیام گاہ پر باجماعت ادا فرمارہے تھے۔ فیاضی مزاج میں داخل تھی، حاجت مندوں کو خوب تقسیم فرمانے کا حکم دیا۔ حسن سلوک اور صلہ رحمی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ ☆ ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز جمعرات گھر تشریف لے گئے گھر کی خواتین نے زیارت کی۔ دیر تک تشریف فرمارہے۔ مولانا محمد رابع حسنی مدظلہٗ آپ کے ساتھ تھے۔ گفتگو فرماتے رہے۔ تراویح کے بعد مجلس میں دریافت فرمایا کہ مسجد میں کتنے لوگ ہیں؟ عرض کیا گیا مسجد بھر گئی۔ فرمایا "یہ بانی (حضرت شاہ علم اللہؒ) کا اخلاص ہے"۔

☆ ۲۲؍رمضان المبارک بروز جمعہ سخت سردی تھی۔ علی میاںؒ تہجد کے لیے بیدار ہوئے۔ سحری فرمائی۔ فجر کی نماز باجماعت ادا کی اور آرام فرمانے کے لیے لیٹ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے بیدار ہوئے، وضو فرمایا، اشراق کی نماز پڑھی۔ نصف گھنٹہ تلاوت فرمائی، سجدہ تلاوت کیا، اس کے بعد حسب معمول تیرہ یا چودہ مرتبہ سورہ یٰسین کی تلاوت فرمائی اور نام لے لے کر ایصال ثواب فرماتے رہے، اس سے فارغ ہوکر فرمایا کہ "جلدی غسل کرادو"۔ ساڑھے گیارہ بجے غسل خانہ تشریف لے گئے۔ داخل ہوتے ہوتے فرمایا کہ آج رمضان کی کیا تاریخ ہے۔ عرض کیا گیا بائیسواں روزہ ہے۔ غسل سے فراغت کے بعد دوسری لنگی اور روئی کی صدری پہنادی گئی۔ باہر آئے، خدام سے کہنے لگے تم ہی لوگوں کا کام ہے کہ غسل کرادیتے ہو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے۔ سوال کیا، کیا جمعہ میں کچھ تاخیر ہوسکتی ہے؟" خدام نے جواب دیا کہ جب حضرت پوری طرح فارغ ہوجائیں گے تب ہی جمعہ ہوگا۔ پھر فرمایا عبداللہ سے کہہ

دیناوہی نماز پڑھائیں''۔ جب شیروانی پہنائی جانے لگی تو فرمایا وقت کم ہے قرآن مجید دے دو، سورہ کہف پڑھنی ہے۔ پھر سورہ یٰسین پڑھنا شروع کردی۔ آدھا منٹ ہوا ہوگا کہ جسم پشت کی طرف ڈھلکنے لگا۔ چہرہ مبارک سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ دوسرے عالم کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز جمعہ پونے بارہ بجے تلاوت کلام پاک کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

وفات کی خبر نماز جمعہ تک پورے عالمِ اسلام میں پھیل چکی تھی۔ تجہیز و تکفین کی گئی۔ ڈیڑھ لاکھ لوگ رائے بریلی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے پہنچ گئے، بہتوں نے زیارت کی۔ بعد نماز عشاء دس بجے رات آخری آرام گاہ تک لے جایا گیا۔ ساڑھے دس بجے مولانا محمد رابع حسنی مدظلہٗ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت شاہ علم اللّٰہؒ کے حظیرہ میں ان کے بڑے بیٹے شاہ ہدایت اللّٰہؒ کے پہلو میں لحد تیار کی گئی۔ اس حظیرہ میں شاہ صاحب کے علاوہ علی میاںؒ کے والد، بڑے بھائی، والدہ، دونوں بہنیں، بھتیجے اور بڑے بھانجے مدفون ہیں۔ نماز کے بعد جسد مبارک کو لحد میں اُتارا گیا، یہ خدمت مولانا محمد رابع حسنی مدظلہٗ، مولانا عبداللّٰہ حسنیؒ، خادم خاص حاجی عبدالرزاقؒ اور کاتب نثار الحق صاحبان نے انجام دی۔ ملک فہد کے ایماء پر ستائیسویں شب کو حرم مکی اور حرم مدنی دونوں جگہ غائبانہ نماز ادا کی گئی۔ شاید عالمِ اسلام کا کوئی ملک بچا ہو جہاں غائبانہ نماز جنازہ ادا نہ کی گئی ہو۔ تعزیت کے لیئے عالمِ اسلام کے متعدد عرب علماء، فضلاء تشریف لائے۔ کوئی اہم شخصیت باقی نہیں رہی تھی جس نے حاضری نہ دی ہو۔ تعزیتی خطوط سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں آئے۔ مشائخ کے بھی، بادشاہوں اور وزراء کے بھی، دینی وملّی پیشواؤں کے بھی اور سیاسی رہنماؤں کے بھی۔ ان میں سے صرف شیخ محمد بن عبداللّٰہ السبیل کا تعزیتی مکتوب نقل کیا جاتا ہے، جو حرم مکی کے امام بھی ہیں اور شؤن الحرمین کے صدر بھی اور اس منصب جلیل کے اعتبار سے بلاشبہ ان کو عالمِ اسلام کی سب سے بڑی شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپنے تعزیتی مکتوب میں لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم علماء کرام، گرامی قدر ذمہ داران اور ملت اسلامیہ ہندیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

شدید قلبی رنج اور اندوہ غم کے ساتھ عالم جلیل اور داعی عظیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ اس عظیم صدمہ کو جھیلنے کی سکت آپ اور ہم سب کو عطا فرمائے۔ اور آپ اور تمام پسماندگان کو بیش از بیش اجر سے نوازے اور اس خسارے کی تلافی فرمائے۔ ہم آپ سے تعزیت کرتے وقت خود بھی تعزیت کے مستحق ہیں بلکہ ساری امت اسلامیہ کی تعزیت کی جانی چاہیے۔ حضرت مولانا کا سانحہ وفات ایک زبردست حادثہ اور شدید آزمائش ہے جس سے مسلمانان عالم اس وقت دوچار ہیں اس لیے کہ مولانا مرحوم نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنی زبان وقلم اور جسم وجان کو وقف کر دیا تھا۔ اور اس میدان میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اور تمام برادرانِ اسلام کو اس صدمۂ جانکاہ کو سہارنے کی طاقت عطا فرمائے۔ اور عالمِ اسلام کی اس محرومی کی تلافی فرمائے۔

ہم اس موقع پر آپ کو یہ اطلاع بھی دینا چاہتے ہیں کہ خادم الحرمین الشریفین فہد بن عبدالعزیز فرمانروائے مملکت سعودیہ عرب نے حرم مکی و مدنی دونوں جگہ ۲۷؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز دوشنبہ بعد نماز عشاء (یعنی ستائیسویں شب) حضرت مرحوم کے لیے غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم جاری فرمایا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ علامہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور انھیں اپنے نیکوکار بندوں میں شامل فرمائے اور انھیں ابرار واتقیاء شہداء وصالحین کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

محمد بن عبداللہ السبیل

صدر نشیں امور حرمین شریفین

امام وخطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ

☆☆☆

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج، عادات و معمولات

علی میاںؒ نے بڑی منظم اور مشغول زندگی گزاری۔ ان کا گھرانہ خالص دینی علمی گھرانہ ہے۔ والد کم گو اور تصنیفی مزاج رکھنے والے تھے۔ والدہ نہایت نیک سیرت، عبادت گزار خاتون تھیں۔ علی میاںؒ نو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ اور بڑے بھائی نے تربیت و نگہداشت کے فرائض انجام دیے۔ بچپن ہی سے والدہ نے نمازوں کا پابند بنا دیا تھا، بھائی نے سخت نگرانی کی۔ وہ ایک بہترین مربی تھے۔ محبت کے ساتھ محنت اور مجاہدے کی خوبیوں سے آراستہ کیا۔ بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا۔ اُن اساتذہ نے علی میاںؒ کی صلاحیتوں کو پہچان لیا اور اُن کی تعلیم و تربیت میں کسر نہیں رکھی۔ علی میاںؒ نے اپنے استادوں کے لائق شاگرد ہونے کا ثبوت دیا۔ عمر کے ساتھ مطالعہ میں استغراق اور انہماک کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ابتداء میں بڑے بھائی کے مشورے سے بہترین علمی دینی کتب کا مطالعہ کیا۔ اردو اور عربی تحریر و انشا کی مشق کی۔ قرآن کریم حفظ کرنے کا عظیم الشان کام کیا۔ بزرگانِ دین کی خدمت میں حاضر ہوکر عبادت و ریاضت میں وقت گزارا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی فرائض انجام دیتے وقت ایک اچھے استاد کی طرح طلباء کی تربیت پر بھی خاص توجہ دی۔ مولانا محمد الیاسؒ سے تعلق کے بعد دارالعلوم کے طلباء کے ساتھ دعوتی اور تبلیغی سفر کیے۔ گرمی، بارش کی پرواہ نہ کی۔ اس دینی دعوتی تحریک کو زندگی کا مبارک قدم قرار دیا۔ مولانا محمد الیاسؒ کی حیات میں کئی کئی روز نظام الدین میں قیام فرماتے تھے۔ شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ساتھ رمضان المبارک گزارتے تھے۔ بڑی سخت جدوجہد کا دور تھا۔ تبلیغی انہماک، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس تمام کام محنت طلب توجہ طلب تھے۔

''عادات و معمولات'' علی میاںؒ کے پوتے، مولانا محمد الحسنیؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولانا بلال عبدالحی حسنی کی تصنیف ''سوانح مفکر اسلام'' سے ماخوذ ہیں۔

ہنگامہ آرائی بالکل پسند نہیں تھی۔ کتابوں کا مطالعہ، تصنیف وتالیف محبوب مشغلہ تھا۔ اُن کے لیے وہ وقت سخت مجاہدہ اور امتحان کا ہوتا تھا جب اپنے علمی تصنیفی ذوق کے دائرے سے باہر نکلتے۔ ہندوستان میں قیام کے دوران دارالعلوم کے انتظامی اور تعلیمی مسائل میں وقت گزارتے یا اپنے شیخ ومرشد حضرت رائے پوری ؒ کے ذوق وتربیت کے مطابق ذکروتسبیح اور یادِ خدا میں وقت صرف کرتے۔

۱۹۵۷ء کے بعد دعوتی اور تصنیفی مشاغل کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے سبکدوش ہوگئے۔ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا ہندوستان ہی نہیں عالم عربی، اسلامی ممالک میں تحریک دعوت وتبلیغ کی جدوجہد کا مبارک سلسلہ بھی جاری رہا۔

عزیزوں کے اصرار پر مستقل رفیق (جو راحت وآرام کا خیال رکھے) اور مددگار تلاش کیا گیا۔ ایک ایسے معاون کو بھی منتخب کیا گیا جو تصنیف وتالیف میں مدد کے ساتھ خطوط کے جواب کا املا لکھ سکے۔ چالیس سال تک نہایت جانثاری اور وفاداری سے حاجی عبدالرزاق صاحب نصیرآبادی نے آپ ؒ کی شب وروز خدمت کی اور نثارالحق صاحب نے لکھنے پڑھنے کے کاموں میں بہترین معاون کا کردار ادا کیا۔

تکیہ شاہ علم اللہ میں قیام کے دوران تہجد کے وقت بیدار ہوکر مسجد شاہ علم اللہ تشریف لے جاتے۔ نمازِ تہجد اور فجر ادا کرنے کے بعد ذکر جہری فرماتے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد چہل قدمی کے لیے تشریف لے جاتے۔ راستے میں سورۂ یٰسین کا معمول پورا فرماتے، تسبیحات میں مشغول رہتے۔ واپس تشریف لاکر ناشتہ کرتے۔ ضروریات سے فارغ ہوکر اشراق کی نماز ادا کرتے، اس کے بعد ایک پارہ تلاوت فرماتے۔ اسی وقت قرآن پاک کا دور بھی فرماتے۔ اس کے بعد تصنیف وتالیف کا کام ہوتا۔ خطوط کے جواب دیتے۔ ظہر کی نماز کے بعد کھانا کھاتے، کچھ دیر آرام فرماتے، عصر سے نصف گھنٹہ قبل بیدار ہوکر مطالعہ فرماتے۔ عصر سے مغرب تک عمومی مجلس ہوتی۔ مغرب بعد اوّابین میں طویل قرأت فرماتے۔ کچھ ذکر فرماتے۔ رائے بریلی

میں قیام ہوتا تو گھر تشریف لے جاتے عشاء کے قریب باہر تشریف لاتے، لکھنؤ قیام میں وہ وقت یا تو مطالعہ میں صرف ہوتا یا خصوصی ملاقات میں عشاء بعد کھانا کھاتے، معمولی چہل قدمی کے بعد مجلس میں تشریف فرما ہوتے۔ اس وقت عمومی طور پر بڑے انشراح کے ساتھ گفتگو فرماتے۔ اس زمانے میں کم خوابی کی شکایت رہنے لگی تھی، اس کا بڑا سبب عالمِ اسلام کے حالات کی فکر اور اس پر اضطراب و بے چینی کی کیفیت تھی۔ ۱۹۷۷ء کے بعد مزید ضعف بڑھ گیا۔ رات نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے فجر کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام فرماتے۔ اس کے بعد ناشتہ اور ضروریات سے فارغ ہوکر تصنیفی کام اور خطوط کے جواب دینے کا مشغلہ رہتا، ظہر سے پہلے سورہ یٰسین کا معمول پورا فرماتے۔ مغرب کے بعد اوّابین کا معمول باقی رہا، طویل قرأت کا معمول ترک کردیا۔

آخری سالوں میں سورہ یٰسین کا اہتمام بہت بڑھ گیا تھا۔ روزانہ تیرہ مرتبہ سورہ یٰسین پڑھ کر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر آخر تک اصلاحی وتجدیدی کام کرنے والوں، اپنے نسبی تعلق والوں یا روحانی سلسلہ کے نسبت والوں کا نام لے کر ایصالِ ثواب فرماتے، دعائے مغفرت کرتے۔ فجر کی نماز کے بعد منزل پڑھ کر تعلق والوں کا نام لے کر دعا فرماتے۔ جمعہ کے دن سورہ کہف کی تلاوت فرماتے، نماز سے پہلے دیر تک دعا فرماتے، عصر ومغرب کے درمیان درود شریف پڑھنے کا اہتمام فرماتے۔ ابتدائی دور میں رمضان المبارک میں تراویح کی امامت فرماتے، بیس پاروں کے بعد کوئی دوسرا حافظ تکمیل کردیتا تھا۔ رمضان میں تلاوت کے معمول میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ آخر عمر میں قاری قاسم صاحب کی تلاوت کے کیسٹ سے روزانہ ایک پارہ سنتے۔ عصر سے مغرب تک مسجد میں رہ کر ذکر ودعا میں مشغول رہتے۔ جب تک صحت رہی آخری عشرہ کے اعتکاف کا بھی معمول رہا۔ اعتکاف دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں فرماتے۔ آخری سات آٹھ سالوں سے درسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

آخری رمضان میں شدید کمزوری کی وجہ سے درسِ قرآن موقوف کرنا پڑا۔ رمضان میں ضرورت مندوں کا بے حد خیال فرماتے، مہمانوں کی تعداد آخری عشرہ میں تین چار سو تک ہو جاتی اور بعض دنوں میں ہزار آدمی دستر خوان پر کھانا کھاتے۔ مہمانوں کی تواضع پر اپنے پاس ہی سے صرف کرتے۔ ہمیشہ باوضو رہتے، اذان سنتے ہی مسجد تشریف لے جانے کا معمول تھا۔ دورانِ سفر بھی باجماعت نماز ادا فرماتے۔ ہوائی جہاز کے سفر میں مستقل درود شریف کا ورد رہتا تھا۔ اکل حلال کا اہتمام فرماتے تھے۔

(سوانح مفکر اسلام۔ مولانا بلال عبدالحی حسنی۔ ص:۴۹۱۔۴۹۷)

• علی میاںؒ کے معتمد اور خاص شاگرد ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (استاد ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ) نے اُن کی سیرت کے نادر پہلو تلاش کیے ہیں۔

''لباس میں اناقت تو نہیں ہاں! نفاست اور صفائی کو پسند کرتے، کتابیں اچھے خط میں لکھی ہوئی، بہترین طباعت اور خوبصورت جلد بندی کے ساتھ پسند فرماتے۔ اول جلول، درویشانہ مجذوبانہ انداز انھیں پسند نہیں، دوسروں کی راحت رسانی کا خیال بہت رہتا اور اس سے زیادہ یہ کہ کسی کا احساس مجروح نہ ہونے پائے...... معاملات میں صرف ایک بات جانتے تھے کہ ان کے ذمہ کسی کا حبہ باقی نہ رہے، باقی رہا حساب کتاب اشیاء کی قیمتوں، لین دین کے اندراجات سے بالکل مناسبت نہیں تھی بلکہ ایک حد تک الجھن ہوتی تھی''۔

(میرِ کارواں۔ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ)

مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ اپنے خال معظم علی میاںؒ کی صفات وکمالات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مولانا رحمۃ اللہ علیہ متعدد ومتنوع کمالات اور خصوصیات کے حامل انسان تھے۔ ان کی زندگی سادگی اور تواضع کی زندگی تھی، رہائش میں بھی اور لباس میں بھی...... وسعت قلبی، دل آزادی سے پرہیز، انتقام نہ لینا، صبر،

خاموشی کو ترجیح دینا، ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے میں محتاط رہنا، صلہ رحمی، اکرام مومن، مساویانہ برتاؤ، انسانیت کا احترام، سادگی اور تواضع، حقوق کی ادائیگی کی فکر، بزرگوں کے ساتھ نیازمندانہ اور سعادت مندانہ برتاؤ، رحم دلی، بردباری، غریبوں کی مدد، سخاوت، مہمان نوازی، حسن سلوک، ایثار، قربانی ان کی نمایاں صفات تھیں...... مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی نجی زندگی میں ملنسار، بااخلاق، متواضع صفت کے حامل سخی اور ہمدردانہ مزاج رکھنے والے تھے"۔

(عہد ساز شخصیت۔ مولانا محمد رابع حسنی۔ ص:۴۶ تا ۹۱)

☆☆☆

"انسان کے جوہر انسانیت کی اُس خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا، اس کے اندر وہ لامحدود طلب، وہ بلند ہمت، وہ بلند پرور، ذی روح، اور وہ مضطرب دل ہے کہ ساری دنیا مل کر اس کی تسکین نہیں کر سکتی"۔

(مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علی میاںؒ کا دورِ نظامت

ہندوستان کی مشہور دینی درس گاہ ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' لکھنؤ جو علی میاںؒ کی مادرِ علمی ہے۔ تکمیل تعلیم کے بعد انہیں دارالعلوم میں کام کرنے کا ایک وسیع میدان ملا۔ دارالعلوم میں استاذ تفسیر وادب کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا، یہ تقرر با تنخواہ تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً دس سال جاری رہا لیکن دعوتی مقصد سے علی میاںؒ کو بہت سفر کرنے ہوتے تھے، آپ نے ۱۹۴۴ء میں معاوضہ سے معذرت کردی اور ندوہ کے کاموں سے ان کا تعلق رضا کارانہ ہوگیا۔ ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کو علی میاںؒ کی کارکردگی اور افادیت کی قدر تھی، چنانچہ انھیں ۱۹۴۸ء میں ندوۃ العلماء کی مجلسِ انتظامی اور مجلسِ دارالعلوم کا رکن منتخب کیا گیا۔ ایک سال بعد ۱۹۴۹ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحریک پر نائب معتمد تعلیمات بنایا گیا اور سید صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد علی میاںؒ دارالعلوم کے معتمدِ تعلیمات کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے دورِ نظامت میں آپ کو دارالعلوم کا نائب ناظم منتخب کیا گیا۔

۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ ناظم ندوۃ العلماء کی رحلت کے بعد علی میاںؒ کو دارالعلوم کی نظامت کے فرائض سونپے گئے۔ علی میاںؒ کے والد حکیم عبدالحیٔ حسنیؒ (دورِ نظامت ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۳ء) اور برادرِ اکبر ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ (دورِ نظامت ۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۱ء) دارالعلوم کے نظامت کے فرائض بخوبی انجام دے چکے تھے۔ علی میاںؒ نظامت کے کاموں سے واقف تھے۔ ان کے دورِ نظامت میں دارالعلوم نے تعلیمی اور تعمیری میدان میں نمایاں ترقی کی۔ ۱۹۶۹ء میں خرابی صحت کی وجہ سے انھوں نے دارالعلوم سے سبکدوش ہونا چاہا لیکن اکابرینِ ندوۃ نے اسے منظور نہیں کیا اور آپ تاحیات ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عہدے پر فائز رہے۔

علی میاںؒ بیسویں صدی کے جید علماء ومشائخ میں امتیازی شان رکھتے تھے۔

آپ اولوالعزم قائد کی صلاحیتوں سے متصف تھے، انھیں اوصاف کی بدولت آپ نے عالمِ اسلام اور انسانیت کی صحیح رہنمائی کی، دنیا کی متعدد تنظیموں، اداروں، تحریکات اور جماعتوں کے کامیاب قائد اور رہنما ثابت ہوئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے اس کے علمی، تعلیمی ارتقاء کے سلسلے میں انقلابی اقدامات کیے اُن کی ذاتی کوششوں سے دارالعلوم تہذیب اسلامی کا گہوارہ اور اصلاح وتربیت کا بہترین مرکز بن کر منظرِ عام پر آیا۔ اُن کی اولوالعزمی اور کامیاب منصوبوں، مخلصانہ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ندوۃ العلماء کو ایک خاص وقار اور اعتبار حاصل ہوا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنی فکری اور علمی بنیاد پر قائم رہتے ہوئے ہندوستان اور عالمِ اسلام کے علمی حلقوں میں مرکزِ توجہ بن گیا۔

۱۹۳۴ء سے دسمبر ۱۹۹۹ء تک تقریباً ۶۵ سال آپ ندوہ سے اور ندوہ آپ سے وابستہ رہا۔ آپ اور آپ کے رفقاء نے ان ۶۵ سالوں میں طلباء کی کردار سازی کا نمایاں کام انجام دیا۔ علی میاںؒ کے دورِ نظامت کی علمی، تصنیفی، دعوتی اور ثقافتی سرگرمیاں، طلباء میں روحانیت، خداترسی، خوفِ خدا کی روح پیدا کرنے اور دارالعلوم کو روحانی فضا عطا کرنے میں بہترین معاون ثابت ہوئیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علی میاںؒ کے دورِ نظامت کے ابتدائی دور اور بتدریج ترقی کے سلسلہ میں مولانا محمد رابع حسنی مدظلہٗ لکھتے ہیں:

مولانا ۱۹۶۱ء میں ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے، اس وقت ندوہ ایک کم طلباء کا اور کم شہرت کا ادارہ تھا۔ ان کی کوششوں سے اور ان کی باہر کی شہرت سے اس کو ترقی ملنا شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں اُن کو اپنے خاص رفقاء سے اچھا تعاون ملا...... علمی، تعلیمی اور دعوتی پہلوؤں سے جو ترقی تھی وہ خاصی حد تک حاصل ہوئی۔

مولانا کے نائب ناظم منتخب ہونے کے وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دارالاقامہ کی صرف ایک عمارت تھی جو ایک منزلہ تھی بتدریج دو منزلہ ہوگئی اور اس کے پہلو میں مزید پانچ کئی منزلہ دارالاقامے تعمیر ہوئے۔ طلباء کی تعداد آغاز میں صرف ڈیڑھ سو تھی جو ۲۰۰۰ء

کے آغاز تک دو ہزار احاطہ کے اندر ڈھائی ہزار شہر میں قائم کردہ مکاتب میں یعنی مجموعی طور پر چار ہزار صرف لکھنؤ کے اندر ہوگئی۔ لکھنؤ کے باہر دار العلوم کی چھوٹی بڑی شاخیں قائم ہوئیں، جن میں بتدریج اضافہ ہوا، یہ اس وقت ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی ہیں۔ ہندوستان سے باہر کئی ممالک میں بھی دار العلوم کی شاخیں قائم ہوگئی ہیں۔ ان تمام مدرسوں کے طلباء کی تعداد شمار کی جائے تو پندرہ ہزار سے زیادہ ہو جائے گی۔

نظامِ تعلیم کے لحاظ سے مولاناؒ کے دور کے آغاز میں دار العلوم ندوۃ العلماء مکتب کے چار درجات اور عربی کے نو درجات پر مشتمل تھا اور ہر درجہ ایک ایک سیکشن میں تھا۔ لیکن مولانا کے عہد میں بتدریج ترقی عمل میں آئی، مکتب ۶ سال کا، پھر متوسط دو سال کا، پھر ثانویہ تین سال کا، پھر عالیہ چار سال کا اور فضیلت دو سال کا، کل سترہ سال کا نصاب کر دیا گیا۔ عالیہ اور فضیلت کو دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک علوم دینیہ اور دوسرا ادب و زبان کا شعبہ اور ہر شعبہ میں چھوٹے چھوٹے مزید شعبے قائم کر دیے گئے مثلاً علوم دینیہ میں تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب کے شعبہ میں ادبِ جدید اور ادبِ قدیم اور نقد و بلاغت کے شعبے بنا دیے گئے، عالمیت کے بعد طلباء کو ذیلی شعبوں کے اندر اختیار دیا جاتا ہے۔ المعهد العالي للقضاة والافتاء علوم دینیہ کے شعبہ کے طلبا کے لیے اور المعهد العالي للدعوة الفكر الاسلامي، اس سے دونوں شعبوں کے طلبا کے لیے ایک سال کا رکھا گیا ہے تاکہ اس میں مہارت اور کام کرنے کی صلاحیت کی مشق کرائی جا سکے۔ عالمیت کے درجات میں طلباء کی تعداد بہت بڑھ جانے کی وجہ سے درجہ میں متعدد سیکشن قائم کر دیے گئے۔

(عہد ساز شخصیت۔ مولانا محمد رابع حسنی۔ ص: ۲۳۹۔۲۴۰)

علی میاںؒ کا دورِ نظامت ندوۃ العلماء کا دورِ زرّیں کہا جانے کا مستحق ہے۔ دار العلوم کے معتمد تعلیم عبد السلام قدوائی ندویؒ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ان کو نظامت کے کاموں سے پہلے سے مناسب واقفیت تھی، جدید و قدیم دونوں حلقے ان پر اعتماد رکھتے تھے، وقت کے نامور مشائخ سے ان

کا تعلق تھا، دینی اور قومی تحریکوں کے سربراہ اُن کے قدرداں تھے۔ جس طرح ہندوستان میں اُن کی اہمیت کا اعتراف کیا جاتا تھا اُسی طرح باہر کے ملکوں میں بھی اُن کی لیاقت کا شہرہ تھا ان کے دورِ نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا شہرہ دنیا کے دور دراز ملکوں تک پہنچا اور خاص طور پر عرب ممالک میں وہ اس طرح متعارف ہوا کہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔.....ان کے دورِ نظامت میں مسائل حاضرہ کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے مجلس تحقیقات شرعیہ قائم ہوئی۔ دینی و علمی کتابوں کی نشر و اشاعت کا مختلف زبانوں بالخصوص انگریزی، اردو زبانوں میں وسیع پیمانے پر انتظام ہوا۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی انگریزی مطبوعات نے یورپ، امریکہ، افریقہ اور برصغیر ہند میں شہرت و مقبولیت حاصل کی اور انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر کی عرصے سے جو کمی محسوس کی جارہی تھی وہ دور ہوئی، مختلف حلقوں سے رابطہ قائم ہوا۔ بیرونی ممالک سے بھی تعلقات مستحکم ہوئے۔ خدا نے ان کو سرگرم و مخلص معاون و رفیق عطا فرمائے جن کی سعئ پیہم اور فکرمندی سے دارالعلوم نے مالی، دینی، تعلیمی اعتبار سے نمایاں ترقی کی۔"

(رودادِ چمن۔ مولانا محمد الحسنی۔ ص: ۱۶۱ ۔۱۶۰)

۱۹۶۱ء کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیمی و تعمیری مقاصد کی تکمیل و تحصیل میں بھی بہت تیزی آئی اور دارالعلوم کی ترقی و استحکام کے سلسلے میں کئی اہم کام انجام پذیر ہوئے۔ مثلاً نصاب و نظامِ تعلیم کی تجدید اور عصری تقاضوں کے پیش نظر مفید اضافے، نیا دستور العمل اور آئین، مختلف شعبوں کی ترقی و استحکام، نئے شعبوں کا قیام مثلاً مدرسہ ثانویہ کا قیام، تخصص کا انتظام، مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام وغیرہ تعمیرات کے سلسلے میں دارالعلوم میں جو توسیع و اضافہ ہوئے وہ درج ذیل ہیں۔

دارالعلوم کے دو وسیع شاندار ہوسٹل، دارالاقاموں کی توسیع، کتب خانے کی

عمارت، کتب خانہ شبلی کی عمارت، مدرسہ تحفیظ القرآن، دارالعافیہ، دفاتر دارالعلوم کی عمارت وغیرہ۔

نشر واشاعت سے متعلق ترقی کے سلسلہ میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا قیام، دارالعلوم کے ترجمان رسائل "تعمیر حیات"، "الرّائد"، "البعث الاسلامی" کا اجراء اور ترقی، انگریزی میں "دی فریگرینس آف ایسٹ"، ہندی میں "سچا راہی"، رابطہ ادبِ اسلامی کا سہ ماہی رسالہ "کاروانِ ادب"، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاریخ کی ترتیب واشاعت بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

علمی سرگرمیاں کسی ادارے کی جان ہوتی ہیں۔ دارالعلوم کی علمی سرگرمیوں کے سلسلے میں "النادی العربی"، "جمیعۃ الاصلاح"، "۸۵ سالہ جشن تعلیمی" اور "رابطۃ الادب الاسلامی العلمی کا قیام شامل ہے۔

اسلامی ممالک میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا تعارف

علی میاںؒ کے دورِ نظامت کی ایک اہم خصوصیت دارالعلوم ندوۃ العلماء کا اسلامی ممالک میں تعارف ہے۔ سن ۱۹۵۰ء میں علی میاںؒ کے مصر کے سفر کے موقع پر اسلامی ملکوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا پہلا عمومی اور ہمہ گیر تعارف ہوا۔ علی میاںؒ کے علمی دینی سفروں، علمی مقام ومرتبے اور ان کی شہرت وتعلقات کی بناء پر دارالعلوم ندوہ العلماء کے وقعت اور وقار میں اضافہ ہوا۔ عالمِ عرب اور دیگر اسلامی ممالک کی موقر یونیورسٹیز نے دارالعلوم کو علمی اور دینی اہمیت کے ساتھ تسلیم کیا۔ علی میاںؒ کی ذات والا صفات سے دارالعلوم کو جو عالمگیر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ دنیائے اسلام کی علمی تاریخ کا زرّیں باب ہے چنانچہ مختلف اسلامی ملکوں اور عرب ملکوں کے طلباء دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے آئے۔ اور دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلباء عرب جامعات میں بسلسلہ تعلیم داخل ہوئے۔

معتمد تعلیم عبداللہ عباس ندویؒ لکھتے ہیں۔

''غیر ملکی طلباء خاص طور سے عرب ممالک کی جامعات سے فارغ ہو کر یا فارغ ہونے سے پہلے یہاں آکر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ عالم اسلام کے بہت سے علماء وراساتذہ کی یہ خواہش ہے کہ ان کے لڑکے مولانا (علی میاںؒ) کے قریب آکر رہیں۔ اس وقت بھی ایسے طالب علم یہاں زیر تعلیم ہیں جن کے سر پرستوں نے دوسرے مدارس سے پوری واقفیت کے بعد اپنے تجربے اور مشاہدات کی روشنی میں ندوۃ کو ترجیح دی ہے۔''

(تعمیر حیات ۱۰/اکتوبر ۱۹۸۸ء دارالعلوم کی سالانہ رپورٹ از عبداللہ عباس ندویؒ)

ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ، نائجیریا، امریکہ، برما، بنگلہ دیش، مصر وشام اور سعودی عرب کے متعدد طلباء یہاں سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور ان میں سے بعض یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے وطن اور اجنبی ملکوں میں مفید دعوتی اور تعلیمی کام انجام دے رہے ہیں۔''

(تعمیر حیات اگست ۱۹۸۹ء ''روئداد ناظم ندوۃ برائے جلسہ انتظامیہ جولائی ۱۹۸۹ء)

دارالعلوم ندوۃ میں توسیعی خطبات کی روایت علی میاںؒ کے دور نظامت میں بھی قائم رہی۔ ہر سال ملک یا بیرونِ ملک کے ممتاز علماء ومفکرین کو مدعو کیا جاتا، مختلف علمی موضوعات پر تحقیقی مقالے پڑھے جاتے تاکہ طلباء کے فکر ونظر میں وسعت پیدا ہو۔

مولانا محمد رابع ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ترقی اور تعلیمی معیار کی بلندی کے سلسلہ میں علی میاںؒ کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مولانا کے مراسم اور دلچسپی کے نتیجے میں ندوۃ میں عالمی سطح کے کئی علمی پروگرام منعقد ہوئے۔ عالمِ اسلام کی بزرگ اور ذی وقار شخصیات ندوۃ تشریف لائیں۔ امام کعبہ شیخ عبداللہ السبیل، امام مسجد اقصیٰ شیخ صیام اور دیگر علمائے کرام تشریف لائے۔ عظیم مصری عالم شیخ یوسف القرضاوی ندوہ آئے توسیعی خطبات دیئے، ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر جامعہ ازہر کے وائس چانسلر شیخ عبدالحلیم محمود ندوہ تشریف لائے...... حضرت

مولانا کچھ کم چالیس سال ندوہ کے ناظمِ اعلیٰ رہے یہ پورا عرصہ ندوہ کی ترقی، تعلیمی معیار کی بلندی اور وقعت ووقار میں اضافے کا زمانہ ہے"۔

ادب اسلامی پر سیمینار

اسلامی ادیبوں کی عالمی تنظیم رابطة الادب الاسلامی قائم ہوئی علی میاںؒ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اسلام کی روشنی میں ادب اور تاریخ ادب کے مطالعے کا خیال ان کا بہت پرانا خیال تھا اس تنظیم کے قیام کے بعد دارالعلوم میں ادب اسلامی پر سیمینار منعقد ہوا۔ عالمِ عرب کے علمی ادبی حلقوں میں اس سلسلہ میں ندوۃ العلماء کی سبقت کا اعتراف کیا گیا۔ رابطہ ادب اسلامی کے آغاز ومقاصد کی تفصیلات مضمون "علی میاںؒ کا قلمی جہاد" میں شامل کی گئی ہیں۔

جمیعة الاصلاح

طلباء کی علمی سرگرمیوں کو فروغ دینے، ان میں وسعت واستحکام پیدا کرنے کے لیے جمیعة الاصلاح قائم کی گئی۔ اس کے زیرِ اہتمام سالانہ ششماہی تحریری و تقریری مقابلے منعقد کیے جاتے رہے تاکہ طلباء میں تحریر وتقریر کا ذوق پیدا ہو۔ 'الاصلاح' کے نام سے طلباء کا ترجمان ایک رسالہ بھی شائع کیا جاتا ہے "النادی العربی" کے زیرِ اہتمام طلبہ میں عربی زبان کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ ہر سال تحریر وتقریر کا ذوق شوق بڑھانے کے لیے سالانہ اور ششماہی، انعامی مقابلے بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔

علی میاںؒ کے دورِ نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان کو زندہ اور روزمرّہ کی زبان کے طور پر برتنے کا ذوق عام ہوا۔ دارالعلوم کے ماحول میں ثقافتی تنوع پیدا ہوا۔ جدید اور قدیم کتابوں کے ذخیرے کے علاوہ ہر طرح کے رسالے اخبارات عالم اسلام کے گوشے گوشے سے آنے لگے۔ علی میاںؒ کے عالم اسلام اور عالم عرب سے تعلقات کی وجہ سے عالم اسلام کی رنگارنگ شخصیتوں کی آمد ورفت کا سلسلہ رہا۔ عالم اسلام

اور مغربی دنیا سے شائع ہونے والے لٹریچر اور جدید تحریکات ورجحانات سے واقفیت کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ اس غرض سے طلبہ کو جدید و مؤثر اسلوب میں خاص طور پر عربی میں اپنے خیالات اور اسلام کی صحیح دعوت پیش کرنے کے لیے تیار کیا جانے لگا۔

۱۹۸۷ء میں ندوۃ کی سند فضیلت کو ایم۔ اے۔ عربی کے داخلے کے لیے منظور کرلیا اس سے قبل لکھنؤ یونیورسٹی ندوۃ العلماء کی سند عالمیت کو بی۔ اے۔ میں داخلہ کے لیے منظور کر چکی تھی۔

نصاب درس پر مجلس مذاکرہ

علی میاںؒ، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس وتدریس کے زمانے میں ہی بانیان ندوہ کے تخیلات میں رنگ بھرنے کی سعی کا آغاز کر چکے تھے۔ دارالعلوم کے تعلیمی نقطہ نظر اور مقاصد کے مطابق نصاب تعلیم کی تیاری کا کام علی میاںؒ کا زورِ قلم برسوں پہلے انجام دے چکا تھا۔ علی میاںؒ کی تیار کردہ درسیات مختارات من ادب العربی، القراۃ الراشدہ اور قصص النبیین دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علاوہ ملک کے متعدد تعلیمی اداروں اور دانش گاہوں کے نصاب تعلیم میں شامل تھیں اور ممالک عربیہ میں بھی مقبول ہو چکی تھیں۔ مصر وشام کے ماہرین تعلیم ان کو دوسری کتابوں پر ترجیح دے رہے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بنیادی مقصد اصلاح نصاب کے پیش نظر ۱۹۸۴ء میں نصاب درس پر ایک مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا، جس میں ملک اور بیرون ملک کے ماہرین تعلیم اور اساتذہ نے شرکت کی اور اپنی بیش قیمت تجاویز پیش کیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترتیب واصلاح نصاب میں علی میاںؒ نے اہم وکلیدی کردار ادا کیا ہے اصلاح نصاب کے سلسلہ میں بہ حیثیت ناظم دارالعلوم اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں۔

> ''ندوۃ العلماء کی تحریک کے بانی و ذمہ دار مدارس عربیہ کے نصاب کو ایک ذی نمو، ترقی پذیر، حقیقت پسند اور تقاضائے وقت کو پورا کرنے والا تعلیمی تربیتی، دعوتی، اور اختصاصی نظام تعلیم سمجھتے تھے اس لیے نئی نصابی

کتابوں کی ترتیب و تألیف کا کام اور اس میں تقاضائے وقت کے مطابق اضافہ اور ترمیم کا کام جاری رہا ہے۔ دارالعلوم نے عربی زبان و ادب، تمرین الصرف، نحو، تاریخ اور ادب کے مضامین و نصاب تعلیم میں اپنے کو خود کفیل بنا لیا ہے اور وہ اب مصر یا کسی عرب ملک کے نصاب کا محتاج اور رہین منّت نہیں ہے جس میں وہاں کے مخصوص حالات کی بناء پر دینی عنصر کی کمی علمانیت کا غلبہ ہے۔ ہمارا عربی زبان و ادب کا یہ نصاب بلاد عربیہ اور بلاد مقدسہ میں بھی مقبول اور بعض حیثیتوں سے فائق ہے اس نصاب کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان کی صحت و حلاوت اور معلومات عامہ کے ساتھ دین کا رنگ عقیدہ و اخلاق کی تعلیم اور اصلاح و تربیت کا فائدہ اس میں غالب اور نمایاں ہے"۔

(کاروان زندگی حصہ چہارم ص۔۲۸۳)

فضلائے ندوہ کے ذریعہ تیار کردہ کتب میں سے چند نصابی کتابوں کے نام جو آپ کے دور نظامت میں تیار کی گئی تھیں، یہ ہیں الادب العربی بین العرض و نقد۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، معلّم الانشاء حصّہ اوّل دوم مولانا عبدالماجد ندوی، معلّم الانشاء حصّہ سوم مولانا محمد رابع حسنی ندوی، تاریخ الادب العربی: مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد واضح رشید ندوی، دروس الاشیاء: مولانا محبوب الرحمٰن ازہری۔ تمرین النحو۔ مولانا مصطفےٰ ندوی و عبدالماجد، تمرین الصرف، مولوی معین اللہ ندوی، علم التصریف: مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی۔ جزیرۃ العرب: مولانا محمد رابع حسنی ندوی، العقیدۃ السنیۃ: مولانا محمد اویس ندوی، الفقۃ المیسر: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی، تفہیم المنطق: ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی"۔

۸۵ سالہ جشن تعلیمی

ندوۃ العلماء ایک ہمہ گیر علمی، دینی، اصلاحی اور تعلیمی تحریک کی حیثیت سے ۱۳۱۰ھ میں قائم ہوا تھا۔ اس تحریک کے کارکنوں نے تحریک کے عظیم مقاصد کو عملی شکل

دینے کی سعی کی۔ تحریک کے چھ سال بعد ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ دارالعلوم کی تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ تجربہ بابرکت اور کامیاب ثابت ہوا۔ ندوۃ العلماء کے تعارف کے لیے عظیم الشان سالانہ جلسوں کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ ذمہ دارانِ ندوہ، اصلاحی اور تبلیغی دورے کرتے تھے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس کانپور میں ہوا تھا۔ ۱۹۲۷ء کے امرتسر اجلاس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۲۷ء کے بعد بعض وجوہ سے یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۶۴ء میں علی میاںؒ (ناظم ندوۃ العلماء) نے اجلاس کے انعقاد کی تحریک فرمائی۔ مولانا محمد الحسنیؒ کی ادارت میں ''تعمیرِ حیات'' کا اجرا عمل میں آیا لیکن کسی وجہ سے اجلاس نہیں ہوسکا۔ ۱۹۷۴ء میں آپ نے دوبارہ اجلاس کے انعقاد کی تحریک فرمائی۔ ۱۹۷۵ء میں ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی کا انعقاد عمل میں آیا۔ مولانا عمران خاں ندویؒ کو اجلاس کا عمومی ناظم منتخب کیا گیا۔

مولانا محمد الحسنیؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اجلاس کی روداد اپنے خاص اسلوب میں تحریر کی، جس میں علمیت کے ساتھ سادگی اور رنگینی کا مؤثر امتزاج ہے۔

''اجلاس کے قریبی اور فوری محرکات میں سب سے بڑا حصہ (جس سے اس کا اوّلین تقاضا پیدا ہوا اور شدت اختیار کرگیا) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ناظم ندوۃ العلماء کے ممالک عربیہ واسلامیہ کے مسلسل دوروں اور وہاں کی جامعات، علمی مجالس اور عمومی اجتماعات میں ان کی تقریر اور خطبات کا ہے جن کا آغاز ۱۹۵۰ء میں سفر حجاز، شام اور مصر وسوڈان سے ہوگیا تھا۔ مصر میں جو اس وقت علم وادب کے لحاظ سے اپنے پورے شباب اور عروج پر تھا، مولانا کا کئی ماہ مسلسل قیام رہا اور ندوہ کے نام اور کام سے (جس سے ابھی تک چند نفوس آشنا تھے اور بہت مخصوص اور محدود علمی حلقوں میں اس کا تعارف تھا) ایک بڑا حلقہ اچھی طرح واقف ہوگیا جس میں ہر طبقہ کے ممتاز ونامور افراد، تعلیم یافتہ، ذہین و بے چین نوجوان لائق اساتذہ اور صفِ اوّل کے اہلِ فکر واہلِ قلم بلکہ دیہات کے سادہ لوح اور مخلص مسلمان بھی شامل تھے...... یہ ندوہ کا

پہلا عمومی اور ہمہ گیر تعارف تھا اس کے بعد مولانا کے سفر برابر جاری رہے، اور نہ صرف ممالک عربیہ اسلامیہ بلکہ یورپ کے متعدد ملکوں تک اس کا سلسلہ دراز ہو گیا اور رابطہ عالمِ اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی وغیرہ کے سالانہ جلسوں میں تقریباً ہر سال شرکت نیز مولانا کی عربی تصنیفات کی عالمِ عربی میں بڑے پیمانے پر اشاعت و مقبولیت کی وجہ سے ندوہ کو قدرتی طور پر عام مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے فکر و نظر کی بلندی، تخیل و نصب العین کی جامعیت اور دماغ و دل کے توازن نے علمی و دینی حلقوں کو خاص طور پر اور وسیع پیمانے پر متاثر کیا۔

دار العلوم سے نکلنے والے عربی رسائل ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' اور پندرہ روزہ ''الرائد'' نے بھی جو عالمِ اسلامی میں بہت قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اس تعارف میں اور ندوۃ العلماء کی مناسب اور دلآویز تصویر پیش کرنے میں پورا حصّہ لیا''۔

(روداد چمن: مولانا محمد الحسنی۔ص:۱۸تا۱۹)

ندوۃ العلماء کا یہ اجلاس بین الاقوامی سطح پر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۳۱؍اکتوبر تا ۳ نومبر ۱۹۷۵ء اجلاس کی تاریخیں طے ہو گئیں۔ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے جشن کی صدارت کی۔ عالمِ اسلام اور ہندوستان کی ممتاز ہستیوں کے علاوہ قومی اور ملّی یونیورسٹیوں کے سربراہوں نے شرکت کی۔

رودادِ چمن کے مصنف مولانا محمد الحسنیؒ نے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کی روداد مرتب کی اور جشن کی خوش گوار یادوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

''اس تختی برِ اعظم کی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب علم و فضل اور جمال و کمال کی یہ کہکشاں یہاں دیکھی گئی۔ جامعات اسلامیہ کے نمائندے، ان کے سربراہ اور ذمہ دار آج جس طرح شانہ بشانہ، قطار اندر قطار یہاں نظر آرہے تھے اور دلفریب منظر پیش کر رہے تھے وہ تاریخ کی ایسی امانت ہے جس کا کوئی مؤرّخ اور وقائع نگار نظر انداز نہیں کر سکتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈائس نہیں عالمِ اسلام کا حسین و جمیل گلدستہ

ہے، جس میں اس کے وسیع قلم رو سے ہر رنگ و بُو کے پھول اکٹھا کر کے بہت خوبصورتی اور خوش ذوقی کے ساتھ سجا دیئے گئے ہیں"۔

(روداد چمن: ص:۷۹ تا ۸۰)

ندوۃ العلماء کا جشن تعلیمی ہر حیثیت سے بہت کامیاب رہا۔ اس کی صدائے بازگشت پورے عالمِ اسلام میں سنی گئی۔ اجلاس میں مصر، سعودی عرب (ریاض، مکۃ المکرمہ، مدینہ منورہ) متحدہ عرب امارات، قطر، کویت، بحرین، اردن، ایران، عراق، شام، الجیریا، روس، یوگنڈا، نیپال، تھائی لینڈ، مشرقی افریقہ اور بنگلہ دیش کے مندوبین نے شرکت کی۔

علی میاںؒ نے اپنے خطاب میں بحیثیت ناظمِ ندوہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مسلک، نظریہ علم، تاریخ، طریق فکر، اس کی روح اور خمیر کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ یہ اجلاس دارالعلوم کی تاریخ میں یادگار اجلاس ثابت ہوا۔ عالمی سطح پر اور وسیع پیمانے پر دارالعلوم اور تحریک ندوۃ العلماء کا تعارف ہوا۔

تاریخ ندوۃ العلماء کی ترتیب

علی میاںؒ کے دورِ نظامت میں ہی تاریخ دارالعلوم ندوۃ العلماء مرتب کی گئی۔ اس کا پہلا حصہ مولوی اسحٰق جلیسؒ ندوی، اور دوسرا حصہ مولوی شمس تبریز خاں کے قلم سے ہے۔ دونوں حصے شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی دینی کارناموں اور اس کے اہم کردار کو سمجھا جاسکتا ہے۔ تحریک ندوہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی، علمی، روحانی، اخلاقی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں اہم رہی ہے اور اس کے فضلاء نے ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے سے لے کر اپنے دور کے فتنوں کے مقابلے میں بھی قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ اس کے منتسبین نے دین کی سربلندی اور حفاظت کے ساتھ طلباء کو حمیت اسلامی اور غیرت ایمانی کا درس دیا۔ مشرق سے مغرب تک دارالعلوم کے خوشہ چین اور اس کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے والوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔

"میرے خیال میں ندوۃ کا سب سے بڑا تعلیمی کارنامہ تعلیمی و ثقافتی میدان میں رونما ہوا۔۔۔ ندوۃ نے اپنی کشادہ فہمی کاوش دماغی اور قدیم و جدید کی جامعیت اور نئے حالات کی نباضی و مزاج شناسی کے سبب نصاب تعلیم میں مناسب تبدیلیوں کا عمل مسلسل اور مستقل طور پر جاری رکھا اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی مخلصانہ کوشش جاری رکھی......جس کے نتیجے میں وہ برصغیر ہندو پاک میں عربی ادب و صحافت کے ایک ممتاز ادارہ اور عربیت کے گہوارہ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا اور اس نے عربی صحافت کے میدان میں اسلامی الفکر انشاء پردازوں اور اہل قلم کی ایک جماعت تیار کر دی، جس نے ہندوستان کے علاوہ عالم اسلام اور عالم عربی کے حالات و سیاسیات پر بھی اپنا اثر ڈالا"

(تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم مرتب مولوی شمس تبریز خاں۔ ص:۱۱)

دارالعلوم ندوۃ سے اردو عربی رسائل و مجلّات میں البعث الاسلامی"، الرّائد"، تعمیر حیات، الاصلاح (طلباء کا ترجمان) ہیں۔ عربی رسائل عرب دنیا میں بہت ذوق شوق سے پڑھے جاتے ہیں، شعبہ صحافت کو مستقل ایک شعبہ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ ان تمام رسائل اور مکتبہ ندوۃ العلماء کا تعلق اسی شعبہ سے ہے۔ مکتبہ ندوۃ العلماء سے عربی اردو کی کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ رابطۃ الادب الاسلامی کا ترجمان کاروان ادب بھی شائع ہوتا ہے ۱۹۹۶ء کی سالانہ تعلیمی رپورٹ میں ناظم ندوۃ العلماء علی میاںؒ لکھتے ہیں۔

"ندوۃ نے مختلف پہلوؤں سے ترقی کی اور مختلف نوعیتوں سے وسعت حاصل کی اور اس کی کارکردگی بھی قابل شکر ہے۔۔۔ اس وقت اس کے ملحقہ مدارس اور اس کی شاخیں الحمدللہ ملک کے باہر بھی قائم ہو رہی ہیں۔ ملیشیا، نیپال، بنگلہ دیش، میں کئی شاخیں گذشتہ کئی سالوں میں قائم ہو چکی ہیں اب تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ اور

انگلستان میں بھی قائم کی جارہی ہیں۔۔۔ ہندوستان میں چھوٹے بڑے مدرسے ایک سو کے قریب ہو گئے ہیں جنھوں نے ندوۃ العلماء کے تعلیمی نظام کو اپنایا ہے شہر لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی شاخیں جو ابتدائی اور متوسط تعلیم کا کام کر رہی ہیں ایک درجن سے زیادہ ہیں۔۔۔ احاطہ، ندوۃ کے اندر طلباء کی تعداد دو ہزار اور احاطہ کے باہر ساڑھے تین ہزار ہے ان مدارس کے طلبہ ملحقہ مدارس سے پاس ہو کر اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے ندوۃ العلماء کے اس مرکزی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

فضیلت کے بعد ایک درجہ تکمیل کا رکھا گیا تھا جو ڈاکٹریٹ کے متوازی ہے پہلے بھی بعض طلباء نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن اس سال میں باقاعدہ طریقہ سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد سند بھی دی گئی۔

(تعمیر حیات لکھنؤ اگست ۱۹۹۶ء ص۔۱۶)

ندوۃ العلماء کا خاصا وسیع کتب خانہ ہے جو "کتب خانہ علامہ شبلیؒ" کے نام سے موسوم ہے اور بہت معیاری، متنوع کتابوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے اوپر ہے، طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد اور وقت و جگہ کی تنگی کی وجہ سے سات ذیلی کتب خانے دار العلوم ندوۃ العلماء کے احاطے کے اندر قائم کیے گئے ہیں ان میں ضرورت کے مطابق کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔

جمیعۃ الاصلاح کا کتب خانہ قدیم ہے اور گذشتہ کئی سال سے کلیۃ الشریعۃ اور کلیۃ اللغۃ کے الگ الگ کتب خانے قائم کیے گئے ہیں۔

متوسط استعداد کے طلبہ کے لیے عربی مطالعہ کا کتب خانہ مکتبہ الرائد، رواق سلیمانی، رواقِ اطہر، رواقِ عبدالحئی، دار الاقاموں کے ہال میں وسیع کتب خانے قائم کیے گئے ہیں جو عام طور پر رات میں کھلتے ہیں جن میں طلباء کی خاصی تعداد جا کر استفادہ کرتی ہے۔۔۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں اساتذہ کی ٹریننگ کا سینٹر قائم کرنے

کی تجویز کئی سال سے زیر غور ہے سال گذشتہ دارالعلوم کے ملحقہ مدرسوں کے اساتذہ کوٹریننگ دی گئی۔ امید ہے کہ بہت جلد یہ ٹریننگ سینٹر قائم ہو جائے گا۔ ۱۹۹۶ء میں ندوۃ میں ایک میڈیا سینٹر قائم کیا گیا ہے اخبارات یا رسائل کے ذریعہ مسلمانوں یا اسلام سے متعلق کوئی اعتراض یا غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے تو ندوۃ کے صحافی اس کا معقول جواب دیتے ہیں۔ علی میاںؒ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا ندوۃ العلماء کے فکر کی اہمیت وافادیت بڑھتی جائے گی'' بلاشبہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں ندوی فکر کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء تحریر فرماتے ہیں:

''ان سب باتوں کی وجہ سے ندوۃ العلماء پورے عالمِ اسلام بلکہ پوری دنیا کے دانشور طبقہ میں جانا پہچانا ادارہ بن چکا ہے جو اپنے تعلیمی مدارج کے اعتبار سے یونیورسٹی کی تعلیم کے مطابق ہے اور نصاب کے اعتبار سے کسی بھی بڑی دینی درس گاہ کی خصوصیت کا حامل ہے۔ مضامین نصاب کے اعتبار سے قدیم وجدید کے صالح اور ضروری مضامین کو جمع کیے ہوئے ہے اس کے کام اور نام کو اب بہت وقیع سمجھا جانے لگا ہے''۔

(عہد ساز شخصیت۔ ص: ۲۴۲)

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی کوششوں کو ہندوستان ہی نہیں عالم عرب اور عالم اسلام کی علمی و تعلیمی حلقوں میں بے حد پذیرائی ہوئی ہے۔ شیخ الازہر عبدالحلیم محمودؒ نے ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی کے موقع پر فرمایا تھا۔

''اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء کو آغاز ہی سے اس کے پروگرام اور مقاصد اور اس کے جدوجہد اور مساعی میں برکت وتوفیق عطا فرمائی اور اس کو ان مسرت انگیز نتائج تک پہنچایا ہے۔ اُس نے محدثین بھی پیدا کیے، فقہا بھی، کتاب اللہ کے عالم اور مفسر بھی، غرض علوم اسلامیہ کے ہر شعبہ میں یہ ادارہ برگ وبار لایا اور آج بھی وہ حکمت وموعظت حسنہ کے

ساتھ ساتھ دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے رہا ہے......آج پورا عالم اسلام ندوۃ کی قابلِ تحسین وآفریں مساعی کا احساس رکھتا ہے۔"

(روداد چمن۔ص:۱۲۴۔۱۲۵)

شیخ علی طنطاوی "فی مسیرۃ الحیاۃ" کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"ندوۃ کی مثال اس نوجوان کی سی ہے جس کی پرورش طاعتِ الٰہی کی نورانی فضا میں ہوئی وہ از ہر جیسا قدیم ادارہ نہیں ہے اس لیے اس کا کارنامے بھی اتنے نہیں ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں لیکن روز ازل سے ہی اس کی اساس تقویٰ الٰہی پر رکھی گئی اور ابتداء سے ہی جادۂ اعتدال پر گامزن ہے۔ وہ اعلیٰ اقدار جن کی کشش اور اثر زمانہ قدیم سے اب تک انسانوں کو اپنی طرف مائل کرتا رہا ہے یعنی حق، خیر اور حسن و جمال یہ تینوں اقدار ندوۃ میں موجود ہیں۔ جمال اس کے محل وقوع میں ہے خیر اس کے افراد میں ہے اور حق مقدس مقصد میں ہے جس کی تکمیل کے لیے ندوۃ جدوجہد کررہا ہے"

مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان دار العلوم ندوۃ العلماء کی ترقی اور اس کے منتسبین بالخصوص حضرت مولانا علی میاںؒ کی مخلصانہ جدوجہد کو سراہتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ندوہ کی علمی، دینی فضا کو دیکھ کر بڑی امیدیں قائم ہوئیں اور حوصلہ بڑھا۔ بقول اکبر مرحوم ندوہ مسلمانوں کی "زبان ہوشمند" تو ہمیشہ سے تھا لیکن "دل دردمند" کی جو کسر بیان کی جاتی تھی وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے پوری فرمادی۔

خاص طور سے مولانا علی میاں مدظلہ العالی کی فکر و بصیرت، جہد و عمل اور سوز و گداز کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی نے اس ادارے کو حیاتِ نو بخش دی"۔

(جہاں دیدہ۔ص:۵۲۴)

دار العلوم ندوۃ العلماء ایک آفاقی اور اسلامی اسلوب دعوت، تربیت اور فکر کا نام ہے۔ علی میاںؒ کے دورِ نظامت میں دار العلوم ندوۃ نے تعلیمی ثقافتی اور تعمیری میدان میں نمایاں ترقی کی۔ اپنی سنجیدہ ٹھوس علمی و دعوتی جدوجہد سے اسلامی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ عربوں نے ندوی طرزِ فکر دعوت اور لٹریچر اور اس کی اہم شخصیات کا اعتراف کیا۔ ندوۃ العلماء کے فرزندوں نے ہندوستانی علماء کے علمی دعوتی اور تحقیقی کاموں کا تعارف کرایا اور ہندوستان کا وقار عالم عرب میں بلند ہوا۔ دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ ادب اسلامی پر توجہ مرکوز کی گئی اور رابطہ ادب اسلامی کی شکل میں اسلامی دعوت کو فروغ کے لیے جدوجہد کا ایک میدان عطا کیا گیا۔ صحیح عربی ذوق اور لسانی جاذبیت اور دلکشی کے ساتھ دین کے مقصد اور اخلاقی تعلیمات پر دھیان دیا گیا اور عربی زبان و ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں ایسا سلسلہ کتب مرتب کیا گیا جو اس کمی کو پورا کرے۔ عرب اور بلاد عربیہ کے ماہرین تعلیم نے بھی اسے سراہا۔ برصغیر میں عربی صحافت کو فروغ ہوا اور ندوۃ العلماء ممتاز حیثیت سے منظر عام پر آیا اس کے رسائل کے ذریعہ عالم اسلام اور عالم عربی سے علمی و ثقافتی تعلقات میں استحکام پیدا ہوا۔

> ”اگر مسلمانوں کے لیے ترقی کا کوئی راستہ ہے اس ملک میں عزت پانے کا قیادت کا تو یہ کہ وہ داعی بن کر قیادت کریں، حریف بن کر نہیں...... عددی اقلیت ہونے نے تو ایک طرح سے قسمت پر مہر لگا دی ہے اگر مسلمان داعی کی حیثیت حاصل کریں گے تو اللہ اس کے طفیل میں سب کچھ عنایت کرے گا“
>
> (مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ)

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا قلمی جہاد

(دینی تحریکات اور اداروں سے وابستگی)

علی میاںؒ اپنی علمی زندگی کے آغاز میں تجدیدی اور اصلاحی تحریکات کی تاریخ اور شخصیات کے کاموں سے واقف ہو چکے تھے بلکہ تاریخ و تذکرہ نویسی کا کام بھی انجام دے چکے تھے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء جیسے فکری ادارے کے دینی علمی تعلیمی اور ثقافتی ماحول میں ان کا فکری نشو و نما ہوا تھا۔ بڑے بھائی، اساتذہ اور مرشدین کی سرپرستی توجہ اور تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ انھیں عربی اور اردو زبان پر یکساں عالمانہ، ادیبانہ قدرت حاصل ہوگئی تھی، انھوں نے عربی تعلیم کے آغاز کے ساتھ اردو زبان و ادب کی معیاری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ خاندان کی جدوجہد، جہاد اور قربانی کی روایات اور اس کے اثرات رگوں میں دوڑتے خون میں شامل تھے۔ اسلام کے بقاء اور تحفظ کی کوشش امت مسلمہ کی تعلیم، تربیت اور اصلاح، اتحادِ ملت کی فکر اور بلاتفریق مذہب و ملت انسانیت کی تعمیر ان کی تقریر و تحریر کے خاص موضوعات بن گئے، یہ موضوعات جو اُن کے مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ نوجوانی میں ہی مختلف دینی دعوتی، اصلاحی تحریکات سے وابستہ ہوئے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات انجام دینے کے زمانے میں طالب علموں کے لیے کسی صالح تحریک اور صحت مند لٹریچر کی تلاش مولانا مودودیؒ کی جماعت اسلامی کی طرف لے گئی۔ مدرسہ سے باہر مذہبی انہماک کی فکر نے مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوتی تبلیغی تحریک کو پسند کیا اور اس میں شمولیت اختیار کی۔ ہندوستان اور عالمِ اسلام عالمِ عرب میں تبلیغی تحریک کے طریقہ پر دعوت کا کام کیا۔ ہندوستان میں بلاتفریق مذہب و ملت انسانیت کی تعمیر اور اصلاح کے لیے تحریک پیامِ انسانیت کو ضروری قرار دیا۔ دینی تعلیم کی فکر میں صدر دینی تعلیمی کونسل کی حیثیت سے مؤثر رہنما کے فرائض انجام دیے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں مغربی نظامِ تعلیم مغرب کی مادّی تہذیب، ارتداد اور لادینیت سے حفاظت کے لیے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے قیام کو وقت کی اہم ضرورت سمجھا۔ عصری اسلوب اور مؤثر

زبان میں لٹریچر کے ذریعہ ارتدادی تحریکوں اور ملحدانہ لہروں کا مقابلہ کیا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے اسلامی شریعت کے تحفظ اور بقاء کے لیے پیش پیش رہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے بنیادی حیاتی رکن کی حیثیت سے اسلامی دعوت کی نشر واشاعت کے خلوصِ دل سے جدوجہد کی۔ ادب میں اسلامی عناصر کی تلاش و جستجو کا گلستاں اسلامی ادیبوں کی تنظیم رابطہ ادب اسلامی ہے۔ ادبی موضوعات پر معتبر اسلوب، آسان زبان اور متوازن انداز میں خیالات کی ترجمانی کی۔ ادب کے معیاری اُصول، قواعد وضوابط مرتب کیے۔ آکسفورڈ اسلامک سینٹر کے قیام کے بعد سینٹر کے چیئرمین منتخب کیے گئے، علم کی اشاعت وترقی اور اس کے ذریعہ انسانیت کی رہنمائی اور اصلاح میں اسلام کی تاریخی کردار کی وضاحت کی۔ علی میاںؒ کے علمی، ادبی، دینی، تعلیمی، تحریکی خدمات کے اعتراف میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ عرب، عالم اسلام میں ایک مفکر، داعی اور صاحبِ اسلوب کا درجہ دیا گیا۔

مذکورہ بالا تمام تحریکات اور اداروں سے علی میاںؒ کی وابستگی کا زمانی رقبہ نصف صدی سے زیادہ پر اور مکانی رقبہ عالمِ عربی سے عالمِ اسلام تک محیط ہے۔ علی میاںؒ کسی تحریک کے سرگرم رکن، کسی کے صحیح ترجمان، اہم وقابل ذکر ممبر اور کسی تحریک کے بانی اور روحِ رواں تھے۔ ان کی ذات ملک وقوم کے لیے باعث فخر تھی۔ ہر طبقہ کے لوگ ان کا احترام کرتے تھے، ان کی وجہ سے ہندوستان اور اہلِ ہند کے وقار اور عظمت میں اضافہ ہوا۔

ان کی مساعی سے اسلامی ممالک کے تعلیم یافتہ عوام اور علماء یکساں واقف تھے، ان کا احترام کرتے تھے اور دینی وعلمی معاملات میں ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کا دل ودماغ ہر وقت ساری دنیا بالخصوص ہندوستان میں امن وسکون، انصاف اور انسان دوستی کے لیے متفکر رہتا تھا۔ ہر دینی اور علمی دانش گاہ کے لیے اُن کی نیک خواہشات اور مساعی ہر وقت شامل رہتی تھیں۔ مختلف تحریکات میں عملی وابستگی کے پس پشت کسی دنیاوی جاہ وحشم سے مرعوبیت، دولت وثروت، شہرت

ونا موری کا حصول یا کسی قسم کا خوف ولالچ نہیں تھا بلکہ معتدل، متوازن، صحت مند، صالح اور محتاط رویوں کے ساتھ ملت کی خیر خواہی مقصد تھا، دین کی نشر واشاعت اور اصلاح کا جذبہ کارفرما تھا۔

''جماعت اسلامی'' دارالعلوم میں درس وتدریس کے دوران علی میاںؒ کو طلباء کی خارجی مشغولیت کے لیے ''صالح تحریک'' اور ''صحت مند لٹریچر'' کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ جماعت اسلامی کے بانی وقائد مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ترجمان القرآن، لاہور میں ان کو اپنے خیالات اور احساسات کی ترجمانی نظر آئی، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں (مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ) نے اسلام کے حقائق اور اس کے قوانین ومعاشرت اور اس کی اقتصادی وسیاسی نظاموں کو اس انداز سے پیش کیا، جس میں معذرت وتاویل کا وہ رنگ نہیں تھا جو عرصہ سے ان مسائل پر لکھنے والے دانشوروں اور اہل قلم کے یہاں پایا جاتا تھا بلکہ انھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات کے بارے میں اقدامی پوزیشن اختیار کی اور خود اس کی بنیادوں اور جڑوں پر تیشہ زنی کی، جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کا وہ احساس کمتری اور احساس شکست خوردگی دور ہوگیا جو خالص مغربی تعلیم نے ان میں پیدا کردیا تھا اور بہت سے نوجوانوں کے دل میں اسلام کی سربلندی اور اسلامی حکومت کے قیام کا جذبہ اور ضرورت کا احساس بیدار ہوگیا، جو اس کو ناقابل عمل بلکہ ناقابل تصور سمجھنے لگے تھے۔ یہ ان کی وہ خدمت ہے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا''۔

(پرانے چراغ۔ ج: دوم، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ص: ۳۰۱)

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک علی میاںؒ جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن رہے اور جماعت اسلامی لکھنؤ کے ذمہ دار کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن اس

مدت میں جماعت کے لٹریچر اور اہلِ جماعت کا بغور مطالعہ کرنے کے دوران اُن کے ذہن میں مختلف اشکالات پیدا ہوئے۔ جن میں اضافہ ہوا اور اختلاف کی شکل اختیار کر گئے اور انھوں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جماعت سے علیحدگی کے اسباب خودنوشت سوانح 'کاروانِ زندگی' میں تحریر کیے ہیں۔ ان میں پہلا سبب جماعت اسلامی کے منتسبین بانی جماعت کے متعلق غلو پیدا ہونا، دوسرے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور ملازمین افراد محسوس کرتے تھے کہ بانی جماعت سے قبل نہ کسی نے اسلام کو سمجھا اور نہ ان سے بہتر کسی نے اسلام کو پیش کیا۔ تیسرے منتسبین جماعت میں اسلام کی تاریخ اصلاح اور تجدید سے ناواقفیت پائی جاتی تھی، چوتھے جماعت کے افراد میں تنقید کا غلبہ تھا، علماء اور دینی حلقے بھی بے جا تنقید کا نشانہ بنے ہوئے تھے، پانچویں دینی ذوق اور عمل روبہ تنزل تھا اس کے علاوہ علی میاںؒ کو اصلاح نفس اور تعلق مع اللہ میں کمی کا بھی شدت سے احساس ہوا۔ بنیادی خیالات اور طریق کار کا فرق ہی علی میاںؒ کے جماعت اسلامی کے علیحدگی کا سبب بنا۔ ایک عالم، مفکر اور داعی کی حیثیت سے انھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اسلامی تاریخ سے ناواقفیت دور کرنے کا بیڑا اُٹھایا، ۱۹۵۵ء میں ان کی یہ کوشش ''تاریخ دعوت وعزیمت'' جیسی ضخیم تصنیف کی شکل میں منظرِ عام پر آئی، اس تصنیف میں دورِ خلافتِ راشدہ سے اسلام کی اصلاحی وتجدیدی تاریخ کے تسلسل کو بیان کیا گیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کی دین کی تفہیم وتشریح سے اختلاف کے پیش نظر علی میاںؒ نے ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں اپنے موقف کے سلسلے میں مدلل طرزِ بیان اختیار کیا۔ یہ تصنیف معاصر تحریکوں اور تحریروں کے آئینے میں جائزہ اور تبصرہ ہے۔ اس کے ذریعہ عالمِ اسلام کے نوجوانوں کی رہبری کا کام کیا اور جماعت اسلامی کے داعیوں کو اس اہم مسئلہ پر نظرِ ثانی کرنے کی دعوت دی۔ علی میاںؒ کی یہ کتاب مولانا مودودیؒ مرحوم کی

حیات میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آگئی تھی۔

مجلس مشاورت، ۱۹۶۴ء میں مسلمانوں کے 'اجتماعی مسائل کا حل' تلاش کرنے اور مسلمانوں کے انتشار اور لامرکزیت کو دور کرنے کے لیے مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، اس تحریک کے روح رواں ڈاکٹر سید محمود تھے اور علی میاںؒ اس کے بنیادی رکن تھے۔ اس تحریک کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے:

مسلمانوں کی مختلف جماعتیں مشترک مقاصد پر جمع ہوں، باہمی تبادلہ خیال اور تعاون سے مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل تلاش کیا جائے، مسلمانوں کے باہمی اختلافات دور ہوں، اتحاد واتفاق کی فضا قائم ہو، مسلمانوں میں حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا ہو، مسلمان ملّی تشخص کے ساتھ ہندوستان میں رہ سکیں، حکمراں جماعت میں مسلمانوں کی صحیح قیادت ہو سکے۔

علی میاںؒ مجلس مشاورت کی تحریک کے سرگرم کارکنان میں تھے۔ انھوں نے مجلس کے وفد کے ساتھ ہندوستان کے فسادزدہ علاقوں کا دورہ کیا، مسلمانوں کے مشترکہ جماعت کا خیر مقدم کیا گیا۔ جماعت کے اراکین نے اس بات کی کوشش کی کہ ہندوستان کے ۱۹۶۷ء کے عمومی انتخابات میں مسلمان اپنا وزن ثابت کریں تاکہ ملک کی سیاست پر اثر انداز ہوں۔ اس طرح مسلم مجلس مشاورت کچھ مسائل میں مشترک جدوجہد کے اصول پر قائم ہوا، مجلس مشاورت میں جماعتیں نہیں بلکہ جماعتوں کے افراد شریک ہوئے تھے۔ سب ہی اشتراک واتحاد کے خواہاں تھے لیکن مجلس مشاورت جس کی بنیاد اخلاص، ایمانداری اور اتحادِ ملت کی نیت سے رکھی گئی تھی ملت کی مختلف الخیالی، جلد بازی اور بنیادی انتشار کا شکار ہوگئی۔ علی میاںؒ تصنیف اور تالیف کے مردِ میدان تھے ان کا ذوق سیاسی نہیں تھا، ان کا مزاج خالص دینی وعلمی تھا چنانچہ جوڑتوڑ اور سیاسی ہنگامہ آرائی کے متحمل نہ ہوسکے اور بہت جلد مجلس سے باضابطہ تعلق ختم کرلیا۔

"تبلیغی تحریک" مولانا الیاسؒ کی دینی دعوت کی تحریک سے وابستگی دارالعلوم

کے طلباء کے لیے مدرسہ سے باہر کسی دینی مصروفیت اور مذہبی انہماک کے لیے کی گئی تھی۔ یہ نو اور اس کے قرب وجوار میں علی میاںؒ نے ندوہ کے طلباء کے ساتھ دین کی دعوت وتبلیغ کا کام تحریک کے قائد کے لائحہ عمل کے مطابق کیا۔ تبلیغی جماعت کے لیے آپ کی بے لوث خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بہت قدر فرماتے تھے اور جماعت کی روح قرار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ آں محترم کی توجہاتِ عالیہ سے تبلیغ کو جس قدر نفع پہنچا ہے اب تک لگنے والوں میں کسی سے نہیں پہونچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مخصوص توجہات کو اس طرف اور زائد سے زائد مبذول فرمائے۔ (آمین)

علی میاںؒ نے تبلیغ کا کام عرب ممالک میں بھی کیا۔ عرب ممالک میں اس کام کے لیے آپ کو تبلیغی تحریک کے اصل داعیوں کی طرف سے منتخب کیا گیا تھا۔ مولانا الیاسؒ سے قلبی تعلق کو اپنی زندگی کا اہم موڑ قرار دیتے تھے۔ علی میاںؒ نے ''ایک اہم دینی دعوت'' کے نام سے ایک مختصر رسالہ اس تحریک کے تعارف میں لکھا۔ عرب ممالک کے لیے عربی زبان میں دعوتی لٹریچر تیار کیا، اس سلسلے میں رسالہ ''الی ممثلی البلاد الاسلامیہ'' بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس رسالے میں ''داعی'' کے بلند مقام سے خطاب کیا گیا ہے، اس میں قلب کی حرارت بھی ہے، روح کا کرب بھی، انقلاب کی دعوت بھی، درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی بھی کی گئی ہے، آخر میں تبلیغی جماعت کا تعارف، میوات میں کام کی نوعیت اور حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی مساعی، علمی رسوخ، تعلق باللہ اور اس کے ثمرات کا بیان ہے۔

علی میاںؒ مدارس میں تبلیغ و دعوت کے کام کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے اپنی علمی، دعوتی، اصلاحی تجربات کی روشنی میں تبلیغ ودعوت کے کام کو مدرسے کی تعلیم سے جوڑنے پر زور دیا، مولانا الیاسؒ کے طریقۂ تبلیغ کو علمی حلقوں میں روشناس کیا۔ اس کے دوررس فوائد سے آگاہ کیا۔

علی میاںؒ ایک علمی اور فکری پس منظر رکھتے تھے، مولانا الیاسؒ کے انتقال کے

بعد جب مولانا محمد یوسفؒ تحریک کے قائد بنے تو علی میاںؒ نے ان کو کچھ مشورے دیے تاکہ تحریک کو منظم، مؤثر اور پُرکشش بنایا جائے جس سے مولانا محمد یوسفؒ نے اتفاق نہیں کیا، چنانچہ علی میاںؒ نے یہ فیصلہ کیا کہ تحریک کے مرکز سے اپنا تعلق اور دعوت کی مشغولیت کو جاری رکھا جائے، اور اپنے دائرہ کار میں اس کو زیادہ مفید بنانے اور حالات و ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے دعوت و تفہیم کی اپنی زبان استعمال کرنے کا درمیانی راستہ تلاش کیا جائے۔ علی میاںؒ تاحیات اپنے اسی اصول پر قائم رہے، ان کے ایک رسالہ ''تبلیغ دین کے لیے ایک اہم اصول'' ان کے معتدل اور متوازن اندازِ فکر کی غمازی کرتا ہے۔ تبلیغ دین کے لیے اعتدال کو ایک اہم اصول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سب سے مشکل چیز اعتدال ہے، انبیاء علیہ السلام میں اعتدال بدرجۂ اتم ہوتا ہے، یہ بالکل ممکن ہے کہ پچاس برس بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں جو صاحبِ نظر بھی ہوں، اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو اور دعوت کے طریقے میں زمانے کی ضرورت اور تقاضے کے لحاظ سے تبدیلیاں کریں، اس وقت اگر ایک جامد طبقہ اس کی مخالفت محض اس بناء پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا کرتے تھے تو اس کا رویہ غلط ہوگا۔ اس کا اصرار ہٹ دھرمی ہوگا۔ کبھی کبھی ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا کہ یہی طریقہ کار اور یہی طرز دین کی خدمت اور احیاء کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے ہر جگہ کے لیے ضروری ہے اس کے علاوہ سب غلط ہے جب تک اس مخصوص طریقے پر کام نہ ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ ساری جدو جہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا، یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے اسی طرز فکر کے نتیجے میں مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے ہیں، اصل

حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک غور اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہنچادیا اور ہم نے اس کو مفید پایا پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں ہمیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہیے لیکن اگر کوئی خاص طریقہ ایک رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہوجائے گی اس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ وہ اس کے اصلاح کے لیے جدوجہد کریں اوران رسومات کو مٹائیں''۔

(تبلیغ دین کے لیے ایک اہم اصول: مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ص:۹)

علی میاںؒ نے ہندوستان اور بیرونِ ہند کئی دعوتی تبلیغی اسفار کیے، تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں شرکت کی، تقاریر کیں، ان کے قلم سے ''مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی تحریک'' کے نام سے سوانح اور تبلیغی کام کا تعارف بھی شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ دعوت وتبلیغ ان کا محبوب اور پسندیدہ کام تھا، ان کو احیاءِ اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کی ہر کوشش سے قلبی مناسبت تھی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے عرب و اسلامی ممالک میں اپنے شاگردِ عزیز کی تبلیغی ودعوتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''آج وہ سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے مشہور روزگار ہیں اور تبلیغ دین کے کام میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہیں...... حجاز اور مصر کی فضائیں ان کی دعوت کے نغموں سے مسحور ہیں...... اللہ تعالیٰ نے عربی تقریر وتحریر کی دولت ان کو عنایت فرمائی ہے جس کو وہ الحمدللہ دین کی راہ میں لٹا رہے ہیں''۔

(یادِ رفتگاں۔ص:۵۰)

''<u>تحریک پیامِ انسانیت</u>'' علی میاںؒ کی قائم کردہ تحریک ہے، <u>۱۹۵۴ء</u> میں اس تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا، تحریک کے بانی وروحِ رواں علی میاںؒ <u>۱۹۴۷ء</u> سے یہ محسوس کررہے تھے کہ اصلاحی وفلاحی کام کے لیے معتدل وپُرسکون فضا اور

ماحول کا ہندوستان سے خاتمہ ہو رہا ہے، ملک تیزی سے اخلاقی انحطاط، قومی و اجتماعی اضمحلال کی طرف جا رہا ہے، خود غرضی و خود پرستی کا سودا سب پر سوار ہے، انسان کے جان و مال، عزت اور آبرو کا احترام ختم ہو رہا ہے۔ حقیر شخصی فوائد کے لیے اجتماعی و ملکی مفاد کو آسانی سے قربان کرنا، کام چوری، احساس ذمہ داری کا فقدان، رشوت خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، بدعنوانی نے عام زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ ان پریشان کن حالات کی وجہ سے علی میاںؒ نے بلاتفریق مذہب وملت عام ہندوستانیوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا۔ تحریک پیامِ انسانیت کا موضوع انسانیت اور اخلاق ہے اور اس کا مقصد ہندوستان کے رہنے والوں میں زندگی کا سلیقہ اور شہریت کا احساس پیدا کرنا تھا۔ یہ تحریک وحدت ادیان کی نہیں وحدتِ انسان کی ' تحریک ہے۔ دروۂ مالوہ کی روداد "تحفۂ انسانیت" کے پیش لفظ میں علی میاںؒ لکھتے ہیں:

"اس تحریک (تحریک پیامِ انسانیت) کا بنیادی مقصد ہندوستان کی پوری آبادی کو بلاتفریق مذہب وملت انسانیت کو، نئی زندگی دینا اور انسانوں کو انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا تھا، اس دعوت کے بعد ملک کے کئی طویل وعریض دورے ہوئے، جن میں مختلف ریاستوں میں یہ پیغام، بڑے پبلک جلسوں میں، خواص اور دانشوروں کی محفلوں میں سنایا گیا۔ یہ ایک دکھے ہوئے دل اور چوٹ کھائے ہوئے دماغ کی پکار تھی اور ہندوستان کی تیزی کے ساتھ بگڑی ہوئی صورت حال کی سچی تصویر اور اس پر اظہارِ تشویش جس میں "اگر صورتِ حال کو نہ صرف باقی رہنے بلکہ بڑھنے کا موقع دیا گیا تو کسی تعمیری کام، خدمت انسان، ملک کی سالمیت، اعلیٰ اخلاقی قدروں کی حفاظت حتیٰ کہ ضروریاتِ زندگی کی قانونی اور جائز طریقہ پر تکمیل کا موقع اور پھر آگے بڑھ کر

معمول کے مطابق زندگی کی بھی گنجائش نہیں رہے گی...... اور شاعرفطرت اقبالؔ کے الفاظ میں یہ ملک ایک وسیع ''قمار خانہ''، ''جوئے کا اڈّہ'' بن کر رہ جائے گا۔ ایسی صورت میں شریفوں کو اپنی شرافت، ضمیر والوں کو اپنا ضمیر، مذہب والوں کو اپنا مذہب، علمی ذوق رکھنے والوں اور تحقیق وتصنیف کا کام کرنے والوں کو اپنا کام جاری رکھنا اور ذوق کی تسکین کا سامان کرنا بھی مشکل ہو جائے گا، قوموں اور تہذیبوں پر یہ وقت آئے ہیں اور پھر ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا گیا ہے اس لیے یہ صورتِ حال سب کی فکر کا باعث اور سب کے توجہ کی مستحق ہونی چاہیے''۔

(تحفۂ انسانیت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مرتبہ: مولوی اسحاق جلیس ندوی۔ ص:۱۔۲)

علی میاںؒ نے بلاتفریق مذہب وملت انسانیت کی تعمیر وترقی کا بیڑا اُٹھایا۔ ''ہندوستانی سماج کی خبر لیجیے'' مضمون میں ملک کی بگڑتی ہوئی اخلاقی صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا۔ علی میاںؒ تبلیغی تحریک سے وابستہ تھے، تبلیغی دوروں کے ساتھ شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب سے ملاقات کرتے پیامِ انسانیت کے جلسوں کا انعقاد کیا جاتا، تبلیغی دوروں کے ساتھ شامل ان مخلوط اجتماعات کی تقریریں ''پیامِ انسانیت'' اور ''مقامِ انسانیت'' کے نام سے شائع ہوئیں۔ تحریک پیامِ انسانیت کے ذریعہ علی میاںؒ نے ''اصلاح'' کا نعرہ دیا اور اپنی تقاریر میں بتایا کہ ''ملک یا قوم کے تحفظ وبقا کے لیے افراد کو خود غرضی، ظلم، بے ایمانی اور خیانت سے بچانے کے لیے اصل طاقت خدا کا عقیدہ اور خوف ہے''۔...... اس کے بعد کسی درجہ میں کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا سکتی ہے تو وہ سچی حب الوطنی ہے''۔

علی میاںؒ ان تقریروں میں دنیا کی تاریخ یا مستند واقعات سے حقائق پیش کرتے ہیں، نتائج اخذ کرتے ہیں اور قاری یا سامعین کو آگاہ کرتے ہیں کہ اگر

انھوں نے تاریخ سے سبق نہیں لیا تو ان کا یہ عمل انتہائی غیر دانشمندانہ ہوگا۔ پیغمبروں کی تعلیمات اور طریقے کی روشنی میں انسانیت کو آواز دیتے، اور مسلمانوں کو ان کی ''دوہری ذمہ داری'' یاد دلاتے، ایک خیر امت ہونے کی بناء پر اور دوسری وہ جو معاشرہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہے۔

ہندوستان کے مختلف اضلاع میں وقتاً فوقتاً پیامِ انسانیت کے جلسے منعقد کیے جاتے رہے، بلاتفریق مذہب وملت لوگ شریک ہوئے، اگرچہ علی میاںؒ کے بیرونی اسفار، ندوہ کی نظامت اور تصنیفی اشتغال کی وجہ سے تحریک پیامِ انسانیت کے جلسوں میں کمی رہی لیکن پیامِ انسانیت کے ان جلسوں میں کثیر تعداد میں مسلم و غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب شریک ہوئے، علی میاںؒ اور تحریک کے چند ترجمان مولانا اسحاق جلیس ندویؒ، مولانا عبدالکریم پارکھؒ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشیؒ تقریر کرتے، یہ تقریریں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے دلکش قابل فہم اور مؤثر ہوا کرتی تھیں۔

علی میاںؒ نے ہمیشہ اس تحریک کو ملک کی تعمیر وترقی کے لیے ضروری اور بے حد اہم قرار دیا، اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیامِ انسانیت کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پُرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی اس لیے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون بلکہ پاسباں ومحافظ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ہر دعوت وتحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے''۔

(کاروانِ زندگی۔ ج:۲، ص:۱۱۳)

تحریک کی اہمیت وافادیت کے باوجود اس کے روحِ رواں خود اس بات سے متفکر رہے کہ تحریک کی رفتار دھیمی اور اس کے ترجمان بہت کم ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''تحریک کسی نہ کسی طرح جاری ہے لیکن اس کو جس توجہ اور انہماک، جتنے وقت اور جتنے ترجمانوں اور داعیوں کی ضرورت ہے وہ ابھی تک فراہم نہیں ہوئے ہیں۔ بڑا انحصار ان رسائل اور تقریروں پر رہ گیا ہے جو اردو ہندی انگریزی میں چھپ چکی ہیں یا کبھی کبھی کے میرے سفروں اور دوروں پر، لیکن اس قحط الرجال، بے سروسامانی، لوگوں کی ابھی تک اس کام کی اہمیت اور ضرورت نہ سمجھنے کے باوجود اب بھی اس کام کی اہمیت اور ضرورت پر اتنا ہی یقین ہے جتنا پہلے دن تھا بلکہ ملک کے تیزی سے بگڑتے ہوئے حالات نے اس کی ضرورت کا اور بھی شدت کے ساتھ احساس پیدا کر دیا ہے۔

(کاروانِ زندگی۔ ج:۲، ص:۱۲۵)

پیامِ انسانیت''، ''مقامِ انسانیت''، ''تحفۂ انسانیت'' اصلاح معاشرہ کی اس تحریک کے سلسلہ کی مختصر مگر اہم کتب ہیں۔ تحریک پیامِ انسانیت کی تقاریر اردو، ہندی، انگریزی میں شائع ہوئی ہیں۔

''دینی تعلیمی کونسل'' ۱۹۵۹ء میں مشرقی یوپی کے ضلع بستی میں دینی تعلیمی کونسل قائم کی گئی جس کے روحِ رواں قاضی عدیل عباسی تھے۔ علی میاںؒ کاروانِ زندگی' میں دینی تعلیمی کونسل کے قیام کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جہاں تک ملت اسلامیہ ہندیہ کا تعلق ہے اس کے اہم ترین اور موت وحیات کا فیصلہ کرنے والے مسائل میں مسلمانوں کی نئی نسل کا اسلام کے بنیادی عقائد، ایمانیات اور اپنے ملّی تشخص اور امتیاز پر برقرار رہنے کا مسئلہ تھا جو ہندوستان کے ایک سیکولر (نامذہبی) اسٹیٹ بن جانے کے بعد بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا......اسی کے ساتھ

مسلمانوں کے بارے میں ماضی کی تلخیاں، پاکستان کا وجود اور
ہندو احیائیت کی موجودگی، غیر مذہبی نصاب کے واضعین کی بھی
ہندو ذہنیت، ان سب نے مل کر مسئلہ کو نہایت پیچیدہ بنادیا تھا"۔

(کاروانِ زندگی۔ ج:۱، ص:۴۵۹)

ملک وملت کے ایک فکرمند قاضی عدیل عباسی نے اس خطرہ کو محسوس کیا۔ اپنے ضلع کے حدود میں علی میاںؒ کے مشورہ سے مکاتب اور مدارس کا کام خاموشی سے شروع کیا۔ یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو دینی تعلیمی کونسل کے نام سے باقاعدہ ایک تنظیم قائم کی گئی۔ ضلع بستی اُتر پردیش میں علی میاںؒ کی زیرِ صدارت دینی تعلیمی کونسل کی پہلی صوبائی کانفرنس منعقد کی گئی، علی میاںؒ کو کونسل کا صدر منتخب کیا گیا۔ ابتداء میں چٹکی فنڈ سے (ہر گھر میں عورتیں کھانا پکاتے وقت روزانہ ایک مٹھی آٹا مکتب کے نام سے الگ رکھ دیتیں اور اس کو جمع کر کے فروخت کیا جاتا) مکتب کا خرچ چلایا جاتا تھا۔ یہ دینی تعلیمی تحریک گذشتہ ۴۸ سال سے یوپی اور ہندوستان کے مختلف اضلاع کے مسلمانوں کی سرگرم تنظیم ہے اور مسلمان بچوں بچیوں کے لیے اردو کے ذریعہ دینی تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔ اس کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ بچے، سچے مسلمان اور اچھے شہری بنیں۔ وقتاً فوقتاً اس کی کانفرنسیں ہوتی ہیں جس میں کارکردگی کا جائزہ لیا جاتا ہے اور غفلت و بے عملی کو دور کرنے کے لیے نئی تجاویز پیش کی جاتی ہیں اور آئندہ ان کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ علی میاںؒ کی صدارتی تقریروں میں صورت حال کی عکاسی، مسلمانوں کے جذبات اور نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے، وہ ملت کا احتساب بھی کرتے ہیں اور انھیں بیداری کا پیغام بھی دیتے ہیں اور اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی غفلت اور بے علمی سے اپنی ملّی صحت خود بگاڑ چکیں گے تو پھر بڑے بڑے صلحاء اور اتقیاء بھی زندہ ہو کر اس کو توانا اور صحت مند نہیں بنا سکتے"۔ علی میاںؒ اپنی تقاریر میں اس بات پر زور دیتے رہے کہ "مسلمانوں کو دینی تعلیمی تحریک کو زندگی کا مقصد بنا لینا چاہیے اور سنجیدگی کے ساتھ اس تعمیری کام میں لگ جانا چاہیے۔ اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا

اہتمام کرنا چاہیے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت کو "نسل کشی" قرار دیتے تھے۔

علی میاںؒ نے اس تحریک کو ملک میں ملّی تشخص کی حفاظت کا سب سے محفوظ اور ٹھوس تعمیری قدم کہا اور مسلمانوں کے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کے لیے اسے اہم قرار دیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے سکریٹری کونسل کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے حکومت کی منظور شدہ نصابی کتب کا جائزہ لیا اور بتایا کہ اسکولوں میں رائج نصاب کی کتابوں میں ایسی تاریخ پڑھائی جاتی ہے جو مسلمانوں سے نفرت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ نصابی کتب کا جائزہ حکومت کو بغرض اصلاح کتب پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۸۹ء میں مدارس عربیہ پر لیبر ایکٹ کے نفاذ اور مدارس و مکاتب کو سرکاری امداد کی پیش کش کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے علی میاںؒ نے کہا:

> "میں مذہب و تاریخ کے گہرے مطالعے کے بعد یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ملک میں ملت اسلامیہ کے سامنے ایسا فیصلہ کن مرحلہ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا، اگر ملت میں جذبہ واحساس بیدار ہو، وہ ایک خوددار اور باوقار ملت کی حیثیت سے اپنے وجود کا ثبوت دینے پر تیار ہو تو بڑے سے بڑے مسائل کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اس ملک میں اور خاص کر اس صوبہ اُتر پردیش میں تیزی کے ساتھ ایک منصوبہ بند کلچرل انقلاب آرہا ہے...... مدارس اور مکاتب کے لیے سرکاری گرانٹ ناقابل قبول ہے۔ اس سے سرکاری مداخلت کے دروازے کھلیں گے اور جو چیز اس وقت بہت بے ضرر نظر آرہی ہے وہ آئندہ اپنے مضمرات کے ساتھ نمودار ہوگی"۔

(تعمیر حیات لکھنؤ، ۱۰ر جون ۱۹۸۹ء، تکبیر مسلسل مجموعہ خطبات وتقاریر دینی تعلیمی کونسل)

دینی تعلیمی کونسل نے مسلمانوں کی جدید نسل کو ذہنی، فکری، تہذیبی اور دینی ارتداد سے بچانے اور اس سیلاب کے رُخ کو موڑنے کے لیے پورے ملک میں آزاد دینی مدارس کا جال بچھانے کا کام کیا نیز سرکاری نصابی کتب سے ایسی تاریخ کی

نشاندہی کی جس سے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ سرکاری تعلیم کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ دینی تعلیم کے متوازی نظام کو ضروری قرار دیتے ہوئے یوپی اور ہندوستان کے دوسرے سات صوبوں میں دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل کی گئی ہے۔ دینی تعلیمی کونسل کی ایک میٹنگ میں علی میاںؒ نے اس کام کو سنجیدگی سے کرنے کی اپیل کی، انھوں نے کہا:

''دینی تعلیمی کونسل نے آزاد و خود کفیل مکاتب کی جو تحریک شروع کی ہے اس کو مزید تقویت پہنچانے کی ضرورت ہے اور اس فیصلہ کی ضرورت ہے کہ گاؤں اور قصبات میں مکاتب کا جال بچھا دیا جائے۔ کوئی مسجد ایسی نہ ہو جس میں مکتب نہ ہو، یہی مکتب ہیں جو ملت کی نوجوان نسل کو ایمان و اسلام سے وابستہ رکھیں گے''۔

(تکبیر مسلسل۔ تعمیر حیات لکھنؤ، جون ۱۹۸۹ء)

۲۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۳ء دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں دینی تعلیمی کنونشن منعقد کیا گیا، جس میں اتر پردیش اور ملک کے دوسرے دور دراز صوبوں کے ممتاز اصحاب شریک ہوئے۔ علی میاںؒ نے خطبۂ صدارت دیا، جس میں ملت کے مسائل اور اس کے مستقبل کی نشاندہی، مسلمانوں کی نئی نسل کے اسلامی نشو ونما بلکہ بقائے ایمان اور اسلام سے وابستگی کے مسئلہ پر فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

''آج اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اس نسل کو کیسے بچایا جائے؟ سرکاری تعلیم کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ دینی تعلیم کا کوئی متوازی نظام بھی چلانا چاہیے، اسی بنیاد پر دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی ہے اور اس کی دعوت وجد وجہد سے ہزاروں مکاتب و مدارس قائم ہوئے، ملک کی موجودہ سیاسی تبدیلیوں اور انتخابی نتائج اور مذہبی عصبیت پیدا کرنے کے بعض مواقع کے بہم ہو جانے یا پیدا کر لینے کی وجہ سے اس دینی ذہنی اور تہذیبی نسل کشی

کا خطرہ کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ اس وقت کا اہم ترین کام نظامِ تعلیم کی اصلاح کا مطالبہ اور اس کے لیے جدوجہد کے ساتھ آزاد دینی مکاتب و مدارس کے قیام اور مساجد اور گھروں میں ضروری دینی تعلیم اور مساوی دین کی تلقین، اردو پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی جدوجہد ہے اور اس کام کو مقبول ترین عبادت رضائے الٰہی کا ذریعہ اور اس ملک میں حفاظت دین کا واحد طریقہ سمجھنے کی ضرورت ہے''۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ج:۵، ص:۳۰۳، تکبیر مسلسل)

نومبر ۱۹۹۸ء میں اُتر پردیش میں سرکاری اسکولوں میں یہ سرکلر جاری کیا گیا کہ وندے ماترم کا گیت پڑھنا ہر ایک پر لازم اور ضروری ہے، یہ ایک مشرکانہ عقیدہ توحید کے منافی گیت ہے مسلمانوں کے لیے یہ صورتِ حال تشویشناک تھی۔ دینی تعلیمی کونسل کے کئی اجلاس میں جو علی میاںؒ کی صدارت میں ہوئے اس مسئلہ پر فکر و تشویش کا اظہار اور قانونی احتجاج کیا گیا۔ ۱۹ر نومبر کو علی میاںؒ نے میڈیا کے انٹرویو لینے والوں کے سامنے بیان میں اس سرکلر کے نقصانات اور ملک پر پڑنے والے مضر اثرات کا ذکر فرمایا اور نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اُن کے عقیدہ توحید کی ہے اور وہ اس کی حفاظت کو ایمان کی شرط سمجھتے ہیں۔ ہماری مخالفت صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہے یہ خالص دینی اور شرعی مسئلہ ہے اور حکومت اس کو جس طرح اسکولوں میں نافذ کرنا چاہتی ہے وہ میرے نزدیک مخالفت فی الدین ہے......اگر یہ مسئلہ جاری رہا تو میرا مشورہ ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹا لیں''۔

علی میاںؒ کے اس بیان پر نہ صرف حکومت نے معذرت کی بلکہ وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے سلسلہ میں اپنے احکامات منسوخ کرنے کا حکم جاری کیا۔

(سوانح مفکر اسلام۔ مولانا بلال عبدالحی حسنی۔ ص:۴۶۰)

علی میاںؒ دینی تعلیمی تحریک کو وقت کا اہم جہاد تصور کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں تا کہ اللہ کی رحمتوں کا نزول ہو اور مسلمانوں کے حالات خوش گوار ہوں، ان کا یقین تھا کہ یہ کام تنہا مسلم فرقہ کے مفاد میں نہیں بلکہ ملک کے مفاد میں ہے اور اسے ہونا چاہیے۔

"آزاد مکاتب و مدارس، صباحی، شبینہ حلقہائے تعلیم اور گھر کی دینی تعلیمی تربیت، اسلامی اصول اور اخلاق کی پابندی راست گوئی و راست روی اور سیرت و تعلیمات نبوی ﷺ سے واقفیت کے عمومی و مؤثر انتظامات سے صرف ملت ہی کو فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ یہ پورے ملک اور جمہوریہ ہند کے مفاد میں بھی ہے جو تیزی سے اخلاقی زوال، خود پرستی، دولت پرستی اور عمومی بدنظمی اور کرپشن کی طرف جا رہا ہے۔ اس اسلامی تعلیم و تربیت کے اثر سے خاصی تعداد میں وہ طبقہ پیدا ہوگا جو اس حد تک دولت کا پجاری نہیں ہوگا جس حد تک یہ وبا ملک میں پھیل گئی ہے، اس کو کسی نہ کسی درجہ میں خدا کا خوف اور خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا عقیدہ اس انتہا تک پہنچنے سے باز رکھے گا جس انتہا تک خالص مادّی تعلیم نے پہنچا دیا ہے۔ نبی رحمت ﷺ کی امت کو اپنے ملک، ماحول اور سماج کے لیے امت رحمت اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے ایک فرض شناس، رحم دل اور ماہر ملاح کشتی بان کا کردار ادا کرنا ہے، جن کی موجودگی میں اس ملک کو تباہ اور اس کشتی کو ڈوبنا نہیں چاہیے"۔

(کاروانِ زندگی۔ ج:۵، ص:۳۰۴ اور تکبیر مسلسل)

دینی تعلیمی کونسل کا قافلہ رواں دواں ہے، علی میاںؒ تاحیات کونسل کے صدر رہے، اس مسئلہ کی اہمیت اور ضرورت پر کی گئی ان کی تقاریر بہت اہم مفید ہیں، انھوں

نے قرآن پاک کی آیات، تاریخ کے واقعات کی روشنی میں مسائل کا جائزہ لیا اور خطرناک پہلوؤں کی نشاندہی کی، مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری سے آگاہ کیا۔

"مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" ایک تحقیقی تصنیفی اور اشاعتی ادارہ ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ یہ مجلس دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ماتحت ادارہ نہیں ہے، ندوۃ العلماء کے ناظم علی میاںؒ اور متعدد فضلاء اس کے مؤسس اور روح رواں تھے۔ علی میاںؒ کی صدارت میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا قیام اہم ترین دعوتی و اصلاحی مقاصد کے تحت عمل میں آیا۔ مولوی اسحاق جلیس ندوی مجلس کے قیام کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "مختلف زبانوں میں ایسے پُرمغز اور صالح لٹریچر کی تیاری جو اسلام کی مؤثر وطاقتور نمائندگی کر سکے، ☆ مغرب کی نفس پرست اور خدا بیزار تہذیب وادب کے پیدا کردہ بگاڑ اور ذہنی انتشار کو رفع کرے، ☆ اس نئے ارتداد کا مقابلہ کرے جو یورپ کی مادّی تہذیب کے اثر سے سارے عالم میں پھیل رہا ہے، ☆ ایمان و یقین کی بنیادیں ذہن ودماغ میں ازسرنو استوارے کرے، ☆ اسلام کی طاقتور نمائندگی وترجمانی کرے، ☆ غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت حق وصداقت پہنچانے کا مؤثر ذریعہ بنے"۔

(اسلامیات پر انگریزی لٹریچر جائزہ تبصرہ وتقاضہ۔ اسحاق جلیس ندوی، ص:۲۱)

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے سب سے پہلے علی میاںؒ کا تحریر کردہ رسالہ "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" شائع ہوا۔ علی میاںؒ نے ہمیشہ مغربیت کے اس مضر پہلو کو کہ وہ مذہب کو زندگی سے علیحدہ کرتا ہے بہت خطرناک قرار دیا۔ علی میاںؒ نے اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا کہ مغربیت کا یہ پہلو مغربی تعلیم کی وجہ سے خاصا عام ہونے لگا ہے، انھوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہن سازی پر زور دیا۔ اپنے مضمون "نیا طوفان اور اُس کا مقابلہ" میں اس پر زور دیتے ہوئے صراحت سے کہا:

''آج کا جہاد، وقت کا فریضہ اور عصر حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے جو عالمِ اسلام کے سر سے گزر رہی ہے، نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اُس کے قلب ومرکز پر حملہ کیا جائے، وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے احساسات وعقائد، اس کے نظام وحقائق اور رسالت محمدیؐ پر وہ اعتماد واپس لایا جائے جس کا رشتہ اس طبقے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے اور اس کی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کردیا جائے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل ودماغ میں گھر کر گئے ہیں ان سے علم اور عقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں۔

یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے۔ شک والحاد، نفاق وارتیاب کا ایک طوفان ہے جو اس نے ہمارے دل اور دماغ میں برپا کر رکھا ہے...... اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ لادینی مزاج، اندازِ فکر ادب وثقافت اور صحافت وسیاست کے راستے سے جمہور تک پہونچ چکا ہے...... مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانہ کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے''۔

('نیا طوفان اور اس کا مقابلہ'، ص:۲۹ تا ۳۱)

اس کے بعد مجلس کے ارکان ورفقاء نے بیش قیمت کتابیں تصنیف کیں جن کو اس ادارہ نے شائع کیا۔ مئی ۱۹۵۹ء سے اس وقت تک کے قلیل عرصہ میں

مجلس تحقیقات نے دینی، علمی حلقوں میں خاصی مقبولیت اور وقعت حاصل کر لی ہے۔ اس کی مطبوعات کو اندرون اور بیرونِ ملک قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بعض حیثیتوں سے عالم اسلام میں اس کا ممتاز مقام ہے، مجلس نے بیک وقت اردو، عربی، انگریزی اور ہندی چار زبانوں میں تصنیف و اشاعت کا آغاز کیا تھا۔ اب بنگلہ زبان میں بھی لٹریچر شائع کیا جاتا ہے۔ ان تصنیفات کے ذریعہ عصر حاضر کے چیلنجوں کا جواب دیا جاتا ہے، نئے فکری و ثقافتی فتنوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ مجلس کی مطبوعات کی ملک و بیرونِ ملک پذیرائی ہوتی ہے۔ علی میاںؒ کی زیر سرپرستی مئی ۱۹۵۹ء سے ۱۹۹۹ء تک تقریباً ۴۰ سال کے عرصہ میں کئی زبانوں میں چھوٹی بڑی ۲۷۰ کتابیں شائع ہو چکی تھیں، جن میں سے ہر ایک کے متعدد ایڈیشن نکل چکے تھے۔ ارتدادی تحریکوں اور ملحدانہ لہروں کے مقابلے کے لیے مجلس تحقیقات کا قیام عمل میں آیا، اپنے قیام سے اب تک مجلس اپنے بنیادی مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں بلکہ کسی حد تک کامیابی سے ہمکنار ہے۔

رابطة العالم الاسلامی: ۱۹۶۲ء میں مصر و سعودی حکومت کے درمیان اختلافات عروج پر تھے۔ سعودی حکومت کی ایماء پر علمائے عرب نے حج کے لیے آئے ہوئے مشاہیر عالم سے رابطہ قائم کیا اور مسلمانوں کی ایک تنظیم رابطة العالم الاسلامی کے نام سے وجود میں آئی۔ تاسیسی اراکین کا انتخاب ہوا۔ ممبران کا انتخاب ان کی ذاتی شخصیت اور علمی شہرت کی بنیاد پر کیا گیا۔ علی میاںؒ تنظیم کی پہلی مؤتمر میں شریک ہوئے، ہندوستان سے علی میاںؒ کو بنیادی حیاتی رکن منتخب کیا گیا، یہ ہندوستان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس تنظیم کے مقاصد پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں علی میاںؒ کے مزاج و خیالات سے ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

> ''اسلامی دعوت کی نشر و اشاعت، دعوت اسلامی کے سلسلہ میں کی جانے والی جدوجہد میں باہمی ربط و تعاون تلاش کرنا، دنیا کے ہر

حصہ میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات ان کے مسائل ومشکلات کا مطالعہ اور ان کی ہر ممکن مدد، مساجد کی اصلاح وتعمیر، ثقافتی وعلمی مراکز کا قیام اور وہاں کے ماہرین کے خطبات، اسلامی ثقافت کی اشاعت کے لیے دیگر ذرائع اسباب کی فراہمی، شفاخانوں وطبی امداد کے مراکز کا قیام، قرآن پاک کی تقسیم، مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی روک تھام، اعدائے اسلام کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد میں ہر ممکن مدد وتعاون اور اس قسم کی منتشر کوششوں کو باہم مربوط ومنظم کرنے کی کوشش"۔

رابطة العالم الاسلامي کی مؤتمر ہر سال حج کے موسم میں مکہ مکرمہ میں منعقد ہوتی ہے، تقریباً ہر سال علی میاںؒ نے اس کے سالانہ مؤتمر میں شرکت کی۔ علی میاںؒ نے ۱۹۷۳ء میں رابطہ کی طرف سے چھ مسلم ممالک کا دورہ بھی کیا۔ رابطہ کی کئی مجالس کی صدارت کی۔ عالمِ عرب میں علی میاںؒ کو بلند مقام اور مرتبہ حاصل تھا، وہ اپنی صلابت رائے، عزیمت واستقامت کی وجہ سے تا حیات عرب کی اس تنظیم کے اہم اور فعال رکن رہے۔

<u>رابطة الادب الاسلامي العالمية</u> اسلامی ادب اور ادیبوں کی عالمی تنظیم اور ادبی تحریک ہے۔ ۹ رمئی ۱۹۸۴ء کو مکہ مکرمہ میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ علی میاںؒ اردن کے سفر سے واپسی پر حجاز تشریف لے گئے۔ مصر، سعودی عرب، شام اور یمن کے ممتاز ادیبوں نے ان کے فلسفہ وفکر کو عملی تعبیر دینے پر اصرار کیا۔ علی میاںؒ سے اس کی صدارت قبول کرنے کی درخواست کی۔ رابطة الادب الاسلامي کا صدر دفتر دارالعلوم ندوۃ العلماء کو بنایا گیا۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی استاذ عربی ادب دارالعلوم ندوۃ کو اس تنظیم کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

۱۹۵۷ء میں شام کے المجمع العلمي کے رکن منتخب ہونے پر علی میاںؒ نے مقالہ لکھا، جس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ عربی ادب کا از سر نو جائزہ لے کر ادب اسلامی کو

ممتاز درجہ دیا جائے وہ اپنے اسی نظریہ کے تحت مختارات مرتب کر چکے تھے جو ہندوستان کے علاوہ اسلامی وعرب ممالک کی جامعات میں داخل نصاب ہے عربی ادیبوں نقادوں نے اعتراف کیا کہ عربی ادب کی تاریخ کے ازسر نو مطالعہ کا خیال اسی کتاب سے پیدا ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب اسلامی کے موضوع پر عالمی سیمینار منعقد کیا گیا تھا، اسلامی دنیا میں اس کا بھی زبردست استقبال کیا گیا تھا اور ندوۃ العلماء کی سبقت کا اعتراف کیا گیا تھا۔ دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں سے خاص طور پر بلادِ عربیہ کی یونیورسٹیوں اور علمی ادبی اداروں اور مرکزوں سے بڑی تعداد میں اہل علم وادب شریک ہوئے۔ اس کے بعد عالم اسلامی کی کئی یونیورسٹیوں میں ادبِ اسلامی پر سیمینار ہوئے۔

(کاروانِ ادب، لکھنؤ، مئی جون ۱۹۹۴ء۔ ص:۱۳۰۔۱۴)

علی میاںؒ رابطة الادب الاسلامی العالمیه کے قیام کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس کے قیام کے اصل محرک وداعی امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے شعبۂ ادب کے صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا تھے، جنھوں نے ادباء کی ایک مجلس میں پہلی ملاقات کے موقع پر کئی سال پہلے ریاض میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ ادب اسلامی کے نقطۂ نظر سے اور ادب عربی میں اسلامی عناصر کی تلاش اور اُجاگر کرنے کے لیے ادب عربی اور عربی زبان کے اسلامی کتب خانے کو دوبارہ کھنگالنے اور اس کا ازسر نو جائزہ لینے کا خیال سب سے پہلے آپ کی کتاب مختارات کے مقدمہ اور اس مضمون سے ہوا جو آپ نے المجمع العلمی العربی دمشق کا رکن منتخب ہونے پر ۱۹۵۷ء میں لکھا تھا اور وہ المجمع کے سہ ماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر باشا نے خود سالہا سال سے اسی لائن پر کام شروع کر رکھا تھا اور کئی مجموعے مرتب کر کے شائع کر چکے تھے"۔

(کاروانِ زندگی۔ ج: سوم، ص:۲۸)

"رابطۃ ادب اسلامی کے قیام کے بعد اس کی سکریٹریٹ کی طرف سے ایک اعلان شائع کیا گیا، جس میں کہا گیا کہ مرکزی کمیٹی پوری دنیا کے مسلمان ادیبوں کو جن میں اسلامی غیرت ہے اور جنھیں مسلمان نسلوں کے ذہن وافکار کی فکر ہے ہم رابطۃ ادب اسلامی کے قیام کی خوش خبری دے رہے ہیں۔ اس کی سرگرمیوں میں شرکت اس خواب کو حقیقت بنانے اور بامقصد ادب کی تخلیق کے ذریعہ اس کے اغراض ومقاصد کو بروئے کار لانے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ ادب اسلامی کے نظریہ کو واضح اور عملی شکل میں پیش کیا جائے اور انحراف پسند ادب کے مقابلے میں ایک مؤثر اور طاقتور ادبی تحریک کی شکل دی جاسکے"۔

۱۹۸٦ء میں عالمی رابطۃ الادب الاسلامی العالمیہ کی باقاعدہ تشکیل ہوئی، اس کے مرکزی مجلس عاملہ منتخب ہوئی، جو پندرہ ارکان پر مشتمل تھی۔ علی میاںؒ اس انجمن کے تاحیات صدر رہے۔ رابطہ ادب اسلامی کے سکریٹری مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے مطابق اس مجلس کی علمی شاخیں دیگر خطوں اور علاقوں میں ہیں۔ ادب اسلامی کے مقاصد کے حصول کے لیے لکھنؤ اور متعدد خطوں میں اساتذۂ ادب کوشاں ہیں خاص طور پر مصر، شام، حجاز، نجد اور مراکش کے اہل علم و ادب نمایاں ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ بلادِ عربیہ کے ادیبوں کی خاصی تعداد اس علمی مجلس کی رکن بن چکی ہے۔ اس تنظیم کا مرکزی دفتر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک بلادِ شرقیہ کے لیے لکھنؤ میں اور دوسرا بلادِ عربیہ کے لیے ریاض میں ہے۔

"رابطہ ادب اسلامی کے عہدیداران کا نیا انتخاب یا اُن کی تجدید ہر تیسرے سال ایک کانفرنس کے موقع پر کی جاتی ہے۔ اس میں ہر ملک سے دو نمائندے اور صدر و نائب صدر اس کمیٹی کے ارکان ہوتے ہیں۔ یہ رابطہ کے مشاورتی بورڈ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے سالانہ

اجتماعات ہوتے ہیں اور انتظامی مسائل پر غور ہوتا ہے اور پالیسی بنتی ہے۔ اسلامی ادب کے موضوعات پر لٹریچر تیار کرایا جاتا ہے"۔

(عہد ساز شخصیت۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی۔ ص:۱۹۲)

علی میاںؒ کی علمی، دینی، تعلیمی اور دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ ادب اسلامی سے دلچسپی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ عرب ادیبوں اور دانشوروں کے تعاون سے رابطة الادب الاسلامی العالمیة کا ادارہ قائم کیا اور ایسے ادب کو پیش کرنے کا عزم کیا جو ادب کے جملہ شرائط اور عناصر کا جامع ہو، خواہ قصیدہ ہو یا ڈرامہ، افسانہ ہو یا ناول۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں ادبی رنگ غالب اور نمایاں ہو اور قاری پر اس کا یہ اثر مرتب ہو کہ وہ ادب پارہ کے مطالعہ کے بعد اسلام کی طرف کشش محسوس کرے۔ رابطة الادب الاسلامی العالمیة علمی و ادبی دائرے تک محدود ہے۔ سیاسی یا جماعتی اداروں سے علیحدہ ہے، اس کے مقاصد صرف اسلامی اور ادبی ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی کے ایک شعبہ کے طور پر ادارہ صحافت الاسلامیہ قائم کیا گیا، اس ادارہ نے اور اس سے قبل اس کے پیش رو مجلس ادبِ اسلامی نے ادب اِسلامی کے تذکرہ و تشریح کے سلسلہ میں کئی پمفلٹ اور مختصر کتابیں بھی شائع کیں، ان میں دین و ادب اردو میں اور الادب الاسلامی عربی میں شائع ہوئیں۔ علی میاںؒ صدر رابطة الادب الاسلامی کی کتاب نظرات فی الادب اس سلسلہ کی اوّل اور نہایت اہم بنیادی کتاب ہے۔ یہ کتاب اور دوسری کتابیں تاحال عربی میں ہیں۔ مشرقی دفتر واقع ریاض (سعودی عرب) نے عربی میں ایک سہ ماہی بلیٹن مجلّة الادب الاسلامی بھی نکالا ہے۔ اردو میں رابطہ کا ترجمان سہ ماہی 'کاروانِ ادب' ہے۔ لاہور پاکستان سے اردو کا مجلّہ "قافلۂ ادب اسلامی" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

دنیا کے مختلف حصوں میں رابطة الادب الاسلامی کی بڑی بڑی کانفرنسیں ہوئیں جن میں زبان و ادب کے ماہرین اور ممتاز اہلِ قلم نے اپنے

اپنے ملکوں اور علاقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی۔ ترکی، مراکش، مصر، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، یورپ، آکسفورڈ نیز امریکہ میں ادب کے نئے نئے موضوعات پر سیمینار منعقد ہوئے۔ ہندوستان میں ملکی سطح پر بیس سے اوپر سیمینار منعقد ہوئے۔ ان سیمیناروں کے منتخب مقالات رابطہ کے رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ علی میاںؒ ان سیمیناروں میں شرکت کا التزام رکھتے تھے، صدارتی کلمات کے علاوہ اپنے مقالے کے ساتھ شرکت کا اہتمام رکھتے تھے۔

علی میاںؒ نے رابطة الأدب الإسلامي العالمية کے قیام اور اس کے مقاصد کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔

> ''یہ دعوت ایک ایسے ملک سے شروع ہوئی جو عجمی ہے بلکہ جس کو اپنی عجمیت پر ناز ہے اور جہاں اسلام اور مسلمانوں کو ہر طرف سے مقابلہ درپیش ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام ایک عالمی دین ہے اور اس کی دعوت تمام دنیا اور تمام انسانوں کے لیے ہے، اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ اس سے مسابقت کا جذبہ پیدا ہو اور اہل عرب آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لیں اور ہم تمام مسلمانوں پر اس کے احسانات ہیں۔ ہم تک عربی زبان وادب، قرآن کریم، احادیث شریفہ اور عربی ثقافت انھیں عربوں کے ذریعے پہونچی۔ یہ ان کا ناقابل فراموش احسان ہے، یہ دعوت اللہ کی حکمت ومصلحت کے مطابق اور اس کی توفیق سے ہندوستان سے اُٹھی اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کا توقع سے کہیں زیادہ استقبال ہوا خاص طور سے عرب ادباء وفضلاء کی جانب سے۔

(سہ ماہی 'کاروانِ ادب' ۱۹۸۴ء)

علی میاںؒ نے جو ادب کو دعوت اور تربیت کا ذریعہ قرار دیتے تھے ادب کی اصلاح کی صرف کوشش ہی نہیں کہ بلکہ اپنے اس نقطۂ نظر کو اپنی مختلف تصنیفات اور مقالات میں پیش کیا۔ نظرات في الأدب، روائع من أدب الدعوة اور

مختارات کا مقدمہ علی میاںؒ کے ادبی نظریات کے خاص ترجمان ہیں۔علی میاںؒ نے خالص ادبی موضوعات پر معتبر اسلوب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔بچوں کے معیار پر اُتر کر آسان اسلوب میں بچوں کا ادب تیار کیا۔فکری موضوعات پر متوازن انداز میں اپنے خیالات کی ترجمانی کی۔

رابطة الادب الاسلامي العالميه نے اپنی عمر کی مختصر مدت میں ادب کے صالح نقطہ نظر اور اس کے تصور کو واضح کرنے کے مقصد کو پورا کیا۔شکوک وشبہات اور منفی خیالات کو دور کرنے کی جدوجہد کی،ادب کے اسلامی معیار اور اصول متعین کرنے کی طرف پیش رفت ہوئی۔علی میاںؒ کے رحلت فرمانے کے بعد ڈاکٹر عبدالقدوس صالح کو رابطة الادب الاسلامی کا صدر منتخب کیا گیا۔

☆ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ۱۹۷۲ء میں قائم کیا گیا۔یہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا متفق علیہ ادارہ ہے،اس میں ہر مسلک ہر مکتب فکر کے علماء، ماہرین قانون شریک ہیں جو مسلمانوں کے عائلی قانون (پرسنل لا) کی حفاظت کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے بورڈ واضح اور متفقہ رائے کا اظہار کرتا ہے۔دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں علی میاںؒ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا بالاتفاق صدر منتخب کیا گیا۔وہ ۱۹۹۹ء تک مسلم پرسنل لا بورڈ کی رہنمائی ورہبری،اسلامی شریعت کے تحفظ وبقا کے لیے کوشاں رہے۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علی میاںؒ کی صدارت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل شدہ مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا،جس میں مختلف عہدوں کے لیے مختلف حلقوں،طبقوں اور فرقوں کی نمائندگی کی رعایت رکھی گئی۔علی میاںؒ نے ایک انٹرویو میں پرسنل لا بورڈ کے قیام کے سلسلہ میں بتایا۔

> ”مسلمانوں کے لیے پوری زندگی کے واسطے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا قرآن موجود ہے،جس پر عمل کرنے کا ہر مسلمان ازروئے عقیدہ پابند ہے،زندگی سے تعلق رکھنے والے نکاح،فسخ نکاح،طلاق،

وراثت، ہبہ، وصیت وغیرہ معاملات (جنہیں پرسنل لا کہا جاتا ہے) بھی ہیں، انگریزی دورِ حکومت میں مسلمانون سے ان کی زندگی کے سارے شعبوں سے متعلق قانون شریعت کے فیصلے کرنے کا حق تو جبراً چھین لیا گیا تھا البتہ مسلمانوں کی قربانی اور کوشش کی بنا پر صرف چند معاملات (نکاح وطلاق) میں اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کا قانونی حق دے دیا گیا تھا۔ اسی کا نام عدالتی زبان میں مسلم پرسنل لا ہو گیا۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلم پرسنل لا انگریزوں کا وضع کیا ہوا قانون نہیں بلکہ انگریزی دورِ حکومت میں مسلمانوں کی زندگی سے متعلق گوشوں سے (جن کا اوپر ذکر آیا) میں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا قانون ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلم پرسنل لا قانون شریعت کا ایک حصّہ ہے نہ کہ کل شریعت۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد مسلمانوں کو اپنی آزاد حکومت سے بجا طور پر توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کو ان کی پوری زندگی سے متعلق قوانین شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا حق دے گی مگر بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس (یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے خطرہ سے) انگریزی دورِ حکومت میں طے شدہ حق کو بچانے کی فکر میں مسلمانوں کو مبتلا ہو جانا پڑا اور اسی کے لیے بورڈ کی تشکیل کرنا پڑی، اس وجہ سے پوری زندگی سے متعلق قوانین شریعت کا نفاذ تو گویا بعید از قیاس بن کر رہ گیا اور اس بارے میں سوچنا بھی اب تقریباً ناممکن ہو گیا۔

(جہدِ مسلسل مجموعۂ خطبات وتقاریر، تعمیر حیات لکھنؤ، ستمبر ۱۹۸۹ء)

ہندوستان کے مسلمانوں کا تجدد پسند طبقہ اور آزاد خیال طبقہ وقتاً فوقتاً

مشترک عائلی قانون کا مطالبہ کرتا رہا ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ہمیشہ اس کے خلاف آواز اُٹھائی کیونکہ علمائے کرام اور قائدین ملت اس بات سے خوف واقف ہیں کہ یہ کوڈ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے اپنے تشخصات کے ساتھ وجود وبقاء کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ اسی خطرہ کی بُو سونگھ کر پرسنل لا بورڈ قائم کیا گیا ہے، یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے دینی وشرعی نقطۂ نگاہ سے موت وحیات کا مسئلہ ہے۔ علی میاںؒ کے صدارتی دور میں ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئے جو بورڈ کی تاریخ میں اس سے پہلے پیش نہیں آئے تھے۔ آغاز اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ہوا۔ کلکتہ اجلاس کے موقع پر 5 لاکھ کے مجمع میں مسلمانوں کو قانونِ شریعت پر چلنے کی تاکید کی، ان کی دینی غیرت اور ایمانی جوش وجذبہ کو اُبھارتے ہوئے فرمایا کہ ”جب ہم اہلِ حکومت اور برادرانِ وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کا حق کیوں نہ ہو، اُن سے شکایت کریں گے، اُن کا دامن پکڑیں گے لیکن آپ کا گریبان پکڑیں گے اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا کہ پہلے تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو، تم اِس قانون پر چلتے ہو، تم اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے“۔

(تقریر۔ اپریل ۱۹۸۵ء۔ شہید مینار، کلکتہ)

مئی ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں اپنا وہ فیصلہ دیا، جس میں دین میں کھلی مداخلت، قرآن مجید کی من مانی تشریح و تفسیر، شریعت اسلامی کی توہین اور اس پر کھلا حملہ تھا۔ اس واقعہ نے ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہندوستان گیر مہم چلائی گئی، پورب سے پچھم تک، اتر سے دکھن تک عظیم الشان جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا،

کثیر تعداد میں مسلمانوں نے وزیر اعظم راجیو گاندھی کے نام احتجاجی خطوط اور تار بھیجے۔ مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ، سربرآوردہ معززین خواتین نے بھی اس مسئلہ پر شریعت کی مکمل حمایت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تائید کی، علی میاںؒ نے کئی مرتبہ پرسنل لا بورڈ کے وفد کے ساتھ وزیر اعظم راجیو گاندھی سے ملاقات کی اور نفقہ مطلقہ کے بل کے سلسلہ میں گفتگو کی۔ ماہرینِ قانون اور علماء نے مسلم بل کے متن میں ترمیم اور قانونی لفظی خامیوں کو دور کر کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو پیش کیا۔ علی میاںؒ نے ارکان بورڈ کے ساتھ راجیو گاندھی سے مل کر اس نازک مسئلہ کو نہایت جرأت مندی سے حل کیا، پارلیمنٹ میں راجیو گاندھی نے بل کی حمایت میں بیان دیا، بل اتفاق رائے سے منظور ہو گیا۔ مسلم مطلقہ بل کے سلسلہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی اور حکومت سے مسئلہ طے کرادیا تھا علی میاںؒ اس کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''بورڈ کی کامیابی کا بڑا راز یہ تھا کہ یہ مسئلہ بالکل اس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس میں کسی قائدانہ یا سیاسی مسابقت، مقابلہ کا جذبہ شامل نہیں تھا اور بورڈ کے ارکان نے عوام کے پورے اعتماد کے ساتھ افہام و تفہیم کے ذریعہ اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی اور وزیر قانون کو دلائل سے مطمئن کر کے اور اس کا ثبوت فراہم کر کے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان اس کی تائید میں ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ملک میں صدہا عوامی جلسے اس کی تائید میں ہوئے اور ہزارہا تار وزیر اعظم کو ملے، اسی کے ساتھ دعاؤں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہ مسئلہ اس آسانی سے طے ہو گیا جو بہت سے لوگوں کے لیے حیرت انگیز اور تعجب خیز تھا''۔

(کاروانِ زندگی حصہ چہارم، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۳۷۸)

۱۵ر دسمبر کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آٹھویں اجلاس کے موقع پر علی میاںؒ

نے خطبہ صدارت دیا، جس میں پارلیمنٹ سے بل پاس ہونے کے بعد کے حالات کا جائزہ لیا گیا اور مشترک عائلی قانون یونیفارم سول کوڈ کے محرکات اور خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے ملت کو جمہوری دستوری جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہنے پر زور دیا۔ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء میں ملک کے غیر معتدل حالات اور فسادات کی وجہ سے بورڈ کا اجلاس عام نہیں ہوا۔ ۵/مارچ ۱۹۸۹ء کو کانپور میں بورڈ کا نواں اجلاس عام منعقد کیا گیا، جس کے خطبہ صدارت میں علی میاںؒ نے اسلامی قانون کی بہتری اور قرآنی شرعی تعلیمات کی برتری کے بارے میں متعدد فضلائے مغرب وماہرین قانون کے اعترافات اور مذہب واخلاق کی مستند ومشہور کتابوں کے اقتباسات پیش کیے اور یہ بتایا کہ ہندوستان جیسے وسیع اور کثیر المذاہب ملک میں مذہبی آزادی اور ملی تشخص کا بقا مناسب ہی نہیں بلکہ بے حد ضروری ہے اور یہ ملک کی تعمیر وترقی میں بے حد معاون ہوگا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے مقاصد میں ایسا لٹریچر تیار کرنا بھی شامل ہے جو معاشرے میں پھیلی کمزوریوں کو دور کر سکے بالخصوص ایسے معاملات جن سے حقوق زوجین کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو، اس کے دائرہ فکر میں ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے زیر اہتمام منت اللہ رحمانی امیر امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی زیر نگرانی مستند علماء اور ماہرین فقہ نے یہ کام شروع کیا اور سب سے پہلے جدید زبان واسلوب اور ترتیب کے ساتھ آئینی قانون اور مسائل نکاح وطلاق، حقوق وفرائض کی تدوین اور ترتیب کا کام کیا گیا۔ مئی ۱۹۹۰ء میں یہ کام مکمل ہوگیا۔ ''اس کے تیار ہو جانے کے بعد عدالتوں اور قانون ساز مجلسوں کو یہ کہنے کا موقع باقی نہیں رہا کہ مسلمانوں کے عائلی قانون پر علماء کی کوئی مستند کتاب نہیں ہے''۔ اس کے ہندی انگریزی ترجمہ کی تجویز بھی پرسنل لا بورڈ نے اتفاق رائے سے منظور کی۔ علی میاںؒ پرسنل لا کے تحفظ کے سلسلہ میں ملک کے ہر ایک وزیر اعظم سے ملتے رہے۔ انھوں نے ذاتی خطوط بھی لکھے اور صدر پرسنل لا بورڈ

کی حیثیت سے بھی خطوط لکھے اور ہمیشہ یونیفارم سول کوڈ کی مخالفت کی یہاں تک کہ وی. پی سنگھ نے انھیں یقین دلایا کہ ”حکومت کا پرسنل لا میں مداخلت کا ارادہ نہیں ہے اور یونیفارم سول کوڈ مختلف فرقوں اور اقلیتوں پر تھوپا نہیں جائے گا“۔

۱۹۹۲ء میں پرسنل لا بورڈ کا دسواں اجلاس دہلی میں منعقد کیا گیا، علی میاںؒ نے اس کے خطبۂ صدارت میں عائلی قانون کی وحدت کی ضرورت پر جو مبالغانہ اور غیر دانشمندانہ زور دیا جارہا ہے، تنقید اور جرح کی۔ صاف صاف کہا کہ کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پُر خطر ہے، حکومت کو حقیقت پسندی سے کام لینے کا مشورہ دیا گیا“۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۹۲ء میں امارت شرعیہ بہار اور مسلم پرسنل لا بورڈ نے پٹنہ (بہار) میں اصلاح معاشرہ کے عنوان سے عظیم جلسے کا انعقاد کیا، علی میاںؒ اس کے پُر زور داعیوں میں تھے، علی میاںؒ نے اس جلسے میں شرکت کی اور ۱۵/۲۰ ہزار کے مجمع کو خطاب کیا۔ ۱۹۹۳ء میں جے پور راجستھان میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر علی میاںؒ نے خاصا وقیع خطبہ صدارت دیا، جس میں ”اسلامی عائلی، شرعی قانون کے تحفظ کی سعی وجدوجہد کی قابل حفاظت تاریخ پیش کی“ اور مسلمانوں سے قانون شریعت پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا۔ شادی بیاہ، ترکہ اور تمام معاملات میں اسلامی طریقہ اور شریفانہ انسانی طریقہ کو اپنانے کا پیغام دیا اور شریعت کے مقابل ہر قانون، رسم ورواج سے مجتنب اور محفوظ رہنے کی پابندی اور التزام کی دعوت دی۔

۱۵/اپریل ۱۹۹۳ء کو پرسنل لا بورڈ کے اراکین نے بورڈ کے صدر کی قیادت میں وزیراعظم چندر شیکھر کو ایک واضح اور مفصل میمورنڈم پیش کیا۔ جون ۱۹۹۵ء کو دہلی میں بورڈ کی میٹنگ میں گورنمنٹ گرانٹ کے مسئلے پر بطور خاص توجہ کی گئی۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا کے وقف بورڈ سے ائمہ مساجد کو مشاہرہ دینے کا مسئلہ تھا، بعض جدت پسند مسلمانوں کی طرف سے اس کی پُر زور تحریک تھی، علی میاںؒ نے اسے ”دین میں نئے فتنے کا آغاز“ کہا اور اس کی سختی سے مخالفت کی، حکومت کو

بھی اس اقدام سے روکا گیا، جس میں بورڈ کو کامیابی حاصل ہوئی۔

علی میاںؒ نے کہا ''اگر مساجد اور مدارس کی یہ آزادی خود کفالتی اور ائمہ مساجد کے ایثار واستغنا کا سدباب کردیا گیا اور وہ حکومت کے حاشیہ بردار اور براہِ راست نمک خوار ہوگئے تو پھر حق گوئی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، منکرات وبدعات اور جہاد واعلان بالحق کا سلسلہ مسدود ہوجائے گا اور ان مساجد ومدارس سے الیکشنوں میں بھی کام لیا جائے گا اور حکومت کی تائید وحمایت کا بھی''۔

(جہدِ مسلسل مجموعۂ خطبات وتقاریر، کاروانِ زندگی۔ ج: ششم)

علی میاںؒ نے مدارس عربیہ کے کردار، ایثار اور استغنا وقربانی کی مثالیں دے کر واقعات بیان کیے۔ علی میاںؒ اپنے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں امت میں غلط رجحانات، اقتدار پرستی کے جذبہ کی وجہ سے دین میں مسخ وتحریف کے خطرات سے خوب واقف تھے بلکہ تحقیق وتصنیف کے مرحلے سے گزر چکے تھے۔ اس مسئلہ پر فکر وتدبر کے ساتھ سختی سے مخالفت کی اور بتایا کہ ''اسلام وہ واحد دین ہے جو مسخ وتحریف، اقتدار وقت کا آلۂ کار بننے سے محفوظ رہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ مساجد اور مدارس کی آزادی، حکومتوں سے بے نیازی اور خود کفالتی ہے، مسلمانوں کے جذبہ ایثار واعانت، ائمہ مساجد، ذمہ داران واساتذہ اور مدارس کے ایثار وقربانی اور استغناء کا نتیجہ ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ اپنے دائرہ کار میں مسلمانوں کے عائلی قانون کی حفاظت کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ مفکرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ ہندیہ کو اس کے خصائص، اس کی اجتماعی وملّی شخصیت سے جدا کرنے کی منصوبہ بند تحریک ایک عرصہ سے چل رہی ہے، بار بار اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلامی ثقافت وتہذیب بلکہ امتیازی عقائد سے مسلمانوں کو محروم کردیا جائے، اس وقت سب سے اہم اور ضروری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں وحدتِ فکر پیدا ہو، باہمی اعتماد سے بلکہ عملی تعاون سے علمائے دین اور قائدین ملت کا احترام

کیا جائے۔ ملت اسلامیہ کو ان مسائل کے ساتھ اندرونی مسائل نے بھی گھیر لیا ہے ذہنی انتشار اور کردار کشی کی مہم چل نکلی، مستند علمائے دین اور مخلص قائدین پر الزامات اور مخالفانہ پروپگنڈے شروع کر دیے گئے اور انھیں جرح وتعدیل کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ یہ ساری نامناسب ناگوار باتیں اس کے مخلصین کارکنان کے ساتھ اس کے صدر کے خلاف بھی کہی جاتی رہیں، پریس نے ان باتوں کو خوب اُچھالا اور پرسنل لا بورڈ کے اصلاحی وتعمیری کام میں رکاوٹ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی گئی، سطحی معلومات رکھنے والے اہلِ قلم نے مسئلہ کی وکالت شروع کی، جس سے ہندی انگریزی اخبارات کو اسلامی شریعت کی توہین وتذلیل کا موضوع مل گیا۔

(مجموعۂ تقاریر، جہد مسلسل)

علی میاںؒ اس صورتِ حال سے بہت دلبرداشتہ ہوئے اور انھوں نے بار بار اس کے خلاف تحریر وتقریر کے ذریعہ آواز بلند کی۔ علی میاںؒ نے بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ”انگریزی ہندی اخبارات کو اس توہین وتذلیل اور مضحکہ خیزی کا موقع اس عجلت اور جذباتیت اور کوتاہ اندیشی نے دیا، جو اس سلسلہ میں ہمارے بعض ملّی حلقوں اور مکاتب خیال کی طرف سے ظاہر ہوئی۔ علی میاںؒ ہندوستان میں اس فضا کو قائم اور باقی رہنا ضروری قرار دیتے تھے کہ جس میں اسلام کے تعارف اور اس کی دعوت وتبلیغ کا کام بھی ہوسکے، پیامِ انسانیت کی تحریک بھی چلائی جاسکے اور بقائے باہم کی ضرورت کا احساس اور اس کے لیے فضا ہموار ہونے کی کوشش بھی باقی رہے۔

اپریل ۱۹۹۳ء میں علی میاںؒ پر بابری مسجد کے سلسلہ میں خفیہ معاہدہ کا الزام لگایا گیا۔ علی میاںؒ کے خلاف ’قومی آواز‘ میں مضامین شائع ہوئے، اُسی زمانے میں علی میاںؒ کا ایک بیان ’قومی آواز‘ میں شائع ہوا جو بورڈ کے مسلک، طریق کار اور خود صدر پرسنل لا بورڈ کے ذہن اور طریق فکر کا بہترین ترجمان ہے۔

''مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستان میں ملّت کے مسائل کو حل کرنے
کے لیے شریعت اسلامی کے احکامات کے دائرہ میں دستوری اور
جمہوری طریق کار ہی کو اختیار کرنا مناسب اور بہتر سمجھتا رہا ہے اور
یہی اس کے پیش نظر اب بھی ہے۔ میں نے پرسنل لا بورڈ سے اپنے کو
اس وجہ سے وابستہ رکھا ہے کہ وہ ملت کا ایک فعال اور نمائندہ پلیٹ
فارم ہے اور زیادہ تر علماء پر مشتمل ہے اور اس کا مرکزی موضوع تحفظ
قانون شریعت، اصلاحِ معاشرہ اور مسلمانوں میں دینی ملّی اور
معتدل تعمیری سیاسی شعور پیدا کرنا ہے''۔

('قومی آواز' دہلی۔ ۱۴؍اپریل ۱۹۹۳ء)

مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبئی کے اجلاس (۲۸، ۲۹، ۳۰؍اکتوبر ۱۹۹۹ء میں علی میاںؒ اپنی علالت کی وجہ سے تشریف نہیں لے جاسکے لیکن خطبۂ صدارت تیار کر کے ارسال کیا۔ یہ علی میاںؒ کا آخری خطبۂ صدارت ہے، جس میں مکمل اسلامی تشخص کے ساتھ ملک میں باعزت شہری کی طرح زندگی گزارنے کا پیغام دیا ہے۔

''ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن
ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی
کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔ ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی،
مجبوری یا بیچارگی پر مبنی نہیں ہے ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔
ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ
سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اِس ملک میں اپنے
پورے عقائد دینی شعور، قانونِ شریعت اور اپنی پوری مذہبی
تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے ہم ان کے کسی ایک نقطہ
سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔
اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور

عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور و آئین کا بھی فیصلہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی خصوصیات قانونِ شریعت، احکامِ دین، اپنے عقائد و شعائر اپنی تہذیب اور اپنی اُن چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں اس ملک میں رہیں اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے۔ ہمارا خمیر ضرور اس ملک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے اور مسلمان جس ملک میں رہے گا اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں ہم اس ملک میں آزاد ہیں اس کی تعمیر و ترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں اس لیے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری انسانی اخلاقی اور قانونی حق ہے اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے''۔

(اسلام ایک مکمل دین مستقل تہذیب۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۳۰۔۳۱)

علی میاںؒ کے عہد صدارت میں پرسنل لا بورڈ کے طریقہ کار اور دائرہ عمل میں بڑی وسعت ہوئی۔ ہندگیر پیمانے پر اصلاحِ معاشرہ کی تحریک چلائی گئی۔ ''تحفظ شریعت ہفتہ'' منایا گیا۔ ملک کے کئی اہم شہروں جنوبی دہلی، تھانہ (ممبئی)، اکولہ (مہاراشٹر) اور اندور (مدھیہ پردیش) میں دارالقضاء کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی رہنمائی میں بورڈ کے ممتاز فقہاء کرام کی کمیٹی تشکیل دی

گئی، جس نے قانون فقہ اسلامی کی ترتیب اور تدوین کا کام انجام دیا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ علی میاںؒ کی سرکردگی میں ہندوستانی مسلمانوں کے عائلی قوانین کے تحفظ، اسلامی تشخص کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود و بقا کے لیے سرگرم رہا۔ علی میاںؒ کی رہنمائی پر ہندوستان کے مسلمان اکثریت کو کامل اعتماد بلکہ فخر کا احساس بھی ہوا۔

☆ آکسفورڈ اسلامک سینٹر: بیسویں صدی کے اواخر میں آکسفورڈ میں اسلامک سینٹر کا قیام ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ ۱۰/ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو اس سینٹر کا باقاعدہ قیام عمل میں لایا گیا۔ مئی ۱۹۸۳ء میں علی میاںؒ کو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بذریعۂ خط اس منصوبہ کی اطلاع کی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے صاحبزادے ڈاکٹر فرحان نظامی (جو ان دنوں یونیورسٹی میں تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے) اور سینٹ کراس کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر ڈی. جی. براوننگ نے علی میاںؒ سے اس کارِ خیر میں شرکت کی درخواست کی، اس کی تاسیس اور اس کے مقاصد و دستور العمل کی ترتیب کے لندن آنے کی دعوت دی، اسلامک سینٹر کے قیام کی تحریک کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''یہاں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی حرج نہیں کہ سالہا سال سے میری یہ تمنا تھی اور کبھی کبھی اس کے لیے دعا بھی کرتا تھا کہ کوئی ایسا موقع آئے کہ مغرب کے ممتاز دانشور کہیں مجتمع ہوں اور مجھے ان کے سامنے مغربی تہذیب، فلسفہ زندگی اور عالم انسانی کی اس فکری، تہذیبی اور اخلاقی قیادت کی ناکامی پر جو تقدیر سے اس کے ہاتھ میں آگئی ہے آزادانہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملے اور میں ان کے سامنے وہ حقائق رکھ سکوں، جن کے سننے کی نوبت ان کو سالہا سال نہیں آتی اور ان کا احساس برتری ان پر غور کرنے کا موقع نہیں دیتا، من جانب اللہ اس تقریب کے پیدا ہو جانے سے اپنی اس آرزو کی تکمیل نظر آئی''۔

مجوزہ اسلامک سینٹر کے قیام کے سلسلہ میں جولائی ۱۹۸۳ء میں لندن میں مشاورتی مجلس منعقد کی گئی، جس میں علی میاںؒ، مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی معیت میں شریک ہوئے، مرکز کے مقاصد اور اس کے لائحہ عمل پر غور وفکر کیا گیا۔ علی میاںؒ نے اس بات پر اصرار کیا کہ ''یہ مرکز دوسرے مراکز سے مختلف ہو، اس میں اعلیٰ تحقیقی کام ہو اسلام کی تاریخ، تمدن و روایات کا تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر مطالعہ کیا جائے''۔ علی میاںؒ کے تجویز کردہ بنیادی خطوط پر یونیورسٹی نے اسلامک سینٹر کا قیام منظور کیا۔ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۸۵ء کو سینٹر کی باضابطہ تاسیس عمل میں آئی، ڈاکٹر فرحان نظامی کو جو سینٹ کراس کالج آکسفورڈ کے شعبہ تاریخ سے متعلق تھے بالاتفاق سینٹر کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا، ڈاکٹر ڈیوڈ براؤننگ کو اس کا رجسٹرار بنایا گیا۔ علی میاںؒ کو مرکز کے ٹرسٹ کا چیئرمین منتخب کیا گیا، اسلامک سینٹر کو وقف کی شکل میں تشکیل دیا گیا، ۱۴؍ٹرسٹیوں پر مشتمل مجلس متولیان میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے دو نمائندے سینٹ کراس کالج کے ڈاکٹر فرحان نظامی اور باقی گیارہ ممبر عالم اسلام کے صحیح الفکر مسلمان نامزد کیے گئے۔ علی میاںؒ نے ٹرسٹ کے قیام کے لیے پانچ سو پونڈ عطیہ کا اعلان کیا، شیخ سلطان محمد قاسمی حاکم شارجہ نے عمارت کی جگہ کے اکوئرمینٹ کے اخراجات برداشت کرنے کا اعلان کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی سات سو سالہ تاریخ کا یہ تاریخ ساز دن تھا جب علی میاںؒ نے ٹرسٹیوں کی پہلی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

> ''مجھے مسرت ہے کہ آکسفورڈ میں اس وقت اسلامک سینٹر کا قیام عمل میں آرہا ہے آج کا دن صرف تاریخی نہیں بلکہ تاریخ ساز دن ہے اس مرکز علمی کے ذریعہ مشرق ومغرب میں اخلاقی روایات کو کھلے دل اور دماغ کے ساتھ مطالعہ کرنے کے مواقع پیدا ہوں گے اور غلط فہمیوں کی وہ کہر چھٹ جائے گی جس نے اسلام کے حقیقی خدوخال کو سمجھنے میں رکاوٹ پیدا کی ہے اس مرکز کا مستقبل انشاءاللہ شاندار ہوگا اور

اس کے ذریعہ اسلام اور انسانیت دونوں کی خدمت کی جائے گی''۔

(تعمیر حیات لکھنؤ، نومبر ۱۹۸۵ء)

سینٹر کی تشکیل کے بعد سینٹر کے چیئرمین علی میاںؒ کی طرف سے تقریباً ایک سو منتخب ترین افراد کو ڈنر پر مدعو کیا گیا، جس میں یونیورسٹی کے پروفیسر برطانیہ کا دانشور طبقہ، مشرقی فضلاء اور مغربی علماء شریک تھے علی میاںؒ نے اس موقع پر اپنی فصیح و بلیغ تقریر میں سینٹر کے قیام کو فال نیک بتاتے ہوئے کہا۔

''اس سے دوستی اور مفاہمت کے نئے دروازے کھلیں گے اسلام نے انسانیت کا جو درس دیا ہے اور جس طرح انسانیت کو اعلیٰ مقام پر پہنچایا ہے ضروری ہے کہ اس کا صحیح احساس پیدا ہو، بعثت نبوی کے وقت انسانیت سکرات موت کی ہچکیاں لے رہی تھی، رسول ﷺ نے اس کی مردہ رگوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑائی، آنے والی صدیوں میں جو ترقی ممکن ہوئی وہ بقائے انسانیت کے لیے اس عظیم الشان کوشش کا نتیجہ تھی جو حضور ﷺ کی ذات اقدس سے شروع ہوئی تھی۔ اگر اس وقت حضور ﷺ وہ کوشش بقاء انسانیت کے لیے نہ فرماتے تو نہ یونیورسٹیاں ہوتیں نہ یہ ادارے، ان کے اثرات آج تک انسانیت پر رحمت کی امید بنے ہوئے ہیں، اس بناء پر اسلامی مرکز کا قیام یونیورسٹی کا احسان نہیں شکر و اعتراف کا اظہار ہے اور خراج محبت و شرافت ہے جو کہ بہ رضا و رغبت اسلام کو پیش کیا جا رہا ہے''۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ج: سوم، ص: ۱۰۸)

اگست ۱۹۸۶ء میں علی میاںؒ بحیثیت صدر اسلامک سینٹر کے مجلس انتظامی میں شریک ہوئے۔ اگست ۱۹۸۷ء میں ٹرسٹیز کی سالانہ میٹنگ میں شرکت کی اور ''علم کی اشاعت و ترقی اور اس کے ذریعہ انسانیت کی رہنمائی اور اصلاح میں اسلام

کا تاریخی کردار'' کے عنوان سے مضمون تیار کیا جسے ڈاکٹر فرحان نظامی نے پڑھ کر سنایا، اس میٹنگ میں ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (سکریٹری رابطۂ عالم اسلامی) کو نائب صدر منتخب کیا گیا، علی میاںؒ نے اس مقالہ میں اس بات پر زور دیا کہ ''ہمیں کبھی یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے (انسان اپنی ذات سے نہ تو علم کا منبع ہے اور نہ منتہیٰ وہ صرف اللہ کی مرضی پوری کرنے والا نائب یا نمائندہ ہے)۔ قرآن مجید نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے علم کا استعمال خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے کرنے پر مامور کیا تھا، علم کی تاریخ بلکہ تاریخ عالم کا یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ انسان نے یہ فراموش کر دیا کہ وہ خالق کائنات کا نائب اور خلیفہ ہے۔ اسے اس دنیا کی امامت سپرد کی گئی تھی مالک اور آقا بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ زمین کے اوپر اور اس کے اندر پائے جانے والے خزانوں کو اپنی ذاتی، قومی، نسلی اور طبقاتی مفاد کے لیے یا سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے۔ انسانیت کی تاریخ اور علم دونوں کے لیے وہ منحوس ترین دن تھا جب اس نے تباہی کے اس راستہ کا انتخاب کیا صرف یہ احساس کہ انسان اس دنیا کا مالک ہونے کے بجائے خدا کا خلیفہ و نائب ہے، اسے صراطِ مستقیم پر رکھ سکتا ہے کیونکہ اس حقیقت کا عرفان ہی اسے من مانی کاروائی کرنے میں مانع ہو سکتا ہے۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ج: سوم، ص: ۲۷۴-۲۷۵)

۱۹۸۹ء میں علی میاںؒ، مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی معیت میں لندن گئے اور اسلامک سینٹر کے ٹرسٹیوں کی میٹنگ میں شریک ہوئے۔ اس میٹنگ میں تین اہم نکات پر توجہ دی گئی۔ اوّل اعلیٰ علمی سطح کا سہ ماہی انگریزی مجلّہ کا اجراء، دوسرے انگریزی میں مؤقر اور مستند تاریخ اسلامی کی ترتیب، تیسرے اسلام کے تعلق سے انگریزی میں ایک معیاری تاریخی اٹلس کی تیاری اور مختلف اسلامی موضوعات پر عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں کے توسیعی خطبات کا سلسلہ، فکر اسلامی کے مفید پہلوؤں پر تحقیق کرنے والوں کو تعلیمی وظائف مہیا کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

۱۹۹۰ء میں علی میاںؒ قدیم مرض نقرس کی وجہ سے اسلامک سینٹر کے سالانہ جلسہ میں شریک نہیں ہو سکے۔ ۱۹۹۱ء میں اسلامک سینٹر کی میٹنگ میں شریک ہوئے اور مفید مشورے وتجاویز دیں، ۱۹۹۲ء میں علی میاںؒ نے لندن کا سفر کیا، سینٹر کے جلسہ انتظامیہ میں شرکت کی، حکومت ازبکستان سے اسلامک سینٹر کا ایک معاہدہ ہوا، جس کے تحت امام بخاریؒ کی آخری آرام گاہ سے متصل یادگار مدرسہ اور مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا اور اس کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ انگریزی میں جامع اور وسیع اسلامی تاریخ مرتب کرنے کے سلسلہ میں پیش رفت کا جائزہ لیا گیا۔ مولانا حکیم عبدالحیؒ حسنی کی معرکۃ الآرا تصنیف نزهة الخواطر في بهجة المسامع والنواظر کی آٹھوں جلدوں کو کمپیوٹرائزڈ کرلیا گیا۔ اس تصنیف کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ساڑھے چار ہزار سے زیادہ شخصیات کے تراجم ہیں جو پہلی صدی ہجری میں ہندوستان آنے والے صحابہ وتابعین، فاتحین اور مبلغین کے ذکر سے شروع ہوتے ہیں اور چودھویں صدی ہجری کے نصف تک کے اہل فضل وکمال کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ اسلامک سینٹر آکسفورڈ کے ذریعہ اس ضخیم کتاب کی تمام جلدوں کی کمپیوٹر کے ذریعہ محفوظ کرنے کے ساتھ انگریزی میں تاریخ اسلام کی تدوین وترتیب پر تیز رفتاری کے ساتھ کام کیا جارہا ہے۔ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام علی میاںؒ کا پسندیدہ موضوع تھے۔ ۱۹۸۳ء اسلامک سینٹر کا قیام ان کے ایک آرزو کی تکمیل تھی، جس کے لیے انھوں نے دعا کی اور وقت آنے پر عملی تعاون بھی کیا۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۶ء تک علی میاںؒ نے تقریباً ہر سال لندن جاکر اسلامک سینٹر کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی جو بورڈ کی کاروائیوں سے آگاہی حاصل کی، متعدد معاملات پر تبادلہ خیال کیا اور اپنے تجربے ومطالعہ کی روشنی میں تجاویز پیش کیں۔

(کاروانِ زندگی۔ ج: ششم)

علی میاںؒ نے اپنی تقاریر اور گفتگو میں ایسا معتدل ومتوازن رویہ اختیار کیا جس نے مغربی دانشوروں کو متاثر کیا۔ چنانچہ ان کا انداز نہ نفرت انگیز ہے نہ حقارت آمیز بلکہ ایسا جدید اسلوب اور سائنٹفک انداز ہے جو اسلام کے احیاء وتجدید کے

لیے ضروری ہے۔ اسلامی لٹریچر کو باعتبار زبان اور باعتبار مضمون بے حد جاندار اور موثر بناتا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی مغرب کی سب سے قدیم اور سب سے زیادہ مقتدر یونیورسٹی ہے جس کا نام علمی دنیا میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے، یونیورسٹی کی سات سو سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اس عظیم الشان اسلامی علمی مرکز کا قیام زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ علی میاںؒ کا اس مرکز کے ٹرسٹ کا چیئرمین منتخب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور شخصیت کے اثرات مشرق سے مغرب کی طرف پھیل گئے اور ان کے علمی تبحر، فکر و نظر کی گہرائی اور عبقری شخصیت کی دلکشی سے مغرب بھی متاثر ہونے پر مجبور ہوا ہے۔

آکسفورڈ کے اسلامی مرکز نے اعلان کیا کہ برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے اسلامی تحقیقات کے لیے ایک فیلوشپ منظور کی ہے، ایک پریس ریلیز میں جو آکسفورڈ کے اسلامی مرکز کی طرف سے جاری کیا گیا، شہزادہ چارلس نے کہا کہ یہ فیلوشپ اسلامی مرکز کے مدیر سے وابستہ ہوگی اور جس کو یہ فیلوشپ دی جائے گی وہ موڈیلین کالج کا ممبر بھی ہوگا۔ مرکز کے ترجمان نے کہا ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک اکیڈمک منصب شہزادہ کے نام سے منسوب ہوگا۔ جو مختلف تہذیبوں کی حامل قوموں کے درمیان ڈائیلوگ کی علمی اور معنوی مدد کرے گا۔ بیان میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ آکسفورڈ کے اسلامی مرکز کی تاسیس اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے اس کا الحاق ۱۹۸۵ء میں ہوا، اس کا مقصد علمی بحث و تحقیق کے ذریعہ اسلام اور عالمِ اسلام سے بہتر واقفیت پیدا کرنا ہے، اس کا مقصد علمی اجتماعات اور کانفرنسیں منعقد کرنا ہے تاکہ لوگ اسلام اور عالمِ اسلام سے واقفیت حاصل کر سکیں، بیان میں مزید کہا گیا کہ اکادمی کی سرگرمیاں صرف دینی، ثقافتی اور عالمِ اسلام کے تاریخی پہلوؤں پر ہی محصور نہیں ہوں گی بلکہ موجودہ اسلامی معاشرے کے اسلام کی روشنی میں تقاضوں کا مطالعہ بھی اس کے مقاصد میں شامل ہوگا۔ یورپ میں اسلامک سینٹر کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی مؤثر ترجمانی کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے علی میاںؒ

نے ایک موقع پر فرمایا:

''یورپ میں اسلامک سینٹر کا قیام آکسفورڈ یونیورسٹی کے حدود میں اور یونیورسٹی کے ہمدردی کے ساتھ آزادانہ طریقہ سے سینٹر کا قائم ہونا بہت اہم ہے کیونکہ یورپ کا پڑھا لکھا طبقہ خاص طور پر، علمی و تعلیمی زندگی سے وابستہ حلقہ اسلام کے متعلق نہ صرف یہ کہ غلط فہمی میں رہا بلکہ اسلام کو ایک غیر حقیقت پسند اور غیر عملی مذہب سمجھتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یورپ میں اسلام کا تعارف علمی انداز میں بہت کم کرایا جاسکا کیونکہ جو لوگ یورپ کی زبان و مزاج علمی سے واقفیت حاصل کرتے رہے وہ یورپ سے مرعوبیت اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایسے میں متاثر کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا، اب مغربی تہذیب اپنی بے راہ روی کی اس منزل پر پہنچ گئی جو اس کے لیے خودکشی کی منزل کے مترادف ہے۔ اس وقت مسلمانوں اور مشرقی قوموں کی ذمہ داری ہے کہ یورپ، ان کے عظیم فکر و مذہب سے واقف ہو اور زندگی میں اس کو جائز مقام دے۔ اسے اسلام کی رہنمائی حاصل ہو اور فکر و حیات میں تبدیلی کر کے تباہی و بربادی سے بچایا جا سکے۔ اس صدی میں آکسفورڈ میں اسلامک سینٹر کا قیام ایک اہم تاریخی بلکہ تاریخ ساز واقعہ ہے، اس سے مشرق و مغرب کے علمی تہذیبی روابط کا نیا دور شروع ہوا ہے، اسلامی فکر، تاریخ، ثقافت اور اخلاقی، روحانی قدروں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مواقع پیدا ہوئے ہیں''۔

علی میاںؒ اسلام کے بقاء اور تحفظ، اُمّتِ مسلمہ کی تربیت و اصلاح اور اتحادِ ملت کی خاص فکر رکھتے تھے۔ اپنے علمی، دینی ذہن اور خداداد صلاحیت کی بناء پر انھوں نے علمی، ادبی، مذہبی، اصلاحی، تعلیمی و تربیتی تحریکات میں قائدانہ رول ادا کیا اور ایک طویل عرصہ تک مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ اپنے عالمانہ مشوروں، دینی بصیرت سے ہر تحریک کو فعّال تحریک بنانے پر توجّہ دی۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بلاتفریق انسانوں کو انسانیت کا سبق یاد دلایا۔ مغربی تہذیب اور تعلیم کے جلو میں آنے

والے نئے فکری اور ثقافتی فتنوں سے مقابلہ کیا۔ اسلامی فکر اور تعلیمات کو عقلی اور فکری بنیاد پر برتر ثابت کیا۔ علمی اور تاریخی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا کہ انسانیت کی بقاء اور نجات اسلامی فکر اور تربیت کی مؤثر ترجمانی، وقت کی زبان اور اسلوب اپنانے میں ہے۔ علی میاںؒ کا نقطۂ نظر بڑا دردمندانہ، علمی اور عملی لحاظ سے مدلل، آفاقی، معتدل، متوازن اور جامع ہوتا تھا۔ یہ لسانی اور قلمی جہاد علی میاںؒ کی علمی، عملی زندگی کا روشن اور تابناک پہلو ہے۔

☆☆☆

"نبی رحمت کی اُمت کو اپنے ملک، ماحول اور سماج کے لیے اُمتِ رحمت اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے ایک فرض شناس، رحم دل اور ماہر، ملاح اور کشتی بان کا کردار ادا کرنا ہے جن کی موجودگی میں اِس ملک کو تباہ اور اس کشتی کو ڈوبنا نہیں چاہیے"۔

(مولانا سیّدابوالحسن علی ندویؒ)

مفکرِ اسلام مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا فکر و فلسفہ

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ علمی ذوق، ستھرا مذاق، دینی، اصلاحی، دعوتی تحریکی اور تصنیفی مزاج رکھتے تھے۔ وہ ایک کثیر المطالعہ وسیع المشاہدہ عالم دین تھے۔ علماء، داعیان، مصلحین و مجددین کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خالص دینی و علمی ماحول میں پرورش ہوئی۔ علومِ اسلامیہ و فنونِ ادبیہ کی تکمیل علمائے عباقرہ اور یکتائے روزگار اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء جیسے فکری ادارہ کے دینی علمی تعلیمی اور ثقافتی ماحول میں ان کا فکری نشو و نما ہوا۔ نوجوانی میں مختلف تحریکات سے تعلق قائم ہوا، ہندوستان کے صاحبِ نسبت بزرگوں سے استفادہ کیا۔ ان کا عہد دو صدیوں کا سنگم تھا۔ قسم قسم کی آزمائشیں، فتنے اور چیلنج تھے جن کا مقابلہ وقت کی سب سے اہم ضرورت تھی۔

تجدیدی و اصلاحی تحریکات کی تاریخ نویسی سے علی میاںؒ کو خاص مناسبت رہی۔ ان کی علمی، ادبی، دینی، دعوتی جد و جہد کا زمانی رقبہ نصف صدی سے زیادہ اور مکانی رقبہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں رہ کر ''عربی لے کو اپنایا''۔ دلچسپی کے مرکز دو موضوع تھے ایک مذاہب اور اس میں بھی تقابلی مطالعہ دوسرا تاریخ صرف ایک حصے کی تاریخ نہیں بلکہ تاریخ عالم''۔ علی میاںؒ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں تاریخ عالم کا مطالعہ کیا۔ دور اندیشی اُن کا خاص وصف تھا، عالمِ اسلام کی سیاسی، سماجی تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر تھی، خطرات کا احساس بہت پہلے سے کر لیا کرتے اور تحفظ کی تدبیریں بتاتے تھے۔ وہ اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں ملک و قوم اور ملتِ اسلامیہ کے مسائل پر غور کرتے، نتائج اخذ کرتے حقائق بیان کرتے، اندیشوں اور اُمیدوں کا اظہار کرتے صحیح مشورے دیتے تھے۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے اپنی تصنیف 'عہد ساز شخصیت' میں علی میاںؒ

کی خاص صفات و امتیازات اور طرزِ فکر کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مولانا رحمۃ اللہ علیہ متعدد اور متنوع کمالات و خصوصیات کے حامل انسان تھے، وہ ایک طرف ممتاز مفکر و مصلح، دوسری طرف کامیاب معلم و مربی اور تیسری طرف باا ثر صاحبِ قلم اور صاحبِ اسلوب ادیب تھے۔

مولاناؒ نے دو خاص صفتوں کو حرزِ جاں بنایا تھا ایک تو قوم وملت کی خیر خواہی و خیر طلبی اور دوسرے زہد و قناعت کے ساتھ حصول مقصد کے لیے لگن اور قربانی، اس کے ساتھ طبیعت کی نرمی، کریمانہ اخلاق، والہانہ جذبہ عمل، فہم وفراست اور مقصد کی بلندی جیسی ممتاز صفات، مولاناؒ کی خصوصیات تھیں اپنی انھیں صلاحیتوں سے انھوں نے متعدد اہم ترین مسائل حل کیے اور قوم کے دانشوروں اور رہبروں کو متاثر کیا''۔

(عہد ساز شخصیت، مولانا محمد رابع حسنی ندوی)

علی میاںؒ کو عالم اسلام اور عرب ممالک کے ممتاز اہلِ علم اور شیوخ سے ملنے، دینی، دعوتی، علمی موضوعات پر تبادلہ خیال کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے جو دعوتی اور فکری کاموں کے سلسلہ میں مفید ثابت ہوئے۔ عالمِ عربی سے اپنے گہرے روابط اور عربوں سے اپنے دیرینہ تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مجھے عالمِ عربی میں کمزوریوں اور اس کے سر پر منڈلانے والے خطرات سے واقفیت کے وہ مواقع حاصل ہوئے جو (خاص اسباب و حالات کے بناء پر) ہندوستان میں میرے محدود علم میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوئے ہوں گے میری تعلیم اور تربیت شروع سے عرب اساتذہ کے ماتحت ہوئی اور بدو شعور سے اس زمین سے اپنے وطن کا سا اُنس اور واقفیت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے مجھے ہندوستان سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن عرب کی سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے وہاں کی تحریکات، رجحانات، مکاتیب خیال اور شخصیتوں سے اتنا واقف ہوگیا تھا کہ مجھے کسی عرب ملک میں کبھی اجنبیت اور بیگانگی کا احساس نہیں ہوا۔

اس کے بعد بارہا مجھے مشرقِ وسطیٰ کے دورے کا موقع ملا اور تقریباً پوری عرب

دنیا کی سیاحت کی، سیاحت بھی زائرانہ نہیں محرمانہ، میں عربی دنیا کے تمام مرکزوں میں مہینوں اور ہفتوں رہا ہوں اور اُن کے حقیقی خیالات اور جذبات سے واقفیت کا موقع ملا ہے، معذرت اور احساس ندامت کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ مجھے اُن کے فطری محاسن اُن کے قومی خصائص، ان کے خداداد کمالات، ان کی حسنِ طبیعت اور ان کے سوز دروں، اُسی کے ساتھ اُن کی مشکلات ان کی آزمائشوں اُن کے مسائل اور اُن کے مصائب کا جیسا علم ہے قدرتی طور پر بہت سے اصحاب کو نہیں ہے، جو اپنے علم و فضل، دین وتقویٰ، علمی کمالات یا سیاسی خدمات میں مجھ سے بدرجہا فائق اور میرے لیے لائق صد عزت واحترام ہیں۔ یہ کوئی کمال نہیں، حکمت الٰہی کی کرشمہ سازی ہے محض انعام نہیں امتحان اور آزمائش بھی ہے۔''

علی میاںؒ نے عرب اور اسلامی ممالک میں اشتراکیت، لامذہبیت کے بڑھتے اثرات کو دیکھا، عالمِ اسلام کے سر پر منڈلاتے ذہنی تہذیبی اور اعتقادی ارتداد کے خطرات کو شدت سے محسوس کیا۔ کاروانِ زندگی میں لکھتے ہیں:

''حجاز سے ۱۹۴۸ء میں واپس ہوا تو عربوں کو ان کی زبان میں اسلام کی دعوت، عالم اسلام ہی نہیں انسانی دنیا میں، داعیانہ اور قائدانہ کردار ادا کرنے اور اپنا قدیم منصب سنبھالنے کی دعوت، دل و دماغ پر چھا گئی اور اعصاب پر اس طرح مستولی اور حاوی ہوگئی کہ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد اور موضوع بنانے کا خیال آنے لگا۔

(کاروانِ زندگی۔ ج:۱،ص:۳۵۱)

علی میاںؒ نے اسلام کے اصل پیغام اور اس کی اصل روح سے دنیا کو متعارف کرایا۔ تمام عمر دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت اور اتحادِ ملت کے لیے جدوجہد کی۔ دین وملت کو نقصان پہنچانے والے واقعات پر حکمت کے ساتھ جرأت مندانہ طریقہ اپنایا۔ اپنی تقریر وتحریر میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مزاج، صلاحیت اور فہم کے مطابق طریقہ اختیار کیا، عام مسلمانوں میں علمائے سلف اور صوفیائے کرام کے طریقے کو پسند کیا، اصحابِ اقتدار میں مجدد الف ثانی کے طریقے خاموشی کے ساتھ خطوط کے ذریعہ

نصیحت آمیزی کو مناسب خیال کیا۔ان کی جرأت، ذہانت، ذکاوت، دور بینی اور دور اندیشی اور مومنانہ فراست نے ملک اور بیرونِ ملک اُن کے وقار میں اضافہ کیا۔ عالمِ اسلام سے باخبری، اسلام کی نشأۃ الثانیہ کی فکر اور جدوجہد، نئے نئے فکری ثقافتی فتنوں کے سد باب، علمی دینی دعوتی انہماک، حوصلہ افزا تعمیری ادب کے ذریعہ صحیح راہِ عمل کی نشاندہی اور رہنمائی نے انھیں برصغیر، عالمِ اسلام اور عالمِ عرب میں مفکر، مصلح، داعی اور صاحبِ اسلوب ادیب کا درجہ عطا کیا۔

علی میاںؒ کی تصانیف وتقاریر سے ان کی فکر کے اہم بنیادی پہلو سامنے آتے ہیں۔ان کے فکر وفلسفہ کی عالیشان اور پائیدار عمارت انھیں مضبوط ستونوں پر قائم ہے (۱) راسخ عقیدہ اور پختہ ایمان کے بغیر مادیت کا مقابلہ ممکن نہیں (۲) وحی الٰہی ہدایت کا اصل سرچشمہ اور وہی فیصلہ کن (۳) قرآن کریم سے دلی مناسبت اور تعلق پیدا کرنا (۴) سنت نبوی اور سیرتِ نبوی سے قلبی تعلق اور ربط (۵) روحانی قوت کو بیدار اور ربانی طرزِ زندگی کو اختیار کرنا (۶) تعمیر واتحاد کی دعوت نہ کہ انتشار وتخریب کی (۷) جہاد فی سبیل اللہ کی روح کو بیدار کرنے کی ضرورت (۸) اسلامی تاریخ اور اس کے کارناموں کو پیشِ نظر رکھنا (۹) مادّی تہذیب اور مغربی فکر وفلسفہ پر تنقید (۱۰) عقیدہ ختم نبوت پر زور اور قادیانی فتنہ کی سرکوبی امت مسلمہ کا بنیادی فرض (۱۱) امت مسلمہ نے ماضی میں جو کردار، انسانیت کے نجات کے لیے ادا کیا، ہر دور میں اُسی کردار کی ضرورت (۱۲) مسلم معاشرہ میں فکری ارتداد کی نشاندہی، اس کے مقابلے کے لیے طرزِ فکر میں انقلابی تبدیلی کی ضرورت (۱۳) صحابہ کرامؓ کی فضیلت اور دین میں اُن کے اصل مقام ومرتبہ شناسی پر زور (۱۴) المیہ فلسطین کے بنیادی اسباب اور قضیہ کے حل کا صحیح طریقہ (۱۵) اسلامی ممالک کو مغرب کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا واحد راستہ، آزادانہ اسلامی نصاب اور نظامِ تعلیم (۱۶) نوخیز نسلوں کی تعلیم وتربیت اور اس کا صحیح طریق کار (۱۷) تحریک پیامِ انسانیت (۱۸) اسلامی تحریکات اور انسانیت کی بیداری کے لیے رہنما اصولوں کی وضاحت اور تبلیغ۔

علی میاںؒ کے زبان وقلم نے بارہا دنیا پر اسلام کے عطایا وبخششوں کا جائزہ لیا ہے یہ ان کا محبوب موضوع ہے، وہ اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھ چکے تھے۔ تصنیف ''الاسلام أثره فی الحضارة و فضله علی الانسانية'' میں انتخاب واختصار کے ساتھ دنیا کو اسلام کی جانب سے عطا ہونے والے دس اہم بنیادی عطیات وانعامات کا ذکر کیا ہے۔قرآنی آیات واحادیث سے اسلامی تعلیم پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ سب چیزیں اسلام کا بیش بہا عطیہ وانعام ہیں۔ انسانی زندگی پر ان کے دوررس اثرات ونتائج مرتب ہوئے ہیں۔اسلام نے ہر منزل پر تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دیا ہے، اسلام پر راسخ اور پختہ یقین کے بعد ہی موجودہ دور کے فتنہ مادیت سے مقابلہ ممکن ہے۔

''اسلام میں تغیر پذیر انسانیت کی رہنمائی کی مکمل صلاحیت ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے کامل اور مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے......زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اس کا شباب ہر وقت قائم ہے......اس رواں دواں سدا جوان زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا اس دین کی بنیاد ''ابدی عقائد اور حقائق'' پر ہے۔ یہ دین زندگی سے پُر ہے اور حرکت اس کے رگ وپے میں بھری ہوئی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے''۔

(تاریخ دعوت وعزیمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۷)

علی میاںؒ نے قرآن کا مطالعہ عربی زبان وبیان کی روشنی میں کیا، عربی زبان کے مختلف اسالیب سے ان کی واقفیت مددگار ثابت ہوئی۔انھوں نے قرآن کریم کو اسی قدرتی تازگی اور سادگی سے سمجھا جیسا قرنِ اوّل کے سادہ مزاج عربوں نے سمجھا تھا۔علی میاںؒ کو

ایسے بزرگوں کی علمی صحبت اور تربیت میسر آئی جن کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی۔ شیخ خلیل عربؒ، خواجہ احمد فاروقیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ۔ اِن عبقری اساتذہ کے درسِ قرآن میں شرکت سے قرآن فہمی میں امتیازی شان حاصل ہوئی۔

ان کی تصانیف پر قرآن کریم کا رنگ غالب ہے۔ قرآن کریم سے اس خصوصی تعلق کے بارے میں علی میاںؒ "قرآنی افادات" میں تحریر فرماتے ہیں:

"جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصانیف دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے"۔

(قرآنی افادات۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۲۱)

علی میاںؒ دعوتِ الی اللہ کی اہمیت و فرضیت اور اس کارِ عظیم کی بجا آوری میں "حکمت و موعظمت" کے کلیدی اصول سے واقف تھے، اس اہم نکتہ سے بھی واقف تھے کہ قرآن کریم نے "حکمت اور موعظت حسنہ" کو مبہم نہیں چھوڑا۔ انبیائے کرام کے انمول نمونے دے کر اس کے خطوط اور حدود کی وضاحت کردی۔ علی میاںؒ نے دعوت و تبلیغ کی ابتداء درسِ قرآن سے کی اور حکمت و موعظت حسنہ کا خالص قرآنی انداز اختیار کیا۔ تقاریر میں قرآن کریم کی آیات کی تشریح کی، قرآن کریم کے ذریعے کیے گئے دعوت کے طریقے کو پیشِ نظر رکھا۔ علی میاںؒ اس بات کے داعی تھے کہ قرآن کریم ہدایت و دعوت کی کتاب ہے اور احکام و شریعت کی بھی، لیکن اس کے اندر دعوت و ہدایت کا پہلو دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان کی بنیاد ہدایت پر ہے اور تبلیغ پر، ایمان کے حصول کا دارومدار ہے۔

(تبلیغ اور دعوت کا معجزانہ اسلوب۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی لازوال امامت اور عالمگیر دعوت، ابراہیمی اور محمدی تہذیب کی حقیقت بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''یہ وہ دعوت ہے جو انسان اور انسان میں، اور وطن اور وطن میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی۔ رنگ ونسل اور زبان کے معاملے میں کوئی جانب داری نہیں برتتی اور نہ کسی جارحیت کی روادار ہے......

اس دعوت کی اساس عقیدے میں توحید پر، اجتماعی زندگی میں انسانیت کے احترام اور مساوات پر اخلاقیات کے شعبہ میں تقویٰ، حیا اور تواضع پر، میدانِ عمل میں آخرت کے لیے جدوجہد اور جہاد وقربانی پر، میدانِ جنگ میں شجاعت کے ساتھ رحم دلی اور شفقت پر اور انتظامِ حکومت کے دائرہ میں ہدایت کے پہلو کو مالیات وآمدنی پر ترجیح دینے اور خدمت لینے کے بجائے خدمت کرنے اور نفع اُٹھانے کے بجائے نفع پہونچانے پر ہے''۔

(اسلام مکمل دین مستقل تہذیب۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۲۲)

علی میاںؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس وتدریس کے زمانے سے ہی اس فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ قرآن کریم سے دلی مناسبت عشق وشغف اس کی عظمت واہمیت کو طلبا کے دلوں میں جاگزیں کرنا بہت ضروری ہے۔ قرآن کریم کے اصول ومبادی الصراع بين الايمان والمادّية اور روائع من ادب الدعوة في القرآن والسيرة اور اس سب سے پہلے قصص النبيين کے ذریعہ قرآن کریم میں گہرے غوروفکر، احترام اور عظمت اور اس سے دلی مناسبت پیدا کرنے کی کوششوں کا آغاز کر چکے تھے۔ وحیِ الٰہی کو ہدایت کا اصل سرچشمہ اور فیصلہ کن قرار دیتے تھے۔

''ہمیں آسمانی مذاہب وکتب میں سے کسی مذہب وکتاب کا علم نہیں جس سے عقل سے کام لینے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے، غوروفکر وتجربات سے نتیجہ نکالنے، اسباب ومسببات اور نتائج ومقدمات کا ربط معلوم کرنے اور کائنات سے عبرت وبصیرت حاصل کرنے کی دعوت دی ہو، اپنے ماحول پر غور کرنے کی انسانی

صلاحیت سے کام نہ لینے، آیات انفس و آفاق سے اعراض، ممالک واقوام کی زندگی کے گزشتہ واقعات سے عدم عبرت ونصیحت اور فرد و جماعت اور حکومتی سطح کے اعمال و اخلاق کے نتائج سے روگردانی پر قرآن مجید کی طرح گرفت کی ہو"۔

(تہذیب وتمدن پر اسلام کا اثر۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۱۰)

قرآن کریم نے ہر انسان کو ظاہری حواس سے کام لینے کی جو ترغیب دی ہے علی میاںؒ اُسی پر عمل پیرا رہنے کی دعوت دیتے ہیں تا کہ انسان بصارت سے بصیرت تک پہنچے اور بیداری کے ساتھ راہِ ہدایت پر گامزن ہو سکے۔

علی میاںؒ سنت نبوی اور سیرت نبوی سے قلبی تعلق اور ربط ضروری قرار دیتے ہیں، مسلم معاشرے کو جو اقدار وافکار کی تیز و تند کشمکش سے دوچار ہے گہرے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ "موجودہ بے راہ روی، اسلام کی صحیح روح سے بُعد، آسمانی مذاہب کے مخالف مادّی اقدار کی غلامی، مصنوعی طریقوں اور مغربی طرزِ فکر سے وابستگی اور اُس کے اثر سے اسلام کی ایک نئی تعبیر اور دین کی ایک نئی تفہیم کو دنیا کے سامنے پیش کرنا، منہاج ومزاج نبوت سے ناآشنائی اور اس کی اصل قدر و قیمت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے...... آج عالمِ اسلام میں عمل میں کوتاہی اور طاعات سے غفلت اور نفس پر گراں گزرنے والی چیز سے وحشت اور نبی ﷺ کی سنتوں کے معاملے میں نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی غفلت، سب اسی عظمت رسول ﷺ کا احساس نہ ہونے کا نتیجہ ہے جس پر قرآن زور دیتا ہے اس کے ساتھ ہی رسول ﷺ سے محبت کی کمی کو بھی اس میں بہت دخل ہے"۔

علی میاںؒ اپنی تقاریر میں فرمایا کرتے تھے "اسلام کے اعلیٰ اصولوں میں دنیا اس وقت کشش محسوس کرے گی جب ہم ان کا مظاہرہ اپنی عملی زندگی میں کریں گے"۔

"نوجوانان مکہ کے نام پیام" میں عالمِ اسلام کو اپنے منفرد طرزِ فکر اور مؤثر اسلوب میں مخاطب کرتے ہیں اور انھیں یاد دلاتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی ذات گرامی، سنت نبوی

اور سیرت نبوی سے قلبی تعلق اور ربط، اسلام کی دعوت اُن کے اوّلین فرائض میں شامل ہے۔ ۴۸ سال کی عمر میں تحریر کیا گیا یہ پیغام جو بظاہر مکہ کے نوجوانوں کے نام ہے لیکن دراصل تمام امتِ مسلمہ کے لیے اس میں نصیحت ہے:

''عرب جہاں بھی ہیں اور جتنے بھی ہیں اگر سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھے ان سے خطاب کا موقع ملے، میری بات وہ سن سکیں اور اُن کے دلوں میں اتر سکے تو عرض کروں گا۔

بزرگو! اسلام جس کو سیدنا محمد ﷺ لائے ہیں یہی آپ کی زندگی کا سرچشمہ ہے یہی آپ کی قوت ہے اور اسی سے آپ کی رگوں کا خون گردش میں ہے اسی اسلام سے آپ کے وجود کی صبح صادق نمودار ہوئی۔ آپ دنیا میں روشناس ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے آپ کی سرفرازی ہے اسی نام کے صدقہ میں آپ کی نبض حیات میں گرمی اور قلب میں حرارت قائم ہے اور صرف آپ ہی نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام میں اگر خیر کا کوئی ذرّہ ہے تو وہ اسی ذاتِ گرامی کا عطیہ ہے اور آپ سن لیجیے کہ اسی نسبت سے آپ کی آج بھی عزت ہے اس رسول عربی کے دامن سے وابستگی آپ کا سب سے بڑا ہنر ہے اگر خدانخواستہ اس ذاتِ اقدس سے عرب کا رشتہ ٹوٹا یا کمزور ہوا تو اس کی حیثیت ایک ایسے دریا کی ہوگی جس میں پانی نہ ہو، عربوں کا سب سے بڑا عروج اسی میں ہے کہ وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا امام و قائد، رہبر و رہنما مان کر اسلام کو لے کر اُٹھیں جیسا کہ عہدِ اوّل میں اُن کے اسلاف اُٹھے تھے (آج بھی ضرورت ہے کہ) اسلام کی دعوت کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھیں اور مظلوم انسانیت کو یورپ کے چنگل سے آزاد کرائیں جو اپنے جہل میں انانیت میں آ کر ساری دنیا کو انارکی، ویرانی اور تباہی کی طرف لے جارہا ہے۔ عرب اُٹھیں اور تہذیب و اخلاق کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالیں، دنیا کو بے چینی، اضطراب، خودرائی اور خود پسندی کے حصار سے نکال کر امن، سلامتی، بھائی چارگی اور محبت کے راستے پر گامزن کریں۔ عالمِ عرب کا یہ فرض ہے جس میں انھوں نے کوتاہی کی تو اُن

سے پرسش ہوگی وہ سوچ لیں کہ کل اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے اور کیا جواب دیں گے“۔

(وصایا اساطین الدین والادب والسیاسة ۔شیخ عبداللہ المزروع، ترجمہ:مولانا عبداللہ عباس ندویؒ)

صحابہ کرام کی فضیلت اور دین میں ان کے اصل مقام و مرتبہ شناسی پر زور دیتے ہیں۔صحابہ کرامؓ کو انسانی عالمی مرقع کی سب سے حسین تصویر اور امتِ مسلمہ کو صحابہ کے اصل مقام و مرتبہ کو پہچاننے اور اسوۂ صحابہ کو حرزِ جاں بنانے کا پیغام دیتے ہیں۔

”اس دین کے داعی اوّل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور صحبت میں ایسی تاثیر تھی جس کو ”نورِ نبوت“ اور برکت صحبت سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے وہ مردم گری اور مردم سازی میں ماہر تھے۔ان کے صحبت یافتہ افراد میں تعلق مع اللہ، اخلاص، عبودیت، تواضع، ایثار و بے نفسی، ذوق عبادت، تحقیر دنیا، فکر آخرت، احتساب نفس اور استقامت کی وہ شان پائی جاتی ہے جو بڑے بڑے فلاسفروں، دانشوروں، ماہرینِ تعلیم اور معلّمین اخلاق کے تیار کیے ہوئے لوگوں میں عنقا ہے۔

”آپؐ کے تیار کیے ہوئے افراد میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار ہے اور نوعِ انسانی کے لیے باعث شرف و افتخار ہے انسانیت کے مرقع میں بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر، اس سے زیادہ حسین وجمیل، اس سے زیادہ دلکش و دل آویز تصویر نہیں ملتی جو اُن کی زندگی میں نظر آتی ہے۔اُن کا پختہ یقین، اُن کا گہرا علم، اُن کا سچا دل، اُن کی بے تکلف زندگی، ان کی بے نفسی، خداترسی اُن کی پاکبازی، پاکیزگی، اُن کی شفقت و رافت ان کی شجاعت وجلاوت، اُن کا ذوق عبادت اور شوق شہادت، ان کی شہسواری، ان کی شب زندہ داری، ان کی سیم و زر سے بے پروائی اور اُن کی دنیا سے بے رغبتی، اُن کا عدل، اُن کا حسنِ انتظام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔نبوت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جو انسانی افراد تیار کیے ان میں ایک ایک فرد ایسا تھا کہ اگر تاریخ کی متواتر شہادتیں نہ ہوتیں تو ایک شاعرانہ تخیل اور فرضی افسانہ معلوم ہوتا لیکن اب وہ ایک تاریخی حقیقت اور ایک مسلّم الثبوت واقعہ ہے جس

میں شک کی گنجائش نہیں''۔

(دین اسلام اور اوّلین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۷۔۱۸)

علی میاںؒ روحانی قوت کو بیدار اور ربّانی طرزِ زندگی کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ جذبۂ جہاد وقربانی میں ترقی ہو، پُرخطر رجحانات اور بے اعتدالیوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ کلمہ حق کہنے کی جرأت پیدا ہو، علی الاعلان اختلافات ظاہر کرکے حکومت اور معاشرے کو خطرناک نتائج سے بچایا جاسکے۔

''یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سرفروشی وجاں بازی، جہاد وقربانی اور تجدید وانقلاب وفتح وتسخیر کے لیے جس روحانی وقلبی قوت کا جس وجاہت اور شجاعت، جس اخلاص و للّٰہیت، جس جذب وکشش اور جس حوصلہ وہمت کی ضرورت ہے وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیب نفس، ریاضت وعبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی اس لیے آپ دیکھیں گے کہ جنھوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیے ہیں ان میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔''

علی میاںؒ دعوت وتجدید، اصلاح وانقلاب اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح کو بیدار کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ دعوت واصلاح اور تجدید کے تسلسل کی ضرورت واہمیت پر ان کا نتیجہ خیز قلم امت کی رہنمائی کرتا ہے۔ ''کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ اپنی خصوصیات برقرار رکھ سکتا ہے جب تک اس میں لگاتار ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور کامل یقین کے نتیجے میں اُس کے تنِ مردہ میں زندگی کی روح پھونک دیں۔ اسی اصول کے نتیجے میں اسلام کے داعیوں کا سلسلہ قائم رہا ہے اور بعد کے آنے والے جوشِ عمل سے سرشار رہتے ہیں...... اس دین میں ایسے اشخاص پیدا کرنے کی جو صلاحیت اور طاقت ہے اس سے پہلے کسی دین میں اس کا اظہار نظر نہیں آتا۔ اس مسلسل دعوت وتجدید کے عمل کے نتیجے میں یہ دین ہر قسم کی تحریف وتبدیلی سے محفوظ رہا.......... میرے نزدیک جن بزرگوں نے یہ تاریخی مجتہدانہ کام انجام دیا ہے ان کی خصوصیات اور اصل جوہر، ایمان

ویقین، عشق ومحبت، دردوسوز، جذبۂ اتباعِ سنت، عزیمت، علوئے ہمت، ذوق دعوت وتبلیغ، اصلاح اعمال واخلاق، صحیح علوم اور دینی حکم ومعارف تھے۔

علی میاںؒ نے تاریخ اسلام اور تاریخِ عالم کا مطالعہ دعوتی اصلاحی فکر ونظر سے کیا تھا۔ دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں مصلحین اور مجددین کے تجربات کو پیش نظر رکھا۔ تاریخ دعوت وعزیمت میں اصلاح وانقلاب کے تجربے کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''اصلاح وانقلاب کا سب سے کامیاب تجربہ وہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانی نے اختیار کیا۔ انھوں نے (ایک یمنی عالم کے الفاظ میں) ایمان والوں کے خود کرسی اقتدار پر پہونچنے پر اصرار نہیں کیا۔ اقتدار کے کرسی نشینوں تک ایمان پہونچانے، ان کو ایمان اور دینی دعوت اور سعی کا علمبردار بنانے اور اُن کے ہاتھوں سے وہ کام کرانے کا عزم کیا جو وہ خود انجام دینا چاہتے تھے''۔

علی میاںؒ اپنے زمانے کے واقعات میں خاتمہ خلافت کو سب سے بڑا حادثہ تصور کرتے تھے، یہ خاتمہ خلافت کمال اتاترک کے ہاتھوں ہوا تھا۔ علی میاںؒ نے اس کو اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے (Turning Point) اہم موڑ کا درجہ دیا، اس واقعہ نے اسلامی زندگی کی گاڑی کو ایک ایسا موڑ دیا جس کی وجہ سے دنیا مغربی تہذیب کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔ علی میاںؒ نے امتِ اسلامیہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات، مصائب وآلام کو اسی دردناک واقعہ کا نتیجہ بتایا۔

''خاتمہ خلافت اور اُمتِ اسلامیہ پر مغربی تہذیب کی یلغار اور دشمنانِ اسلام کی اُمت اسلامیہ پر جرأت وجسارت میں جو اضافہ ہوا ہے وہ ترازو کے اس پلڑے کے جھکنے کی وجہ سے ہوا ہے اس سازش کی وجہ سے عالمِ اسلام میں وحدت کی جڑیں سوکھنے لگیں، فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہوا، اور صیہونی طاقتیں مشرق کی طرف بڑھنے لگیں، نئے نئے فتنوں کے دروازے کھل گئے۔ یہودی سازشوں کے نقطۂ عروج پر پہنچنے کے اسباب، اسلام سے دوری، زندگی سے اسلامی روابط کا منقطع ہونا، اسلامی مظاہر کا استخفاف اور اسلام کی راہ میں کام کرنے

والوں کا قلع قمع کرنا، اس کے چند اہم اسباب ہیں"۔

علی میاںؒ نے اپنی تصنیف ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) الصراع بین الفکر الاسلامیة والفکرة العربیه (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش اور المسلمون و قضیة فلسطین (عالم عربی کا المیہ) میں حادثہ خلافت اور اس کے نتائج پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

"چنانچہ اس آزمائش کے بعد حوادث کا سلسلہ جاری ہے جس نے مسلمانوں کے رابطے کو مفلوج کر دیا اور ایک خاندان کئی خاندانوں میں بٹ گیا، افکار وخیالات میں تبدیلی آگئی، دنیا میں ہندوستانی سب سے زیادہ خلافت کے بقاء وتحفظ کے خواہش مند تھے اور خلافت کے خاتمے کا سب سے زیادہ افسوس انھیں کو ہوا کیونکہ اس واقعہ کا اُن سے خاص تعلق تھا۔ خلافت پسندی کا نتیجہ تھا کہ حاکم انگریز خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو آلہ کار بنانے میں ناکام رہے اور عرب خاندان کو واسطے کے طور پر استعمال کیا۔"

سنِ طفولیت میں وقوع پذیر خاتمہ خلافت کے اس واقعہ کو علی میاںؒ نے اپنی زندگی کا اہم سانحہ اور عالمِ اسلام کا بڑا المیہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے"ان واقعات نے میرے ایمان کو مستحکم کر دیا کہ اسلام ہی عالمِ عرب اور عالمِ انسانیت کو بچانے کے لیے زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اِس مسئلہ کا واحد حل اسلام ہے جو عالمی قیادت کو جابرانہ ہاتھوں سے چھین کر انسانی اقتدار کے حامل مومنانہ ہاتھوں میں سونپ سکتا ہے"۔

علی میاںؒ کی نشو ونما خالص عربیت کے ماحول میں ہوئی، وہ مصر کی علمی، سیاسی، ادبی شخصیات سے اس درجہ متعارف رہے جیسے کوئی ہندوستانی اردو کے ادیبوں اور ہندو پاک کی شخصیات سے واقف ہو، ان کا وہاں کے مقتدر علماء سے براہِ راست برسہا برس تعلق قائم رہا، چنانچہ جمال عبدالناصر (سابق صدر مصر) کا زمانہ عروج میں علی میاںؒ نے اپنے نفرت اور بغض کا برملا اظہار کیا۔ برسرِ عام تقریر میں (مدینہ منورہ کی

مجلس ثقافی کے عام جلسے میں جہاں جمال عبدالناصر کے سیکڑوں ہمدرد اور ہمنوا شریک تھے) اور عام مجلسوں میں بھی اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

(میر کارواں۔ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی)

عربوں کی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں پر علی میاںؒ نے آزادانہ تنقید کی انھیں مخلصانہ مشورے دیے اپنے تاثرات اور جذبات کا بے باکانہ اظہار کیا۔ دینی شعور کی بیداری پر زور دیا، عربوں نے ہمیشہ فراخ دلی اور عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اُن کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔

''میری مجبوری ہے کہ میں ان خطرات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجودہ عالمِ عربی میں اسلام کو بحیثیت مکمل اور آخری دین کے اور عربوں کو اس کے پُر جوش داعی اور وفادار سپاہی کے درپیش ہیں''۔

''تو امیری عربی رہی'' عنوان کے تحت عربی دنیا سے اپنی گہری عقیدت اور دیرینہ وابستگی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں نہ میری معلومات سیکنڈ ہینڈ ہیں اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ ان کے مصائب اور اُن کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے اور نہ میں اچانک اور بے وقت اس میدان میں آگیا ہوں، میں اپنے کو (ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی) اس وسیع اور عظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے ایک فرد سمجھتا ہوں، میں اُن کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت اُن کی قسمت سے وابستہ ہے ان کی عزت سے میری عزت اور اُن کی ذلت سے میری ذلت ہے۔ میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن عرب کی محبوب سرزمین ہے، اس کی زبان اور ادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے۔ عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اور سربلندی کے لیے

قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں ہے، میرا خمیر اور میرا آب وگلِ ہندوستان کی سرزمین سے ہے مجھے اس کا اعتراف بھی ہے اور اس پر فخر بھی لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور مجھے اقبالؔ کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ

مرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخم ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں، میں کہ نوا میری عربی رہی

(عالمِ عربی کا المیہ۔ ص:۱۵۹)

علی میاںؒ نے عربوں کے ساتھ عقیدت اور محبت کے باوجود عرب قومیت کی سخت مخالفت کی۔ امت مسلمہ کو قومیت کے فتنہ سے آگاہ کیا، اِس لسانی اور تہذیبی عصبیت کے نقصان بتائے اور وحدت اسلامی کو مضبوط کرنے کی دعوت دی ''یہی وحدتِ اسلامی ہے جو امن پسند ہے اور تعمیری صلاحیت رکھنے والی ہے، وہ انسانوں کو جوڑتی ہے توڑتی نہیں، انسانوں کے لیے تعمیر کا باعث ہے تخریب کا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اور آپ کو بہت پہلے یہ نعمت عطا کی تھی۔'' وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا (سورہ آل عمران۔۱۰۳)

اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دل ملادیے تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہوگئے''۔

(دعوت فکر وعمل۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۵۵)

قرآن کریم کے مطالعہ اور قانون فطرت کی روشنی میں ''المیہ فلسطین'' کا جائزہ اور محاسبہ کیا تو اس کو عصر حاضر کا المناک سانحہ قرار دیا۔ ''اس المیے کے پیچھے وہی اسباب وعوامل ہیں جو مجموعی طور پر ملتِ اسلامیہ کے زوال واضمحلال کا سبب بنے ہوئے ہیں'' سیاسی اعتبار سے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے، حجاز، شام و فلسطین کی ترکوں سے بغاوت اور عربوں کی برطانوی اقتدار پر اعتماد سے اس کی

ابتداء ہوئی ہے، صدر ناصر کی اشتراکیت پسندی نے اس کو استحکام بخشا، مشرق وسطیٰ کے استحصال کے ساتھ مسئلہ فلسطین المیے میں تبدیل ہوتا رہا، برطانیہ نے اپنے اقتدار کے ایام میں عربوں کو عرب قوم پرستی کا سبق پڑھایا اور اسلام کی عالمگیر وسعت و آفاقیت سے قوم پرستی کے تنگ اور محدود قید خانے میں قید کر دیا۔ ''المیہ فلسطین'' کے اہم اسباب، دولت پرستی، لذت پسندی، عیش کوشی اور مغربی طرزِ زندگی کی پیروی اور میدان علم و عمل سے دوری ہیں۔

''شکست کا پہلا سبب مغربی تہذیب اور دولت وثروت کا وہ سیلاب ہے جو ان ملکوں پر ایک طوفان کی طرح اُمنڈ آیا ہے۔ اس تہذیب اور اس دولت نے اس سپاہیانہ اور مجاہدانہ مزاج رکھنے والی امت پر جو اپنی فطرت اور اپنی تاریخ کے لحاظ سے جنگ آزما اور خطر پسند اور اپنے دعوت و پیغام کے لحاظ سے جفاکش اور سادگی پسند تھی، بہت گہرا اثر ڈالا بلکہ اس کی دنیا ہی بدل کر رکھ۔ اس میں عیش پسندی، آرام طلبی، تن آسانی پیدا ہوگئی، جاں بازی اور مہم جوئی، خطر پسندی اور حوصلہ مندی، خود اعتمادی اور خود شناسی، مصائب اور مشکلات پر صبر اور زندگی کے معرکے میں ثابت قدمی کے اوصاف داستانِ پارینہ بن کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام و فرائض کی قیمت لوگوں کی نگاہوں میں کم ہوگئی۔ منکرات، معاصی اور احکامِ خداوندی کی برسرِ عام نافرمانی اور سرتابی کی عادت پڑگئی، علماء نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دیا اور احتساب کا کام چھوڑ دیا۔ ظالم و جابر حکمرانوں اور مطلق العنان فرمانرواؤں کے سامنے حق بات کہنے کا رواج جاتا رہا ہے، بے حیائی، فسق و فجور اور الحاد و زندقہ پھیلانے والے رسالے اور اخبارات گھر گھر پھیل گئے، جو بے حیائی کی اشاعت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لذت پرستی، عیش پسندی، زندگی سے لطف اندوزی، نگاہ کی تفریح، دل کی معصیت کی ایک طوفانی موج اُٹھی اور اخلاق، ضمیر، اصول اور تعلیمات، حرام وحلال کے امتیاز کی ساری متاع اپنے ساتھ بہا کر لے گئی اور ایسا وقت آیا کہ وہ لوگ جو خدا کے قانون مکافات سے واقف اور گذشتہ تہذیبوں اور قوموں کی تاریخ سے باخبر تھے کبھی کبھی اس ڈر سے آسمان کی

طرف نظر اُٹھاتے تھے کہ کہیں خدانخواستہ کوئی قہر وعذاب اور سزا تو نازل نہیں ہورہی ہے''۔

(عالمِ عربی کا المیہ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۳۲۔۳۳)

عرب قوم پرستی کے خلاف اور عالمِ اسلام کی متحدہ قوت کے حق میں آواز بلند کرنے والوں میں علی میاںؒ بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ اپنی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' اور ''الاسلام والعرب'' نیز اپنی تقریر وتحریر سے مسلسل اسلام کی عالمگیر قومیت کی حمایت کرتے رہے۔ المیہ فلسطین کے دوسرے بنیادی سبب عرب قوم پرستی کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسرا سبب قومیت عربیہ کا ظہور ہے، جس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد عربوں کی زندگی اوران کے جذبات واحساسات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ عصبیت اسلامی عصبیت کے نقصان کے ساتھ پروان چڑھتی رہی، یہاں تک کہ اس نے ایک عقیدہ اور مذہب کی شکل اختیار کرلی اور قوم پرست اس کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان رہنے لگے اور اُس کی اشاعت وترقی میں اتنی گرم جوشی اور ولولہ کے ساتھ حصّہ لینے لگے جس طرح دنیا کے مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت میں حصّہ لیتے ہیں اور اس کے لیے کھل کر تعصب برتتے ہیں۔ شعر وادب، تصنیف وتالیف، تاریخ وفلسفہ، صحافت اور ریڈیو سب ایک ساتھ اس کی ترویج وتحسین اور آرائش وتزئین کے لیے وقف ہوگئے اور اس کے نتیجے میں نعمت اسلام کی ناقدری اور دعوتِ محمدیؐ کی حق تلفی وناشکری اور احسان ناشناسی کا رجحان پیدا ہوگیا''۔

(عالمِ عربی کا المیہ۔ ص: ۳۴۔۳۵)

اس المیہ کے تیسرے سبب سازشوں، بغاوتوں اور انقلابوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان منحوس مسلسل اور پے درپے انقلابات نے ان ملکوں کو اپنے بہترین قومی قائدین اور سیاسی لیڈروں سے محروم کردیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج یہ ممالک سخت قسم کے قحط الرجال کا شکار ہیں، ان کے یہاں ممتاز وفائق قائدین کا ایک مستقل مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ اب وہاں صرف ایک سرکاری پارٹی ایک ٹولی کی حکومت ہے اور صرف ایک نقطۂ نظر کو

پھولنے پھلنے کی اجازت ہے۔ ان مطلق العنان اور آمرانہ حکومتوں نے (جو انتہا پسندانہ اشتراکی حکومتوں کے شاگرد اور مقلد ہیں) سب سے بڑا کام اپنے پیش نظر یہ رکھا کہ ملک میں ہر اُٹھتی ہوئی آواز، ہر دھڑکتے ہوئے دل اور ہر چلتی ہوئی نبض کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے اور وہ کانٹا ہی نکال دیا جائے جو پہلو میں چبھ سکتا ہے''۔

(عالمِ عربی کا المیہ۔ ص: ۳۸)

علی میاںؒ نے بارہا مسلمانانِ عرب کی غیرت وحمیت کو بیدار کرنے کے لیے سخت اور صریح الفاظ میں تنبیہ کی ''عالم عربی کو اگر کمیونزم یا یہودیت سے جنگ کرنا ہے یا کسی دوسرے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تو اس دولت کے بل بوتے پر جنگ نہیں کر سکتا جو برطانیہ اس کو عطا کرتا ہے یا امریکہ اس کو خیرات دیتا ہے یا پیٹرول کی قیمت کے طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے، وہ اپنے دشمن کا مقابلہ صرف اس ایمان، معنوی قوت، اس روح اور اسپرٹ کے ساتھ کر سکتا ہے جس اسپرٹ کے ساتھ اس نے بیک وقت رومی اور ایرانی حکومتوں کو جنگ کی دعوت دی تھی اور فتح حاصل کی تھی۔ وہ اس دل کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا جس کو زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو۔ اس جسم سے مقابلہ نہیں کر سکتا جو عیش وعشرت کا دلدادہ ہو، اس عقل کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا جس کو شک وشبہ کا گھن لگ چکا ہو اور افکار وخواہشات باہم دست وگریباں ہوں۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ ص: ۳۱۴)

علی میاںؒ نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق اور کھویا ہوا مقام یاد دلایا، انسانی تاریخ اور اسلامی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا، اسلام کے عالمی اور ابدی پیغام کی حیثیت واضح کی جو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ باقی رہے پروان چڑھے اور قیادت کے فرائض انجام دے۔'' رسول ﷺ نے میدانِ بدر میں فرمایا تھا ''اللّٰھم ان تھلک ھٰذہِ العَصَابۃ لاتُعبد'' (اے اللہ! اگر تو اس جماعت کو ہلاک کر دے گا تو پھر تیری عبادت نہ کی جائے گی) مسلمانوں کے سارے

نقائص کے باوجود یہ حقیقت بھی اسی طرح باقی ہے۔ جاہلیت دنیا کے لیے جو نقشہ رکھتی ہے اور جس نقشہ پر آج وہ دنیا کو چلا رہی ہے اس کے خلاف اگر کوئی نقشہ ہے تو صرف مسلمانوں کے پاس ہے اگرچہ مسلمان خود اس کو بھولے ہوئے ہیں لیکن یہ نقشہ ابھی ضائع نہیں ہوا ہے اور نہ کبھی ضائع ہو سکتا ہے۔ مسلمان اپنے دین کی رو سے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں، جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے وہ مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب ہوگا۔ انھیں کے خاکستر میں وہ چنگاری دبی ہوئی ہے جو کسی نہ کسی دن بھڑک کر جاہلیت کے خرمن کو جلا کر خاک کر دے گی''۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ ص: ۲۸۳)

کتاب و سنت اور تاریخ ملت کی روشنی میں امت کی مشکلات اور مسائل کا حل (جو ایک خاص عقیدے اور نصب العین کی حامل ہے) تلاش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں ''اس امت کے ساتھ دنیائے انسانیت کی قسمت وابستہ ہے اس لیے نوع انسانی کی مشکلات و مسائل کا حل بھی اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے اس طرح مسلمانوں کے ساتھ دنیا کے انسانوں کو بھی ''بین الاقوامی کشیدگی'' ختم کرنے ''امن انسانیت''، ''مساوات واخوت کی فضا قائم کرنے ''زندگی کو صحیح اور صالح فطری اساس'' پر قائم کرنے، ''ایک عالمگیر انسانی تہذیب و تمدن کی راہ ہموار کرنے کے لیے (جس میں مادّیت، روحانیت کا اشتراک اور خداپرستی، انسان دوستی اور حقیقت پسندی کا صحیح امتزاج ہو اور جس میں استحصال کے بجائے تعاون و ایثار سیاست کی جگہ اخلاق وشرافت، امانت و دیانت اور نفع طلبی و بدخواہی کے مقابلے میں نفع رسانی وخیر سگالی کے جذبات کی حکمرانی ہو) اسلام کی اشد ضرورت ہے''۔

علی میاںؒ نے صالح اسلامی معاشرے کی تشکیل، تعمیر انسانیت اور اتحادِ ملت کے محاذ پر اپنی زندگی اور توانائی صرف کی۔ حجاز، عالمِ اسلام کے مختلف ممالک، مشرقی

اور مغربی ممالک کے سفر کیے۔ عوام وخواص سے ملاقات کی، سربراہانِ مملکت، زعماء اور شیوخ کو خطوط لکھے۔ درسگاہوں کے طلبا اور اساتذہ کو خطاب کیا۔ ان کے نزدیک ''عالم اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور پیدا کیا جائے''۔ اس شعور کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و ناانصافی کو برداشت کر سکے، نہ دین و اخلاق سے انحراف کو، جو صحیح اور غلط، خلوص اور نفاق، دوست اور دشمن اور مصلح و مفسد کے درمیان آسانی سے تمیز کر سکے، مجرم اس کی ناراضگی اور عتاب سے نہ بچ سکیں اور مخلص اس کے اعتراف اور قدرشناسی سے محروم نہ رہیں، وہ اپنے تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل ومعاملات میں ایک عاقل اور بالغ انسان کی طرح غور کر سکے اور فیصلہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو، جب تک یہ شعور پیدا نہ ہو، کسی اسلامی ملک وقوم کا جوشِ عمل، صلاحیت کار، دینی جذبات اور مذہبی زندگی کے مظاہر مناخر کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے''۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ ص: ۳۰۰)

ہندوستان میں علماء اور طلباء کے ایک مجمع کو خطاب فرماتے ہوئے اسلامی قانون کی برتری ثابت کرنے کی جدوجہد کو ضروری قرار دیا۔ ''زمانہ کا مجدد کہلانے کا مستحق وہ ہوگا جو اسلامی شریعت کی برتری ثابت کر کے زندگی سے اس کا پیوند لگائے اور یہ ثابت کرے کہ اسلامی قانون، وضعی قانون اور انسانوں کے تمام خودساختہ قوانین سے آگے ہے۔ وہ زمانے کے آگے کی چیز ہے زمانہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکا''۔

(جہدِ مسلسل۔ مجموعہ تقاریر)

ملت کے افراد کی ذہنی اور فکری تشکیل کا کام نہایت حکیمانہ انداز میں انجام دیتے ہیں۔ مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں، ان کی ذمہ داری اور ان کے فرض سے آگاہ کرتے ہیں مغرب کی ناقابل تقلید

باتوں پر عمل پیرا ہونے اور مخرب اخلاق باتوں سے اجتناب کو بے حد ضروری قرار دیتے ہیں۔ مغرب کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کو اُجاگر کرنے پر زور دیتے ہیں" آپ کو یہاں سے واپس جا کر اپنے بھائیوں کو بتانا ہے کہ مغرب کے پاس کیا خوبیاں ہیں، اس کی قوت کا کیا راز ہے اور اُن کی زندگی کے کون سے پہلو قابل تقلید ہیں؟ اس طرح مغرب کی کون کون سی بیماریاں ہیں جو اس کے درخت کو گھن کی طرح کھاتی جارہی ہیں وہ کس اخلاقی جذام میں مبتلا ہے ہمیں اس کی کن کن چیزوں سے پرہیز کرنا ہے اور اُس کی کون کون سی چیزیں ہیں جن میں مشرق کو اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں"۔

(مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں۔ص:۵۸)

مصر کے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ قیادت کے منصب کو سنبھالیں اور یورپ کو ایمان اور اخلاق کی تعلیم دیں۔ "اسمعی یا مصر" تقریر میں اہل مصر کو ان کا فرض یاد دلاتے ہیں۔

"آپ دونوں ثقافتوں کے سنگم ہیں، ایشیا اور عرب ملکوں کا آپ پر حق یہ ہے کہ آپ یورپ کے علم اور تجربات اِن مشرقی ملکوں میں منتقل کریں آپ اپنی ذمہ داری سے اُس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہوسکتے جب تک آپ اُن کے علوم، ان کی عملی سرگرمیوں، جدوجہد اور طریقہ کار سے ان مشرقی عرب ممالک کو باخبر نہ کردیں۔

اور یورپ کی بھی ذمہ داری آپ پر ہے اور اس ذمہ داری سے آپ اسی وقت عہدہ برآ ہوں گے کہ جب آپ جزیرۃ العرب کے پیغام اسلام کو اُن ملکوں میں پہنچائیں اور جن مشکلات نے یورپ کے بڑے بڑے مفکرین کو عاجز کردیا ہے اُن کا اسلامی حل ان کے سامنے پیش کریں...... یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ یورپ نے آپ پر جو احسان کیا ہے اس سے بڑا یورپ پر آپ کا یہ احسان ہوگا۔

(العرب والاسلام۔ص:۳۱)

مسلمان نوجوانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:" دنیا کی سعادت و

کامرانی تک پہونچنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے پُل تعمیر کریں اس پُل سے دنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے۔ زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ وبار لاتی ہے، انفرادی خواہش وہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اللہ کی زمین میں امن وسلامتی پھیلانے کے لیے قربان کریں۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ص:۳۲۴)

علی میاںؒ نے اپنے دعوتی اور فکری سفر میں قرآن، حدیث، ادب اور تاریخ کو پیشِ نظر رکھا، صالح اسلامی معاشرے کی تشکیل میں قرآن وحدیث کو بنیادی کردار کی حیثیت قرار دیا، طلبہ کو علومِ اسلامیہ میں بصیرت پیدا کرنے، مہارت حاصل کرنے کی تلقین کی۔

''قرآن مجید اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اب بھی زندگی اور طاقت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے عالمِ اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے، ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہلی دنیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ اُبھرتا ہے اور ان کی تاثیر سے ایک اونگھتی سوتی قوم ایک پُرجوش، بےچین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے، ان کے اثر سے اگر ان کو اثر کرنے کا موقع دیا جائے، پھر ایک بار ایمان اور نفاق، یقین اور شک، وقتی فوائد اور مستحکم عقائد، موقع پرست ذہنیت اور حق پرست ضمیر، عقل مصلحت بیں اور عشق مصلحت سوز کے درمیان معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے، پھر جسمانی راحت اور قلب کے سکون، تن آسانی کی زندگی اور شہادت کی موت کے درمیان کشمکش پیدا ہوتی ہے، وہ مبارک کشمکش جو ہر پیغمبر نے اپنے اپنے وقت میں پیدا کی تھی اور جس کے بغیر حق وباطل کا فیصلہ اور اس دنیا کی اصلاح وانقلاب کا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ص:۴۰۶)

علی میاںؒ نے دعوتی کاموں میں اخلاص کے ساتھ معیار کی بلندی اور اسلوب

کو بنیادی اہمیت دی، زمانہ کے تقاضوں سے باخبری اور انسانی نفسیات کی رعایت کے ساتھ ساتھ خوداعتمادی کو اشد ضروری قرار دیا۔ حاملین علومِ نبوت کو خودشناسی، خودداری، خوداعتمادی کا سبق یاددلاتے ہوئے فرماتے ہیں ''آپ کے پاس جو دولت ہے اس سے دنیا کا دامن خالی ہے۔ آپ کے سینے میں علوم نبوت ہیں اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں اور جن کے گم ہونے سے آج عالم میں اندھیرا ہے، اضطراب ہے، انتشار ہے، شروفساد ہے، آپ اپنے ان سادہ کپڑوں ان حقیر جسموں اور اس خالی جیب اور دامن پر نظر نہ کریں۔ آپ دیکھیں کہ آپ کا سینہ کن دولتوں سے معمور ہے اور آپ کے اندر کیسا بدرِ کامل مستور ہے''۔ ایک اور موقع پر عہد حاضر میں طلبا کو ان کی ذمہ داریاں یاددلاتے ہوئے نصیحت کی: ''زمانہ کا دامن پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے وہ حالات کے مطابق، لوگوں کی استعداد کے مطابق نئے سیاسی تغیرات اور تبدیلیوں کے مطابق ہر دور میں رہنمائی اور رہبری کا طالب ہوتا ہے سوچنے کے طریقے اور مطمئن کرنے کی صلاحیت اتنی مختلف ہوگئی ہیں کہ ان میں قدیم طرز کی بالکل تقلید نہیں کی جاسکتی...... آج زمانہ بہت سی نئی چیزوں، ان چیزوں سے بہت زیادہ نازک اور اہم چیزوں کا طالب ہے، جن کا وہ ہمارے اسلاف سے طالب تھا...... کسی چیز کا تسلسل زمانہ کے لیے بالکل کافی نہیں ہے وہ ایسا حقیقت پسند بے مروّت اور اتنا غیر جانب دار ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ میں کوئی نئی چیز نہ دی جائے اور اس کی گردن کو کسی بوجھ سے ایسا بوجھل نہ کردیا جائے کہ وہ جھکنے پر مجبور ہو، اس وقت تک وہ کسی کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس لیے زمانے کو اعتراف پر مجبور کرنے، اپنی فوقیت کا نقش قائم کرنے، مناسب اور شایانِ شان مقام حاصل کرنے کے لیے آپ کو بڑی جدوجہد کرنی ہوگی''۔

(پاجا سراغ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۷۸تا۸۵)

دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار کیوں ہے انسانیت کی بربادی کے اسباب کیا ہیں؟ جدید تہذیب اور فکری قیادت کی کمزوریوں پر گرفت کرتے ہیں۔

''ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت معاشرہ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد پیدا کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرسکتی ہے، وہ خلا میں سفر کرنے کے لیے محفوظ اور سریع الاثر آلات تیار کرسکتی ہے انسان کو چاند اور ستاروں پر پہنچا سکتی ہے وہ ذرّاتی طاقت سے بڑے سے بڑا کام لے سکتی ہے۔ وہ ملک سے غریبی کو دور کرسکتی ہے وہ پوری کی پوری قوم، ایک ملک کی آبادی کو خواندہ اور تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے ہے اس کی ان کامیابیوں اور فتوحات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں، وہ صالح اور صاحبِ یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے یہی اس کی سب سے بڑی ناکامی اور بدقسمتی ہے اس وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع اور برباد ہو رہی ہیں اور ساری دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار ہے''۔

(اسلام اور مغرب۔ ص:۶۳)

علی میاںؒ دینی تعلیم میں اُس اسلوب فکر کے حامی تھے جس سے طالب علم اپنے عہد کے فتنوں سے واقف ہوسکے اور اُن میں فتنوں کا مقابلہ کرنے، دین کی ترقی اور بہبودی کے لیے اعلا صلاحیت پیدا ہو۔ ''آپ اسلام کو اچھی طرح سمجھیں اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ قرآن اور سنت اور سیرتِ نبوی کا مطالعہ کریں، یہ سمجھ کر قرآن پڑھیں کہ جیسے ابھی اُترا ہے اور آپ ہی کے لیے اُترا ہے اس طریقہ سے تلاوت سے آپ کا صحیح مطلب اخذ کرسکیں گے اور اس میں آپ کو مزہ آئے گا آپ روحانی اور اخلاقی تربیت کا بھی خیال رکھیں، فرائض کی پابندی کریں اور اخلاقی آزادی سے بچیں، نیز اوقات کو ضائع کرنے سے پرہیز کریں اور مہمل باتوں سے دور رہیں، آپ کے لیے ہمہ وقت یہ سوچتے رہنا بھی ضروری ہے کہ جب آپ یہاں سے اپنے وطن واپس جائیں گے تو اس دینی خدمت کو کیسے کریں گے آپ ابھی سے اس کے لیے تیاری کریں۔ اس تیاری کے وسائل میں سے مختلف اسلامی ممالک کی دینی تحریکوں، مجددین کی تاریخ اور تعلیم کے خاکوں اور تحریک دعوت کے طرز اور اسلوب سے واقفیت پیدا کریں اور یہاں کے

زمانہ قیام میں اس کی مشق کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ صرف علم ومطالعہ ہرگز کافی نہیں جب تک اس کے ساتھ کوئی پیغام، فکر، مقصد، روح اور دینی رجحان نہ ہو اور یہ بات ان غیر رسمی مجلسوں اور ان شخصیتوں کے بغیر ممکن نہیں ہوتی جو فی سبیل اللہ اس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔''

علی میاںؒ نے بار بار اِس اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ''مغربی تعلیم سے آراستہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کی ابدی قیادت کی صلاحیت پر اعتماد بحال کرنا وقت کا سب سے اہم اور بنیادی تقاضہ ہے۔

''جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دل ودماغ میں اسلام کی قیادت کی صلاحیت اور ہر زمانہ میں نوع انسانی کی رہنمائی کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ جدید مغربی تعلیم نے اس طبقہ کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے۔ اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے کچھ کام کیے تھے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم ختم کر دی تھی، تعلیم کو اس نے عام کر دیا تھا۔ اس ترقی یافتہ دور میں اب اسلام کی کوئی ضرورت نہیں۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے سب سے پہلے علی میاںؒ کا تحریر کردہ رسالہ ''نیا طوفان اور اس کا مقابلہ'' شائع ہوا۔ اُنھوں نے ہمیشہ مغربیت کے اس مضر پہلو کو کہ وہ مذہب کو زندگی سے علیحدہ کرتا ہے بہت خطرناک قرار دیا۔ علی میاںؒ نے اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا کہ مغربیت کا یہ پہلو مغربی تعلیم کی وجہ سے خاصا عام ہونے لگا ہے، چنانچہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہن سازی کو اہم اور ضروری قرار دیا ہے۔

> ''آج کا جہاد، وقت کا فریضہ اور عصر حاضر کی سب سے بڑی دینی ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے جو عالمِ اسلام کے سر سے گزر رہی ہے، نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اُس کے قلب ومرکز پر حملہ کیا جائے، وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں

اسلام کے احساسات وعقائد، اس کے نظام وحقائق اور رسالت محمدیؐ پر وہ اعتماد واپس لایا جائے جس کا رشتہ اس طبقے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے اور اس کی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل ودماغ میں گھر کر گئے ہیں ان سے علم اور عقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں۔

یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے۔ شک والحاد، نفاق و ارتیاب کا ایک طوفان ہے جو اس نے ہمارے دل اور دماغ میں برپا کر رکھا ہے...... اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ لادینی مزاج، اندازِ فکر ادب وثقافت اور صحافت وسیاست کے راستے سے جمہور تک پہونچ چکا ہے...... مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانہ کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے''۔

('نیا طوفان اور اس کا مقابلہ'، ص: ۲۹ تا ۳۱)

علی میاںؒ اسلام پر فخر وناز کی نفسیات پیدا کرنے، جدید نوجوان طبقے میں دینی روح پھونکنے، فکری ارتداد اور اس کے بھیانک نتائج کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ کیوں کہ آج کا دور عقل ودلیل اور حجت کا دور ہے، کسی فکر اور فلسفہ یا نظریۂ حیات کو بزور جبر قبول نہیں کرتا، دلیل وحجت کے ساتھ ثابت کرنے پر قبول کرتا ہے۔ ۱۸ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے

طلباء کے سامنے ناصحانہ، عالمانہ اور فکر انگیز تقریر کی۔ جس میں انگریزی زبان اور مصنّفین، کے اسالیب سے واقفیت کی تلقین کی۔

''بلادِ عربیہ میں اس وقت وہی طبقہ برسرِ اقتدار ہے جو یورپ اور امریکہ کا تعلیم یافتہ ہے اس لیے ایسی صورت میں ہمیں اس کی خاص طور سے تیاری کرنی ہوگی کہ ایسا لٹریچر تیار کریں جو تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کرے، ہر دور میں اسلام کی مکمل رہنمائی اور قیادت کی صلاحیت پر ایمان ان کے دل و دماغ میں راسخ کر دے۔ اس طبقہ کو مطمئن کرنے کی تیاری بھی آپ کے ذمہ ہے آپ حالات و رجحانات کا برابر محاسبہ کرتے رہیے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طبقہ کون سی زبان سمجھتا ہے کون سے دلائل اس کے سامنے پیش کرنا چاہیے کس اسلوب میں اس سے گفتگو کرنا چاہیے''۔

ایسے لٹریچر کے لیے جس میں تحریر کی قوت اور کلام کی تاثیر ہو، علی میاںؒ لکھنے والے کی اندرونی کیفیت کو مؤثر، اہم اور ضروری قرار دیتے ہیں۔

''ادب اور انشاء کے سلسلے میں عام مؤرخ اور نقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام و بقائے دوام کے لیے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیت، اس کا یقین، دلی جذبہ کسی حقیقت کے اظہار کے لیے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے۔ ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لیے مضطرب اور بے قرار ہو جب قدرت کی طرف سے ذوقِ سلیم بھی عطا ہو اور اس کی تحریر میں علم و ادب، عقل و استدلال اور حسنِ بیان کے ساتھ، سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا اثر ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد بھی اس کی تاثیر اور قوت تسخیر قائم رہتی ہے''۔

(تاریخ دعوت و عزیمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ج:۳، ص:۲۴۲۔۲۴۳)

امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو ملّی تشخص کی حفاظت اور دعوتی منصب اور ذمہ داری کو یاد رکھنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

''قبل اس کے کہ میں امریکہ کی سرزمین کو خیرباد کہوں میں آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ آپ اس تہذیب سے مرعوب نہ ہوں آپ جس درخت کے پھل ہیں وہ نبوت کا درخت ہے۔ آپ یہاں رہیں لیکن آپ تہذیب کے غلام نہ بنیں۔ آپ شوق سے یہاں فائدہ اُٹھائیں۔ لیکن آپ اس مادّیت سے مرعوب نہ ہوں آپ اپنا پیغام یاد رکھیں آپ اپنی شخصیت کو تحلیل نہ ہونے دیں''۔

(نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں۔ ص:۲۶)

علی میاںؒ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے نا اُمید نہیں، بلکہ اس طبقہ کو اُمید کی روشنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اپنی مخصوص عصری تربیت اور جدید صلاحیتوں کی بناء پر قیادت و رہنمائی کے منصب پر فائز ہے اپنی ان تمام کمزوریوں اور مزاج کے باوجود جو مغربی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، سلامت فکر اور قبولِ حق کی استعداد و صلاحیت سے محروم نہیں بلکہ عام طور پر وہ قوتِ فیصلہ، قوتِ عمل اور حقیقت پسندی میں بعض دوسرے طبقوں سے بھی ممتاز ہے اس طبقہ کے بہت سے افراد جب کسی بات کو صحیح اور حق سمجھ لیتے ہیں تو بڑے جوش اور انہماک کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہو جاتے ہیں، اس طبقہ میں بکثرت ایسے افراد پائے جاتے ہیں جن کو اسلام سے گہرا تعلق اور سچا عشق ہے۔ اس طبقہ سے اسلام کو بعض بڑے صحیح الخیال اور عمیق النظر مفکر، اسلام کے شیدائی اور سرفروش مجاہد حاصل ہوئے، بہت سی دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکات کو اسی طبقہ سے پُرجوش داعی اور باعمل سپاہی ملے، مشرق وسطیٰ میں سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ، شیخ حسن بناء کو اور ہندوستان میں تحریکِ خلافت سے لے کر عصرِ حاضر تک کی تمام دینی تحریکات کے قائدین کو اسی طبقہ میں سے اپنے بہترین کارکن ہاتھ آئے، اب بھی اگر دین کے داعی بے لوث اور مخلصانہ طریقہ پر اس طبقہ کو دین سے مانوس رکھنے کی کوشش کریں، ان کے ذہن کی

اُن شکنوں کو دور کریں جو مغرب کی مخصوص مزاج کی تعلیم نے ڈال دی ہے، اور ایمان کی اِس چنگاری کو متحرک کرنے میں کامیاب ہوجائیں، جو اَب بھی اُن کے دل و دماغ کے اندر دبی ہوئی ہے، تو اب بھی اس طبقہ میں اقبالؔ اور محمد علی جوہر جیسے صاحبِ فکر و صاحبِ عمل افراد پیدا ہوسکتے ہیں۔ یہ دین کے داعی کے لیے ایک ایسا حیرت انگیز لیکن مسرت بخش انکشاف ہوگا کہ اُس کی زبان سے بے اختیار نکلے گا۔

''ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی''

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:۲۷۵)

علی میاںؒ نے مادّی تہذیب، مغربی فکر و فلسفہ کا تجزیہ کیا اور آزادانہ اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔

''اسلامی ممالک مغرب کی غلامی سے اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتے جب تک ''آزادانہ اسلامی نصاب اور نظامِ تعلیم'' نہ اپنایا جائے۔ کیونکہ مغربی ملکوں سے درآمد نظامِ تعلیم سے تیار ہونے والی نئی نسل کشمکش اور تضاد کا شکار ہوجاتی ہے۔ بے یقینی، خوف، دہشت اور ذہنی انتشار بے اعتمادی کی فضا میں رہتی ہے...... یہ مسئلہ عالمِ اسلام کا اہم مسئلہ ہے اور اس کا حل وقت کی اہم ضرورت اور مسلمانانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے...... اس مسئلہ کا حل خواہ کتنا ہی دشوار نظر آرہا ہو اور صبر آزما، وقت طلب ہو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو ازسرِ نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادّیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی اور روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے بجائے تقویٰ الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری و ساری کردی جائے۔ اس مقصد کے لیے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک علومِ عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنا ہوگی، مغرب کی ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی

قیادت وامامت سے انکار کرنا پڑے گا اس کے علوم ونظریات پر علمی تحلیل وتجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانی تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا۔ اس کے علوم کے ساتھ موادِ خام کا معاملہ کرنا ہوگا اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنا ہوں گی جوان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات، رجحانات اور ان کے عقیدے وتہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔ اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہوسکتے ہیں لیکن یہ تجدد پسندی، آزاد خیالی اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے جس نے عالمِ اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے اور اسلام کے فکری واجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہے"۔

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص: ۲۵۲۔۲۵۳)

وقت کے ہر چیلنج کے مقابلے کے لیے نوخیز نسلوں کی تعلیم وتربیت اور اس کے صحیح طریقہ کار کی طرف رہنمائی کرتے ہیں "ہر دور کا ایک بڑا چیلنج رہا ہے اور بزرگانِ دین نے ایسے چیلنجوں کا مقابلہ ہمت وحکمت سے کیا ہے، آج کے دور کے دنیائے اسلام میں سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا دینِ اسلام پر بحیثیت ایک زندہ کامل دین کے اعتماد کو بحال کیا جائے...... چنانچہ کرنے کا بہت اہم کام یہ ہے کہ اس طبقہ تک رسائی حاصل کی جائے اور اس کے علمی معیار کے مطابق اس کا اعتماد اسلام پر بحیثیت ایک زندہ ومکمل ضابطۂ حیات کے بحال کیا جائے...... اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمان بچوں کے تعلیمی نصاب و نظام کی تطہیر کی جائے اور اس میں اسلامی تعلیمات واقدار ودینی تربیت اس طرح شامل کی جائے کہ آج کا مسلمان نوجوان علوم جدیدہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک مخلص اور دیانت دار سفیر وسپاہی بھی بن جائے اس کام کی طرف سے اسلامی تحریکوں اور مخلص کارکنوں نے اب تک صرف نظر کیا ہے، اس کام کے نتیجے میں ایسی

تعلیم یافتہ مسلمان نسل وجود میں آئے گی جو دینی تعلیم وتربیت اور حمیت سے آراستہ ہو اور پھر یہ نسل اسلام کو اپنی انفرادی زندگیوں میں مکمل طور پر نافذ کرنے کی کوشاں ہو۔
(کاروانِ زندگی حصہ پنجم۔ص:۲۵۳)

اگست ۱۹۹۶ء میں نوٹنگھم (برطانیہ) میں لڑکیوں کی ایک دینی درس گاہ کے افتتاح کے موقع پر نظامِ تعلیم ونصابِ تعلیم کی اہمیت اور افادیت سے آگہی کے ساتھ وقتاً فوقتاً اصلاحی اور تعمیری، تبدیلیوں کے عمل کو ضروری قرار دیا ''نصابِ تعلیم ایسا ہو جس میں دعوتی اسلوب اپنایا جائے، اسلامی تعلیمات اور خصوصیات کا ترجمان ہو، نئی نسل کو ذہنی ارتداد سے بچانے کا کام کر سکے، زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اسی میں اصلاحی وتعمیری تبدیلیاں لائی جاتی رہیں۔

علی میاںؒ نے بلاتفریق مذہب وملت ہندوستان کے تمام باشندوں کو پیامِ انسانیت کا درس دیا، ملک کے حالات کا جائزہ لیا، خطرات اور اندیشوں سے آگاہ کیا، وہ ملک وملت کو خوش حالی اور کامیابی کے راستے پر لے جانے کا پختہ عزم رکھتے تھے۔

''تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم کا اخلاقی زوال پہلے شروع ہوتا ہے سیاسی زوال بعد میں آتا ہے۔(یونان، رومۃ الکبریٰ، سلطنت ساسانیہ، قدیم ہندوستان اور اسلامی سلطنتوں کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) ہمارے ملک کے ذمہ داروں، سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں دانش گاہوں کے سربراہوں، ملک کے اربابِ حل وعقد اور دانشوروں کو پوری حقیقت پسندی، وسیع النظری سے ملک کے حالات کا جائزہ لینا چاہیے، اور اس مہیب اخلاقی زوال سے لرزہ براندام ہوجانا چاہیے، جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ اس ملک میں صرف پیسہ، عہدہ، ذات، برادری اور سیاسی مقاصد کی تکمیل ہی حقیقت ہے، باقی صرف فلسفے اور مذہبی لوگوں کی سادہ لوحی اور واعظوں کی لفاظی ہے پھر اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں راس کماری سے لے کر سری نگر تک یہ آواز بلند کرنے والا کوئی

نہیں، یہ کہنے والا کہ اخلاق درست کرو، انسانیت کا سبق پڑھو، ملک کو بچاؤ کوئی نہیں، یہ کہنے والے ہزار ہیں کہ ہماری پارٹی میں آؤ فلاں کی قیادت تسلیم کرو، اس کا شکوہ نہیں کہ جو کچھ ہورہا ہے غلط ہورہا ہے، سب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے ہمارے جھنڈے کے نیچے اور ہمارے زیر اقتدار ہو۔

(تحفۂ دکن۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۴۷)

علی میاںؒ تاحیات ملک وملت کی اصلاح کے لیے فکر مند رہے۔ ''روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ یہ ملک تیزی کے ساتھ اخلاقی انارکی، بلکہ قومی اور اجتماعی خودکشی کی طرف جارہا ہے، اخلاقی قدریں بے دردی کے ساتھ پامال کی جارہی ہیں، خودغرضی بلکہ خود پرستی کا جنون (ان افراد کو مستثنیٰ کر کے جن پر مذہب واخلاق کی کسی وجہ سے گرفت مضبوط ہے یا جو زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہیں) سب پر سوار ہے، انسان کی جان ومال، عزت اور آبرو کا احترام تیزی کے ساتھ رخصت ہورہا ہے، حقیر شخصی فوائد کے لیے اجتماعی وملکی مفاد کو آسانی سے قربان کر دیا جاتا ہے، کام چوری، احساسِ ذمہ داری کا فقدان، رشوت خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، بدعنوانی یہ سب اسی درخت کے پھل ہیں اور انھوں نے پوری زندگی کو عذاب بنادیا ہے اور ان کی وجہ سے ملک کے آزاد وبااختیار ہوجانے کے بعد بھی اس میں جینے اور آزادی سے فائدہ اُٹھانے کا مزہ نہیں رہا''۔

بلاتفریق مذہب وملت اپنے ہم وطنوں سے خطاب کرتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی روشنی میں اپنے عزیز ملک اور اس کے معاشرے کی فکر اور ذمہ داری کا احساس دلاتے ہیں۔ ''اس وقت ہندوستان کو آپ کی ذہانت، آپ کی قانون دانی، آپ کی محنت، آپ کی شرافت کی بے حد ضرورت ہے، یوں سمجھیے کہ ایک کشتی، ایک ناؤ طوفان میں پھنس گئی ہے، خوفناک لہریں منہ کھولے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی ہیں، اس کشتی میں کچھ کمزور لوگ سوار ہیں، کشتی ڈوبنے کے بالکل قریب ہے، ایسے وقت میں کوئی ایسا ملاح، ایسا

کھیون ہار آجائے جو اس کشتی کو پار لگادے تو وہ بڑا محسن ہوگا۔ آج ہمارا ملک، جس پر ہم کشتی کی طرح سوار ہیں، اس میں سوراخ کیا جارہا ہے، اگر یہ کشتی ڈوب گئی تو اچھے اور برے، پڑھے لکھے اور ان پڑھ، غریب اور مالدار، چھوٹے اور بڑے، بچے اور جوان سب ڈوب جائیں گے، ہمارے پیغمبر ﷺ نے کشتی کی مثال دے کر یہ بات فرمائی ہے اگر نیچے کے حصے کے لوگ اس میں سوراخ کریں تو اوپر کے لوگوں (Upper Class) کو تماشائی نہیں بننا چاہیے اس لیے کہ کشتی ڈوبی تو وہ بھی نہیں بچیں گے۔...... ہماری سوسائٹی کرپٹ (Currupt) ہورہی ہے پوری سوسائٹی میں مختلف نشتر سے سوراخ کیا جارہا ہے''۔

علی میاںؒ نے کامیاب زندگی، خوش اسلوب معاشرے اور محفوظ وباعزت ملک کی بنیادی شرطوں کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ''شریفانہ انسانی زندگی گذارنے کا بنیادی فن خداترسی، انسان دوستی، ضبط نفس کی ہمت اور صلاحیت، ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی عادت، انسانیت کا احترام، انسانی جان ومال، عزت وآبرو کے تحفظ کا جذبہ، حقوق کے مطالبہ پر ادائے فرض کو ترجیح، مظلوموں اور طاقتوروں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ، ان انسانوں سے جو دولت ووجاہت کے سوا کوئی جوہر نہیں رکھتے، عدم مرعوبیت وبے خوفی، ہر موقع پر اور خود اپنی قوم اور اپنی جماعت کے مقابلہ میں کلمۂ حق کہنے کی جرأت، اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور ترازو کی تول، کسی دانا بینا طاقت کی نگرانی کا یقین اور اس کے سامنے جواب دہی اور حساب کا کھٹکا، یہی صحیح خوشگوار وبے خطر اور کامیاب زندگی گذارنے کی بنیادی شرطیں ہیں، ایک اچھے، خوش اسلوب معاشرہ اور ایک طاقتور ومحفوظ وباعزت ملک کی حقیقی ضرورتیں اور اس کے تحفظ کی ضمانتیں ہیں''۔

علی میاںؒ نے ''ترشید الصحوۃ الاسلامیہ'' میں اسلامی تحریکات اور بیداری کے لیے کچھ رہنما اصول بھی بتائے ہیں ''اس محاضرہ میں دو ذیلی عنوانات ہیں ''نازک امانت'' اور ''بیداری اسلام کی فطرت ہے'' اس کے بعد اسلامی تحریکات میں

حصہ لینے والوں کے لیے حسب ذیل پہلوؤں اور گوشوں کی اہمیت واضح کی گئی ہے جس میں (۱) اسلامی عقائد کے ساتھ کامل ہم آہنگی (۲) دینیات کے وسیع مطالعہ کی ضرورت (۳) زمانے اور مشکلات و مسائل کا فہم وادراک (۴) زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کے نتائج (۵) اوّلین اسلامی معاشرے کا امتیاز (۶) جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت (۷) غیر ضروری مسائل ومشکلات سے اجتناب کی ضرورت (۸) جاہ ومنصب سے بے نیازی (۹) جرأت وشجاعت اور قربانی کا جذبہ وشوق شامل ہیں۔

(کاروانِ زندگی حصہ پنجم۔ص:۴۸۔۴۹)

علی میاںؒ اس بات کے پُرزور داعی ہیں کہ اس وقت زمانے کو ایسے مردانِ کار کی ضرورت ہے، جو اس نئے دور کو ایک نئی فکری قیادت ایک نیا دینی اعتماد، ایک نئی روحانی واخلاقی قوت عطا کر سکے جو طاقتور، باخبر، صالح اور مصلح ہو، اعتدال وتوازن قائم رکھ سکے۔

''ضرورت کی حد تک اور انسانیت کے مفاد اور نیک مقاصد کے لیے اسلام، زندگی، کائنات اور علم کی راہ میں جدوجہد کو نہ صرف جائز قرار دیتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کی ترغیب بھی دیتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے طاقتور، باخبر وہوشمند اور صالح و مصلح مومن کی مثال دی ہے، جو کائناتی و مادّی طاقتوں کو مسخر بھی کرتا ہے اور اسباب و وسائل کا ذخیرہ بھی جمع کرتا ہے اور اپنی فتوحات اور مہمات کا دائرہ بھی برابر وسیع کرتا رہتا ہے، لیکن اپنی طاقت، سلطنت اور قیادت کے شباب میں بھی اور ظاہری اسباب پر تصرف کے بعد بھی اپنے رب پر ایمان رکھتا ہے، اپنے ضعف کا معترف ہے، انسانیت اور کمزور قوموں پر رحمدل اور حق کا حامی ہے، اور اپنی ساری قوت، جدوجہد، صلاحیتیں اور اپنے سارے وسائل اور ذخائر، اللہ کے نام کی بلندی اور انسانوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف اور انسان کی بندگی سے اللہ کی بندگی کی طرف بلانے میں صرف کرتا ہے، یہ وہی سیرت اور کردار ہے جس کی نمائندگی سلیمان بن داؤد علیہ السلام، ذوالقرنین اور خلفائے

راشدین اور ائمہ اسلام نے اپنے اپنے زمانہ میں کی ہے''۔

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ص: ۲۸۰۔۲۸۱)

''علی میاںؒ کی تصنیفات کو پڑھنے والا یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ وہ ثقافتِ اسلامیہ کے سرسبز چمن کے تازہ اور پختہ ثمر ہیں، ان کی شخصیت ان تمام علوم کی جامع ہے اور یہ سب علوم ایک دائرے، ایک اکائی میں ہیں، علی میاںؒ ان کے درمیان تفریق پر یقین نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک اسلامی داعی کی حیثیت سے غور وفکر کرتے اور نتائج اخذ کرتے ہیں''۔اُن کی تقریر وتحریر میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ تاریخ گذشتہ اقوامِ عالم کا آئینہ ہے، عروج وزوال کے اسباب اس میں موجود ہیں اس لیے کوئی بھی عروج وزوال اتفاقی طور پر واقع نہیں ہوتا، یہ وہ قوانین کائنات ہیں جن کا تعلق اقوامِ عالم کے اعمال واخلاق سے ہے، علم قرآن اور حدیث اسلامی شریعت کے سرچشمہ اوّل ہیں جو انسانی زندگی کے عروج وزوال کے اسباب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں''۔

علی میاںؒ نے علوم عربیہ کے ساتھ علوم ادبیہ میں، مہارت حاصل کرنے کا پیغام دیا، اور اسی کو حقائق کے افہام وتفہیم کا اصل وسیلہ اور ذریعہ بتایا، نئی نسل کی تربیتی پہلو پر خاص توجہ دی، اُن کے فکر وفلسفہ میں دعوت، اصلاح، تعلیم وتربیت اور اتحادِ ملت کے پہلو مرکزی حیثیت رکھتے ہیں صالح نسل کی تعمیر وتشکیل کے لیے صالح معاشرے کا قیام ضروری قرار دیتے تھے۔ وہ تعلیم وتربیت کے میدان میں اسلامی پس منظر اور عمیق تجربات اور وسیع علم رکھتے تھے۔ اسلامی ممالک میں تعلیم وتربیت کے نظام کو اہم قرار دیتے تھے۔ (مغرب کی ذہنی غلامی سے آزادی کے لیے'' آزادانہ نصاب ونظامِ تعلیم'' کو اپنانے پر زور دیتے تھے) عالمِ اسلام میں نظامِ تعلیم کے غیر ملکی مشیروں کے کام کو'' زہر آلود سرچشمے'' سے تعبیر کرتے تھے، اس نظامِ تعلیم کے عظیم نقصانات سے آگاہ کرتے تھے۔ ''اربابِ اقتدار نے اپنے تعلیمی پروگراموں اور علمی اداروں میں غیر ملکی متخصصین اور مشیروں کو منصوبہ سازی کے لیے مدعو کیا، یہ لوگ اپنے ملکوں سے نہ صرف نصاب تعلیم لائے بلکہ اُنھوں نے تعلیمی

نظریات اور تربیتی تصورات کو بھی بر آمد کیا۔ طلباء کو مغربی ممالک میں تعلیم وتربیت کے لیے بھیجا گیا۔ پروگراموں کی منصوبہ سازی اور تعلیمی موقف کے وضع کرنے میں مکمل آزادی کے نتیجہ میں ایسا طبقہ وجود میں آگیا جس کے عقائد وافکار اور اخلاق متزلزل تھے اس طبقہ کے لوگ مغربی افکار اور اسلامی افکار کے درمیان کشمکش کا شکار ہو کر رہ گئے''۔

علی میاںؒ کی دوربیں نگاہ اور ذکاوت حس، ملت اسلامیہ کی نئی نسل کے مستقبل کے بارے میں نہایت باوزن اور معنی خیز فیصلے صادر کرتی ہے۔ ''نئی نسل خواہ وہ ہمارے ملک، ہندوستان میں ہو یا عالم اسلام میں وہ غیر ملکی انتقالی مرحلے سے گزر رہی ہے اس نسل نے غیر ملکی افکار کے تلخ جام پیے ہیں اور غیر اسلامی نظام کے سائے میں زندگی گزاری ہے جتنے بھی غیر اسلامی نظام ہیں وہ سب اپنا سامانِ تقویت مغربی تہذیب سے لیتے ہیں سب کا منہج، منبع اور طریق کار ایک ہے صورتیں مختلف ہیں غیر ملکی نظام خشک اور کھوکھلا ہونے کے باوجود موجودہ نسل کو اپنی گمراہی سے مطمئن کرنے کا کام بہتر انداز میں کرتا ہے لیکن مغربی تہذیب، مسلمانوں کو پیغام سعادت دینے میں ناکام ہو چکی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب جب بھی انسانی نسل پر فکری یلغار ہوئی دعوتی میدان کے عالی ہمت، اولوالعزم مجاہدوں نے غیر ملکی نظام کی لعنتوں کو بے نقاب کیا اور ان کے طریق کار پر تنقید کی اور کامیابی حاصل کی۔ اسلامی قائدین اور مفکرین کے لیے سب سے ضروری کام یہ ہے کہ وہ انسانی نسل کے دلوں کی تربیت ونگہداشت بہتر انداز سے کریں کیونکہ مغربی تہذیب کی رسوائی آشکارا ہو چکی ہے۔ مسلمان کے دل میں دینی جذبہ کو اُبھاریں اور قرنِ اوّل کے نہج پر دلوں میں ایمان بالآخرت کو مضبوط اور مستحکم کریں اور اس کام کے لیے وہ جدید وقدیم وسائل کو مکمل طور پر استعمال کریں، نشر واشاعت کے ذریعہ تعلیمی طریقے اور مادّی تیاریوں کی جتنی بھی راہیں کھلی ہیں ان کا بھرپور استعمال کریں، اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے عصری اسلوب میں مفید لٹریچر تیار کیا جائے، نوجوانوں کی تربیت کی جائے، اُن کے اور اصحابِ دل کے درمیان رابطے کو مضبوط

کیا جائے، اسلام اور غیر مسلموں کے درمیان جو گہری خلیج ہے، اسے پُر کیا جائے۔ جو لوگ اسلامی حقائق سے ناواقف ہیں انھیں واقف کرایا جائے۔''

علی میاںؒ اس بات کے پُر زور داعی تھے کہ قرآن کریم اور سیرت نبوی ﷺ یہ دونوں ایسے سرچشمہ حیات ہیں جن سے ایمانی غیرت کو بھڑکایا جا سکتا ہے۔ کلام اللہ اور سیرۃ النبی نے تاریخ کے ہر دور میں بے یارومددگار امت کو زندہ اور طاقتور اُمت بنانے میں کامیاب انقلاب برپا کیا ہے، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ علمائے اسلام اور مفکرین ملت مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں مغربی تہذیب کے ناکامی کے پہلو کو سامنے رکھیں۔ عصری اسالیب میں ان حقیقتوں کو نشر کیا جائے اور اسوۂ حسنہ کے مطابق تربیت کے فرائض کو انجام دیا جائے تاکہ گمراہی کا خاتمہ ہو، صالح اسلامی نظام و معاشرے کی تشکیل ہو اور اسلام کی عظمت اور حکمت سامنے آئے۔

......☆......

قرآن مجید کے فہم کا اصل دروازہ تب کھلتا ہے جب آدمی بغیر کسی انسانی حجاب کے، اس کلام کے ذریعہ صاحب کلام سے ہم کلام ہو۔ اس کا راستہ قرآن کریم کی بکثرت تلاوت اور ان بندگان خدا کی صحبت ہے جو اس کتاب کے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں اور جن کے رگ و پے میں یہ کلام بس گیا ہے، ضرورت اِس کی ہے کہ پڑھنے والا اس کلام سے براہ راست تعارف و انس حاصل کرے اور اُس کو ایسا محسوس ہو کہ وہ براہ راست مخاطب ہے شاعر محمد اقبالؔ نے غلط نہیں کہا کہ

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؒ نہ صاحب کشافؒ

(مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ)

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت وسوانح نگاری، تذکرہ نویسی

(سیرت سید احمد شہیدؒ سے کاروانِ زندگی تک)

علی میاںؒ کی تحریری وتصنیفی زندگی کا آغاز تذکرہ نویسی، سیرت اور سوانح نگاری سے ہوا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے ایک مضمون کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ مضمون سید احمد شہیدؒ کی سیرت وسوانح پر تھا، جو عربی کے مشہور رسالہ ''المنار'' قاہرہ میں شائع ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں ان کی پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ منظر عام پر آئی۔ یکے بعد دیگرے اہلِ دعوت وعزیمت نامور دینی و روحانی شخصیتوں کے تذکرے اور سوانح حیات منظر عام پر آتی رہیں۔ اس فہرست میں بزرگان سلف بھی ہیں جو پچھلی صدیوں میں گذر چکے ہیں وہ اصحاب دعوت وعزیمت اور نفوس قدسیہ بھی ہیں جن سے مصنف کا براہ راست تعلق رہا اور خاندانی افراد بھی شامل ہیں۔

اہلِ علم اور اہلِ دین کی سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کا ذوق علی میاںؒ کو ورثے میں ملا تھا۔ یہ موضوع ان کے لیے محبوب اور دلچسپ تھا۔ ان کے دادا حکیم سید فخر الدینؒ خیالیؔ فارسی کے ممتاز مؤرخ تھے۔ مہر جہاں تاب، سیرت السادات اور تذکرہ علمیہ ان کی یادگار تصنیفات ہیں۔ ان کے والد ''نزهة الخواطر'' اور ''الثقافة الاسلامیه فی الهند'' جیسی جلیل القدر تصانیف کے مصنف تھے۔ علی میاںؒ کا تاریخی ذوق، سوانح نگاری کا شوق ایک زبردست علمی ماحول کا پروردہ اور تربیت یافتہ ہے۔

علی میاںؒ کے قلم سے سیرت وسوانح نگاری، تذکرہ نویسی کے موضوع پر عربی اور اردو میں کئی کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوئیں۔ بزرگوں، دینی شخصیتوں کی سیرت نگاری اور دینی واصلاحی تحریکات کی تاریخ نویسی سے قلبی مناسبت کا نقش اوّل

سیرت سید احمد شہیدؒ ہے جو بہت کم عمری میں لکھی گئی۔ اس کتاب کے درج ذیل اقتباس سے مصنف کے طرزِ تحریر اور فطری لگاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں۔ لیکن ایمان و یقین اور اخلاص وللّٰہیت کی ایسی بادِ بہاری ہمارے علم میں کم سے کم نہیں چلی۔ نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل، جوش جہاد، ایمان واحتساب، شوقِ شہادت اور یقینِ آخرت کے لیے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے۔ آدم گری، مردم سازی اصلاح وانقلاب کے ایسے محیر العقل واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔"

(سیرت سید احمد شہیدؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ حصہ اوّل ص:۵۴)

علی میاںؒ، اپنے ذوق سوانح نگاری کے سلسلے میں کاروان زندگی میں رقم طراز ہیں۔

"یہ بڑا مبارک آغاز تھا اور اس میں میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مجھے خود اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفریں ثابت ہوگا اور یہ کتاب ہندوستان میں اتنی مقبول اور دینی حلقے میں میرے تعارف اور بزرگوں کے یہاں قرب کا ذریعہ بنے گی۔"

(کاروانِ زندگی۔ حصہ اوّل ص:۱۶۹)

حقیقت یہ ہے کہ سیرت سید احمد شہیدؒ نے ۱۹۴۷ء سے قبل کے سیاسی انقلاب کے زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک خاص اثر ڈالا تھا۔ سید احمد شہیدؒ کی سیرت کے بعد علی میاںؒ کے قلم سے کئی سوانحی کتب تیار ہوئیں جن میں سوانح مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت، سوانح عبدالقادرؒ رائے پوری، سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سہارنپوری وغیرہ بہت اہم ہیں۔ خاندانی بزرگوں میں "حیات عبدالحیؒ" ان کے والد ماجد مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ کی

سوانح اور علمی کارناموں کی روداد ہے اور ''ذکر خیر'' میں والدہ ماجدہ خیر النساء بہتر (جو شاہ ضیاء النبیؒ کی بیٹی نیک سیرت، عبادت گزار، شاعرہ اور مصنفہ بھی تھیں) کی سوانح حیات ہے۔ بڑے بھائی ڈاکٹر عبد العلی حسنیؒ کا مختصر تذکرہ حیاتِ عبدالحیؒ میں بطورِ ضمیمہ شامل کیا گیا۔ یہ مضمون اپنے سب سے بڑے محسن و مربی کو خراجِ تحسین ہے۔

سیرت و سوانح نگاری علی میاںؒ کا وہ محبوب ترین موضوع تھا جس میں ان کی قلمی کاوشوں کا بیشتر حصّہ شامل ہے انھوں نے سیرت سید احمد شہیدؒ سے جس علمی کاوش کا آغاز کیا تھا اس کی سب سے اہم کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور حیات مبارکہ پر ''السیرۃ النبویۃ''، ''نبی رحمت'' ہے۔ اس کتاب کا شمار ان کی اہم تصانیف میں کیے جانے کا مستحق ہے جس میں ان کا فن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک اور اہم تصنیف ''المرتضیٰ'' ہے، جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حیات و کمالات پر مشتمل ہے۔ مصنف کے یہی ذوق سوانح نگاری و تذکرہ نویسی اذاھبت ریح الایمان، نزھۃ الخواطر جلد ہشتم، شخصیات و کتب، ''پرانے چراغ'' کی شکل میں منظرِ عام پر آئی ہے۔

علی میاں کی سوانحی تصانیف کو تین انواع پر منقسم کر سکتے ہیں۔ (۱) علی میاںؒ کے خاندانی بزرگوں کی سوانح (۲) ان بزرگوں کی سوانح جن سے علی میاںؒ کا علمی یا روحانی ربط رہا (۳) اکابرینِ اسلام پر جدید انداز میں لکھی گئی سوانحی کتب۔

السیرۃ النبویۃ (نبی رحمت)

''نبی رحمت'' حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ اور سیرت مبارکہ پر علی میاںؒ کی ایک مدلل علمی تصنیف ہے۔ علی میاںؒ نے اس موضوع کو بہت تامل کے ساتھ شروع کیا، اس کی وجہ انہوں نے خود بیان کی، کہ اس محبوب اور جلیل القدر موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے ان کی بصارت اور وقت کی تنگی حائل رہی۔ تیسری وجہ موضوع کا مہتمم بالشان ہونا تھا۔ علی میاںؒ نے اس تصنیف کی تیاری کے دوران میں

جن باتوں کو ملحوظ رکھا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) عصری اور علمی اسلوب پر لکھی جائے۔

(ب) قدیم و جدید دونوں قسم کے مأخذ سے پورا استفادہ کیا جائے۔

(ج) کتاب کی بنیاد اوّلین اور اصل مأخذ پر ہو اور قرآن و حدیث سے انحراف نہ کیا جائے۔

(د) معلومات محض انسائیکلو پیڈیا طرز پر بیان نہ کی جائیں بلکہ معلومات کو مناسب نقد و تمحیص کے ساتھ ساتھ دینی حقائق و مسلّمات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ واقعات اور حالات اور سیرت کو تشکیک آمیز پیرائے میں بیان کرنے کے بجائے خود اپنی زبان سے بولنے کا موقع دیا جائے۔ ان کو پڑھنے والے کے دماغ اور دل، ذہن و نظر میں اپنا راستہ بنانے کا موقع دیا جائے۔

(ہ) سیرت محمدیہ کو پیش کرتے وقت عقل و جذبات، بیک وقت دونوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ علی میاںؒ کے نزدیک جذبات اس لیے ضروری ہیں کہ ''عالمانہ بحث اور معروضی نقد و جائزہ، جذبۂ محبت اور ذوق و شوق کی کیفیت کو سرد اور افسردہ نہ کردے جو سیرت کے جمال جہاں آرا سے لطف اندوز ہونے اور اپنے دیدۂ دل کو اس سے روشن اور منوّر کرنے کی ناگزیر ضرورت ہے اور اس سے صحیح اور کامل استفادہ اور اس کے مسائل، احکام اور واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی لازمی شرط ہے۔''

(و) رنگینیِ بیان، انداز نگارش کے ذریعہ اثر انگیزی اور دلآویزی پیدا کرنے کے بجائے حُسن بیان، حُسن ترتیب اور حُسن انتخاب سے کام لیا جائے۔ اپنے ذاتی میلانات و تجربات اور اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے حقائق کو صحیح انداز میں پیش کیا جائے۔

(ز) حیات مبارکہ کے واقعات کو ان کے اصل عربی ماحول میں پیش کیا جائے اور اسلام کی کامیابی کا تجزیہ اس کے پس منظر میں کیا جائے۔ اس پس منظر میں مذکورہ حقیقتیں شامل ہیں۔

اُس زمانے میں عقل وشعور وتہذیب وتمدن کی سطح، ملک کے اجتماعی سیاسی، دینی ومذہبی حالات، اقتصادی وسیاسی ڈھانچہ، حربی اور عسکری طاقت کی نوعیت، اُس ملک کے باشندوں کے صحیح رجحانات، مزاج، ذہن، نفسیات وغیرہ کو پیش نظر رکھا جائے۔ جغرافیائی حالات، گردونواح، انفرادی اور علاقائی طاقتیں، ان کے باہمی تعلقات وربط، معاہدوں اور عہدناموں، ہجرت سے قبل کے معاملات، قومی وملکی دستور، رسم ورواج۔ اُس وقت کے سیاسی حالات، سیاسی قوتوں کی شان وشوکت اور اُس سے پیدا شدہ معاشرے کے حالات۔

(ح) جدید معلومات، تقابلی مطالعہ، جغرافیہ اور تاریخ کی جدید ترین دریافت سے استفادہ۔

(ط) سیرت پاک کی ایسی کتاب جو ہر مُنصف مزاج، تعلیم یافتہ شخص کے سامنے بغیر کسی استثنا اور تاویل کے پیش کی جاسکے۔

(ی) سیرت مبارکہ کی یہ کتاب تربیت ورہنمائی کا کام کرسکے۔

(ک) نئی نسل کے ذہن اور ذوق اور اس کے فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا جائے۔ موجودہ دور کے طرز تحقیق کے مطابق نئے تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل کی جائے۔

(ل) ایک باعظمت وباعزیمت نبیؐ بالخصوص خاتم الانبیاء کی حیات وسیرت کے مطالعہ کا حق صرف ایک عقیدت منداور نیازمند ہی کو نہیں بلکہ نوع انسانی کے ہر طبقہ کو ہے اس لیے وہ منطق کے صحیح، معقول اور قابلِ فہم اصولوں کے مطابق ہو۔''

(نبی رحمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ حصہ اوّل۔ ص: ۱۰ تا ۱۲)

علی میاںؒ کے نزدیک مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کا بھی سیرت پر پورا حق ہے لکھتے ہیں۔

''غیر مسلموں کا حق سیرت پر ان مسلمانوں سے ہرگز کم نہیں جو پہلے ہی سے اسلام وایمان کے سایہ رحمت میں ہیں۔ اس لیے کہ

دواوعلاج کی تندرست سے زیادہ ایک بیمار کو ضرورت ہے۔ دریا
کے اس پار رہنے والے کو پُل کی جتنی حاجت ہوگی اتنی حاجت
پل کے اس طرف رہنے والے کو کیوں کر ہو سکتی ہے۔''

(نبی رحمت۔ حصّہ اوّل۔ ص:۱۳۰)

علی میاںؒ نے اس تصنیف میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور مذکورہ بالا تمام امور کا التزام کیا ہے۔ مستند و معتبر مآخذ کے طور پر ایک سو اکتالیس (۱۴۱) کتابوں کی طویل فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں جہاں قرآن پاک، کتبِ حدیث میں صحیح مسلم، صحیح بخاریؒ، جامع ترمذیؒ، مؤطا امام مالکؒ، مسند امام احمدؒ، سنن ابوداؤدؒ، سنن بیہقیؒ، سنن دارمیؒ شامل ہیں وہیں انجیل، توریت، جیوش انسائیکلو پیڈیا، سیتارتھ، پرکاش منوشاستر، مہابھارت، بنو کیتھولک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ سیرت کی متعدد کتب میں سیرۃ ابن ہشام، زاد المعاد، خاتم النبیین، کامل ابن کثیر، تاریخ طبری، رحمۃ للعالمین، سیرۃ النبی ہیں۔ ادب عربی کی بلند پایہ کتب بھی ہیں۔ موجودہ عہد کی اہم تاریخی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ عرب کے جغرافیائی حالات کو مختلف نقشوں کی مدد سے واضح کیا گیا ہے۔ یہ نقشے خاص طور پر اس کتاب کے لیے متعدد فضلاء نے ترتیب دیے ہیں۔

علی میاںؒ نے حیات طیبہ کے واقعات کے دور رس نتائج کی توضیح میں بہت ذہانت اور دقیقہ سنجی سے کام لیا ہے اور متعدد مقامات پر انتہائی بلند و لطیف مطالب و معانی بیان کیے ہیں۔ مثلاً معراج کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

''واقعہ معراج محض ایک جزئی و ضمنی واقعہ نہ تھا جس میں رسول ﷺ کو اللہ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرایا گیا اور آسمان و زمین کی بادشاہت بے پردہ بے حجاب ہو کر آپ کے سامنے آ گئی۔ نبوّت کی اس غیبی و آسمانی سفر میں اس کے علاوہ بھی بہت بلند و لطیف مطالب و معانی پوشیدہ ہیں اور اس میں بہت دور رس اشارات کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں سورتیں سورۃ اسرا اور سورۃ نجم جو واقعۂ معراج کے سلسلہ میں نازل

ہوئیں یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دونوں قبلوں (مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ) کے نبی اور دونوں سمتوں مشرق و مغرب کے امام، اور اپنے پیش رو تمام انبیاء کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسل انسانی کے رہبر و رہنما ہیں۔ آپ ﷺ کی شخصیت اور آپ کے سفر معراج میں مکّہ، بیت المقدس سے اور مسجد الحرام مسجد اقصیٰ سے ہم آغوش ہوگئی۔ آپ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی اور یہ دراصل آپ کے پیغام و دعوت کی عمومیت و آفاقیت، آپ کی امامت کی ابدیت اور ہر طبقہ انسانی کے لیے آپ کی تعلیمات کی ہمہ گیر صلاحیت کی دلیل و علامت تھی۔

یہ واقعہ رسول ﷺ کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشاندہی آپ کی امامت و قیادت کا بیان، آپ کی اس امّت (جس میں آپ مبعوث ہوئے) کے اصل مقام و حیثیت عرفی کا تعین اور اس کا پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ جو اس امت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے۔

واقعہ معراج دراصل ایک محدود، مقامی اور عارضی نوعیت اور نبوّت کی ابدی اور عالمگیر شخصیت کے درمیان خطِّ فاصل اور امتیازی لکیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کوئی قومی یا مقامی لیڈر کوئی ملکی و وطنی رہنما، کسی خاص نسل کے نجات دہندہ اور کسی نئی شوکت و عظمت کے بانی ہوتے تو آپ کو اس معراج آسمانی کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لیے نہ آپ کو آسمان و زمین کی وسیع بادشاہت کے سیر و مشاہدہ کی حاجت تھی نہ اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے ذریعہ آسمان و زمین کا یہ نیا تعلق قائم ہو۔ اس وقت آپ کی یہ سرزمین، یہ ماحول اور یہ سوسائٹی آپ کے لیے کافی ہوتی۔ اس کو چھوڑ کر آپ کو کسی خطۂ زمین کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ نہ کہ بلند آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی یا مسجد اقصیٰ تشریف لے جانے کی جو کہ آپ کے شہر سے بہت دور عیسائی مذہب اور طاقتور رومن شہنشاہی کے زیر اقتدار تھا۔

واقعہ معراج یہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان قومی اور سیاسی رہنماؤں کی صف سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جن کی صلاحیتوں اور کوششوں کا دائرہ ان کے ملک یا

ان کی قوم تک محدود رہتا ہے۔ اور ان سے صرف انہیں نسلوں اور قوموں کو فائدہ پہنچتا ہے جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے اور اس ماحول تک ان کا اثر باقی رہتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں۔ آپ جس گروہ اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں وہ خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی صف ہے جو آسمان کا پیغام زمین والوں کو اور خالق کا پیغام مخلوق کو پہنچاتے ہیں اور ان سے پوری نوع انسانی (زمانہ وتاریخ رنگ ونسل اور ملک و قوم سے قطع نظر) سرفراز اور سربلند ہوتی ہے اور اس کی قسمت جاگتی ہے۔''

(نبی رحمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ حصہ اوّل۔ ص:۱۴۸۔۱۴۹)

واقعہ معراج کے بارے میں نہایت پُر مغز نتائج اخذ کرتے ہیں اس واقعہ کو اللہ کی طرف سے رسول اکرم ﷺ کی ضیافت اور عزّت افزائی قرار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''یہ اللہ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت وعزّت افزائی تھی جو آپ کی دل داری ودلنوازی اور طائف کے زخموں کو مندمل کرنے اور اس توہین، ناقدری، بے گانگی و بے وفائی کی تلافی کے لیے تھی جس کے سخت امتحان سے آپ وہاں گزرے تھے۔''

(نبی رحمت۔ حصہ اوّل، ص:۱۴۷)

جنگ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے ۳۱۹ اصحاب کرام کے لیے قبلہ رُخ ہوکر ہاتھ اٹھا کر دعا کی ''اے اللہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا فرما جو تو نے وعدہ کیا تھا وہ مجھے عطا فرما۔ اے اللہ اگر اہل اسلام کی یہ مختصر سی جماعت آج ختم ہوجاتی ہے تو روئے زمین پر پھر تیری کوئی عبادت کرنے والا نہ ہوگا۔''

رسول اللہ ﷺ نے ان چند پاکیزہ نفوس کے لیے اس نازک لمحہ میں جن مختصر الفاظ کے ساتھ دعا کی اس میں آپ کے ناز واعتماد، اضطراب و بے قراری، اطمینان قلب اور سکینت اور عجز واحتجاج کے تمام پہلو بیک وقت جلوہ گر تھے۔ یہ اس امّت کا بہترین اور صحیح تعارف، اقوام عالم میں اس کے اصل مقام وپیغام اور دنیا

کے بازار میں اس کی قیمت، افادیت وضرورت کی پوری وضاحت اور یقین کے ساتھ نشاندہی تھی، اس بات کا اظہار واعلان تھا کہ یہ امّت جس مرحلہ یا محاذ کی حفاظت پر مامور ہے وہ دعوت إلی اللہ اور اخلاص کے ساتھ اس کی عبادت اور کامل اطاعت کا محاذ ہے۔

اس فتح مبین نے (جس نے تمام اندازوں اور تجربات کو غلط ثابت کر دکھایا) آپ کے ان الفاظ پر ہمیشہ کے لیے مہر تصدیق ثبت کردی اور اس کا عملی ثبوت فراہم کردیا کہ یہ بات حرف بہ حرف درست تھی اور اس امّت کی صحیح، سچّی اور بولتی ہوئی تصویر یہی ہے۔"

(نبی رحمت۔ حصہ اوّل۔ ص:۲۲۰)

تعداد ازدواج کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علاوہ کسی دوشیزہ اور غیر شادی شدہ خاتون سے نکاح نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ جتنی شادیاں آپ نے فرمائیں اس میں دین اور دعوت دین کی کوئی مصلحت، فراخ قلبی وعالی ظرفی، مکارم اخلاق، مسلمانوں کا کوئی مفاد عام یا کسی بڑے اجتماعی خطرے اور مفسدہ کا سدّ باب آپؐ کے پیشِ نظر تھا۔ رشتوں اور ازدواجی قرابتوں کی عربوں کی قبائلی اور سماجی زندگی میں جس قدر اہمیت ہے اتنی کسی اور سوسائٹی اور سماج میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ شادیاں اور نئی قرابتیں اسلامی دعوت اور اسلام کے مثالی معاشرہ کی تاریخ، خون بہانے سے حفاظت اور عربی قبائل کے ضرر سے بچاؤ کا ایک بڑا ذریعہ تھیں۔ مزید یہ کہ ان ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپؐ کی زندگی کوئی عیش وآرام مرفہ الحالی یالذّت کام ودہن کی زندگی نہ تھی۔ جو تعداد ازدواج میں بہت سے لوگوں کے پیش نظر رہتا ہے۔ وہ اس درجہ زہد وتقشف اور ایثار و

قناعت کی زندگی تھی جس کی استطاعت قدیم اور جدید دور کے بڑے
سے بڑے حوصلہ منداولوالعزم اور نامورزہاد میں بھی نہیں ہے۔"

(نبی رحمت۔حصہ دوم۔ص:۱۶۶)

حیات محمدیہ اور سیرت پاک کے تمام گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد علی میاںؒ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے تعمیر انسانیت کا نیادور شروع ہوا۔

"آپ نے اُس تلوار کو جونوع انسانی کے سر پر لٹک رہی تھی اور کوئی گھڑی تھی کہ اس کے سر پر گر کر اس کو تمام کردے اس تلوار کو ہٹالیا اور اس کو وہ تحفے عطا کئے جنہوں نے اس کو نئی زندگی، نیا حوصلہ، نئی طاقت، نئی عزّت اور نئی منزلِ سفر عطا کی اور ان کی برکت سے انسانی تہذیب وتمدن، علم وفن، روحانیت اور اخلاص اور تعمیر انسانیت کا نیا دور شروع ہوا"۔

(نبی رحمت۔حصہ دوم۔ص:۲۱۶)

اس کے بعد علی میاںؒ ان بنیادی عطیات کا ذکر کرتے ہیں جو اللہ نے نبی آخرالزماں ﷺ کے ذریعہ انسانیت کو عطا کیے۔

"آپ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ نے دنیا کو عقیدہ توحید کی نعمت عطا فرمائی......آپ کا دوسرا انقلاب آفریں اور عظیم احسان وحدت انسانی کا وہ تصور ہے جو آپ نے دنیا کو عطا کیا......آپ نے صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ یہ انقلاب انگیز اور حیرت خیز اعلان فرمایا۔

آپ کی رحمۃ للعالمینی کا تیسرا مظہر اور نوع انسانی پر تیسرا احسان، عظیم احترام انسانیت اور انسان کی قدر و قیمت کا وہ اسلامی تصور ہے جو آپ کا عطیہ اور اسلام کا تحفہ ہے۔...... چوتھا انقلابی کارنامہ

یہ ہے کہ بعثت محمدیؐ کے وقت نوع انسانی کے اکثر افراد پر فطرت انسانی سے (جو) بدگمانی اور خدا کی طرف سے مایوسی کی ایک عام فضا چھائی ہوئی تھی۔ (اس کے مقابلے میں) محمد رسول اللہ ﷺ نے پوری طاقت وصفائی سے اعلان کیا کہ انسان کی فطرت ایک سادہ تختی کے مانند ہے، جس پر پہلے سے کوئی تحریر لکھی نہیں ہے۔ اس پر بہتر سے بہتر تحریر لکھی جا سکتی ہے۔ اس اعلان سے انسان کا اپنی فطرت اور اپنی فطری صلاحیتوں پر وہ اعتماد بحال ہو گیا جو بالکل متزلزل ہو گیا تھا...... نبوّت محمدیؐ کا پانچواں عظیم اور نا قابل فراموش احسان اور ایک گرانقدر تحفہ دین و دنیا کی وحدت کا تصوّر اور یہ انقلاب انگیز تلقین ہے کہ یہ کوئی حقیقی اختلاف نہیں محض اصلاح کا اختلاف ہے...... چھٹا انقلاب یہ ہے کہ بعثت محمدیؐ سے پہلے انسان اپنی منزل مقصود سے بے خبر تھا اس کو یاد نہیں رہا تھا کہ اس کو کہاں جانا ہے...... آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی رت بدل گئی۔ انسانوں کے مزاج بدل گئے دلوں میں خدا کی محبت کا شعلہ بھڑکا، خدا طلبی کا ذوق عام ہوا، انسانوں کو ایک نئی دُھن (خدا کو راضی کرنے اور خدا کی مخلوق کو خدا سے ملانے اور اس کو نفع پہنچانے کی) لگ گئی۔"

(نبی رحمت۔ حصہ دوم۔ ص: ۲۱۶ تا ۲۳۱)

نبی رحمت (السیرة النبویه) میں علی میاںؒ نے سیرت کے اولین مآخذ سے کامل استفادہ کیا ہے اور قدیم و جدید مآخذ کے مطالعے کے ساتھ تنقیدی و تحقیقی طریقے سے علمی و عصری اسلوب میں ضروری مواد پیش کیا ہے۔ علی میاںؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"مصنّف نے اس کتاب میں خود ان واقعات وحالات اور سیرت

کے اصل و بنیادی مواد پر زیادہ اعتماد کیا ہے اور اس کو موقع دیا ہے
کہ وہ خود اپنی زبان سے بولے اور پڑھنے والوں کے دماغ، دل
اور ذہن و نظر میں اپنا راستہ خود بنائے۔ ان منہ سے بولتی ہوئی
صداقتوں اور زندہ حقیقتوں کو فلسفہ کا رنگ دینے، واقعات کی
تاویل کرنے اس کے لیے طویل وعریض مضمون باندھنے کی اس
میں زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔"

(نبی رحمت۔ حصہ اوّل۔ ص:۱۱)

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض ایسی بحثیں شامل کی گئی ہیں جو اس سے قبل سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔ کتاب میں تاریخ کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ عہدِ اسلام سے قبل کے مذہب واخلاق کی نشاندہی کی گئی ہے اس کے علاوہ عرب ممالک کی سماجی سیاسی و اقتصادی تصویر پیش کی گئی ہے۔ علی میاںؒ نے جزیرۃ العرب مکّہ و مدینہ اور طائف پر تاریخی، جغرافیائی، معاشرتی وتہذیبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ سیرت نگاری میں جذبات کا عنصر اتنا ہی رکھا گیا ہے جتنی اس کی ضرورت تھی۔ دل سے زیادہ دماغ کو پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی رعایت ومناسبت سے مؤثر اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ سیرت نگاری کے لیے دقت نظر، دور بینی سے کام لیا گیا ہے۔ محققانہ اور ناقدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ کلام الٰہی حدیث نبوی، سیرت کی متعدد کتب کے علاوہ جغرافیہ، تاریخ وادب کی اہم کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

السیرۃ النبویہ کا اردو ترجمہ "نبی رحمت" علی میاںؒ کے بھتیجے مولانا محمد الحسنیؒ نے کیا ہے، یہ کتاب عربی اور اردو اسلوب نگارش اور انشاء کا بہترین مرقع اور اسلامی ادب کا بہترین شاہکار ہے۔

المرتضٰی

یہ تصنیف حضرت علی بن ابی طالبؓ کی سوانح عمری حالات و کمالات کا

مجموعہ ہے۔ کتاب عربی میں لکھی گئی تھی، علی میاںؒ کے شاگرد رشید ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (استاد ام القریٰ یونیورسٹی) نے کتاب کا اردو ترجمہ کیا، کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حضرت علیؓ کے خاندانی حالات اور عہد و ماحول کا جائزہ لیا گیا ہے اور سیرت و شخصیت کی تشکیل میں ان کے خاندان کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ اس باب میں حضرت علیؓ کی ولادت سے ہجرت تک کے واقعات بھی قلمبند کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں مدینہ منورہ کے قیام کے زمانے سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی وفات تک کے حالات ہیں۔ مختلف غزوات میں ان کے جنگی کارنامے اور شجاعت و بہادری کے خداداد کمالات بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد تین ابواب میں علی الترتیب عہد صدیقی، فاروقی وعثمانی میں پیش آنے والے حالات اور واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے خلفائے ثلاثہ سے تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹے باب میں خلافت مرتضوی کا ذکر ہے۔ عہد خلافت کی دشواریوں کو قلمبند کیا ہے۔ مسلمانوں کے اختلافات، جنگ جمل اور صفین میں ان کی باہمی خوں ریزی کے واقعات لکھے ہیں۔ فتنۂ خوارج اور سبائیت کی تفصیل درج کی ہے۔ ان تمام تفصیلات کو دقت نظر سے یکجا کیا ہے اور اُن حالات کا تجزیہ کیا ہے جن میں حضرت علیؓ نے خلافت کا کام کیا۔

ساتویں باب میں خوارج اور اہل شام کے ساتھ پیش آنے والے حادثات کی تفصیل ہے، حضرت علیؓ کی شہادت اور آل اولاد کا تذکرہ ہے۔ ان کے حکیمانہ و عارفانہ اقوال، شعر وادب میں ان کے کمال کا ذکر ہے۔ آٹھویں باب میں حضرت علیؓ کی پاکیزہ سیرت، زاہدانہ ومتوکلانہ زندگی، عمال و حکام کے ساتھ برتاؤ اور اصول سیاست و طرز حکمرانی وغیرہ پر گفتگو ہے۔ نواں باب حضرت علیؓ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کی سیرت و کردار سے متعلق ہے۔ مصنف نے دونوں کی ایسی دلکش تصویر پیش کی ہے جو اس تصویر سے بہت مختلف و ممتاز ہے جو اثنا عشری فرقہ نے بنا رکھی ہے۔ اس قلمی تصویر سے سبق ملتا ہے کہ مشکلات اور مسائل میں زندگی کی گاڑی

کو کس طرح چلایا جا سکتا ہے۔ حضرات حسنینؓ کے دینی و سیاسی موقف پر بھی بحث کی ہے۔ دسویں باب میں اہل بیت اور حضرت علیؓ کی سیرت اور کارنامے بیان کیے ہیں اور فرقہ امامیہ کے نظریہ امامت کا جائزہ لیا ہے۔

''المرتضیٰ'' حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حالات و کمالات پر تحقیقی انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ علی میاںؒ نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ کتاب میں حضرت علیؓ کی ایسی مستند سوانح عمری ہو جس میں ان کی شخصیت کے حقیقی خط و خال نظر آئیں اور ان کی صحیح اور اصلی تصویر دنیا کے سامنے آجائے۔ غلو آمیز مناقب سے اجتناب کرتے ہوئے تمام غلط فہمیوں کا علمی و تحقیقی انداز میں ازالہ ہو سکے۔

علی میاںؒ عربی اردو اور فارسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ سیرت و سوانح کے موضوع پر تصنیف و تالیف کا طویل تجربہ رکھتے تھے۔ تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی۔ نقطۂ نظر میں اعتدال تھا۔ منطقیانہ استدلال کے بجائے حق و صداقت کی رہبری میں نتائج اخذ کرتے تھے۔ تاریخی بصیرت، تحقیقی نگاہ اور علمی شعور کے مالک تھے۔ علی میاںؒ نے عصر حاضر کے علمی و تحقیقی ذوق و معیار کو سامنے رکھ کر کتاب کی ترتیب کی۔ تاریخی مآخذ کی تلاش و جستجو میں دیدہ ریزی سے کام لیا۔ حالات و کمالات کی صحت و وثوق کا اہتمام کیا۔ بحث و نظر اور تلاش و تحقیق کا معروضی انداز اختیار کیا۔ حضرت علیؓ کی زندگی کے بعض موڑ بڑے نازک اور پیچیدہ ہیں۔ علی میاںؒ نے ایسے نازک مباحث و مسائل پر بڑی فاضلانہ بحث کی اور بعض جگہ نزاعی معاملات سے دامن بچا کر محتاط انداز سے گذر گئے ہیں۔

بعض امور کی حکمت و مصلحت کو بڑے بلیغ علمی انداز میں واضح کیا۔ مثلاً آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ سے آپ ﷺ کی میراث کا مطالبہ کیا گیا تو انھوں نے آپ کا قول پیش کیا۔ ''لا نورث ما ترکنا صدقة''، علی میاںؒ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

''درحقیقت یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان

تھی اور آپ کے طریقہ عمل کے عین مطابق تھی آپ نے ہمیشہ جہاں خطرات کے مواقع آئے اور جان دینے یا قربانی کی ضرورت ہوئی اپنے افراد خاندان اور بنی ہاشم کے افراد کو آگے بڑھایا اور جہاں حصولِ منفعت کا موقع آیا وہاں آپ نے ان کو پیچھے کر دیا...... آنحضرت ﷺ کے عہد سے لے کر آج تک آمدنی کا جو سب سے بڑا ذریعہ امت اسلامیہ میں موجود ہے وہ زکوۃ ہے جس کو آپ نے آل ہاشم اور سادات کے لیے ہمیشہ کے لیے مسدود کر دیا۔ حالانکہ یہ وہ ذریعہ آمدنی ہے جو ایک چشمۂ جاریہ کی طرح آج تک رواں دواں ہے اور رہے گا۔

حجتہ الوداع کے موقع پر جب سودی قرضوں کو کالعدم قرار دیا تو سب سے پہلے اپنے چچا عباس ابن عبدالمطلبؓ کے سودی قرضوں کو کالعدم قرار دیا، جو خون بہا معاف کیا تو سب سے پہلے اپنے خانوادۂ بنی ہاشم کے فرزند اپنے بھتیجے ابن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کا خون بہا کالعدم قرار دیا۔"

(المرتضٰی۔ ص:۱۳۸۔۱۳۹)

علی میاںؒ نے بہت سے مروّجہ نظریات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا اور اس کے بعد یہ ثابت کیا کہ محض تنگ نظری اور بدگمانی نے ہمارے تاریخی مطمحِ نظر کو غبار آلود کر دیا ہے۔ علی میاںؒ نے عمرانی پس منظر میں قبائل کی جذبات کی تفہیم کی اور معاصرانہ رجحانات کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا کہ خلفائے ثلاثہ کی ترتیب زمانی میں کیا حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ اس سلسلہ میں خلیفہ کی اہلیت وصلاحیت کے موضوع پر بحث کی اور چھ خصوصیات کا تذکرہ کیا۔

(الف) خلیفہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل اعتماد حاصل رہا ہو۔

(ب) بلا خیز آندھیوں کے وقت ثابت قدم رہا ہو۔

(ج) اسلام کا صحیح ادراک اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہر ساعت اس کے پیش نظر ہو۔

(د) دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم رکھنے کی فکر ہو۔

(ہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کی تکمیل کا بے پایاں جذبہ رکھتا ہو۔

(و) خلیفہ دنیاوی جاہ و ثروت اور لذت عیش سے بے نیاز ہو۔

(المرتضٰی۔ ص:۹۸ تا ۱۰۰)

مذکورہ بالا خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے علی میاںؒ نے دور نبوی کے واقعات و حالات کی روشنی میں لکھا ہے کہ ''حضرت ابوبکرؓ ان خصوصیات کے جامع اور ان شرائط پر پورے اترتے تھے اور اس وقت ان کے علاوہ بار خلافت اٹھانے کا کوئی دوسرا شخص اہل نہیں تھا'' اس پیچیدہ اور نازک مسئلہ کو علی میاںؒ نے اطمینان بخش دلائل سے حل کیا ہے۔

بعض جانب دار مؤرخین نے خلفائے ثلاثہ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تعلقات کی غلط تصویر کشی کی ہے۔ اس کتاب میں علی میاںؒ نے ان لوگوں کی رائے کی تردید کی اور اپنی بات کے ثبوت میں انتہائی عالمانہ محققانہ اور مدلل انداز سے تینوں خلفاء اور حضرت علیؓ کے مابین تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

> ''حضرت علیؓ اپنی طبعی و خاندانی شرافت و نجابت، عالی ظرفی، بے نفسی، عالی نسبی، بے داغ خلوص و صداقت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانے میں ان کے معاون رہے اور ان کے بہترین مشیر اور سچے خیر خواہ تھے۔ ہر بات میں اس امر کو ترجیح دیتے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری اور بہبود مضمر ہو۔ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اخلاص اور مسلمانوں کے مفاد میں اور خلافت کے اقدامات کو کامیاب بنانے میں صحیح و مخلصانہ مشورہ اور تعاون سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ اس کا انتہائی روشن ناقابل انکار کھلا ہوا ثبوت جس سے روز

روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد اور خلافت کی کامیابی سے زیادہ کوئی شے ان کو عزیز نہ تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرتدین سے جنگ کرنے اور ان کے خلاف فوجی کارروائیوں کی بذاتِ خود قیادت کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ذوالقصّہ جانے کے لیے پابہ رکاب تھے جو ایک انتہائی خطرناک اقدام تھا۔ جس سے نہ صرف ان کی ذات بلکہ پورے اسلامی وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا"۔

(المرتضیٰ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۵۴)

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ "البدایہ والنہایہ" کے مصنف ابن کثیر کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"دارقطنی سعید بن المسیّب سے اور وہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ ذوالقصہ کے لیے تیار ہوئے، اور اپنی سواری (اونٹنی) پر بیٹھ گئے تو حضرت علیؓ نے اس کی مہار پکڑ لی اور کہا اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کدھر جارہے ہیں؟ میں آپ سے وہی کہتا ہوں جو اُحد کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اپنی تلوار نیام میں رکھو اور ہم سب کو اپنی دائمی جدائی کا صدمہ نہ دو اور مدینہ واپس جاؤ، بخدا اگر آپ کو کوئی زخم پیش آیا تو اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے بکھر جائے گا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ واپس ہوگئے۔

(البدایہ والنہایہ۔ ج:۶، ص:۳۱۴۔۳۱۵)

"حضرت علیؓ کا .... پناہ بخدا............ اگر حضرت ابوبکرؓ اور ان کی خلافت کی طرف سے دل صاف نہ ہوتا اور ان سے علی الرغم بیعت وخلافت کی ہوتی تو ان کے لیے یہ سنہرا موقع تھا جس سے

بآسانی فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتے۔ کیا تعجب تھا ان کا رشتۂ حیات ہی منقطع ہو جاتا...... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ممکن تھا (اگر وہ واقعی دل سے حضرت ابوبکرؓ کو ناپسند کرتے اور ان سے گلوخلاصی چاہتے تو) وہ کسی کو اشارہ کر دیتے تو ان کا کام ہی تمام کر دیتا اور یہ سیاسی ذہن رکھنے والوں.......... کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

(المرتضٰی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۵۴۔۱۵۵)

حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے آپسی دوستانہ فدویانہ تعلقات کے بارے میں واقعات زندگی سے نتائج اخذ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اس اہم اور نازک موقعہ پر جو اسلام کے مستقبل اور امّت اسلامیہ کے وجود کو خطرہ میں ڈال سکتا تھا عام اور روز مرّہ کی زندگی میں بھی صدیق اکبرؓ، علی مرتضٰیؓ، کا خصوصی طور پر اور صحابہ کرام کا عمومی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ مسرّت اور تکلیف میں شریک حال ہونا اور ایک خاندان کے افراد کی طرح برتاؤ کرنا تاریخ کے کھلے ہوئے ذہن کے ساتھ وسیع مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے حضرت محمد بن باقر بن زین العابدینؒ صاحب کثیر النواء نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی کوکھ میں درد ہو گیا تو حضرت علیؓ اپنا ہاتھ آگ سے گرم کر کے اس پر پھیرتے تھے اور اس کو سینکتے رہے۔" علی میاںؒ لکھتے ہیں اس قدسی اور پاک نفس جماعت کی حقیقت میں وہ شان تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی "محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں اور آپس میں رحم دل ہیں۔"

(المرتضٰی۔ ص:۱۵۶)

خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خلیفہ ثالث عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تعلقات کی نوعیت واقعات کی روشنی میں دلائل و تجزیہ سے ثابت کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ سے گہرے تعلق و اخلاص اور مسلمانوں کے مفاد کو عزیز رکھنے کے بناء پر حضرت علیؓ نے انہیں روم پر حملہ کرنے سے منع کیا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "لولا علي لهلك عمر" (اگر علیؓ نہ ہوتے عمر ہلاک ہو جاتا)

حضرت عمرؓ بیت المقدس گئے تو حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنایا۔ "باغیوں نے جب حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کیا تو حضرت علیؓ اپنے صاحبزادوں کو لے کر ان کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔"

(المرتضیٰ۔ص:۱۷۶)

علی میاںؒ نے حضرت علی مرتضیٰؓ اور خلفائے ثلاثہ کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالی اور حضرت علیؓ کے سیرت کے تابناک پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ مسلمانوں میں امامت و خلافت کا مسئلہ بڑا اہم ہے اس کی وجہ سے امت مسلمہ دو بڑے فرقوں میں بٹ گئی۔ علی میاںؒ نے "المرتضی" میں اثنا عشری فرقے کے عقیدہ امامت کو مختلف اسباب وعوامل کا نتیجہ بتایا۔ بڑی باریک بینی سے تجزیاتی انداز میں کئی اہم پہلوؤں کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔

> "اہل بیت کرام امت کے اجتماعی عقیدہ اور مسلک پر پوری شدت سے قائم تھے اور اس کے داعی تھے اور اپنے تئیں کتاب و سنت کی پیروی کا پابند اور امت محمدیہ کا فرد باور کرتے تھے جو صرف اپنے عمل و تقویٰ اور علم و اخلاق سے امتیاز و احترام کا مستحق ہو سکتا تھا۔ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ) ......لیکن بعد میں وہ مزاج ابھر آیا جس کی تہہ میں جاہلیت قدیمہ اور ادیان محترفہ کی روح کام کر رہی تھی۔ جس میں ان کے تمدنوں اور فلسفوں کا اثر

تھا جو عہد قدیم میں یونان ایران، ہندوستان وچین میں پروان چڑھے اور نقطۂ عروج پر پہنچے۔ مزاج اور انداز فکر یہ تھا کہ حکمراں خاندان اور ان خاندانوں کے جن کو عہد قدیم سے روحانی یا مذہبی قیادت حاصل رہی ہے اور جنھوں نے سخت ریاضوں اور بڑے مجاہدوں اور کسی درجہ میں عام سطح سے بلند ہو کر اپنی اخلاقی وروحانی حیثیت تسلیم کرائی ہے۔ افراد کو معصوم سمجھا جائے۔ ان کے اس حق اور اختیار کو آنکھ بند کر کے تسلیم کیا کہ وہ مذہبی قوانین کو تبدیل کر سکتے اور توڑ سکتے ہیں۔ اور ان کو قانون سازی کا آزادانہ اور مکمل اختیار ہے۔"

(المرتضیٰ۔ ص: ۴۱۳)

علی میاںؒ نے اثنا عشری فرقے کی مستند کتابوں کے حوالے سے اس کے عقیدہ امامت پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"اس فرقے کے نزدیک رسول اور آپ کے خلفاء اور ائمہ کا تعین من جانب اللہ ہوتا ہے۔ وہ پیغمبروں کی طرح معصوم ہوتے ہیں۔ ان کا درجہ انبیاء سے بڑھا ہوتا ہے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ کے برابر ہوتا ہے۔ ائمہ کے بغیر لوگوں پر کوئی حجت قائم نہیں رہ سکتی اور دنیا بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ایمان کے لیے ان کی معرفت شرط ہے۔ ان کو تحلیل، تشریح اور تحریم کا پورا اختیار ہے اور ان پر ایمان لانے والا جنتی۔ اس قسم کے خیالات اثنا عشری فرقہ میں نسلاً بعد نسل تسلسل کے ساتھ قائم رہے اور اب تک یہی عقیدہ ہے کیوں کہ یہ بنیادی عقائد میں داخل ہے اور یہی عقیدہ عصر حاضر میں امام خمینی تک پہنچا ہے"۔

(المرتضیٰ۔ ص:۴۱۴)

علی میاںؒ نے شیعوں کے باطل عقائد کی تردید کے بجائے دو غیر مسلم دانشوروں کے خیالات پیش کرنے کے ساتھ قارئین کو غور وفکر کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

خلفائے اربعہ پر علی میاںؒ کا ایک مضمون رسالہ ''فاران'' کراچی میں شائع ہوا تھا جس میں علی میاںؒ نے چاروں خلفاء کی عظمت اور خلافت راشدہ کی حقیقت پر بڑی مفید اور متوازن بحث کی ہے۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں۔

> ''میرے نزدیک یہ چاروں فرداً فرداً خلافت نبوی کا مظہر اتم اور مصداق کامل تھے۔ ذاتی فضائل ومباحث اور ان کی بناء پر تفاوت درجات کو الگ کر کے، خلافت کا مزاج اور اس کی روح ان میں سے ہر ایک میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ خلافت راشدہ کیا ہے؟ خلافت راشدہ نہ اسلامی مملکت کی وسعت کا نام ہے نہ کثرت فتوحات کا، نہ کامیابیوں کے تسلسل کا، اگر معیار یہی ہو تو پھر ولید بن عبدالملک اور ہارون الرشید کو سب سے بڑا خلیفہ ماننا پڑے گا۔ خلافت راشدہ نام ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور طرز زندگی میں نیابت کاملہ کا''

(ماہنامہ فاران کراچی۔ ۱۹۵۹ء)

''المرتضیٰ'' وقت کے اہم تقاضے کو پورا کرتی ہے بلکہ اس کتاب سے تاریخ کے بعض ایسے گوشے روشن ہوئے ہیں جن پر مدّتوں سے تعصب اور تنگ نظری کے پردے پڑے ہوئے تھے اور جن کے گرد بقول مصنف ''تنگ وسنگین حصار'' قائم کر دیا گیا تھا۔ کتاب میں اسلامی تاریخ کے ایسے دور کو جو مختلف عقائد کے تصادم کا دور تھا بغیر کسی مناظرہ یا مجادلہ کے پیش کیا ہے۔ علی میاںؒ نے تاریخی بصیرت، محققانہ ژرف نگاہی سے تاریخ نویسی نہیں تاریخ سازی کا کام انجام دیا ہے۔

اُسلوب عالمانہ محققانہ اور پُر اثر ہے۔ مستند مراجع وماخذ کو تلاش کیا گیا ہے

خواہ وہ ایسے مصنّفین ومؤرّخین کے ہوں جن کی گروہی یا مسلکی جانب داری واضح ہو۔ نقطۂ نظر کا اعتدال وتوازن حق وصداقت اور منصفانہ اندازِ بیان اپنایا گیا ہے۔

سیرت سید احمد شہیدؒ:

سیرت سید احمد شہیدؒ علی میاںؒ کے ذوق تاریخ نویسی وسیرت نگاری کا نقش اوّل ہے۔ بہت کم عمری میں لکھی گئی، یہ تصنیف ۱۹۳۹ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی۔ سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اوّل تغیر واضافہ کے ساتھ کئی مرتبہ شائع ہوئی۔ پہلے ایڈیشن میں صرف چار باب تھے چھٹے ایڈیشن میں پچیس باب ہیں، جن میں ہندوستان کے حالات لکھنے کے بعد سید صاحب کے خاندانی حالات ابتدائی تعلیم کھیل مشاغل، خدمت خلق، سیر دہلی اور شاہ عبدالعزیزؒ سے ملاقات کا ذکر ہے۔ دہلی، رائے بریلی، لکھنؤ، کلکتہ، بنارس، پیشاور، مرزا پور، اور کوئٹہ کے اسفار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حج کا عزم اور دعوت وتبلیغ اور سرزمین حجاز میں پیش آئے حالات کا ذکر اور واپسی کی تفصیل ہے۔ ایک باب میں جہاد اور اس کے مقاصد واسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکوڑے کی جنگ، حضرو کے چھاپے کی تفصیل بتاتے ہوئے پچیسویں باب میں بیعت امامت کا جواز اور تفصیل درج ہے۔

''سیرت سید احمد شہیدؒ'' حصہ دوم ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ اس کے تیسرے ایڈیشن میں پچاس باب ہیں۔ دوسری جلد شیدو کی جنگ کے واقعات سے شروع ہوتی ہے۔ اِس میں سید احمد شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تفصیلی حال بیان کیا ہے۔ شہید بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کی شہادت کے ذکر کے بعد ان کے دینی، فطری، اخلاقی، روحانی اور باطنی اوصاف تزکیہ باطن کو تفصیل سے مدلل بیان کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کتاب کے مقدمہ میں علی میاںؒ کے کام کو سراہا ہے اور سید احمد شہیدؒ کی مجاہدانہ کوششوں کو تجدید دین کی تحریک بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

''یہ مسلمانوں کی ایک عظیم الشان تحریک تھی جس کی کھل کر پوری تاریخ لکھنا بھی اب سے پہلے مشکل تھی۔ اس کے متفرق مضامین رسالوں اور کتابوں کے دفینوں میں بند تھے۔ ان سب کو سمیٹ کر ایک دفتر فراہم کرنا بھی ایک کام تھا ہم کو خوشی ہے کہ اس کام کے لیے بھی اس خانوادے کے ایک نوجوان کو جس کو علم وعمل اور فکر وذوق کی دولت سے حصہ وافر ملا ہے، توفیق بخشی گئی، مولوی سید ابوالحسن علی حسنی ندوی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بڑی کوشش سے ان متفرق معلومات کو یکجا کیا ہے اور اس طرح ترتیب دیا ہے کہ تاریخی داستان کے بجائے نوجوان مسلمانوں کے لیے عملی روح کا سامان بن گیا۔''

(سیرت سید احمد شہیدؒ۔ حصہ اوّل۔ ص:۳۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو تجدید دین کی تحریک کہا گیا ہے یہ بات بالکل درست ہے سید احمد شہیدؒ کے حالات زندگی سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے احیاء وتجدید کے لیے سید صاحبؒ کی کوششوں سے ہی ''سلام مسنون'' کا رواج عام ہوا۔ ''حج کی ادائیگی'' کے سلسلہ میں راستے کی بدامنی اور سمندر کی صعوبتوں کی وجہ سے کچھ مدّت سے علماء نے حج کو متروک قرار دے دیا تھا۔ اس سلسلہ میں علی میاںؒ لکھتے ہیں:

''سید احمد شہیدؒ نے علماء کی تاویلوں اور فقہاء کے عذر کو دین کی بڑی تحریف اور فتنہ قرار دیا اور حج کی فرضیت کو بحال کیا اس طرح انھوں نے ''احیائے سنت'' ہی نہیں ''احیائے فرض'' کی خدمت کو انجام دیا۔ حج کے طویل اور دشوار گزار راستے کو بغیر کسی لڑائی اور اسلحہ کے طے کیا اس طرح اس رکن کو دوبارہ زندہ کرنے میں مستقل تجدید و جہاد کا عملی

نمونہ پیش کیا۔ سید صاحب کا بڑا اہم بالشان اور انقلاب انگیز انقلاب
"جہاد کا احیاء" ہے جو اس دور میں باوجود انتہائی ضرورت اور حالات
کے تقاضے کے بالکل فراموش ہو چکا تھا"۔

(سیرت سید احمد شہیدؒ۔ حصہ دوم۔ ص: ۵۴۲)

سید احمد شہیدؒ نے وعظ اور درس کے ذریعہ جہاد کے عمل کو زندہ کیا، عوام و خواص کے دلوں پر خدا کے راستے میں جہاد اور شہادت کی دینی عظمت و تقدس کا نقش بٹھایا۔ اسلام پر دوسرے مذاہب کے اثرات کی بدولت بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کو بہت معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔ سید احمد شہیدؒ نے اپنے بڑے بھائی کی بیوہ سے شادی کر کے اس مخالف شریعت رسم کو ختم کرنے کی پہل کی اور لوگوں کو بدعات سے روکا۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی جدوجہد کی اور عورتوں کے اس طبقہ کو توبہ و استغفار پر آمادہ کیا جس نے جسم فروشی کو ذریعہ معاش بنالیا تھا۔ سید احمد شہیدؒ کی مساعی سے ایسی عورتوں کی ایک بڑی جماعت اسلام کی صحیح تعلیمات سے آشنا ہوئی اور ان میں صحیح اسلامی زندگی کا رجحان پیدا ہوا۔ سید احمد شہیدؒ کی داستان جہاد، اصلاح و تجدید میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جو ان کی تحریک کو تجدید دین کی تحریک ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ سیرت سید احمد شہیدؒ میں اُن کے دلیرانہ کارناموں کی تفصیل ہے۔ مبلّغانہ کوششوں کی کہانی ہے مخلصانہ مذہبی سرگرمیوں کی روداد ہے۔ سید صاحب کے کارناموں اور کردار پر علی میاںؒ نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت مدلل ہے۔

سید احمد شہیدؒ کے تربیت یافتہ، افراد نے ہندوستان میں انگریزوں کی سامراجی قوت سے ٹکر لینے میں سرفروشی دکھائی تھی۔ اُن کی مجاہدانہ تحریک اور بالاکوٹ میں شکست نے مسلمانوں کی جامد زندگی میں روح پھونک دی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزوں نے اپنے جابرانہ و قاہرانہ قوت سے مسلمانوں کے تاج و تخت پر تو قبضہ کرلیا مگر وہ اپنے دورِ حکومت میں مسلمانوں کے دلوں کو

تسخیر نہیں کر سکے۔ یہ روح کیسے پیدا ہوئی ؟ اسی کی پُر کیف داستان ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' میں علی میاںؒ نے بیان کی ہے۔

جب ایمان کی بہار آئی (اذاھبت ریح الایمان)

تیرہویں صدی ہجری کے مشہور مجاہد و مصلح سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی دینی دعوتی مجاہدانہ سرگرمیوں کی روداد ہے۔ علی میاںؒ سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب سید احمد شہیدؒ کے مجاہدانہ کارناموں کو عرب و دیگر اسلامی ممالک میں روشناس کرانے کے لیے لکھی تھی کیونکہ علی میاںؒ کو اپنے عرب و اسلامی ممالک کے سفروں کے دوران اس بات کا اندازہ ہوا کہ ہندوستان کی تجدید دین کی تاریخ کا یہ باب بہت تشنہ ہے۔ ''سن ۱۹۵۱ء میں اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے اس موضوع پر مصر کے مجلّہ ''المسلمون'' میں مضامین لکھنا شروع کیے'' لیکن وہ اس کام کو مکمل نہیں کر سکے اسی خیال کی تکمیل 'جب ایمان کی بہار آئی' (اذاھبت ریح الایمان) کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ کتاب کا اردو ترجمہ علی میاںؒ کے بھتیجے مولانا محمد الحسنیؒ نے کیا۔

کتاب کی ابتدا میں سید احمد شہیدؒ کی مختصر سیرت و سوانح ہے ضمناً مولانا اسماعیل شہیدؒ اور سید صاحب کے دوسرے رفقاء کے واقعات بیان کیے ہیں۔ جن سے ان کی ایمانی حرارت اور دینی جوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ علی میاںؒ نے طالب علمی کے زمانے میں کتاب الاغانی کا مطالعہ کیا تھا جس کے فصیح و بلیغ اسلوب اور خوبصورت تعبیرات نے انہیں بہت متاثر کیا۔ مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں۔

> ''میری تمنا تھی کہ یہ قادرالکلامی یہ ذخیرۂ الفاظ اور حسنِ تعبیر اور قصّوں کا ہلکا پھلکا اسلوب جو کتاب کی خصوصیت ہے اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال ہو اور اس سے کسی حسین و جمیل تاریخ کے رُخ زیبا سے پردہ اٹھایا جائے۔''

(جب ایمان کی بہار آئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۵)

علی میاںؒ نے کتاب کو تحریک کے جستہ جستہ منتخب واقعات سے ترتیب دیا ہے اور واقعات کو ادبی انداز اور قصے کے پیرائے میں لکھنے کی سعی کی ہے۔ جس سے ایمان کی چاشنی اور واقعاتی اسلوب کی لذت محسوس کی جا سکتی ہے۔

''۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ ایمان اور احیاء دین کی اس عجیب اور اثر انگیز تاریخ کو ہلکے پھلکے ادبی انداز میں عربی زبان میں مرتب کیا جائے اور بغیر کسی مبالغہ اور رنگ آرائی کے اصل واقعات کو سادگی کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس تحریک کے قائد کا اصل مرتبہ اور مقام عرب دوستوں کے سامنے آجائے اور اُن کو اندازہ ہو کہ اُن کو اللہ نے کیسی وہبی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں اور ان کے گرد کیسے طاقتور عناصر جمع تھے، تربیت اور تزکیۂ نفس کے شعبہ میں، نیز اخلاص، دعوت میں فنائیت اور مقصد سے عشق میں اُن کا مقام کتنا بلند تھا۔ اس سے اُن کو اس مومن اور مجاہد اسلامی نسل کے اعلیٰ کردار، اخلاقی بلندی اور سیرت کی پختگی نیز اُن کے پیروؤں اور متبعین میں اسلامی دعوت، اور ایمانی تربیت کے نمایاں اثرات کا بھی اندازہ ہو، جو اُن کی کوششوں کے نتیجہ میں تیار ہوئی تھی۔''

(جب ایمان کی بہار آئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۳۰)

علی میاںؒ نے سید احمد شہیدؒ کے مجاہدانہ گوشوں کو واقعات کے ذریعہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ سید احمد شہیدؒ کی اتباع اور پیروی کرنے والوں میں ایسے لوگ سامنے آئے جن میں اسلامی دعوت اور ایمانی تربیت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ کتاب سے تحریک کے روح رواں اور اس کی تاثیر، قائد تحریک کا مقام و مرتبہ، ایمانی استقامت، عقائد کی پختگی اور مجاہدانہ کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ سید احمد شہیدؒ کے رفقاء کی دینی، ایمانی حرارت آشکارا ہوتی ہے اور سید احمد شہیدؒ اور ان کی

جماعت کی سچی اور صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔

کاروانِ ایمان وعزیمت

اصحاب علم وکمال کی خاکہ نگاری وتذکرہ نویسی علی میاںؒ کا محبوب مشغلہ تھا۔ مجاہدین کی سرگرمیوں کی روداد ''کاروان ایمان وعزیمت'' اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو ان کی مشہور تصنیف ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے وقت اس کا مستقل باب تھا بعد میں علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ سید احمد شہیدؒ کے مشہور خلفاء اکابر جماعت کا تذکرہ ہے اور سیّد صاحبؒ کے بعد کی کوششوں اور سلسلہ تنظیم وجہاد کی روداد ہے۔ اس روداد کے چند اہم مجاہدین اور شہداء کے نام یہ ہیں مولانا عبدالحئی بڑہانویؒ، مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ، مولانا یحیٰی علیؒ، مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ، مولانا سید اولاد حسن قنوجیؒ۔

نزهة الخواطر فى بهجة المسامع والنواظر

نزهة الخواطر علی میاںؒ کے والد مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ کا شاندار علمی کارنامہ ہے۔ علی میاںؒ کے والد نے اس کی سات جلدوں کو مکمل کرلیا تھا لیکن آٹھویں جلد نامکمل چھوڑ کر ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۱ھ میں وہ اس دار فانی سے رحلت فرماگئے۔

''نزهة الخواطر'' خاموشی کے ساتھ تصنیف وتالیف کا ذوق رکھنے والے کم گو عالم کی علمی خدمات کا بلند پایہ نمونہ ہے۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں:۔

> ''یہ کتاب آٹھ جلدوں میں تیار ہوئی اس میں ساڑھے چار ہزار سے زیادہ شخصیتوں کے تراجم ہیں اس تصنیف میں مصنف نے جن مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے ان کی تعداد تین سو سے کم نہیں ہے اور وہ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں ہیں۔ کتاب کی پہلی جلد میں اُن اسلامی شخصیتوں سے لے کر (جو قرن اوّل میں ہندوستان آئیں جن

کوعلی میاںؒ نے طبقہ اوّل میں شمار کیا ہے)۔ ساتویں صدی ہجری
تک کے مشاہیر کے حالات ہیں مصنّف نے ہر صدی کے لوگوں کو
ایک طبقہ شمار کیا ہے۔ دوسری جلد میں آٹھویں صدی کے مشاہیر کے
تراجم ہیں کتاب کی یہ جلد سب سے پہلے شائع ہوئی۔ اسی طرح سے
ہر جلد میں ایک ایک صدی کے مشاہیر کے تراجم ہیں۔ یہاں تک کہ
ساتویں جلد تیرہویں صدی کے مشاہیر اور آٹھویں (آخری) جلد
چودھویں صدی کے مشاہیر کے ساتھ مخصوص ہے جن میں سے ایک
بڑی تعداد سے مصنف کو معاصرت، ذاتی واقفیت اور دید وشنید کا تعلق
ہے قدرتاً یہ دو آخری جلدیں سب سے زیادہ ضخیم ہیں۔"

(حیاتِ عبدالحیؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۲۶۶)

عربی کتابوں میں ہندوستان کے علماء کے جو تذکرے ہیں ان کا شمار علی میاںؒ نے کیا ہے حافظ سخاوی نے "الضوء اللامع" جو نویں صدی کے علماء کے حالات پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کے صرف ۸۸ اٹھاسی علماء کا ذکر کیا ہے۔ علامہ شوکانی یمنی نے ہندوستان سے قریب ہوتے ہوئے بھی "البدر الطالع" میں ساتویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی تک ہندوستانی علماء میں صرف سات کا ذکر کیا ہے۔ مُحِبّی نے "خلاصة الاثر" میں گیارہویں صدی کے علماء ہند سے چودہ کا تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ ان کی کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے ان کی تعداد بارہ سو نوے (۱۲۹۰) ہے۔ مرادی نے "سلک الدّرر" میں بارہویں صدی کے صرف سات علماء کا تذکرہ لکھا ہے"۔

(حیاتِ عبدالحیؒ حسنیؒ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۲۵۹)

"حکیم عبدالحیؒ حسنیؒ نے نزهة الخواطر میں چودہ سو سال پر پھیلے ہوئے ساڑھے چار ہزار سے زائد علماء کے حالات یکجا کیے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے اتنا وسیع رقبہ و سنین کے اعتبار سے اتنا طویل عرصہ اور مباحث کے اعتبار سے اتنا متنوع احاطہ، علماء کے حالات میں کسی عرب مصنف نے بھی نہیں کیا۔ عربی زبان کو اپنی علمی

سرگرمیوں کے لیے منتخب کر کے حکیم عبدالحئی الحسنیؒ نے انتہائی تدبر کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اس کتاب کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ عربی زبان کو استعمال کر کے انھوں نے اپنے علمی کارناموں اور ہندوستان کا تعارف عالم عرب میں کرایا بالخصوص ان کی اس عظیم الشان کوشش (**نزهة الخواطر في بهجة المسامع و النواظر**) نے ہندوستانی علماء و فضلاء کو اس علمی دھارے میں شامل کر دیا جو طبقات سیر و تراجم کی صورت میں عالمِ اسلام میں بہہ رہا تھا، اس طرح حکیم عبدالحئی حسنیؒ نے اس قرض کو اُتار دیا جو ہندوستانی علماء پر تھا، مذکورہ تصنیف نے نہ صرف عرب کے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا ۱۹۹۳ء میں اسلامک سینٹر آکسفورڈ نے **نزهة الخواطر في بهجة المسامع و النواظر** کی آٹھوں جلدوں کو کمپیوٹرائز کر دیا ہے۔ جس سے اس کتاب کی اہمیت اور صاحب کتاب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے''۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

نزهة الخواطر ہندوستان کی علمی وثقافتی تاریخ کی قیمتی دستاویز ہے۔ ۱۹۲۳ء میں مصنف حکیم عبدالحئی حسنیؒ دنیائے فانی سے کوچ فرما گئے۔ اور پہلی بار ۱۹۳۱ء میں دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد سے اس کتاب کی دوسری جلد شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ ۱۹۵۹ء تک اس کی سات جلدیں طبع ہوگئیں آٹھویں جلد باقی رہی یہ جلد ۵۵۹ تراجم پر مشتمل تھی اور مولانا عبدالحئی حسنیؒ کے لکھے ہوئے ناتمام تراجم کی کل تعداد ۳۵۰ تھی ان میں سے کچھ حضرات کے کارنامے ان کی وفات کے بعد ظاہر ہوئے جن کا اضافہ ہونا ضروری تھا۔ جو تحریری قوّت اور صلاحیت کے ساتھ کیا جانا تھا خالی جگہوں کی تکمیل، نئے اضافوں اور نئی عبارتوں کی پیوندکاری بہت مشکل کام تھا اس جلد کے تراجم میں اور جلدوں کے مقابلہ میں وسعت اور تنوع بھی زیادہ تھا۔ سوانح نگاری اور تذکرہ نگاری علمی دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ نزهة الخواطر کو مکمل کرنے کے لیے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی میں مہارت رکھتا ہو۔ جس میں بلند حوصلگی، وسعت نظر، علمی تنوع اور قوّت مطالعہ کے ساتھ وسعت قلبی،

علمی رواداری، فراخ دلی اور صبر وتحمل کی صفات بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ علی میاںؒ ان تمام خوبیوں سے متصف تھے۔ علی میاںؒ نے اپنے والد کے شاندار علمی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا اور اہم نامکمل تذکرے کو مکمل کیا۔

نزھۃ الخواطر جلد ہشتم میں علی میاںؒ نے اس بات کا خاص التزام رکھا ہے کہ مولانا عبدالحئی حسنیؒ اور خود ان کی تحریر میں فرق قائم رہے۔ اس کے لیے متن کتاب میں اضافہ کرتے وقت اس کو قوسین (بریکٹ) میں کر دیا۔ علی میاںؒ نے اس حصہ میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان کا طرز واسلوب دوسری جلدوں سے مطابقت رکھتا ہو کیونکہ اس کتاب کا خاص وصف ایجاز واختصار گٹھا ہوا طرز تحریر ہے۔ ''رسائل الاعلام'' کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ علی میاںؒ جب اس کتاب کی تکمیل میں مشغول تھے لغوی ونحوی مشکلات کے سلسلہ میں اپنے استاد شیخ تقی الدین ہلالیؒ المراکشی سے مراسلت فرمایا کرتے تھے۔ ۱۹۹۱ء میں ''نزھۃ الخواطر'' کا نیا ایڈیشن ''الاعلام'' کے نام سے نہایت مفید اضافوں کے ساتھ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی نے شائع کیا ہے۔

تذکرۂ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی

تذکرۂ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی چودھوی صدی ہجری کے مشہور ومقبول بزرگ اور عالم مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ (۱۲۰۸ھ۔ ۱۳۱۳ھ) کی سوانح، حالات وکمالات ارشادات وملفوظات کا مجموعہ ہے۔ ابتداء میں مصنف کے قلم سے مقدمہ ہے اس کے بعد انھوں نے اپنے والد حکیم عبدالحئی حسنیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف نزھۃ الخواطر کی جلد ہشتم سے مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا اجمالی تذکرہ نقل کیا ہے۔ اجداد وشیوخ کے عنوان سے خاندان کے بزرگوں اور شیوخ کا حال ہے۔ علی میاںؒ نے مولانا فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی کی ولادت طفولیت، تعلیم وتربیت، طرزِ معاشرت، حالات ومعمولات کے عنوان سے پیش کیے ہیں۔ شیخ کے کمالات کو وردِ محبت اور ذوق وشوق، اتباع سنّت اور احترام شریعت، قرآن حدیث سے عشق،

بزل وعطا، زہدوتوکل، فیض وتاثیر، کمال علمی، قرآن وحدیث کے الفاظ کے ہندی ترجمے جیسے عنوانات مقرر کرکے پیش کیا ہے۔ علالت اور وفات کے عنوان سے ان کی مرض الموت اور وفات تجہیز وتکفین کی تفصیل ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے شیخ کے بعض مریدین مثلاً مولانا محمد علی مونگیریؒ، حکیم عبدالحیٰ حسنیؒ، نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ، اشرف علی تھانویؒ، نواب علی حسن خاںؒ، مولانا عباد علیؒ کرسوی، مفتی عبداللطیف رحمانیؒ کے تاثراتی مضامین شامل کیے ہیں جو گنج مرادآباد حاضری کے بعد لکھے گئے ہیں۔ آخر میں شیخ فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی کے مریدین کے ناموں کی فہرست ان کی اولاد احفاد کا ذکر ہے۔

مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت کے نام سے علی میاںؒ نے ہندوستان میں تحریک دعوت وتبلیغ کے بانی مولانا الیاسؒ کی سوانح مرتب کی ہے، کتاب میں ان کی دعوت اور طریق دعوت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحریک کے حیات بخش پیغام سے آشنا کیا گیا ہے۔ علی میاںؒ ایک عرصہ تک تبلیغی تحریک سے مکمل طور پر وابستہ رہے اور مولانا الیاسؒ کے مخصوص طریق دعوت پر عمل پیرا رہ کر جماعتی نظام کے مطابق دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتے رہے۔ رجب ۶۲ھ میں مولانا الیاسؒ لکھنؤ تشریف لے گئے ایک مجلس میں علی میاںؒ نے مولانا کی ترجمانی کا فرض ادا کیا۔ مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت کے عمیق اور طاقتور پہلوؤں کو مفکرانہ ترتیب اور دل نشیں انداز میں پیش کیا۔ یہ تقریر ''ایک اہم دینی دعوت'' کے عنوان سے مولانا الیاسؒ کی حیات ہی میں شائع ہوئی۔ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور علی میاںؒ میں گہرا قلبی تعلق قائم تھا۔ علی میاںؒ نے ہندوستان میں ہی نہیں بیرون ہند، عرب ممالک میں بھی اکابرین تحریک کے مشورہ سے مولانا الیاسؒ کے طریق دعوت پر تبلیغ کا کام کیا، مولانا الیاسؒ کے انتقال کے بعد ان کی سوانح اور تجدیدی کارنامے کی روداد مرتب کی ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں خاندان کے اہم بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ خاندان، ماحول،

پیدائش، نشونما، تعلیم و تکمیل کا تفصیل سے ذکر ہے۔ دوسرے باب میں بستی نظام الدین کے قیام اور درس و تدریس کے اہتمام کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ تیسرے چوتھے باب میں میوات میں اصلاح و تعلیم کی ابتداء، مکاتب کے آغاز، میوات میں طلب دین کی عمومی تحریک، تبلیغی گشت کی ابتداء، تبلیغی کام کے نظم و انتظام کے ساتھ چار مرتبہ حج بیت اللہ شریف کی حاضری کی تفصیل ہے پانچویں باب میں میوات میں تبلیغی کام کے استحکام کے ساتھ دوسرے شہروں یعنی دہلی، سہارنپور، لکھنؤ وغیرہ میں دعوت و تبلیغ کے کام کی مفصل روداد ہے۔ چھٹے باب میں علالت، مرض الموت اور وفات کی تفصیل ہے۔ پسماندگان کے تعارف کے ساتھ مولانا کا حلیہ بھی رقم کیا گیا ہے ساتویں باب میں مولانا الیاسؒ کی خصوصی صفات اور امتیازات کا ذکر ہے۔ آٹھویں باب میں مولانا کی دعوت کا ذہنی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اصول و مبادی اور اس کی دینی و فکری اساس کو ان کے طریق کار اور نظام کار کی روشنی میں سپرد قلم کیا ہے۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا منظور نعمانیؒ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

> ''علی میاں کو دینی شخصیتوں کی سیرت نگاری اور دینی و اصلاحی تحریکات کی تاریخ نویسی سے خاص مناسبت ہے اور اس کا خاص ذوق اللہ نے ان کو بخشا ہے۔ اس سلسلہ میں مستقل کتاب کی شکل میں سیرت سید احمد شہیدؒ ان کا نقش اوّل تھا اور مولانا محمد الیاسؒ کی یہ سوانح نقش ثانی ہے۔''

(مولانا الیاسؒ اور ان کی دعوت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۳۶)

علی میاںؒ نے مولانا الیاسؒ کی دینی دعوت کے گوشوں کو اس کے محاسن و خصوصیات کے ساتھ سمجھا اور اپنے موروثی، اصلاحی و تجدیدی مزاج، علم و مطالعے کی مدد سے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ان کی سوانح اور شخصیت کے تعارف سے زیادہ اس کتاب میں مصنف نے ان کی دینی دعوت کی توضیح اور تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے تاکہ ان کے تجدیدی کام اور حیات بخش پیغام سے ہر خاص و عام آشنا ہو سکے۔

علی میاںؒ کی یہ کتاب ان کے سلسلہ تاریخ دعوت وعزیمت کی آخری کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تذکرہ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''سیرت سید احمد شہیدؒ (۲،۱) کی تالیف کے ذریعہ جو ۱۹۳۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اس سلسلہ کو تیرہویں صدی کے آخر تک (اور جہاں تک اس تحتی برّاعظم کا تعلق ہے) چودھویں صدی کی کئی دینی شخصیتوں اور داعیوں (جن میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں) کی سوانح مرتب کر کے اس سلسلہ کو اپنے زمانے تک پہونچا چکا ہے اس طرح درحقیقت ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا چھٹا حصہ بھی اور ساتویں حصہ کا بڑا حصہ بھی مرتب ہو چکا ہے''۔

(تاریخ دعوت وعزیمت۔ حصہ پنجم۔ ص:۱۱)

سوانح عبدالقادر رائے پوریؒ

رائے پور کے مشہور و معروف بزرگ عبدالقادر رائے پوریؒ کے حالات زندگی، شخصیت، اور نمایاں صفات کی داستان ہے۔ اس میں ان کے انداز تربیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے توازن و جامعیت، تعلق مع اللہ، خلوص و محبت کو جستہ جستہ واقعات و حالات کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ علی میاںؒ ان سے روحانی ربط رکھتے تھے یہ کتاب مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے فیض و تاثیر، معرفت و سلوک کا تذکرہ ہے۔ ابتداء میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے قلم سے عالمانہ بسیط مقدمہ شامل ہے۔

کتاب کے پہلے باب خاندان کے حالات بزرگوں کے احوال و سوانح کے بعد ولادت طفولیت اور تحصیل علم کے لیے اسفار، جفاکشانہ طالب علمی، تعلیم سے فراغت اور ملازمت پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں شاہ عبدالرحیمؒ سے وابستگی کی

روداد لکھی ہے۔ تیسرے باب میں رائے پور کے قیام کے دوران مجاہدہ، ریاضت، تربیت وتکمیل کے منازل اور سوانح کی تفصیل ہے۔

صحبتے با اہل دل

بھوپال کے معروف بزرگ اور عالم شاہ محمد یعقوب مجددیؒ (المتوفی: ۱۳۹۰ھ) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے شاہ صاحب ہندوستان میں سلسلہ مجددیہ کے اہم رکن تھے۔ آپ ساری زندگی علوم ومعارف اور سلوک وتصوف کے علمبردار رہے۔ بے شمار انسان بلاتخصیص مذہب وملّت آپ کے کمالات سے مستفید ہوئے۔ آپ اپنے والد شاہ ابواحمد مجددیؒ اور ان کے سلسلے کے صحیح جانشین تھے۔ طویل عرصہ تک آپ نے بھوپال اور اطراف بھوپال میں افادۂ عام کا سلسلہ جاری رکھا۔

علی میاںؒ حضرت شیخ شاہ محمد یعقوب مجددیؒ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ بھی علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا نہایت احترام فرماتے تھے۔ ایک واقعہ چشم دید گواہوں اور عقیدت مندوں کو اب بھی یاد ہے، علی میاںؒ نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

''ایک مرتبہ تو ایسا واقعہ پیش آیا جو عمر بھر نہ بھولے گا اور اس کی یاد مدت العمر چٹکیاں لیتی رہے گی۔ میں حیدرآباد سے آرہا تھا، میں نے اپنے معمول کے مطابق بھوپال مولانا محمد عمران خاں صاحب کو تار دیا کہ میں رات کو پہونچوں گا اور صبح سویرے پنجاب میل سے روانہ ہوجاؤں گا۔ منصوبہ یہ بنایا کہ رات نو بجے سدن ایکسپریس پہنچتا ہے۔ وہ وقت حاضری کا نہیں صبح اسٹیشن جاتے ہوئے سلام اور دست بوسی کرتا جاؤں گا شامت اعمال گاڑی لیٹ ہونا شروع ہوگئی اور چار پانچ گھنٹے لیٹ ہوگئی، دسمبر کا غالباً مہینہ تھا، سردی غیر معمولی پڑ رہی تھی، رات کو ڈیڑھ بجے جب گاڑی بھوپال اسٹیشن پہونچی تو میں احتیاطاً دروازے کے پاس آکر کھڑا ہوگیا کہ شاید مولانا عمران خاں کا قاصد معذرت کے لیے آیا ہو۔ اتنے میں دیکھا کہ میاں رضوان

دوڑے ہوئے آرہے ہیں، نزدیک آئے تو انھوں نے کہا حضرت صاحب تشریف لا رہے ہیں اور رات بھر یہیں پلیٹ فارم پر رہے ہیں، یہ سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور ایسا شرمندہ اور نادم ہوا کہ کچھ بنائے نہیں بنتی تھی کہ میں نے تار دینے کی غلطی کیوں کی۔ حضرت تشریف لائے، میں نے ندامت کا اظہار کیا تو فرمایا بڑی اچھی رات کٹی، ایسا وقت تو بہت مبارک ہوتا ہے پھر مجھے حکم دیا کہ میں سیٹ پر ہی بیٹھا رہوں بنفس نفیس کھڑکی کے سامنے کھڑے رہے، گاڑی مزید لیٹ ہوئی اور کسی طرح سے یہ سخت وقت کٹا، سوائے فنائیت اور ''اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم'' کی عملی تصویر کے آج تک اس کی تاویل سمجھ میں نہ آئی۔''

(نشانِ منزل' بھوپال، ۱۹۷۰ء، ص:۷۹)

علی میاںؒ نے لکھنؤ پہونچ کر حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کو معذرت نامہ ارسال فرمایا تو حضرت صاحبؒ نے خط کا جواب تحریر کیا، اُس خط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت صاحبؒ اعلیٰ ذوق رکھنے والے مردم شناس انسان تھے۔ علی میاںؒ کے بلند مقام و مرتبہ کی قدر دانی فرماتے تھے۔

والا صفات عالی تبار مولوی سید ابوالحسن علی صاحب ادام اللہ برکاتہٗ علینا

السلام علیکم

کرم نامہ شرف صدور فرما کر نہایت شرمندہ اور محجوب کیا اس عاجز کو جو روحی آرام اس شب میں حاصل ہوا تھا جس رات کو حضرت کے استقبال میں آرام کیا تھا اسٹیشن پر، ایسی خوشی اور فرحت کی کوئی رات مجھ کو اپنی زندگی میں یاد نہیں...... مدت سے انتظار اس امر کا تھا کہ کوئی موقعہ ایسا ملے کہ سکوت کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھوں یا کھڑا رہوں اللہ جل شانہٗ کا بے شمار احسان ہے کہ وہ موقع اللہ نے نصیب کیا''

اسی خط میں حضرت صاحبؒ اپنے ملفوظات کی قدردانی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

حضرت کی عنایت اور کرم فرمائی سے جو تازہ کلمات بے ساختہ منھ سے نکلتے

ہیں اپنی عنایت، بہتری اور برکت سے ان کو شرف فرما کر مزین فرما دیتے ہیں۔ یہ سب برکات حضرت کے ہی ہیں، حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد خانقاہ میں جو گفتگو کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے بارات سے دولہا تشریف لے گئے ہیں خود کہہ لو خود ہی سمجھ لو...... حضرت کی تشریف آوری بھوپال میں صرف اس عاجز ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام حضرات کے لیے موجب برکت اور موجب ترقی ظاہر و باطن اور اصلاح ظاہری اور باطنی ہوتی ہے۔ جزاک اللّٰہ عنا خیر الجزاء

تمام بچے بشوق الحاج سلام عرض کرتے ہیں اور بچیاں بھی سلام عرض کرتی ہیں حاضرین خانقاہ سلام عرض کرتے ہیں۔

۲ر ذی قعدہ ۸۷ھ، مطابق ۲۰ر فروری ۱۹۶۸ء

(بحوالہ کاروانِ ادب، اپریل ۱۹۹۷ء ص: ۱۷۷)

علی میاںؒ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللّٰہ کے بڑے قدردانوں میں تھے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان کئی بار بھوپال کا سفر کیا۔ خانقاہ مجددی میں حاضر ہو کر ان کی علمی مجالس میں شریک ہوئے اور ملفوظات کو قلمبند کرنے کا اہتمام کیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''ملفوظات جمع کرنے کی اجازت کسی کو بھی نہیں تھی۔ مولانا علی میاں صاحب ندویؒ یہ کرتے کہ مجلس میں خاموشی سے سنتے رہتے اور ختم مجلس کے معاً بعد تنہائی میں بیٹھ کر تمام و کمال ملفوظات کو لکھ ڈالتے، قوتِ حافظہ اور توجہ و التفات کے اس غیر معمولی کمال کو کرامت نہ کہیے تو اور کیا کہیے۔''

(نشانِ منزل، بھوپال، اگست ۱۹۷۰ء)

مجموعہ ملفوظات میں تیس مجالس کے ارشادات ہیں۔ جو عہدِ حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق ہیں، ان میں زندگیوں کی اصلاح کا پیغام ہے۔ حکمت و موعظت کا سامان ہے، ادبی چاشنی سے پُر بلاغت کا نمونہ ہیں۔ مرض کی تشخیص کے ساتھ دوا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

شاہ محمد یعقوب مجددیؒ نے حکایات اور تمثیلات کے پیرائے میں تصوف

اسلامی، سلوک اور معرفت کا درس دیا ہے، کتب تصوف چھوڑ کر قرآن وحدیث پر توجہ مرکوز فرمائی، ایک مجلس میں بڑھاپے کی شکایت کرنے والے کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''آخرت اور جنت مقصود اور نتیجہ ہے اور بڑھاپا اور موت اس کا ذریعہ اور پُل ہے اسی لیے مجھے تعجب ہوتا ہے جب کوئی بڑھاپے کی شکایت کرتا ہے اور بڑے درد وحسرت سے کہتا ہے اب مرنا ہی باقی ہے اور موت تو آنی ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان خوشی خوشی کھیتی کر کے جب غلہ کاٹنے اور اُٹھانے کا وقت آئے تو رنجیدہ اور مایوس ہو حالانکہ یہ ساری محنت ومشقت اسی دن کے لیے تھی اب اس کا افسوس کیوں اب تو غلہ اُٹھانے اور گھر لے جانے کا وقت آیا۔ حدیث میں آتا ہے جو اللہ کی ملاقات کا شائق ہو اللہ بھی اُس کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے۔ ''مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَائَهُ''

حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے لیے خدا کی طرف سے سلام اور پیغام آتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ، نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۔

(پارہ ۲۴، سورۃ حم السجدۃ، آیت: ۳۰. ۳۱)

ترجمہ: جنھوں نے اقرار کیا اور مان لیا کہ ہمارا رب بس اللہ ہے اور ہم اُس کے بندے اور پرستار ہیں پھر وہ اس قول وقرار پر مستقیم رہے (یعنی اللہ کی مرضیات کے تابع رہ کر زندگی اس طرح گزارے جس طرح اللہ کو رب ماننے کے بعد گزارنی چاہیے) تو ان اہل استقامت پر فرشتے آتے ہیں اور اُن کو پیغام دیتے ہیں کہ کسی طرح کا خوف وغم نہ کرو تمھیں اس جنت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم تمہارے رفیق ہیں حیات دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے میناؤں کا واقعہ سناتے ہیں ''میں کلکتہ میں

جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں ایک انگریز کے مکان میں مینا پلی ہوئی تھی، کلکتہ میں مکانوں کی دیواریں چھوٹی ہوتی ہیں اس لیے اکثر پاس پڑوس والوں کو دوسرے گھروں کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ میناؤں کا ایک جھنڈ گزرا اور انھوں نے آواز دی تو یہ مینا جو پنجرے میں تھی بے قرار ہوگئی اور بہت پھڑ پھڑائی، بالکل یہی حالت روح کی ہے جب وہ اوپر کی آوازیں سنتی ہے اور وہاں سے اس کے کان میں صدا آتی ہے کہ یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ.

(اے روح اپنے مالک و مولا کی یاد سے چین و اطمینان حاصل کرنے والی! پھر چل اپنے مالک اور رب کی طرف، تو اُس سے راضی وہ تجھ سے خوش اور شامل ہو جا میرے خاص بندوں کے زمرہ میں اور آجا میرے مقام رضا جنت میں)

تو وہ بھی پھڑ پھڑاتی ہے اور اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ پنجرے کی تیلیاں توڑ کر وہ بھی اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرے اور اپنے ہم جنسوں میں جا ملے لیکن وہ پنجرے سے مجبور ہوتی ہے بڑھاپے میں جسم ضعیف ہو جاتا ہے "وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ" (اور جس کو ہم بوڑھا کرتے ہیں اس کو لوٹا دیتے ہیں جسمانی بناوٹ میں یعنی وہ بچپن کی طرح پھر کمزور و ناتواں ہو جاتا ہے) گویا قفس کی تیلیاں کمزور ہو جاتی ہیں اور روح کو آزاد ہونے میں آسانی ہوتی ہے اس لیے بڑھاپا موجب شکر و مسرت ہے نہ کہ موجب شکایت و حسرت۔

(صحبتے با اہلِ دل، ص: ۶۵ تا ۶۷)

ایک مجلس میں فرمایا "لوگ دعا میں اپنے مقصود پر اور اُن لوگوں پر نظر رکھتے ہیں جن سے وہ مقصود حاصل ہو سکتا ہے اور نہیں ہوتا۔ میرے یہاں ایک کاریگر دن بھر بجلی کی وائرنگ اور فٹنگ کرتا رہا اس نے بڑی محنت اور خلوص سے کام کیا، میں نے اس کو انعام دینا چاہا کسی طرح قبول نہ کیا، مجھے اس کے جذبہ کی بڑی قدر ہوئی۔ ایک دن میں صحن میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ وہ آیا اور زار و قطار رونے لگا، میں سمجھا کہ اس کے کسی

عزیز کا انتقال ہو گیا، میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں بہت دن سے روزگار کی تلاش میں ہوں لیکن کوئی پوچھتا بھی نہیں، جہاں جاتا ہوں ناکام واپس آتا ہو، میں نے کہا میں تم کو خوش خبری دیتا ہوں کہ تم یوں ہی ناکام رہو گے اور کوئی تمہاری بات بھی نہیں پوچھے گا وہ گھبرایا اور اس نے کہا کیوں؟ میں نے کہا نوکری نہ ڈھونڈو خدا کو ڈھونڈو۔ تمہاری نظر مخلوق پر ہے خدا پر نہیں ہے تم اس کو منانے کی کوشش کرو کام خود تمہارے پاس آئے گا، فرمایا کہ وہ شخص جاہل تھا لیکن یہ بات فوراً اُس کی سمجھ میں آ گئی اگر پڑھا لکھا اور مولوی ہوتا تو اتنی جلدی نہ سمجھتا، علم بڑا حجاب ہے، چند دن کے بعد وہ بڑا خوش نظر آیا، اور کہا مجھے کام مل گیا اور کارخانے والے خود میرے گھر آئے اور مجھے لے گئے تنخواہ بھی کی اور سواری کے لیے سائیکل بھی دی۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگا میں نے کہا یہ شرک ہے اس کا شکریہ ادا کرو جس نے نوکری دی ہے''۔ (ص:۹۷)

اصلاحِ حال کے لیے نفع بخش حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کے ملفوظات کو علی میاںؒ نے نہایت اہتمام سے صفحۂ قرطاس پر منتقل فرمایا، یہ ملفوظات اپنے دامن میں اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کے لیے وافر سامان رکھتے ہیں اِن تمام ملفوظات میں توبہ، استقامت توبہ، ایمان، نماز، تلاوتِ قرآن، اوراد وظائف، ترکِ دنیا، فقر و فاقہ، مجاہدہ، صبر و رضا، توکل، حلم و بردباری، جود و سخا کی تعلیمات دی گئی ہیں۔

حضرت مجددیؒ اپنے سامعین کی استعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے قلبی امراض کا روحانی علاج تجویز فرمایا کرتے تھے۔ قرآن کریم، احادیث نبویہ اور اولیاء اللہ کے واقعات ملفوظات کی تاثیر کو دوبالا کر دیتے تھے۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کی اجازت سے یہ ملفوظات مولانا منظور نعمانی صاحبؒ نے الفرقان میں شائع کیے، یہ سلسلہ ۸۸ھ سے شروع ہوا، ۸۹ھ میں ۲۱ قسطیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ قارئین نے کتابی شکل میں اشاعت پر زور دیا۔ علی میاںؒ نے پورے سلسلہ ملفوظات پر نظرثانی کر کے عنوانات قائم کیے۔ ''صحبتے با اہلِ دل'' میں شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کے حالاتِ

زندگی بھی شامل ہیں۔ملفوظات کے بارے میں علی میاںؒ تحریر فرماتے ہیں: ''ان ملفوظات ومجالس میں جو زندگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے وہ قدرتی طور پر علمی تصنیفات اور عام تحریرات میں نہیں ملتی''۔

(صحبتے با اہلِ دل۔مولانا ابوالحسن علی ندوی)

سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ:

یہ کتاب گنگوہ کے جلیل القدر عالم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ (۱۳۱۵ھ۔۱۴۰۲ھ) کی سیرت وسوانح پر مبنی ہے اس میں شیخ کے باطنی کمالات کی مرقع آرائی بھی کی گئی ہے۔

علی میاںؒ کو شیخ کی صحبت نشینی کے بے شمار مواقع نصیب ہوئے دونوں حضرات کے درمیان ذہنی وقلبی تعلق وارتباط تھا۔حضرت شیخ، علی میاںؒ کی علمی صلاحیتوں سے واقف تھے اسی فرط اعتماد کی وجہ سے علی میاںؒ سے حضرت شیخ نے اپنی اہم عربی تصانیف پر مقدمے لکھوائے۔علی میاںؒ نے حضرت شیخ کی داستان زندگی کی مرقع آرائی کے نازک اور دشوار کام کو بڑی خوبی سے سرانجام دیا ہے۔

یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں وطن، خاندان اور بعض اہم خاندانی بزرگوں کا تذکرہ ہے۔اس میں شیخ کے خاندان کے مفتی الٰہی بخش کی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے معیت اور حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق اوران کی تحریک سے وابستگی کا بھی ذکر ہے دوسرے باب میں شیخ کی پیدائش، طفولیت، تعلیم، تلمذ وبیعت اوران کے والد کے انتقال کی تفصیل ہے۔تیسرے باب میں حضرت شیخ کے مسندِ درس پر رونق افروز ہونے کا ذکر ہے۔اسی میں مولانا سہارنپوری کی شفقت، ''بذل المجهود'' تصنیف کی تکمیل، دو عقد اور دو حج کا ذکر ہے اس باب میں شیخ کی تدریسی زندگی کے آغاز میں ان کو پانچ جگہوں سے بیش قرار مشاہروں پر دعوت کی تفصیل ہے۔یہ حصہ بڑا موثر ہے۔علمی دینی دعوتی کام کرنے والوں کے لیے حضرت شیخ کی دولتِ

دنیا سے بے التفاتی سبق آموز ہے۔ حضرت شیخ نے مظاہر العلوم کی قلیل آمدنی پر زندگی گزاری۔

چوتھے باب میں شیخ کے سہارنپور مستقل قیام، درس وتدریس، ارشاد وتربیت میں انہماک اور اس سلسلہ کے معمولات پیش کیے گئے ہیں۔ مزید چارج کی تفصیل اور اعزہ کی وفات کا ذکر ہے۔ حضرت شیخ کے بے مثال صبر وثبات کو پیش کر کے ان کی سیرت کے اس تابناک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں باب میں اہتمام رمضان، ان متبرک دنوں کے معمولات اور روحانی فضا کا ذکر ہے چھٹے باب میں مدینہ میں مستقل قیام وہاں کے شب وروز مشاغل ومعمولات اور ہندوپاک کے اسفار کی روداد ہے۔ ساتویں باب میں شیخ کی علالت، مرض الموت اور وفات کی تفصیل ہے۔ نویں باب میں شیخ کے وہبی کمالات اور نمایاں صفات اور خصوصیات ہیں۔ دسویں باب میں شیخ کے تصنیفی ذوق اور علمی وتحقیقی تصنیفات پر تبصرہ ہے۔ گیارہویں باب میں شیخ کے ارشادات وملفوظات اور منتخب تحریریں ہیں۔ علی میاںؒ نے شیخ کے اہم حالات نمایاں واقعات اور ان کی حسین اور پاکیزہ سیرت کی دلکش خط وخال نمایاں کیے ہیں۔ ان کے علمی دینی کمالات اصلاحی و تربیتی خدمات اور روحانی فیوض وبرکات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔

حیات عبدالحیؒ:

''حیات عبدالحیؒ'' کے نام سے علی میاںؒ نے اپنے باکمال نامور والد کی سوانح حیات مرتب کی ہے، ان کے علمی دینی کمالات اور خدمات کا مفصل تذکرہ پیش کیا ہے۔ ان کی تمام اردو، عربی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف پر تبصرہ بھی شامل ہے۔

کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں۔ باب اوّل میں خاندانی پس منظر جد امجد والد ماجد کا ذکر ہے دوسرے باب میں مولانا حکیم عبدالحیؒ حسنی کی ولادت، طفولیت، ماحول وخارجی اثرات، تکمیل علم، دینی رسوخ،

توازن و جامعیت کی تفصیل ہے۔ تیسرے باب میں بیعت وارادت تعلیم، سلوک واجازت، دینی مرکزوں کے سفر اور مشائخ علماء کبار سے استفادہ کی روداد سپرد قلم کی گئی ہے۔ چوتھے پانچویں اور چھٹے باب میں مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ کی اصلاحی، علمی سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر ہے نیز ندوۃ العلماء کی تحریک سے دلچسپی، تعاون ندوہ سے باقاعدہ تعلق کے ساتھ ندوہ میں مشغولیت ومصروفیت کا تفصیلی ذکر ہے۔ دارالعلوم ندوۃ میں مولانا محمد علی مونگیریؒ کے معتمد خاص اور مددگار ناظم سے بحیثیت ناظم منتخب ہونے کی تفصیل ہے ندوہ کے دورِ اختلاف اور انتشار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا حکیم عبدالحئی حسنی کے دورِ نظامت میں ندوۃ العلماء کے استحکام وترقی کے لیے کی گئی ان کی کوششوں کی روداد بیان کی ہے۔

ساتویں باب میں حکیم عبدالحئی حسنیؒ کی ذاتی زندگی، طبابت، کسب معاش، نظام الاوقات اور مرضِ وفات کی تفصیل ہے۔ آٹھواں باب ان کی نمایاں صفات، مزاجی خصوصیات، ذوق اور رجحان سے تعلق رکھتا ہے جس میں ان کے اخلاق، حسن سلوک، قناعت وتوکل، طبعی خصوصیات دینی وعلمی کمالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نویں باب میں ہندوستان کی دینی وعلمی عظمت، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کی تدوین اور حکیم عبدالحئی حسنیؒ کی عربی زبان میں تصنیفی خدمات کا جائزہ ہے۔ دسویں باب میں ان کی اردو تصانیف رسائل اور دینی تصانیف پر مفصل تبصرہ ہے۔ آخر میں بطور ضمیمہ حکیم عبدالحئی حسنیؒ کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی سوانح شخصیت اور خصوصی کمالات تحریر کیے ہیں۔

علی میاںؒ نے بڑے تذبذب کے بعد اپنے والد کی سوانح لکھنے کا عزم کیا جس کا احساس انہیں خود بھی تھا۔ سوانح حیات لکھنے میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی کی لکھی ہوئی اپنے والد کی مختصر سوانح ''یادِ ایام'' سے استفادہ کیا ہے۔ اپنے خاندان کے قلمی ذخیرے، انساب وحالات کی مدد سے کتاب کی تکمیل کی۔

حیات عبدالحئیؒ اس شخص کی داستان حیات ہے جس نے تمام عمر گوشہ گمنامی

میں رہ کر بغیر کسی اعلان و تشہیر کے علمی، تعلیمی، تصنیفی اور ادبی کام کیے۔ مولانا عبدالحیؒ کی تصنیف و تالیف اور سرگرمیوں کی ترجمان عربی و اردو دونوں زبانیں ہیں۔ لیکن عربی زبان کو اپنے اہم کاموں کے لیے منتخب کرنے کے ساتھ حکیم عبدالحیؒ حسنیؒ نے انتہائی تدبّر کا ثبوت دیا۔ ان کے اس عظیم الشان فیصلہ کے نتیجہ میں عالم اسلام ہندوستان کی علمی، تہذیبی و ثقافتی تاریخ سے متعارف ہوا۔ ہندوستانی علماء و فضلاء اس علمی دھارے میں شامل ہوئے جو طبقات و سیر و تراجم کی صورت میں عالم اسلام میں بہہ رہا تھا۔ اس طرح مولانا حکیم عبدالحیؒ حسنی نے عالم اسلام کے علمی نقشے میں ہندوستان کا مقام واضح کر دیا۔ حیاتِ عبدالحیؒ ہندوستان کے خاموش علمی و تصنیفی کام کرنے والے اولوالعزم عالم دین، مصنف اور مورّخ کی داستانِ حیات ہے۔ علی میاںؒ نے اپنے بڑے بھائی و مربی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کا مختصر تذکرہ تحریر کیا ہے اور حیات عبدالحیؒ کے اختتام پر اس کو بطور ضمیمہ پیش کیا۔ علی میاںؒ بہت کم عمری میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ بڑے بھائی نے بیک وقت باپ اور بھائی کی محبت دی۔ علی میاںؒ نے اس مضمون میں مولوی حکیم ڈاکٹر عبدالعلیؒ کے حالات، واقعات، تعلیم و تربیت اعزازات و انعامات، امتیازی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور اپنے سب سے بڑے محسن و مربی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیؒ اپنی بہت سی خصوصیات و کمالات کی وجہ سے ایک ایسی نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔ جس میں قدیم تہذیب و ثقافت اور مشرقی مغربی علوم کا نہایت حسین دلآویز امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی شخصیت اور زندگی مسلمان نوجوانوں کے لیے بالخصوص مدارس کے فضلاء کے لیے ایک قابل تقلید عملی نمونہ ہے۔ علی میاںؒ نے ان کی پختگی، جامعیت اور توازن کے ساتھ ان کی صفات اور علمی کمالات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ جس سے حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے توازن، جامعیت، اعلیٰ صفات اور علمی کمالات کی مرقع آرائی ہو گئی ہے۔

ذکر خیر

علی میاںؒ نے اپنی شفیق والدہ خیر النساء بہترؒ (۱۹۶۸ء) کے انتقال کے بعد ان کے حالات اور واقعات زندگی قلمبند کیے۔ یہ مضمون اوّلاً ماہنامہ رضوان لکھنؤ کے خاص نمبر میں شائع ہوا۔ اس خاص نمبر کے تمام مضامین کو ''ذکر خیر'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ کتاب میں شامل پہلا مضمون ''حالات و واقعات زندگی'' علی میاںؒ کا تحریر کردہ معلوماتی، تاثراتی مضمون ہے۔ علی میاں نے اس مضمون میں اپنی والدہ کے حالات زندگی اور واقعات تحریر کیے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں تقریباً ۹؍سال کی عمر میں علی میاںؒ کے سر سے سایہ پدری اُٹھ گیا۔ شفیق اور مغموم لیکن ہوشمند ماں نے علی میاںؒ کی اخلاقی دینی تربیت پورے فکر و توجہ کے ساتھ کی۔ تعلیم کے سلسلہ میں خطوط کے ذریعہ مشورے دیے اور اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔ یتیم بیٹے کے لیے ہمیشہ دعا و مناجات میں مشغول رہیں۔ منظوم دعا و مناجات کے دو مجموعے ''باب رحمت'' اور ''کلید باب رحمت'' ان کی زندگی میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گئے تھے۔ حافظ قرآن اور بے حد نیک دل، عبادت گزار، خدا ترس بی بی تھیں، اپنے وقت کے معروف بزرگ شاہ ضیاء النبیؒ کی سب سے لاڈلی صاحبزادی تھیں۔ گھریلو کاموں میں مجتہدانہ دماغ اور جدّت پسند تھیں بیحد سلیقہ مند واقع ہوئی تھیں۔ بچّوں بچّیوں کی تعلیم و تربیت کا بیحد شوق تھا چنانچہ بچّیوں کی تربیت کے لیے ''حسنِ معاشرت'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی علی میاںؒ کا یہ مضمون موثر دلسوز واقعات سے پر ہے اس پر ان کے تاثراتی جملے والدہ کی سیرت کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جن کی مثال آج کی دنیا میں نایاب ہے یہ مضمون علی میاںؒ کی والدہ کے حالات واقعات کا مرقع ہے۔ جستہ جستہ حالات واقعات سے جہاں والدہ کا جذبۂ ایثار و محبت ظاہر ہوتا ہے وہیں فرمانبردار بیٹے کا جذبہ اطاعت و خدمت بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ ''ذکر خیر'' کے مضامین پڑھنے والا ایک ایسی مثالی خاتون کی شخصیت

سے تعارف کا شرف حاصل کرتا ہے جس کی ساری زندگی ایثار وقربانی کی تصویر کہی جاسکتی ہے۔

''پرانے چراغ'' حصہ اوّل، دوم، سوم:

پرانے چراغ حصہ اوّل، دوم، سوم علی میاںؒ کی خاکہ نویسی اور تذکرہ نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کتابوں میں شامل مضامین مختلف طبقوں کے ارباب کمال کے متعلق ہیں اور بیشتر مضامین اہلِ کمال کی وفات کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان تاثراتی مضامین کا موضوع بلند پایہ علماء بھی ہیں، روحانی مشائخ بھی، داعیانِ دین بھی، رہبران ملّت بھی، مجاہدین بھی، مصلحین بھی، اہلِ کمال ادیب، شاعر اور احباب، رفقاء بھی۔ علی میاںؒ کے ان تاثراتی مضامین میں وہ اشخاص شامل ہیں جو اپنے سیرت وکردار، ملّی ودینی کاموں کی وجہ سے عزّت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ علی میاںؒ نے مضامین میں ان کی سیرت اور خدمات کے گوناگوں پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور زندگی کے اہم نقوش اور شخصیت کے خدوخال کو نمایاں کیا ہے۔ ان ارباب کمال کے اسماء کی فہرست ذیل میں باعتبار حروف تہجی پیش کی جارہی ہے۔

چند بلند پایہ عالم ورہنما انشا پرداز اور ادیب:

علامہ اقبالؒ، مولانا محمد احمد پھولپوریؒ، مولانا محمد اویس ندویؒ، علامہ بهجة البیطارؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، مولانا عبدالشکور فاروقیؒ، مولانا عبدالعزیز میمنؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، چودھری غلام رسول مہرؒ، مولانا ماہر القادریؒ، مولانا مناظر حسن گیلانیؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا نسیم احمد فریدیؒ، مولانا محمد یوسف کاندھلوی۔

مشائخ کبار ومصلحین:

مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا وصی اللہ فتح پوری۔

چند اساتذۂ کرام:

شیخ الحدیث حیدر حسن خاںؒ ٹونکی، شیخ خلیل بن محمد یمانیؒ، مولانا سید طلحہ حسنیؒ۔

چند ہستیاں بلند مقام لیکن گمنام :

مولانا سید حسن مثنیٰ ندویؒ امروہی، الحاج سید خلیل نہٹوریؒ، مولانا شاہ حلیم عطاؒ، سید صدیق حسن آئی سی ایس مرحوم۔

چند ہستیاں کچھ دوست کچھ بزرگ کچھ معاصر:

سید ابوبکر غزنویؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مفتی امین الحسینیؒ، شیخ حسن البناءؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، محمد سلیم مکّی، جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم، محمد صالح القزاز مرحوم، عبداللہ ابراہیم انصاریؒ، صوفی عبدالربؒ، عبدالباری ندویؒ، مولانا عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم، عبدالسلام قدوائی ندویؒ، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعیؒ، مولانا معین الدین احمد ندویؒ، مولانا سید منّت اللہ رحمانیؒ، مولانا مسعود علی ندویؒ۔

ہندوستان کے چند اہل کمال مشاہیر رجال:

مولانا ابوالکلام آزادؒ، حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، مولانا محمد علی جوہر مرحوم۔

چند خادمان دین کارکنان ملّت، احباب و رفقاء:

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی مرحوم، سید محمد جمیلؒ، مولانا عمران خاںؒ ندوی، مولانا عبیداللہ بلیاویؒ، شاہ عبدالرحیم مجددیؒ جے پوری، حاجی عبدالرشید ارشدؒ، حکیم عبدالقوی دریابادیؒ، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰنؒ، مولانا محبّ اللہ ندویؒ۔

چند عزیز اور محبوب شخصیتیں، خورد سال لیکن باکمال رفیق و عزیز:

مولانا ابوالخیر برق مرحوم، مولانا ابوالعرفان ندویؒ، سید احمد الحسنی مرحوم، مولوی

اسحاق جلیس ندویؒ، مولوی عبدالنورؒ (نور عظیم ندوی)، مولانا محمد الحسنیؒ عرف محمد میاں، امۃ اللہ تسنیم عائشہ مرحومہ، محمد ثانی حسنیؒ

مذکورہ بالا ممتاز افراد سے فاضل مصنف کے مخلصانہ روابط اور قریبی تعلقات رہے ہیں۔ یہ مضامین تاثراتی مضامین کے زمرہ میں شامل ہیں۔ ان میں شخصیتوں کی سوانح یا مکمّل تذکرہ اور تاریخ نہیں، نہ ہی یہ ان کے حالات و کمالات کی مکمّل تصویر ہے بلکہ مضمون نگار کے نقوش و تاثّرات ہیں۔ یہ مضامین صرف جذبات کی تسکین کے لیے نہیں لکھے گئے بلکہ نئی نسل کے سامنے مؤثّر طاقتور انسانی مثال پیش کرنا، مصنّف کا بنیادی مقصد رہا ہے۔

علی میاںؒ کی زندگی کے واقعات و تجربات اور دل کے احساسات اور تاثّرات ان شخصیتوں کی زندگی کے واقعات اور قلبی تاثّرات سے گھل مل گئے ہیں۔ مضامین میں مصنّف کے دور کی ترجمانی ہے اس کی تہذیب و ثقافت کے گلہائے رنگارنگ موجود ہیں۔ بیسویں صدی کے مؤثّر اور طاقتور شخصیتوں کی امتیازی صفات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے ہندوستانی اسلامی سماج اپنے تشخص و انفرادیت کو باقی و محفوظ رکھ سکا ہے۔ مشرقی عرب کے معروف داعیان دین، رہنمائے فکر اور طاقتور اسلامی تحریکوں کے قائدین بھی اس میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ موجودہ اسلامی بیداری پیدا کرنے اور مغرب پرستی اور مادّیت سے مقابلہ کرنے میں گزارا ہے۔

شخصیات و کتب (عربی)

یہ کتاب اہلِ کمال بزرگوں کی شخصیت سیرت کمالات کا مجموعہ ہے عربی میں تحریر ان مضامین میں مصنف کے قلبی تاثرات اور یادوں کا خزانہ ہے۔ عبقری شخصیات کا تعارف ہے۔ مضامین میں سیرت نگاری تذکرہ نگاری، خاکہ نویسی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ بزرگوں کے حالات و کمالات کے آئینہ میں انسانی زندگی، اسلام، اخلاص، للّٰہیت اور دعوت و تبلیغ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کتاب میں شامل تمام مضامین مضمون نگار کے حسن مذاق، لطافت طبع اور دینی و ملّی حمیت

کے گواہ ہیں۔ایک مومن کے ادیبانہ قلم سے لکھے گئے ان تعارفی مضامین میں بعض شخصیتوں کے ایسے خط وخال نمایاں ہوگئے ہیں جو روایتی سوانح عمریوں اور رسمی تاریخوں میں عام طور پر نمایاں نہیں ہوتے۔ یہ خط وخال سوانح نگاروں اور تاریخ نویسوں کو گمشدہ کڑیوں کی تلاش میں معاون ہوسکتے ہیں۔ان مضامین میں دلسوزی، دردمندی، بے ساختگی وبرجستگی ہے یہ علی میاںؒ کے علمی اشتغال، تاریخی ذوق، تذکرہ نویسی کے شوق کے آئینہ دار ہیں۔

شخصیات و کتب میں علی میاںؒ نے اپنی جن پسندیدہ شخصیات کا ذکر کیا ہے،ان میں محمد الیاس کاندھلویؒ،مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ،مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ مرحوم، علاّمہ سید سلیمان ندویؒ، حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ، شیخ خلیل بن محمد الیمانیؒ، امام شہید حسن البناءؒ، مفتی سید امین الحسینیؒ ،استاد سید قطبؒ، ڈاکٹر مصطفیٰ السّباعیؒ شامل ہیں۔

''شخصیات و کتب'' کے آخر میں ''میری محسن کتابیں'' الکتب التی عشت فیھا'' کے عنوان سے اکتالیس صفحات کا ایک مضمون شامل ہے۔یہ مضمون مولانا عبدالسلام قدوائیؒ ندوی اور علی میاںؒ کے زیرادارت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان ''رسالہ الندوۃ'' میں شائع ہوا تھا اس مضمون میں علی میاںؒ نے ان تمام کتابوں کا ذکر کیا ہے جن سے وہ بہت متاثّر ہوئے اور وہ کتابیں ان کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ہوئیں۔مذکورہ کتابوں نے ان کے ذہن کو جلا بخشنے کی راہ ہموار کی اور ان کو علم و ادب کے وسیع میدان میں لاکر کھڑا کردیا۔اس مضمون میں علی میاںؒ نے جن محسن کتابوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

''مسدس حالی، الطاف حسین حالی مرحوم، رحمۃ العالمین محمد سلیمان منصور پوریؒ، ارشاد رحمانی ،مولانا محمد علی مونگیریؒ، الحصن الحصین مرتبہ غلام امام محمد بن محمد بن الجزری الشافعیؒ ،الفاروق ،مصنفہ علامہ شبلی نعمانیؒ ،علمائے سلف مصنّف مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ تاریخ گجرات مصنفہ، حکیم عبدالحیؒ حسنیؒ،

قیام اللیل" مصنفہ محمد بن نصر مروزیؒ، البغدادی، تفسیر سورہ النور، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ الجواب الکافی من الدواء الشافی علامہ ابن قیمؒ، تعلیم المتعلّم، مصنفہ علاّمہ برہان الدین زرنوجی تلمیذ صاحب الھدایۃ ۔ الاسلام علی مفترق للطرق، مصنفہ محمد اسد "نزھۃ الخواطر فی بھجۃ المسامع والنواظر" مصنفہ مولوی عبدالحئی حسنیؒ، "مذھب و عقلیات" مصنفہ مولانا عبدالباریؒ ندوی، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورہ اخلاص۔

"کاروانِ زندگی" فی مسیرۃ الحیاۃ

کاروانِ زندگی علی میاںؒ کی خودنوشت سوانح ہے۔ یہ سرگزشت حیات سات حصّوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے حصہ اوّل میں علی میاںؒ نے اپنی پیدائش سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ حصہ دوم میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۳ء تک حصہ سوم میں ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۷ء تک حصہ چہارم میں ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء حصہ پنجم میں دسمبر ۱۹۹۰ء سے دسمبر ۱۹۹۳ء تک حصہ ششم میں جنوری ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک حصہ ہفتم میں ۱۹۹۷ء سے ۱۹۹۹ء تک ذاتی زندگی کے مشاہدات و تجربات، احساسات اور تاثرات ہیں۔ ہندوستان اور عالم اسلام کے واقعات، حادثات، تحریکات اور شخصیات کا ذکر ہے۔ اس خودنوشت سوانح حیات میں پوری بیسویں صدی کی تاریخ محفوظ ہوگئی ہے۔ علی میاںؒ کی سرگزشت حیات کاروانِ زندگی کی ابتدائی تین حصّوں کا عربی ترجمہ في مسیرۃ الحیاۃ کے نام سے مولانا محمد سلمان الحسینی (استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے کیا۔ عالمِ عربی کے مشہور ادیب صاحبِ طرز انشاء پرداز، اسلامی الفکر مصنف استاد علی طنطاوی نے کتاب پر دیباچہ تحریر کیا۔ یہ کتاب دار القلم دمشق سے شائع ہوئی۔ کاروانِ زندگی کے بقیہ حصّوں کا عربی ترجمہ مولانا سید جعفر مسعود ندوی کر رہے ہیں۔ اس سرگزشت حیات میں علی میاںؒ کے ذاتی حالات، مشاغل ملک و بیرون ملک کے سفر، واقعات، حوادثات و تحریکات کا مفصل ذکر ہے۔ مختلف علمی

سمیناروں، جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کی روداد ہے۔ علی میاںؒ کی زندگی بہت مشغول اور گوناگوں سرگرمیوں سے معمور تھی لیکن خوبی یہ ہے کہ ان تمام ہنگاموں کے ساتھ وہ علمی اشتغال قائم رکھتے تھے اور ان کا تصنیفی سفر بھی جاری رہتا تھا۔ 'کاروانِ زندگی' اسی علمی، ادبی و تصنیفی و تحریکی زندگی کی جدّ و جہد کی داستان ہے۔

خودنوشت سوانح، سوانح نگار کے حالات زندگی، تجربات، خیالات و تاثرات کا خزانہ ہوتی ہے۔ موضوع مصنّف کی اپنی شخصیت ہوتی ہے اور پوری کتاب اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ تاریخی حیثیت سے خودنوشت سوانح میں مصنّف کے ذوق کے مطابق اس کے ملک، معاشرے کے عروج و زوال کی داستان ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی تاریخ اور کامیابی اور ناکامی کا قصہ ہوتا ہے۔ ان تمام لوگوں کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے آس پاس ہوتے ہیں جن سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خودنوشت آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی ہوتی ہے۔ 'کاروانِ زندگی' میں علی میاںؒ نے ہندوستان اور بیرون ملک، عالمِ اسلام میں جو واقعات اور تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا ذکر کیا ہے اور ملک و ملّت دونوں کے نقطۂ نظر سے جو مسائل آزمائشیں پیش آئیں اور جو ردّعمل ہوا اس کا مفصّل تذکرہ ہے۔ علی میاںؒ نے اندرونِ ہند اور بیرونِ ہند کئی اہم سفر کیے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں دینی، علمی اجتماعات و مجالس منعقد ہوئیں جن میں شریک ہو کر علی میاںؒ نے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ اس روداد کو انھوں نے اس طرح قلمبند کیا ہے کہ اس عہد اور ماحول کا صحیح خاکہ اور تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کاروانِ زندگی کے مطبوعہ سات حصّے اس مقصد اور ضرورت کو ایک مخصوص انداز میں پورا کرتے ہیں۔ اس خودنوشت سوانح کے مطالعہ سے ہندوستان اور پڑوسی ملکوں اور عالم اسلام کے اہم مرکزوں کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر، پریشانی اور اضطراب کے ساتھ سامنے آجاتی ہے اور مصنّف کی عالمِ عرب، عالمِ اسلام کے مسائل سے باخبری ان کے بارے میں تشویش اور دردمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

علی میاںؒ نے کاروانِ زندگی میں ہندوستان کے ملکی مسائل، ملّی تشخص کے تحفظ، ملک کا اخلاقی زوال، معاشرتی اور سماجی بحران اور کردارکشی کا جائزہ اور مطالعہ پیش کیا ہے۔ ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، ان کو ختم کرنے کی کوششیں، علی میاںؒ و دیگر زعماء کی طرف سے دیے گئے مخلصانہ اور حقیقت پسندانہ مشوروں کا ذکر ہے۔ ان تمام حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے مسلمانوں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اس پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

اس سرگذشت میں ان دینی اور ملّی تحریکوں کا تذکرہ بھی ہے جن کی علی میاںؒ نے قیادت کی یا شریک ہوئے۔ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ، بیرونی ممالک میں اسلام کی ترجمانی اور اس کے تعارف کے سلسلہ میں کی گئی جدّ وجہد کا ذکر کاروانِ زندگی میں تفصیل سے کیا ہے۔ انھوں نے دنیا کی معروف واہم شخصیات کی وفات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ شخصیات دینی و ملّی نقطہ نظر سے قابل قدر حیثیت کی حامل ہیں اور کئی شخصیات کا تعلق علی میاںؒ کی اپنی ذات اور خاندان سے ہے۔

''کاروانِ زندگی'' ایک تاریخی دستاویز ہے، وقت گزرنے کے ساتھ تاریخ کے واقعات قصّہ پارینہ ہو جاتے ہیں اور آنے والی نسلیں ان دشواریوں اور جدّ وجہد کا اندازہ نہیں لگا سکتیں جو اس وقت پیش آئیں۔ کاروانِ زندگی میں تاریخی حالات اور حادثات پر ایک صاحب بصیرت اور عینی شاہد کی شہادت بھی ہے۔ کتاب کے تمام اجزاء بہت اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مؤرخین کے لیے واقعات کے تاریخی جائزہ و تحلیل کے وقت تاریخ نویسی کے گمشدہ کڑیوں کی تلاش میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ملک و ملّت کو جس حقیقت پسندی، بیداری، ہوشمندی، اعتدال و توازن، وسیع النظری اور وسیع القلبی کی ضرورت ہے کاروانِ زندگی کے مطالعہ سے پیدا کی جا سکتی ہے اور زندگی کے میدان میں موجودہ افراد اور آنے والی نسلیں اس سے بہت زیادہ فوائد حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کے ہر جزو میں آنے والی نسلوں کے لیے ہمت آفریں پیغام موجود ہے۔ خودنوشت کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ''مصنف کی ''انا'' بالکل نظر نہیں آتی۔ اس کی مثال

سوائے مخصوص اللہ والوں اور بزرگان سلف کے بہت مشکل سے ملتی ہے۔علی میاںؒ کی خودنوشت کی اس خصوصیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔"

(پسِ کارواں۔ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ)

عالم عربی کے صف اوّل کے صاحب قلم ادیب سید علی طنطاوی نے علی میاںؒ کی خودنوشت سوانح عمری فی مسیرۃ الحیاۃ پر نئے انداز کا دیباچہ لکھا ہے۔جس میں اُن کا اپنا انداز تحریر نمایاں ہے۔جس میں سلاست ہے شیریں بیانی ہے اور تصنّع سے پاک بلاغت ہے لکھتے ہیں:

"اب میں کیا کہوں اس کتاب کے سلسلہ میں برادرم ابوالحسن نے بولنے کی گنجائش ختم کردی ہے۔کہیں ایک انگلی کے بقدر خالی جگہ ہوتی تو قلم کے گھوڑے دوڑا دیتا۔میں نے بہت سی سوانح عمریاں پڑھیں ہیں کچھ لوگوں نے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اپنی یادداشت مرتب کی ہے جیسے احمد امینؔ اور کچھ لوگوں نے ادیبانہ طرز اختیار کیا ہے اور الفاظ کے بیل بوٹوں سے اپنے سوانح کا چوکھٹا تیار کیا ہے جیسے طٰہٰ حسین، کچھ لوگوں نے دیدوشنید یا مشاہدات یا ملاحظات مرتب کیے ہیں جیسے محمد کرد علی لیکن ہمارے بھائی ابوالحسن نے اپنی سوانح حیات میں گفتگو کی ہے۔"

'کاروانِ زندگی' ہندوستان اور عالم اسلام کے ممتاز عالم،ملی رہنما کی داستان حیات ہے جو تمام عمر،اسلام کے احیاء اور ملت اسلامیہ کی سربلندی،انسانیت کی فلاح وترقی کے لیے سرگرم عمل رہے۔یہ کتاب آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی معلوم ہوتی ہے جو ہندوستان اور دنیائے اسلام کے گذشتہ ستّر (۷۰) برس کے اہم قومی ملّی واقعات کی ایک مستند اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

علی میاںؒ کی سوانحی کتب اور خودنوشت سوانح اِس بات کی شاہد ہیں کہ وہ

بیک وقت سوانح نگار، محقق اور مورّخ ہیں۔ ''سوانح کی ترتیب اور تاریخی حالات کی کھوج تحقیق کا ایک جزو ہے۔ تحقیق کے بغیر مؤرّخ، سوانح نگار، سیرت نگار، تذکرہ نویس، ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ علی میاںؒ نے سوانحی کتب میں واقعات کی صحت پر زور دیا ہے۔ حقائق اور ان کے ماخذ کی تلاش کی ہے۔ واقعات کو ان کی صحیح شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی سوانحی کتب تاریخ کے دانشمندانہ فہم اور ادبی ذوق کی حامل ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان کے قلم سے نکلی ہوئی سوانح تاریخ بھی ہوتی ہے اور ادب کا اعلیٰ نمونہ بھی۔

مصنّف کی تاریخی بصیرت سے تاریخی واقعات میں اس وقت جان پڑ جاتی ہے جب اس کے پس منظر اور محرکات کے ساتھ اسے دیکھتے سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں متعلقہ زمانے کی روح کو گرفت میں لانے کا رجحان ملتا ہے۔ اسی لیے زندگی سے بھرپور واقعیت ملتی ہے مستقبل پر واقعہ کے اثرات نشاندہی ان کی فہم و فراست کو ظاہر کرتی ہے۔'' واقعات کے انتخاب اور تاثراتی معنویت کو ترتیب دینے میں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار ملتا ہے۔ وہ اپنی اجتہادی قوت اور ذہانت سے ایسے نتائج اخذ کرتے ہیں جو حقائق سے قریب اور بہت گہرائی لیے ہوتے ہیں۔

سوانح نگار کا اسلوب نگارش بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مواد کو صحیح طور پر سلیقے سے پیش کرنا ہی فن ہے۔ علی میاںؒ سیرت نگاری، سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی میں ماہر ہیں۔ وہ جس فکر کے راہبر ہیں وہ قدیم و جدید کے حسین امتزاج کا جامع ہے۔ عصری اسلوب میں جدید طرز تحقیق کے ساتھ متوازن معتدل انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔ جارحانہ اور متعصبانہ لہجے سے ہمیشہ احتراز کرتے ہیں چنانچہ سیرت، سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی پر ان کی قلمی کاوشات ستر سال پر محیط ہیں اور ان کے موجودہ مقام تک پہنچنے کی تاریخی داستان ہیں۔

علی میاںؒ نے پوری زندگی علماء و مشائخ سے استفادہ اور ملّت اسلامیہ کی

خدمت میں گذاری۔ بزرگوں کی مجلسوں میں شرکت اور استفادہ ان کا مزاج بن گیا۔ اپنے اس خوش گوار علمی سفر کی داستان بڑی جان سوزی و دردمندی سے بیان کی ہے۔ ان کے قلم سے سوانح تراجم اور تذکرے کے موضوع پر جو کتابیں آئیں موضوع کے اعتبار سے ان میں ہم آہنگی اور وحدت ہے لیکن اسلوب تحریر کے اعتبار سے جدّت و انفرادیت کا نمونہ ہیں۔ ''پرانے چراغ'' اور ''شخصیات و کتب'' میں شامل مضامین تاثراتی مضامین ہیں۔ جو ایک دو شخصیات کو مستثنیٰ کر کے سب ہی شخصیتوں کی وفات کے بعد لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین ان کے ادیبانہ قلم کے شاہکار ہیں۔

علی میاںؒ نے جن لوگوں کو دیکھا جوان کے شب و روز کے ساتھ رہے اور جن کو اپنی عملی زندگی میں پرکھا، ان میں متنوع اور کثیر الجہت شخصیات ہیں۔ ان شخصیتوں سے ملاقات کا زمانی رقبہ نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہے جبکہ مکانی رقبہ عالم عربی تک دراز ہے۔ مصنف نے ان شخصیتوں کے افکار و خیالات اور خدمات کی صحیح و سچی تصویر پیش کی ہے۔

'کاروانِ زندگی' ایک ایسی خودنوشت سوانح اور سرگزشت حیات ہے جو ایک مومن کے ادیبانہ قلم کا شاہکار ہے۔ معتدل نقطۂ نظر، عالمانہ توازن کی حامل ایک یادگار آپ بیتی ہے۔ ستر سالہ علمی ادبی، فکری اور اجتماعی زندگی کو سچائی صاف گوئی اور بے مثال سادگی بلکہ انکساری کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے یہی اس کتاب کا امتیازی وصف ہے۔ علی میاںؒ نے خودنوشت سوانح میں ناقدانہ تحلیل و تجزیہ کیا ہے، انداز فکر منطقی اور اسلوب بیان شگفتہ ہے۔ عربی و اردو ادب کے گذشتہ زمانہ میں لکھی ہوئی آپ بیتیوں سے زیادہ جامع و مکمل دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

سیرت و سوانح نگاری کے دشوار گذار میدان میں علی میاںؒ نے اپنی عربی تحریر و انشاء کی مشق اور تجربے کے ساتھ قدم رکھا تھا۔ انھوں نے متقدمین کے متعین کردہ اصولوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس فن کو اپنے وجدانی ذوق، علمی بصارت اور

بصیرت کے ساتھ آگے بڑھایا۔علی میاںؒ نے اپنے ذوق سوانح نگاری، تذکرہ نویسی کی مدد سے اور اپنے تصنیفی تجربات کی روشنی میں، سوانح نگار اور سوانح نگاری کے لیے اصول وشرائط بھی متعین کیے۔انھوں نے سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی میں اپنے متعین کردہ اصولوں کی مکمل پیروی کی ہے۔سیرت وسوانح اور تذکرہ نویسی کے بارے میں علی میاںؒ کا نقطۂ نظر ان کے وسیع مطالعہ علم وتجربہ پر مبنی ہے۔ان کے قلم سے نکلے ہوئے تذکرے، سیرت وسوانح ان کے زرّیں خیالات کے ترجمان بھی ہیں۔عربی اور اردو ادب میں علی میاں کا بحیثیت سیرت وسوانح نگار اور تذکرہ نویس منفرد مقام ہے۔

☆☆☆

''ہم تاریخ اور سیرت کی کتابیں پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن شیخ ندوی ان میں سے وہ لعل وجواہر تلاش کر لیتے ہیں جن کی طرف ہماری نگاہ بھی نہیں پہونچتی''۔

(شیخ یوسف القرضاوی)

ادبِ اسلامی ایک سدا بہار درخت

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ادبی خدمات

علمائے عرب کی طرح فصیح عربی لکھنے اور بولنے پر قدرت رکھنے والے علی میاںؒ ایک عالم دین تھے۔ علمِ دین ہی ان کا اوڑھنا بچھونا اور ان کے فکر و رجحان کا محور تھا۔ قرآن کریم کے عمیق مطالعہ نے علی میاںؒ کے قلب وجگر کو حرارت بخشی اور اس وحی ربّانی کے اسرار و رموز سے بہرہ یاب ہوئے نیز نورِ نبوت ان کی زندگی کا روشن چراغ بن گیا جس سے ان کی ذات نے تعلق مع اللہ اور حبِّ رسول ﷺ کی گرمی حاصل کی۔ قرآن کریم وحدیث رسول کریم ﷺ تو ادبِ عالیہ کے بہترین نمونے ہیں، علی میاںؒ نے ان کا براہِ راست عربی میں مطالعہ کیا نیز ان کی تدریس کے مراحل سے گزرے۔ وہ ادب کی بہترین کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے، اعلیٰ ادبی زبان لکھنے اور بولنے پر قدرت رکھتے تھے۔ پُر اعتماد، طاقتور علمی اسلوب میں با مقصد اصلاحی و تعمیری، عالمانہ، سنجیدہ اور شگفتہ ادب کے دلدادہ تھے۔ ادب کو وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بلکہ اصلاح و تعمیر کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنی تحریر اور تقریر میں برمحل موزوں اشعار اور فصیح و بلیغ اقتباسات استعمال کرتے تھے۔

عربی زبان کے علمی خزانے کو تلاش کرنے میں انھوں نے عربی زبان دانی کی صلاحیت سے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور خالص اسلامی ادب کی تشکیلِ جدید کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ اس وقت رابطة الادب الاسلامي العالمية کے عالمی پیمانہ پر متعدد ارکان ہیں اس کا دائرہ عرب سے انڈونیشیا، ملیشیا تک پھیل چکا ہے ادبِ اسلامی کا یہ سدا بہار درخت نئے برگ و بار کے ساتھ علی میاںؒ کی سیادت و قیادت میں تقریباً دو دہائیوں تک برسرِ عمل رہا ہے۔

علی میاںؒ کے قلم سے متعدد وقیع علمی کتب منظرِ عام پر آئی ہیں ان کتابوں

نے عربی زبان وادب کی گمشدہ راہوں سے آشنا کیا، بچّوں کے ادب کے سلسلہ میں قصص النبیین للأطفال، القرأۃ الواشدۃ اور نوجوانوں کے لیے 'مختارات من ادب العرب' بہت اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں۔ علی میاںؒ کی ادبی تصانیف نقوش اقبال (روائع اقبال)، کاروانِ مدینہ (الطریق الی المدینۃ)، تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب (روائع من أدب الدعوۃ فی القرآن والسیرۃ) اور 'نظرات فی الادب' ادب، تنقیدِ ادب، انشاء اور نصابِ تعلیم کے سلسلہ کے بہترین نمونے ہیں۔ علی میاںؒ نے اپنی تصانیف کے ذریعہ عربی زبان کو تقریر وتحریر کی زندہ زبان کی طرح برتنے کے سلیقے سے آشنا کیا، چھوٹے بچّوں اور نوجوانوں کی نفسیات طرزِ فکر کو مدّنظر رکھا، ایمانی حقائق کی طرف بلیغ اشارے کیے، سیرت کی تعمیر اور ذہن سازی کا کام کیا ہے اپنی علمی لیاقت، صلاحیت پاکیزہ ذوق اور حسن انتخاب کے نمونے پیش کیے ہیں، قرآن کریم اور حدیث نبویہ کی روشنی میں تبلیغ و دعوت کے معجزانہ اسلوب کی نشاندہی کی اور قرآن فہمی کی نئی شاہراہ دکھائی ہے۔

مرکز اسلام میں ایمان ومحبت کی کمزوری اور جذبات ووجدان کی سرد کیفیت کا احساس ہوا تو ''کاروانِ مدینہ'' (الطریق الی المدینۃ) کی تقاریر ومضامین کے ذریعہ ذاتِ نبوی کی عظمت کو ذہن نشین کرانے کے ساتھ سراپا محبوب ذات سے جذباتی لگاؤ میں شدت پیدا کرنے کی کوشش کی، جو بہت کامیاب ہوئی، علمائے عرب اور علمائے اسلام نے اس کوشش کو سراہا۔

''نقوش اقبال'' (روائع اقبال) کے ذریعے اقبالؔ کے کلام وپیام سے عربوں کو آشنا کیا، سلیس شگفتہ اور عالمانہ اسلوب میں اشعار اقبال کی ترجمانی کی۔ اقبال کی شعر وفکر کا اسلامی تناظر میں جائزہ لیا۔ کلام وپیامِ اقبال پر اسلام کے نقطۂ نظر سے ناقدانہ بحث کی، مضامین میں مصنف کی علمیت وخلوص نمایاں نظر آتا ہے۔

مفکر اسلام علی میاںؒ ''اسلامی ادب'' کے تعارف وتشریح کے ساتھ اسلامی رجحان رکھنے والے ادب کو اس کے طاقتور اسلوب کے ساتھ پیش کرتے رہے اور اسلامی ادب

کے ذخیرے میں نئے اضافوں کے ساتھ ساتھ نقد و ادب کے رہنما اصولوں کو متعین کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ علی میاںؒ کا کہنا تھا ''لفظ ادب کے معنوں میں قدیم زمانوں سے اخلاق کا مفہوم شامل رہا ہے...... حدیث صحیح کے الفاظ ''میرے رب نے میری اخلاقی تربیت کی اور خوب کی'' علی میاںؒ چاہتے تھے کہ ادب میں اخلاق، تہذیب اور اعلیٰ انسانی قدریں شامل ہوں اور اس دور میں جب کہ ادب خیر و شر، صلاح و فساد دونوں کے لیے مؤثر ذریعہ ہے، اہلِ قلم کو ادب و اخلاق کے رشتہ کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ فطرت انسانی کا روحانی پہلو جس کا براہِ راست تعلق مذہب سے ہے ادب میں غالب رہنا چاہیے کیونکہ یہی چیز ادب کو ''صالح ادب'' کے زمرہ میں لاتی ہے، گذشتہ دو دہائیوں سے عربی اور دیگر زبانوں پر کمیونسٹ رجحان کے تسلط کی وجہ سے مذہب کو بے دخل کر دیا گیا تھا بلکہ نا قابل برداشت سمجھا جاتا تھا۔ ادب میں اسلامی رجحان و تقاضہ کی موجودگی نے ان کے نزدیک ادب کو بے ادب بنا دیا تھا اگر چہ ادب کی اسلامی اصطلاح، قدیم اصطلاح ہے۔ عربی میں یہ اصطلاح اصلاً اسلام کے ابتدائی ادبی عہد کے لیے استعمال کی جاتی رہی جو آغازِ اسلام سے ۱۳۲ھ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی لفظ ادب کا استعمال اسلامی تصوّر اور فکر کی بنیاد پر بھی کیا گیا لیکن وہ اصطلاح نہیں بنا''۔

علی میاںؒ نے مغربی ادبی فلسفہ و فکر کے حملوں کے بعد ادب کو اسلامی تناظر میں دیکھا، ادب کی اس اصطلاح کو قدیم و جدید دونوں ادبی سرمایوں تک وسیع کرنے کا کام انجام دیا۔ ان کا نظریہ ادب، پُر اعتماد لہجے میں وسعت فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ ''ادب کو زندہ وجود سمجھتے تھے، جس کے پہلو میں درد بھرا دل، باشعور ضمیر، زندہ احساس، پختہ عقیدہ اور اس کا ایک صحیح و معین نصب العین ہوتا ہے، وہ ادب کو وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بلکہ بلند شریفانہ اغراض و مقاصد تک پہنچنے اور فطرتِ انسانی کو متاثر کرنے کا بہترین وسیلہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے نزدیک ادب کا دائرہ بھی وسیع اور آفاقی ہے اس میں بلند افکار ادیبوں کے خیالات کے ساتھ سائل کی صدا، غریب کی

فریاد، ماں کی لوری، خدا شناس کا نالۂ نیم شب بھی شامل ہے''۔

علی میاںؒ جس اسلامی ادب کے داعی اور مبلغ تھے ان کی تصانیف اس کا جیتا جاگتا نمونہ، ان کے اسلامی فکر کی مکمل غماز ہیں۔ ان میں وجدانی قوّت، اندرونی کیفیات، دلی جذبہ، بے قراری، بے چینی شامل ہے۔ ذوقِ سلیم کے ساتھ اسلوبِ بیان پر قدرت بھی حاصل ہے۔ علم وادب عقل واستدلال حسنِ بیان کے ساتھ خونِ جگر بھی شامل ہے۔ اسی وجدانی قوّت، غیر معمولی تاثیر اور پُر اعتماد اور طاقتور اسلوب نے ان کی تقریر اور تحریر کو مقبولیت عطا کی ہے۔

قصص النبيين للأطفال

عربی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی علی میاںؒ کی اہم کتاب ہے، اس کتاب کے پانچ جزو ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

الجزء الأوّل: ابراہیم علیہ السلام سے یوسف علیہ السلام تک، الجزء الثاني: نوح علیہ السلام سے حضرت صالح علیہ السلام تک، الجزء الثالث: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور الجزء الرابع حضرت شعیب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے قصوں پر مشتمل ہے۔ ''سیرۃ خاتم النبیین'' اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے جس میں رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیّبہ کو پیش کیا ہے، علی میاںؒ نے یہ کتاب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مبتدی طلباء کے لیے درسی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے لکھی تھی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم ڈاکٹر عبدالعلی حسنی کے دورِ نظامت میں لکھی گئی تھی، قصص النبیین دارالعلوم کے اصلاح نصاب کی کوششوں کا کامیاب نمونہ ہے۔ انبیاء کرام کے قصّوں پر مشتمل اس کتاب کے لکھنے کی تحریک اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دارالعلوم میں کامل کیلانی کی کتاب حکایات للأطفال کا سلسلہ داخل تھا اور وہ اُس وقت تمام ممالک عربیہ میں حد درجہ مقبول

ہو رہا تھا مجھے اس کے پڑھانے سے بھی واسطہ پڑا مجھے اس کا خالص سیکولر ہونا، جانوروں کے قصے اور تصویروں کی بھرمار چبھتی تھی۔ مخدوم ومحترم عبدالماجد دریابادی نے (جن کی دینی غیرت اور حساسیت طبقۂ علماء کے لیے باعثِ غیرت تھی) خاص طور پر اس پر متوجہ فرمایا۔

(کاروانِ زندگی۔حصہ اوّل۔ص:۲۱۵)

رنگین تصاویر سے مزیّن جانوروں اور جن و پریوں کے قصّوں والی مصر کی کتابیں دارالعلوم کے تعلیمی نقطۂ نظر سے میل نہیں کھاتی تھیں۔علی میاںؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خاص طرزِ فکر کو پیش نظر رکھتے ہوئے 'قصص النبیین للأطفال' لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔جلیل القدر انبیاء کے قصوں کو بچّوں کی نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے نہایت آسان زبان اور دلنشیں انداز میں تحریر کیا۔ کتاب کے طرزِ اسلوب کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اس میں تین باتوں کا التزام کیا گیا ہے۔(۱) الفاظ کا ذخیرہ کم سے کم ہو لیکن اعادہ وتکرار سے اس کو ذہن میں نقش کردیا جائے۔ (۲) کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے اور آیاتِ قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑ دی جائیں۔ (۳) اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، رسالت، آخرت) کی تعلیم وتلقین ضمناً ہوجائے۔(۴) قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے اور ان میں رہنمائی کا سامان ہو کہ ان کے دلوں میں کفر کی نفرت،ایمان وتوحید کی محبّت اور انبیاء کی عظمت راسخ ہوجائے اور یہ سب غیر شعوری طور پر ہو''۔

(کاروانِ زندگی۔حصہ اوّل۔ص:۲۱۶۔۲۱۷)

علی میاںؒ نے ۴۳۔۱۹۴۴ء سے قصص النبیین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ کتاب کے دو حصّے ہی شائع ہوکر منظرِ عام پر آئے۔ ۳۵ سال کے طویل وقفہ کے بعد ۱۹۷۵ء میں اس سلسلہ کی تکمیل کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئے اور اس کا

تیسرا چوتھا حصہ لکھا، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیاء کرام کے قصے شامل ہیں۔

بچوں کے لیے حضرت محمد ﷺ کی سیرتِ طیبہ اس سلسلہ کی آخری کتاب ہے جو مصنف نے ۱۹۷۷ء میں مکمل کی۔ یہ کتاب عربی میں 'مؤسسة الرسالة بیروت' سے شائع ہوئی۔

علی میاںؒ نے سیرۃ خاتم النبیین للأطفال حضرت محمد ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر بچوں کی درسی کتاب کی حیثیت سے لکھی تھی جس کی طرزِ تحریر میں معروضی انداز اپنایا ہے۔ کتاب سیرت کے صحیح اور مستند واقعات پر مبنی ہے، زبان نہایت صاف، شیریں اور دلنشیں ہے۔ واقعات کا انتخاب بھی بہت خوب ہے۔ کتاب، بے حد عقیدت، خلوص اور دلی جذبہ سے لکھی گئی ہے۔ اس لیے مؤثر اور دل آویز ہے۔ واقعات کی پیشکش میں دینی و اخلاقی تربیت کا سامان بھی موجود ہے واقعات سے صحیح نتائج اخذ کیے گئے ہیں قابل غور پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف سکریٹری رابطہ ادب اسلامی (پاکستان) نے کیا۔ ہندی ترجمہ احمد علی ندوی مدیر دارِ عرفات رائے بریلی نے کیا ہے۔

جامعۃ ازہر کے استاد، عظیم المرتبت اسلامی ادیب احمد شرباصی نے بچوں کی تربیت کے لیے بیدار اور باخبر رہنے کو اہم اور ضروری قرار دیا ہے۔ علی میاںؒ کی دور بینی اور دور اندیشی کی تعریف کرتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "عربی شاعر نے بچوں کے بارے میں کہا ہے ہمارے درمیان زمین پر چلتے ہوئے بچے ہمارے جگر پارے ہیں...... بچے ہماری بیش قیمت امانت ہیں۔ ان کی حفاظت و نگرانی بہت ضروری ہے، وہ اپنے مربیوں اور سرپرستوں کے ہاتھ میں ملائم گندھے ہوئے آٹے کی طرح ہیں جیسی چاہو شکل دے دو...... زمانہ طفولیت کی تعلیم و تربیت کے نقوش گہرے اور اَن مٹ ہوتے ہیں اس

زمانے کی تربیت بچّوں کے دل اور دماغ، خیالات اور رجحانات کو زیادہ متاثر کرتی ہے...... بچپن کی تعلیم ایسی ہے جیسے پتھر کا اَن مٹ نقش...... دیکھیے ہمارے فاضل بھائی ابوالحسن علی کو انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا، انھوں نے مسلم بچّوں کے لیے کیسا انمول، نایاب، بیش قیمت قصص النبیّین کا سلسلہ تیار کیا ہے وہ دین کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں...... قصص النبیّین کا اسلوب سادہ، آسان، پُرکشش ہے زبان کے تمام محاسن اس میں موجود ہیں''۔

(سیرت خاتم النبیین۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۴۔۵)

برصغیر ہندوپاک، عالمِ اسلام اور عالمِ عرب کے علمی حلقوں میں اس سلسلۂ قصص کو بے حد سراہا گیا اور ماہرینِ تعلیم نے اس بات کا اعتراف کیا کہ قصص النبیّین کے سلسلے کی یہ کتابیں بیک وقت زبان آموزی اور دینی تلقین کا کام کرتی ہیں۔علی میاںؒ نے کتاب کی ترتیب وتالیف کے سلسلہ میں چھوٹے بچوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سامنے رکھا ہے۔اوّل سے آخر تک قصے کہانیوں کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔سلیس اور شستہ عربی میں پیغمبروں کے سچے سبق آموز قصے لکھے ہیں۔ایک حساس اور باریک بیں استاد کی طرح انھوں نے اس کتاب کے تمام اجزاء میں بچّوں کی عقلی اور روحانی غذا کا اہتمام کیا ہے۔

قصص سے متعلق قرآنی آیات کو جو قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر غیر مسلسل طور پر ملتی ہیں نہایت سلیقے سے یکجا کیا ہے اور ان میں ربط قائم کیا ہے ان کی اس کوشش سے قرآن کریم کے سیاق وسباق میں انبیاء کے قصص اپنی تمام لسانی خوبیوں کے ساتھ ایک جگہ آگئے ہیں۔ یہ مضامین عربی زبان کی تعلیم کے ساتھ قرآن پاک سے مناسبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔کتاب کے تمام اجزاء کے ذریعہ عربی زبان کے اسلوب بیان کے اصولوں سے واقف کرایا ہے۔عربی زبان کو تقریر وتحریر کی زندہ زبان کی طرح برتنے کا سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کی

ہے۔ مصنّف نے اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لیے قصّوں کے درمیان ضروری تفصیلات دی ہیں، ایمانی حقائق کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں جو پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور عقائد کو درست کرنے میں بھی معاونت کرتے ہیں۔

علی میاںؒ کی چھوٹی بہن امۃ اللہ تسنیم عرف عائشہ بی نے قصص النبیین کے تمام اجزاء کو عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''حقیقتاً علم کلام کی کتاب ہے ایمان کے مسائل، توحید کے مسائل جس حسین لطافت سے اس کے اندر جمع کر دیے گئے ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ ادھر زبان و اسلوب بیان کے اصول سمجھتی گئی اُدھر قلب ایمان اور حقائق سے منور ہوتا گیا۔ دماغ نے نشو ونما پائی، روح نے بالیدگی محسوس کی۔

معروف عربی ادیب، انشاء پرداز، محقق اور مفکر سید قطب شہیدؒ نے مصنّف کی محنت پر دل کھول کر داد دی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

> ''میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچّوں کے لیے لکھی گئی ہیں، اور جن میں انبیاء کرام کے حکایات و قصص بھی شامل ہیں خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی ہے جو القصص الدینی للأطفال کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لیے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں تکلّف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ ''قصص النبیین للأطفال'' کے مصنّف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کیے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے اس لیے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصہ کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں

جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں‘‘۔

(مقدمہ قصص النبیین۔ جزء ثالث۔ مطبوعہ دارالکتب العربی ۱۳۷۳ھ)

یہ کتاب ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور روس کے علاوہ کئی اسلامی و عربی ممالک کے مدارس میں بطورِ نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ مصنف خود اپنی اس کتاب پر نازاں ہیں۔ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

’’مصنف اپنی جس خدمت اور توفیقِ الٰہی پر سب سے زیادہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے لیے اسے ذریعہ مغفرت اور ذخیرۂ آخرت تصور کرتا ہے وہ قصص النبیین کا مقبول سلسلہ ہے‘‘۔

القرأة الراشدة

القرأة الرّاشدہ علی میاںؒ نے تین حصوں میں ترتیب دی ہے۔ مصنّف کے تدریسی دور میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مصر کی وزارتِ تعلیم کی مرتب کردہ عربی ریڈر شامل نصاب تھی القرأة الراشدہ اسی کتاب کے نعم البدل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے مصنف نے اس کے اسباب تالیف اس طرح بیان کیے ہیں:

’’مجھے کئی سال درجہ میں اور درجہ کے باہر مصر کی وزارتِ تعلیم کی مرتب کردہ ریڈروں کے سلسلۂ القرأۃ الرشیدہ ۱۔۲۔۳ کے پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ کتاب زبان کی صحت، اصولِ تعلیم، بچوں کی نفسیات، سن و سال اور معلومات کے لحاظ سے ہر طرح کامیاب ہے۔ دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے بھی خالی نہیں لیکن وہ اصلاً مصر کے بچوں (جن میں ایک تعداد عیسائی اور قبطی بچّوں کی بھی ہوتی ہے) ترتیب دی گئی ہے پھر اس پر قدرتاً اور ضرورتاً مقامی اور ملکی چھاپ بھی ہے بکثرت اسباق قاہرہ کے گرد و نواح کے مقامات آثارِ قدیمہ مصری شخصیتوں سے متعلق ہیں‘‘۔

(کاروانِ زندگی حصہ اوّل۔ ص: ۲۱۳)

عرصہ سے ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم کے لیے ایک ایسے نصاب کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں تنوعِ مضامین، معلوماتِ عامّہ، روزمرّہ کی ضروریات اور اخلاقی و اسلامی اسباق ہوں جو عربی تعلیم کے لیے وہ کام کر سکے جو دوسری زبانوں کی ریڈرس انجام دیتی ہیں۔ علی میاںؒ نے عربی زبان کی تعلیم کے لیے اس کی تالیف کا آغاز کیا۔ تعلیمی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ برصغیر ہندوپاک اور عالمِ اسلام کے مدارس میں داخلِ نصاب کی گئی۔ مصنّف نے کتاب اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لکھی تھی۔ مفید اور ضروری معلومات کو اسباق کی زینت بنایا تھا تاکہ نوجوانوں کی سیرت کی تعمیر اور ذہن سازی کا کام بھی ہو سکے۔

> ''کتاب میں اس بات کا التزام کیا گیا کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ بھی نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لادی جارہی ہے یا اس کو خارجی انجکشن دیا جارہا ہے''۔

(کاروانِ زندگی حصہ اوّل۔ ص: ۲۱۴)

چھوٹی عمر کے طالب علموں، لڑکوں کی نفسیات اور ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر **القرأة الراشدہ** کی تالیف کی گئی۔ اس کے مشمولہ مضامین اسلامی تعلیمات، دینی موعظت اور آداب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جیسے **كسرة من الخبز، تاريخ القميص، ماذا تحب أن تكون؟ كن احد السبعة؟** وغیرہ بعض اسباق معلوماتِ عامہ کا خزانہ ہیں جیسے **العين، الجمل، الاسد، القاطرة، جسم النبات، الباخرة** وغیرہ مصنف نے اسلامی تاریخی واقعات بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں **الحنين الى الشهادة، رسالة الى رسول الله في بيت أبي أيوب الأنصاريؓ**، قابلِ ذکر ہیں۔ اسلاف کرام

میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام مالکؒ، شیر شاہ سوریؒ، مظفر حلیم گجراتیؒ جیسے اہم نابغۂ روزگار شخصیتوں کے حالات سبق آموز واقعات بچّوں کی اصلاح وتربیت کے لیے شامل کیے ہیں۔ علمائے اسلام کی خدمات کا تعارف بھی کتاب کا ایک اہم حصہ ہے۔ امام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، ملا نظام الدینؒ فرنگی محلی، شاہ عبدالعزیزؒ کی اسلامی خدمات سے متعارف کرایا گیا ہے۔

ہندوستان میں احیاء اسلام کی کوششوں کا سہرا ان تعلیم گاہوں کے سر ہے جن کو اسلامی قلعہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ مصر کی جامعہ ازہر کے ساتھ مصنّف نے دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء پر معلوماتی مضامین شامل کیے ہیں۔ المنارۃ تتحدث وہ دلچسپ مضمون ہے جس میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ سنائی ہے۔ من النجوم الی الارض میں تاریخ اسلام کی وہ جھلکیاں ہیں جو بلندی سے زمین پر دیکھنے والے کو نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب مضامین اور اسلوب کے اعتبار سے عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے مفید اور پُراز معلومات ہے، کم عمر طلباء کی نفسیات اور ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ طلباء کی ذہن سازی اور تعمیر سیرت میں معاونت کرتی ہے۔ ہر شعبہ زندگی کی مفید اور ضروری معلومات کو یکجا کیا گیا ہے۔ مضامین میں دینی روح اور اخلاقی تعلیمات کا بطورِ خاص دھیان رکھا گیا ہے۔ ہندوستانی طلباء کے لیے ترتیب دی گئی ہے اس لیے اس میں قدرتاً مقامی وملکی چھاپ ہے لیکن ہر جگہ اسلامی رنگ و رجحان کی بھرپور نمائندگی ہے۔

القرأۃ الراشدہ کے تینوں حصّوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں اسلامی تاریخ، نامور اسلامی شخصیتوں، ہندوستان کی اسلامی تاریخ اس کی نامور شخصیتوں سے متعلق اسباق شامل کیے گئے ہیں۔ اس میں اسلام اور ہندوستان کی تاریخ کا خلاصہ بھی ہے اور مشہور دینی درسگاہوں کا تعارف بھی۔ کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات وضروریات کے مطابق ہے، اس میں لسانی ضروریات اور زبان کا معیار قائم رکھنے کی کامیاب سعی کی گئی

ہے۔ اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھا ہے کہ کوئی سبق دینی روح سے خالی نہ ہو اور کسی اچھے نتیجے یا حقیقت کی طرف رہبری کرتا ہو۔ مضامین کے ساتھ ساتھ کتاب زبان کی صحت، طرز اور اسلوب کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے۔

مختارات من ادب العرب

مختارات عربی ادب کے منتخب ادبی نثری نمونوں پر مشتمل ہے۔ مصنف کتاب کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان وادب کی تدریس کے درمیان یہ محسوس ہوا کہ عربی زبان جو ایک زندہ اور جیتی جاگتی زبان ہے اس کو پڑھانے کے لیے درسی کتابوں میں اصلاح وتبدیلی بہت ضروری ہے۔ یہ کتاب مصنف کے برادرِ اکبر ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے دورِ نظامت میں ترتیب دی گئی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اصلاح نصاب کی کوششوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں:

> ’’مجھے سب سے پہلے عربی نثر وادب کے ایسے مجموعے کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا جو قرن اوّل سے لے کر عصرِ حاضر تک کے اعلیٰ ادبی نمونوں پر مشتمل ہو اور جو سجع اور قافیہ، تصنّع اور تکلّف سے آزاد، دلی جذبات، صحت مند خیالات اور صالح مقاصد کا آئینہ دار ہو اور عربی زبان کو صرف ایک ہی رنگ وآہنگ (جس کا مثالی نمونہ مقامات حریری ہے جو ہندوستان کے علمی اور درسی حلقوں میں چھ سو برس سے حکمرانی کرتی رہی ہے اور عربی تحریر کا واحد نمونہ ہے) پیش نہ کرے‘‘۔

(کاروانِ زندگی حصہ اوّل۔ ص: ۲۰۵)

مختارات کے آغاز میں مصنف کے قلم سے ایک مقدمہ شامل ہے جس میں عربی ادیبوں کے طرز واسلوب اور عربی ادب کے مصنوعی اور تقلیدی ادبی نمونوں اور قدیم مروّجہ شہ پاروں پر تنقید ہے۔ اصلاحی وتعمیری ادب کی ضرورت پر زور دیا ہے اور مختارات کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ’’کسی بھی ادب کی آزمائش اور ابتلاء یہ ہے کہ اُس پر ایسے لوگ حاوی

ہو جائیں جو ادب کو بطورِ فن اور پیشہ اپناتے ہیں اور اُس کو صرف اپنے ساتھ مخصوص اور محدود بنا لیتے ہیں۔ اس کو بنانے سنوارنے اور عبارت آرائی کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کمال و مہارت کا سکہ جما کر اپنی مقصد براری کریں۔ یہ صورتِ حال مسلسل ترقی پذیر رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ادب صرف انھیں افراد کی میراث بن کر رہ جاتا ہے اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ادب کا تصوّر ان ہی کی نگارشاتِ قلم تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو محض صنعت و فنکاری اور تقلیدی ادب کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر زور ہوتا ہے نہ روح، جدت و ندرت ہوتی ہے نہ دل آویزی کا کوئی سامان۔

یہ مصنوعی اور تقلیدی ادب، اس فطری، رواں اور سلیس ادب اور اس کی بلیغ تعبیرات پر، جن پر انسان جھوم اُٹھے اور اس کے ذہن و فکر کے اندر وسعت پیدا ہو، جو کسی اسلوب کی اندھی تقلید سے روکے، اور انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرے، وہ ادب جس سے اس قوم کا کتب خانہ بھرا پڑا ہے اس ادب پر تقلیدی اور مصنوعی ادب چھا جاتا ہے حالانکہ اِس رواں اور سلیس ادب میں اس کے سوا اور کوئی عیب نہیں کہ وہ اُن افراد کے قلم سے نکلا ہے جنھوں نے ادیبوں کی وردی نہیں پہنی اور انھوں نے ادب و انشاء کی دوکان نہیں لگائی یا اس کو ذریعہ معاش نہیں بنایا اور ان کی دلکش و دلنواز ادبی خوش بیانیوں کو کسی ادبی عنوان سے موسوم نہیں کیا گیا۔ اور نہ اس کا ادبی سیاق میں ذکر کیا گیا بلکہ اس کی کسی دینی حیثیت، عالمانہ اور فکر انگیز کتاب اور فلسفیانہ یا معاشرتی موضوع کے سلسلہ میں جلوہ نمائی ہوئی ہے۔ یہ سب ادبی شہ پارے دینی و اخلاقی اور علمی کتابوں کے انبار میں دبے ہوئے ہیں۔ روایتی ادب نے خود پسندی کی بناء پر اسے اپنی صف میں جگہ نہیں دی اور مؤرخین ادب نے اپنی فکر و نظر

کی کوتاہی کے سبب ادھر توجہ نہیں کی اور نہ اُسے وہ مقام دیا جس کے وہ شہ پارے بجا طور پر مستحق تھے''۔

(مختارات من ادب العرب الجزء الاوّل۔ص:۷)

علی میاںؒ ناقدین اور ماہرینِ ادب کو ادب کی اوّلین اور حقیقی تربیت گاہ کے پوشیدہ خزانے سے روبرو کرتے ہیں۔مختارات کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''یہ فطری دلآویزی اور قلب و روح کو تسخیر کرنے والا ادب عربی کے وسیع کتب خانے میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے اور اس کی تاریخ مصنوعی و تقلیدی ادب سے زیادہ قدیم ہے کیوں کہ مکاتیب اور خطوط اور قصّے کہانیوں اور اس قسم کے تقلیدی ادب کے مدوّن ہونے سے پہلے حدیث و سیرت کی کتابوں میں یہ فطری اور سحر انگیز ادب مدون ہو چکا تھا، لیکن ادب کے مؤرّخین اور تحقیق کا کام کرنے والوں نے اپنی ساری توجہ تقلیدی اور روایتی ادب پر مرکوز کر دی وہ اسی زنداں کے اسیر اور اسی لکیر کے فقیر رہے جو استادِ اوّل نے کھینچ دی تھی۔

مؤرّخینِ ادب، منتخبات اور درسی کتابوں کے مصنّفین (اگر بے ادبی اور بے ذوقی شمار نہ ہو) مکھی پر مکھی مارتے رہے اور اس ادب پر پردہ پڑا رہا، جس سے عربی زبان کی صلاحیت اور برتری اور اس کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے اور اہلِ زبان کا کمالِ فن، ملکہ اور زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ درحقیقت وہی ادب کی اوّلین اور حقیقی تربیت گاہ ہے''۔

(مختارات من ادب العرب۔ الجزء الاوّل۔ص:۸)

مختاراُت من ادب العرب ۱۳۵۹ھ میں ایک ہی جزو میں شائع ہوئی تھی کچھ عرصہ بعد مصنف نے علیحدہ علیحدہ دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ اس انتخاب میں عربی ادب کے ایسے شاہکار اقتباسات شامل کیے گئے ہیں جن کی وجہ

سے ماہرینِ ادب نے کتاب کو عربی نثر کا بہترین مجموعہ قرار دیا۔

علی میاںؒ انسانی دل ودماغ کو ایمان وعمل کے جذبے سے سرشار رکھنے کا عزم مصمّم رکھتے تھے، انھوں نے یہ کتاب اسلامی حمیت، دینی غیرت اور اخلاقی احساسات کو پروان چڑھانے کی فکر کے ساتھ ترتیب دی ہے، قدیم مروّجہ انتخاب سے اجتناب کیا، ادب کا نئے زاویۂ نگاہ سے انتخاب کیا، زندگی کے حقائق پر نظر رکھی گئی، انسانی جذبات اور احساسات کا ادراک اور مؤثر ادبی لہجہ میں اس کی عکاسی اور مصوری کرنے والے مضامین کو شامل کیا تاکہ طلباء زبان وادب کی تعلیم کے ساتھ حقائق زندگی سے آشنا ہوں اور ماہر اہلِ قلم اصحاب کے مضامین واقتباسات سے دلی جذبات کی مؤثر ترجمانی کا سلیقہ پیدا ہو، زبان واہلِ زبان کی قدرت کا اندازہ ہو، عربی زبان کی گہرائی اور گیرائی اور برتری کو ظاہر کرنے والے اعلیٰ ادبی نمونے طلباء کے سامنے آئیں۔ 'مختارات من ادب العرب' میں مصنوعی اور تقلیدی ادب کے بجائے قلب وروح کو مسخر کرنے والا ادب ہے۔ فطرت وجذبات پر اثر انداز ہونے والے مضامین میں عربی زبان کے محاورات اور تعبیرات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ تکلف وتصنع اور قافیہ بندی نہیں بلکہ زبان کی بے تکلفی روزمرّہ زبان کی بیساختگی کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کتاب کے مضامین دوررس ایمان افروز ہوں نیز اسلامی روح، کردار کی تعمیر کا اہم رول ادا کرسکیں۔ ادب کے وہ نمونے جس میں عریانیت، فحاشی اور مخرّب اخلاق مضامین ہوں اجتناب کیا گیا ہے۔ اس انتخاب سے جہاں اسلامی اقدار پر یقین پختہ ہوتا ہے وہیں ادب کے بہترین نمونے سامنے آتے ہیں، جن سے عربی ادب کی مختلف اصناف سے واقفیت پیدا ہوتی ہے۔ ان منتخب مضامین کو لکھنے والے عالمِ عرب کے قابل ترین مصنّفین ہیں جن کی طرزِ تحریر اور زبان سے واقفیت عربی ادب کے طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ درسی کتاب ایسی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جسے کبھی بھی ادب کی بنیادی کتابوں کے مقابلہ میں رکھا جائے تو بلا مبالغہ بھاری اور افضل قرار

دی جائے گی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ عربی وہ واحد زبان ہے جس میں کلام اللہ اور کلامِ رسولؐ براہِ راست اپنی اصل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ایسی سعادت ہے جو دنیا کی کسی زبان کو حاصل نہیں ہے۔ کلام اللہ اور کلامِ رسولؐ کے ساتھ صحابہ، تابعین اور اس کے بعد آنے والے اصحابِ قلم کی اعلیٰ ادبی، نثری نمونوں کے مطالعہ سے ان کے رجحان طرزِ فکر اور اسلوب کا فرق واضح ہوتا ہے، یہ ایک ایسی خوبی ہے جو کسی ایک مصنف کی مسلسل تحریر کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ اسلوب کا اختلاف قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے اور اس کو اکتاہٹ کا شکار ہونے سے بچالیتا ہے۔

عالمِ عربی کے صفِ اوّل کے مشہور صاحبِ قلم ادیب استاد علی طنطاوی "مختارات من ادب العرب" کی جامعیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہم نے مختارات کو ثانویہ شرعیہ کے طلبا کے لیے ایک طویل عرصہ سے نصابِ درس میں شامل کیا ہے۔ کمیٹی کے تمام اراکین تلاش و جستجو میں تھے کہ انھیں ادب کا مفید انتخاب ملے۔ ہم سب نے 'مختارات من ادب العرب' کو اسکولی نصاب کی کتابوں میں سب سے اچھا اور عمدہ پایا۔ اس میں زبان و ادب کے مختلف رنگ اور اسلوب و بیان کے گلہائے رنگارنگ موجود ہیں۔
>
> قدیم زمانے سے ہماری تمنا تھی کہ ہم طلباء کو اس تنگ و تاریک جیل سے آزاد کریں جس میں ہم نے انھیں قید کر رکھا ہے انھیں تنگ فضا سے نکال کر آزاد فضا اور دن کے اُجالے کی طرف لائیں۔...... ہم لوگ طلبا سے کہا کرتے تھے اسلوب و بیان کا حقیقی و اصل رنگ و روپ اِن لوگوں (جاحظ، ابن عبد، قاضی فاضل) کے سوا جو لوگ ہیں اُن کے پاس ہے۔......

شیخ ابوالحسن الندوی نے ادب اور تاریخ کی کتابوں کی ورق
گردانی کی ہے ان میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لعل وگوہر نکالے ہیں
پھر انھیں مختارات میں محفوظ کردیا''۔

(مختارات: الجزء الاوّل۔ج:۱،ص:۱تا۵)

علی میاںؒ نے اپنے تعلیمی وتربیتی دور سے تدریسی زندگی تک قدم بہ قدم جن اعلیٰ منازل کو طے کیا یہ انتخاب ان کی عکاسی کرتا ہے۔ مصنف نے بحیثیت استاذ ادب العربی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنے اس انتخاب کو تجرباتی طور پر پڑھایا۔ اس وقت مختارات من ادب العرب نہ صرف برصغیر ہندوپاک بلکہ عالمِ اسلام وعالمِ عرب کے متعدد مدارس وجامعات میں داخل نصاب ہے۔

روائع من ادب الدعوۃ فی القرآن والسیرۃ

(تبلیغ اور دعوت کا معجزانہ اسلوب)

علی میاںؒ کے اُن خطبات کا مجموعہ ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی میں دیے گئے تھے۔ علی میاںؒ کے بھانجے مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے اور ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ نے کتاب کے تمام مضامین کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ علی میاںؒ کے یہ مضامین قرآن فہمی میں معاون اور نئے وفکرانگیز پہلوؤں پر مشتمل ہیں۔ انبیاء علیہ السلام کے دعوت وتبلیغ کے نمونوں کو خطبات کا موضوع بنا کر قرآن فہمی کی نئی شاہراہ کھولی ہے۔ انبیاء کے تذکروں کے ساتھ قرآن پاک کی بلاغت کے نازک ترین پہلوؤں کی بہت دلنشیں انداز میں وضاحت کی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد اور اپنی قوم کو دین کی دعوت دیتے ہوئے جو لہجہ اختیار کیا اور نفسیاتی طور پر اپنے والد کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علی میاںؒ فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد سے گفتگو کے وقت منطقی گرفت سے کام نہیں لیا اور نہ ایسی باتیں کہیں جن کو صرف بڑے ذہین قسم کے لوگ ہی سمجھ سکیں بلکہ روزمرّہ کی، آئے دن کی، جانی بوجھی باتوں سے ابتداء کی۔ اُن سے کہا ابا جان! آپ کیوں ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ کسی کام آسکے۔ پھر فرمایا کہ مجھ پر وہ حقیقت آشکارا ہوگئی ہے جس کی آپ کو خبر نہیں۔ یہ بات بھی بجائے خود ایک باپ کو خوش کرنے والی ہے کہ اس کا بیٹا علم وفہم میں، سوجھ بوجھ میں اُس سے بڑھ جائے''۔

''حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے وقت پیغمبرانہ فراست اور حکیمانہ بالغ نظری سے کام لیا۔قوم کے معبودانِ باطل کی ہجو نہیں کی، نہ منطقی دلائل اور فلسفیانہ موشگافی کی۔صرف یہ سوال کیا کہ کیا تم جب اُن کو پکارتے ہو، تو کیا یہ تمہاری پکار سنتے ہیں، نفع یا نقصان پہونچاتے ہیں۔کیوں کہ انسانی زندگی انھیں دو بنیادوں پر قائم ہے...... نفع کی امید اور نقصان کا خوف۔ کہنے لگے یہ بات نہیں کہ وہ ہمیں فائدہ یا نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے یہی وہ بات تھی جو ابراہیم علیہ السلام اُن کے منہ سے نکلوانا چاہتے تھے کیونکہ یہ جواب دراصل جہل اور عاجزی کا اعتراف ہے......'' ان آیاتِ کریمہ کو بار بار پڑھیے آپ محسوس کریں گے کہ ان میں ایک جہانِ معانی آباد ہے ایک معنی سے دوسرے معنی روشن ہوں گے۔ایک بات سے دوسری کارآمد بات نکلے گی۔اور ان دونوں اندازِ بیان (والد کو دعوت دینے اور قوم کو مخاطب

کرنے) کا فرق واضح ہوگا اور یہ اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کس درجہ انسانی نفسیات پر عبور عطا فرمایا تھا۔ اور ذہن وقلب کے باریک سے باریک سوتوں کو جگانے اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں مہارت انھیں حاصل تھی، اپنے مخاطبین سے کس طرح انھوں نے وہ سب اُگلوالیا جو اُن کے دل ودماغ میں محفوظ تھا۔ ان کی ذہانتیں، قوتِ گفتار، مدافعانہ صلاحیتیں سب ظاہر ہوگئیں اور آخر میں ان کے ترکش کا آخری تیر بھی نکلوالیا "بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے پایا ہے" حضرت ابراہیمؑ نے یہ جواب کہلا کر گویا اُن سب کی جھولی خالی کروائی، اب وہ دیوالیہ ہوچکے تھے ان کے پاس کچھ کہنے کو رہ نہیں گیا"۔

(تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب۔ تلخیص، ص:۳۱ تا ۳۵)

حضرت یوسف علیہ السلام کے طرزِ تبلیغ کی نمونے پر بات کرتے ہوئے آغازِ گفتگو اور اظہار کی اہمیت وافادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"گفتگو کا آغاز جس پیرایہ میں کیا گیا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے ایک اعلیٰ درجہ کی بات کے لیے پیرایہ گفتگو بھی اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہیے۔ آدابِ کلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے اگر ایسا نہ ہوتو بات کا حسن ختم ہوجاتا ہے جس طرح ایک پُرشکوہ اور حسین عمارت کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دروازہ بھی دیدہ زیب اور عالیشان ہو، جس کو دیکھتے ہی عمارت کی اہمیت معلوم ہو اور آدمی اندر داخل ہونے میں سہولت اور مسرّت محسوس کرے"۔

(تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب۔ ص:۵۰)

علی میاںؒ ایمان پوشیدہ رکھنے والے مومن اور فرعون کے درمیان مکالمہ کو

حکمت وبلاغت اور موقع شناسی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہیں:

"یہ وہ مکالمہ ہے جو فرعون اور اس شخص کے درمیان ہوا جو صاحبِ ایمان تھا، مگر اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا، یہ مکالمہ بلاشبہ حکمت و بلاغت کا آئینہ ہے اور مردم شناسی، انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اور اُس پر عبور کا اعلیٰ نمونہ ہے یہ بلیغ مثال ایک ایسے مکالمے کی ہے جو بادشاہِ وقت کے اور اس کے حاشیہ نشینوں سے ایک ایسے شخص نے کیا تھا جو ہدایت یافتہ تھا، اور اللہ پر ایمان رکھتا تھا، جب بھی اس مکالمہ کو پڑھتا ہوں تو اس کا پُرشکوہ اندازِ بیان دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ درحقیقت اس مکالمہ کی ادبی حیثیت اور بلاغت اور اس کا حکیمانہ اسلوب، ادبی ذوق کے لیے بڑا سرمایہ ہے، اس کے اندر انسانی نفسیات کا گہرا علم جھلکتا ہے، ذہنی کیفیات کا اُتار چڑھاؤ نظر آتا ہے"۔

(تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب۔ص:۱۰۱)

خاتم الانبیاء رسول اکرم ﷺ نے دعوت وحکمت کے لیے نہایت معجزانہ اسلوب اختیار کیا معمولی اشیاء سے دوررس نتائج نکالے، عقائد، اعمال اور اخلاق کی اصلاح کا کارنامہ انجام دیا۔ دلوں کی تہوں میں جاگزیں محبت کو چھیڑا، ایمان ویقین کو اُبھارا، غرض اپنے بلیغ مواعظ سے لوگوں کو نئی زندگی نئی روح اور نیا جوش عطا کیا۔ علی میاںؒ سیرت محمد ﷺ کے منفرد ومخصوص رنگ کو پیغمبرانہ حکمت اور عقلی وبیانی بلاغت اور انسانی ادب کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہیں۔

"بخدا اگر دنیا کی کسی زبان میں، کسی مذہب کی تاریخ میں تلاش کیا جائے تو اس سے زیادہ بلیغ اندازِ موعظت، انسانی نفوس کے ایسے عمیق علم اور انسانی قلوب کی ایسی چارہ سازی اور مسیحائی کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ حکمت اور دعوت

نبوی کے یہ وہ نمونے ہیں جو انسانی ادب اور انسانی ذخیرۂ
کتب میں بے مثال اور زندہ جاوید ہیں''۔

(تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب۔ص:۱۴۰)

کتاب ''تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب'' کے آٹھ محاضرات کلام اللہ اور حدیث نبویہ کی روشنی میں تبلیغ ودعوت کے معجزانہ اسلوب کی نشاندہی کے لیے لکھے گئے ہیں۔ موضوع دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تربیتی تخیل کا آئینہ دار ہے اور یہ خطبات طلبائے دارالعلوم کے لیے لکھے گئے تھے جن کا مقصد دعوت وتبلیغ کے اصولوں سے آگہی اور اسلامی فکر کی تربیت کرنا تھا۔ قرآنی نمونوں اور نبوی کردار سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ایک داعی اور مبلّغ میں کیا خصوصیات ہونا چاہیے اُس کو کس طرح کا طرزِ کلام اختیار کرنا چاہیے؟ وہ حکمت کیا ہے جو تبلیغ دین کے لیے ضروری ہے؟ تمام خطبات میں سادہ اور دلنشیں انداز اختیار کیا گیا ہے۔

علی میاںؒ عربی زبان وادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے ان کی تصانیف، تقریر وتحریر میں قرآن کریم کے مطالعہ کا ذوق وشوق اور تدبّر، قرآن کریم کا فیض صاف نظر آتا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں مولانا محمد رابع حسنی لکھتے ہیں:

''مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مدظلہٗ سے بہتر اس موضوع کا
حق شاید ہی کوئی ادا کرسکتا ہو کہ اولاً آپ کو اللہ نے عربی
زبان کا وہ ذوق دیا جو اہلِ زبان کو عطا ہوتا ہے اور اہلِ زبان
میں بھی اُن کو ملتا ہے جن کے اندر فطری وجدانی ذوق ہوتا ہے
جس کو وہ اپنے علم ومطالعہ سے جلا دیتے ہیں''۔

(تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب۔ص:۱۱)

رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے''۔
یہ مجموعۂ مضامین اس بات کا بیّن ثبوت ہے، اس میں قرآن کی بلاغت وحکمت اور انبیاء کرام کی پیغمبرانہ حکمت اور عقلی بلاغت کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ

نمونے اپنے رنگ میں جدا، نوعیّت وخصوصیت کے لحاظ سے منفرد اور اسباب اور ماحول کے اعتبار سے نادر ہیں۔ یہ کتاب دین کے فکر وفہم کے ساتھ عربی زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں مددگار ہے۔ ''تبلیغ اور دعوت کا معجزانہ اسلوب'' اپنے موضوع پر مختصر اور جامع کتاب ہے۔

نظرات فی الادب

نظرات فی الادب عربی زبان وادب پر فنی حیثیت سے لکھی گئی اہم تصنیف ہے۔ اسلامی ادیبوں کی عالمی تنظیم رابطة الادب الاسلامی العالمیة کے زیر اہتمام شائع ہونے والی پہلی ادبی تنقیدی تصنیف ہے۔ اس تنظیم کے مقاصد میں ادب اسلامی کا فروغ اور اس کے قدیم وجدید خط وخال کو نمایاں کرنے کے ساتھ نقدِ ادب کے اسلامی اصولوں کی تدوین شامل ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی ایک اہم کتاب ہے۔

کتاب کے آغاز میں عربی نثر اور عربی زبان وادب کے ادیب وناقد ڈاکٹر عبدالباسط بدر استاذ ادب عربی جامعة اسلامیة مدینة المنوّرة رکن رابطة الأدب الاسلامی العالمیة کے قلم سے ایک مبسوط پیش لفظ شامل ہے، جس میں مصنّف کتاب علی میاںؒ سے اپنی دلی وابستگی، عقیدت مندی کا ذکر کیا ہے اور بلند الفاظ میں اُن کی عظیم خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

> ''عربی زبان وادب پر فنی حیثیت سے جو کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں یا لکھی جارہی ہیں ان میں علی میاںؒ کی کتاب ایک سنگ میل ہے جس سے فکر کی نئی شاہراہیں کھلی ہیں، یہ کتاب اسلامی ادب کے معیاری نمونوں سے ہمیں آگاہ کرتی ہے اور اس کے حدود اربعہ متعین کرنے اور قواعد ونظام وضع کرنے میں مدد دیتی ہے۔

مضامین کے لحاظ سے نظرات فی الأدب کو تین ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اولاً اس میں قدیم عربی ادب کا نئے زاویہ سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ادب کے حقیقی سرچشموں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اور تیسرے ادبِ اسلامی کے وسیع آفاق کو پیش کیا گیا ہے''۔

کتاب کا پہلا باب نظرة جديدة الى التراث الأدبي بہت قیمتی، بڑا فکر انگیز مقالہ ہے۔ ۱۹۵۷ء میں علی میاںؒ نے یہ مقالہ شام کی علمی اکیڈمی المجمع العلمي العربي کے رکن منتخب ہونے پر مجلّة اللغة العربية کے لیے لکھا تھا۔ اس مقالے میں عربی ادب کے متداول تاریخ کا مختصر تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے مثلاً تیسری چوتھی صدی ہجری کے عربی زبان اور ادب اور اسلوب تحریر پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے، دورِ متکلمین کے ادب پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ادب میں آنے والی تبدیلیوں، مصنوعی اور تقلیدی ادب اور اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

مصنّف اس بات کے خواہاں ہیں کہ ادب کی تلاش مخصوص شعری و نثری صنف تک محدود نہ رکھی جائے بلکہ ان تحریروں کو بھی ادب میں شامل کیا جائے جو ادب کے نام پر نہیں لکھی گئیں، تکلّف و تصنّع سے پاک ہیں۔ چنانچہ وہ اِس کتاب میں سیرت و مغازی، حدیث و تاریخ کے انتخاب کے ذریعہ عربی ادب و انشاء کے ان سدا بہار پھولوں کی بہار دِکھاتے ہیں جو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والوں کی نگاہوں سے مخفی رہے یا جن کو ناقدین ادب نے ادب کے زمرہ میں شامل ہی نہیں کیا۔ علی میاںؒ کے مقالہ کی عبارتوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کی حرارت و برودت، فقروں کے جوش و جذبہ پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ الفاظ کے نبض شناس ہیں اپنی تنقیدی رائے پُر اعتماد لہجے اور دلنشیں انداز میں پیش کرتے ہیں اور عصرِ حاضر کے ادیبوں مصنّفین سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اسلوب کی بلندی یا پستی کا اندازہ نئے

اصولوں کو بنیاد بنا کر کریں، ادب کو مروّجہ محدود مجبور تصوّر سے نکال کر اس کے وسیع اور آفاقی تصور کو سامنے لائیں۔

"نظرات فی الادب" اسلامی نظریہ ادب کی تشکیل جدید کی بنیادی تصنیف ہے جس میں علی میاںؒ بڑے پُر اعتماد لہجے میں اپنے نظریہ ادب کی وضاحت کرتے ہیں:

"میں ادب کو ایک زندہ وجود سمجھتا ہوں جس کے پہلو میں درد بھرا دل، باشعور ضمیر، زندہ احساس، پختہ عقیدہ اور اس کا ایک صحیح اور معیّن نصب العین ہوتا ہے رنج والم سے وہ رنجور اور اسباب مسرّت سے وہ مسرور ہوتا ہے اور اگر ادب ایسا نہیں تو وہ جامد اور بے جان ادب ہے جو مداری کے نقل و تماشہ اور جمناسٹک کی ورزشوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ادب صرف جی بہلانے اور وقت گزاری کا مشغلہ نہیں وہ بلند اور شریفانہ اغراض و مقاصد تک پہونچنے اور فطرتِ انسانی کو متاثر کرنے کا بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہے"۔

(نظرات فی الادب۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۰۵)

ادب کا رشتہ زندگی سے ہے ادب زندگی کا آئینہ ہے فنی دل بستگی کے ساتھ انسان کی سیرت و شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ علی میاںؒ ادب کو وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بلکہ تعمیر انسانیت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ادب کے دلکش ساحرانہ اور دلنشیں ادیبانہ اسلوب کے قائل تھے۔ ساتھ ہی ادب کو صحت مند قدروں کا حامل دیکھنا چاہتے تھے تا کہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا نمائندہ ادب انسانیت کی فلاح وصلاح کا ذریعہ بن سکے۔ نظرات فی الادب میں شامل مضمون قیمة الادعية النبوية الماثورة الادبية والبلاغة والنفسية والاجتماعية علی میاںؒ کا وہ مقالہ ہے جس میں انھوں نے ماثورہ دعاؤں کی

ادبی بلاغت کی نشاندہی کی ہے۔ مضمون نگار نے تحریر کیا ہے کہ ماثورہ دعاؤں میں جامعیت اور انسانی ضروریات کا وسیع ادراک پایا جاتا ہے اور باریک بینی کے ساتھ ہر ایک حاجت کے مطابق اس کے لیے مناسب ترین الفاظ میں دعا کرنا بلاغت نبوی کا معجزانہ اسلوب ہے۔

عالم اسلام کے معروف عالم، ادیب اور انشاپرداز ڈاکٹر عبد الباسط بدر نے "النظرات فی الادب" کا مفصل جائزہ لے کر اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مصنف نے ادب کے متعین فنون سوانح نگاری، سفرناموں اور کتابوں کے مقدمات کی زبان اور اس کی ادبی رعایتوں پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ متقدمین کے وضع کردہ اصولوں پر تنقید کی ہے اس کی کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے مثلاً مصنف سوانح نگار میں وہ صفت دیکھنا چاہتے ہیں جو اس فن کا متقاضی ہے۔ ایک سوانح نگار میں صاحبِ سوانح سے صحیح واقفیت، ناقدانہ نظر، قوتِ بیان پر قدرت، حالات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کو ضروری قرار دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ اس کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک اچھے سوانح نگار میں اپنے فن کو پیش کرنے کا بلند پاکیزہ مقصد بھی ہونا چاہیے۔ اسے الفاظ کی حرارت و برودت کا ادراک اور اس کے استعمال کے ہنر سے بخوبی واقف ہونا چاہیے"۔

سیرت و تذکرہ اور سوانح نگاری، تاریخ نویسی علی میاںؒ کا خاندانی و موروثی فن ہے۔ سیرت و سوانح پر اردو عربی میں ان کی کئی اہم تصانیف منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ جن میں "نبی رحمت"، المرتضیٰ، تاریخ دعوت و عزیمت، شخصیات و کتب، پرانے چراغ، مولانا الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا

عبدالقادر رائے پوری، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری کی سوانحی کتب بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ بزرگانِ دین کی سوانح پر مبنی کتابیں علی میاںؒ کے وجدانی ذوق دینی بصیرت اور علمی بصارت کی شہادت کے لیے کافی ہیں۔

اس مقالے میں ایک ماہر سوانح نگار نے اپنے تجربات کی روشنی میں سوانح نگاری کے اصولوں میں تبدیلی کے امکانات کو پیش کیا ہے۔ فن سوانح نگاری کو زیادہ مؤثر و دلنشیں اور مفید بنانے کے اصول متعین کرنے کی پیشکش کی ہے۔ علی میاںؒ جن اصولوں کو مرتب و متعین کرنے کی بات کرتے ہیں ان کی سوانحی کتب اس کا کامیاب نمونہ اور جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

نظرات فی الادب میں سفرناموں کے مروّجہ اسلوب کے سلسلہ میں متقدمین کے متعین اصولوں اور معیاروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، ان کے سفرناموں پر بحث کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو بتاتے ہیں۔ ایک سفرنامہ لکھنے والے میں اور اس کے سفرنامے میں کیا کیا خوبیاں ہونا چاہیے اس کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ سفرناموں کے معیار کو بلند کرنے اور بامقصد بنانے کے لیے وہ چاہتے ہیں ''سفرنامہ لکھنے والے کی نگاہ اُس سوسائٹی پر ہو جو اس ملک میں بستی ہے جہاں کا سفرنامہ لکھا ہے۔ سفرنامہ لکھنے والا صاحبِ فکر و ضمیر ہو، تاکہ وہ حالات کا صحیح ادراک کر سکے، واقعات کو اخذ کرے اور تجربے اور فکری بصیرت سے سوسائٹی کے مرکزی خدوخال کو سمجھ سکے، اپنے مشاہدات بیان کرتے وقت اپنے نظریات اور تنقیدی خیالات کو اس خوش اسلوبی سے پیش کر سکے جو سفرنامے کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہو۔ سفرنامہ ایسا مؤثر و دلنشیں پیرایہ بیان میں ہو کہ سفرنامے کا پڑھنے والا، لکھنے والے کے فکر و احساسات کے ساتھ سانس لینے لگے۔

اس کتاب میں شامل مضمون ''مدرسة شبة القارة الهندية العربية والأدبية'' عربی ادب میں ہندوستان کے علماء کی خدمات سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی خدمات کسی گروہی انداز اور مقصد کی حامل نہیں رہی، یہ ایک صدی کی

علمی ادبی خدمات نہایت خاموشی سے ٹھوس علمی اور فکری بنیادوں پر کی گئی ہیں۔ ادبِ اسلامی کی تاریخ کا یہ حصّہ ہندوستان میں عربی ادبی دبستان کے معیار و اقدار کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں کیسے کیسے باغبانوں نے ادب کے چمن زار میں اپنے افکار کے گل بوٹے سجائے اور ادبِ اسلامی کے چراغ کو تیز و تند آندھیوں سے بچا کر روشن رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔

"نظرات في الادب" میں علی میاںؒ نے اس بات کا بہ بانگِ دہل اعلان کیا ہے کہ "ادب کسی گوشہ میں محدود و مجبور نہیں ہے کہ بلکہ وہ زمانی زمینی وسعتوں کا حامل ہے اور اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے صرف عبادت اور ترکِ دنیا کا مذہب نہیں بلکہ زندگی کی وسعتوں کا ساتھ دینے کی کامل صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ادبِ اسلامی کی اپنی عالمگیر شناخت ہے جس میں روانی، جدت، اصلیت، فطرت کی نمائندگی اور صداقت کی پرچھائیاں ہیں، جو انسانی زندگی اور وجدان پر اثر کرتی ہیں"۔ علی میاںؒ نے "ہندوستان کا ادبی اسکول" اپنی اس بات کی تائید میں بطور ثبوت پیش کیا ہے، جہاں فارسی اور اردو میں اسلامی ادب خوب پھلا پھولا ہے اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ اقبالؔ اور رومیؔ کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "ہندوستان کا اسلامی ادب فکر و روح کے اعتبار سے فکر آموز ہے۔ اس کی لئے حیات بخش ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اسلامی مزاج سازی اور تعمیر انسانیت کے کامیاب عناصر موجود ہیں۔

علی میاںؒ نے "نظرات في الادب" میں زبان و ادب کا نئے زاویہ نگاہ سے مطالعہ کیا، ادب کے اسلامی اصولوں کو وضع کیا۔ ایسے قواعد و ضوابط متعیّن کرنے کی راہ دکھائی جو اسلامی نقطہ نظر اور تصوّر کے حامل ہوں۔ ان کی تحریریں ادب کو زندگی کی وسعتوں میں پھیلا کر چلنے کے عزم کا اظہار کرتی ہیں جن کو اسلام نے ایک مسلمان کے لیے جائز رکھا ہے۔ علی میاںؒ نے کسی بھی ادبی نمونے کو اسلامی غیر اسلامی ہونے کے تعین کے لیے ان وسعتوں اور احتیاطوں کے دائرے میں رکھ کر دیکھا جو اسلام کی طرف سے واضح رہنماؤں میں بتائی گئی ہیں۔ اس اصول کو تمام اصنافِ ادب کے لیے

ادب اسلامی کی کسوٹی اور بنیاد کا درجہ دیا، ادب کے ایک ناقد اور مفکر کی حیثیت سے ''وہ ادب کے قائدانہ کردار کو اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کے گرد آلود آئینہ کو صاف کرتے ہیں ادب کے خزانے کو از سرنو کھنگالنے کا اعلان کرتے ہیں''۔

۱۹۵۷ء میں شام کے المجمع العلمی کے رُکن منتخب ہونے پر علی میاںؒ نے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ عربی ادب کا ازسرنو جائزہ لے کر ادبِ اسلامی کو ممتاز درجہ دیا جائے، اپنے اِسی نقطۂ نظر کے تحت وہ مختارات من ادب العرب مرتب کر چکے تھے، مختارات کا مبسوط مقدمہ ''نظرات فی الادب'' میں شامل کیا گیا ہے۔ مقدمہ مصنف کے طرز فکر، اعلیٰ ادبی ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔

علی میاںؒ نے عربی ادب کو ایک ایسے زاویہ نگاہ سے جانچا اور پرکھا جو عربی ادب کی مروّجہ تاریخ کے لیے نیا ہے۔ اسلامی تناظر میں عربی ادب کے اصناف کے تنقیدی مطالعہ کا پیغام دیا ہے۔ اس طرح ادب کی تاریخ کو نئی سمت سے آشنا کیا ہے اس کا نیا رُخ متعیّن کیا ہے۔ اُن کا انداز فکر کی نئی راہوں سے آشنا کرنے والا ہے۔ ادب کے اسلامی سرچشموں کی نشاندہی کے ساتھ اسلامی ادب کے معیاری نمونوں کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ اصنافِ ادب کے تنقیدی جائزہ کے ساتھ اسلامی اصول واقدار کی روشنی میں ادب کے قواعد نظام وضع کرنے کی دعوت دی ہے۔ بلاشبہ اس کتاب نے اسلامی ادب کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کا احساس دلایا ہے اور دوسری جانب جو لوگ کسی نظریے کا بالاعلان اتباع نہیں کرتے تھے انھیں یہ احساس دلایا کہ ادب کے ہر صنف کے لیے لازم ہے کہ ''بنیادی طور پر وہ صالح اور زندگی آمیز نظریہ کا حامل ہو بصورتِ دیگر ادبی شہ پارہ، اس کی فنی کمزوریوں کی وجہ سے کمزور ادب کے خانے میں رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجت علی میاںؒ کے ادبی نظریات کی اہمیت وافادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

علامہ نے ایسے عمومی قواعد وضوابط وضع کیے ہیں جن سے ادب کے اثر اور

دائرہ کار پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اکثر مصنفین اور ناقدین نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ادبی نظریات سب کے سب مغرب کی دین ہیں لیکن علامہ ندوی کے ادبی نظریات کی بنا پر ہم اس پر فخر محسوس کر سکتے ہیں کہ انھوں نے ادبِ اسلامی کی قائدانہ صلاحیت و اہمیت کو ادب و نقد دونوں میدانوں میں پیش کیا ہے اور عربی زبان کی شان کو دوبالا کیا ہے اور ایسے وقت میں کیا جب ہمارے درمیان عربی زبان کی شان کو اسلامی وقار کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔

(فکر اسلامی نمبر۔ص:۲۷۰)

نظرات فی الأدب تخلیق ادب، تحقیق ادب اور تنقید ادب کے گوشوں کے لیے رہنمائی کا سامان رکھتی ہے۔ ادب میں اب تک اشتراکی، مغربی فلسفوں اور دیگر تحریکات کی روشنی میں جو ادب وجود میں آیا ہے یہ کتاب ان کے مقابلے میں نیا طرزِ فکر عطا کرتی ہے۔ علی میاںؒ کے افکار عالیہ، فلسفہ و نظریۂ ادب، عالمی ادب اور ادیبوں پر اثر انداز ہونے کی بھر پور صلاحیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الباسط بدر انھیں حقائق کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ''حالیہ چند برسوں میں ایسے مضامین، کتابیں منظر عام پر آئیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً مصنف کے ذریعہ پیش کیے گئے ادبی اصول و اقدار کی آواز عربی و اسلامی ادیبوں نے سنی اور ادب میں اصلاحی و تعمیری پہلو پر خاص توجہ مبذول کی ہے''۔

الطریق الی المدینة (کاروانِ مدینہ)

علی میاںؒ نے عالمِ اسلام بالخصوص اسلام کے اوّلین مرکز کے بکثرت علمی اور دعوتی سفر کیے، ان سفروں میں انھوں نے مرکز اسلام میں ایمان و محبّت کی کمزوری اور جذبات و وجدان کی سرد کیفیت کو شدّت سے محسوس کیا۔ ان میں رسول اکرم ﷺ سے جذباتی و روحانی تعلق کو کمزور پایا۔ علی میاںؒ نے اِس تبدیلی

کے پسِ پشت آنے والے خطرات کو محسوس کرتے ہوئے اسے ایک بڑے انقلاب اور بدقسمتی کی علامت بتایا، جدید تمدن اور قومیت عربیہ کے پرستار عربوں کو قوم پرستی کے جذبہ کو ختم کرنے کا مشورہ دیا، اپنے اصل مرکز کی طرف واپس آنے کی دعوت دی۔ 'کاروانِ مدینہ' اسی فکر انگیز پہلو پر کی گئی مختلف تقاریر و مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں شامل مضامین و تقاریر کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ وہ کتاب جس کا احسان میں بھول نہیں سکتا۔
۲۔ اقبال درِ دولت پر
۳۔ امت کے وفود آقا کے حضور میں
۴۔ غارِ حرا کی روشنی میں
۵۔ عالمِ نو
۶۔ حدیث مدینہ
۷۔ صور زندگی
۸۔ حضور و سرور
۹۔ فارسی شعراء کی نذرِ عقیدت
۱۰۔ اردو شعراء کی نذرِ عقیدت

مصنف نے مضامین و تقاریر کے ذریعہ حبِّ رسول ﷺ کی دبی چنگاریوں کو مشتعل کرنے اور محبت کی نئی حرارت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ اس عظیم کام کے لیے انھوں نے جاں نثار صحابہؓ کے واقعات اور عجمی غلاموں کے عشقِ رسولؐ اور قلبی روحانی تعلق کے نمونے پیش کیے ہیں۔

الطریق الی المدینة کا پہلا مضمون **الکتاب الذی لا انسی فضله** ''وہ کتاب جس کا احسان میں بھول نہیں سکتا'' میں علی میاںؒ نے قاضی محمد سلیمان منصوری پوری کی کتاب **رحمة للعالمین** کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب سیرت کے موضوع پر ہے جو مصنف نے بہت کم عمری میں پڑھی تھی اس کتاب نے ان کو ایسی دولت سے آشنا کیا جو ''ایمان کے بعد سب سے قیمتی بلکہ زیادہ صحیح ایمان ہی کا حصہ ہے''۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کا اور اس کے مخلص مصنف کا وہ احسان جو میں کبھی نہ بھولوں گا یہ ہے کہ اس نے میرے دل میں اس

خوابیدہ و مخفی محبت کو اُبھارا ہے جس کے بغیر زندگی میں کوئی مزہ نہیں اور جس کے بغیر اس زندگی کی کوئی قیمت بھی نہیں''۔

(کاروانِ مدینہ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۲۴)

رسول اکرم ﷺ سے محبت کو زندگی کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ ان کا قلب مومن حبِ رسول کی قدر و قیمت سے آگاہ کرتا ہے۔ جذبۂ حبِ رسولؐ کے سلسلہ میں اُمت کی مفلسی و تہی دامانی اور سرچشمۂ محبت سے محرومی پر ان کا قلم آنسو بہانے لگتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس امت کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس نے دل سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے اور محبت کی لذت سے محروم ہے۔ اقبالؔ نے بالکل صحیح کہا ہے

شبے پیش خدا بگریستم زار — مسلمانان چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند''

(کاروانِ مدینہ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۲۵۔۲۶)

'اقبالؔ درِ دولت پر' (محمد اقبال فی مدینة الرسول) ۱۹۵۶ء دمشق ریڈیو سے نشر کی گئی تقریر ہے، جس میں ہندوستان کے معروف شاعر محمد اقبالؔ کے کلام کی روشنی میں ان کے جذبۂ عشق رسول کی وضاحت کی گئی ہے۔ علاّمہ اقبالؔ عالمِ تخیل میں سرورِ کائناتؐ کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں قوت تخیل اور زورِ کلام کے ساتھ حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ حس بیدار ہوتی ہے اور بیانِ حق اور جذبہ حبِ رسول ﷺ میں ان کے جوہرِ شاعری بے حجاب و بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون میں علی میاںؒ نے اقبالؔ کے احساسات وخیالات کی خوبصورت ترجمانی کی اور بتایا ہے کہ سیرت کے موضوع پر اقبالؔ کا کلام سب سے زیادہ جاندار، طاقتور اور مؤثر ہے۔ ان کے اشعار، ان کے خیالات جذبات

کے ترجمان اور تجربات کا نچوڑ ہیں اور اس میں ان کے عہد کی تصویر اور ان کے نازک ترین احساسات کی بھرپور ترجمانی ہے۔

''اقبالؔ نے عالمِ خیال میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیا ہے اور اس تصور کے ساتھ وہ قافلۂ شوق کے ساتھ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں، ذوقِ حضوری اور شوق ومحبت میں یہ ریت ان کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ذرّہ دل بن کر دھڑک رہا ہے، وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اور نرم روی اختیار کرے......
حدی خواں کا نغمہ سن کر ان کی آتشِ شوق اور تیز ہونے لگتی ہے، دل کی جراحتیں تازہ ہو جاتی ہیں ان کے پورے وجود میں حرارت اور زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور ان کا سازِ دل، درد واثر میں ڈوبے ہوئے مؤثر وبلیغ اشعار کے ساتھ نغمہ زن ہونے لگتا ہے''۔

(کاروانِ مدینہ۔ ص:۱۲۴)

'امت کے وفود آقا کے حضور' (وفود الامة بين يدی نبيها ﷺ) وہ معرکۃ الآراء مضمون ہے جو سعودی ریڈیو اور فیچر کے طور پر لکھنؤ ریڈیو سے نشر ہوا ہے۔ بارگاہِ نبوی ﷺ میں ائمہ، صلحاء، متقی، سلاطینِ وقت، انقلابی اور شاعر وادیب حاضر ہوتے ہیں اور ہدیۂ سلام پیش کرتے ہیں۔ لباس اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک جذبہ اور تاثر کے ساتھ سب کا حاضر ہونا اس پر علی میاںؒ کی مؤثر ودلکش منظر نگاری محبت کی دبی چنگاریوں کو دو آتشہ بنا دیتی ہے مثلاً فقہ وحدیث کے امام ومجتہد حاضر ہوتے ہیں مختصر، معانی سے لبریز گہرے اور پُر مغز کلمات کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

''یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ کی لازوال، وسیع اور جامع، عادلانہ اور کشادہ شریعت نہ ہوتی اس کے وہ اصول نہ ہوتے جن سے انسانی ذہن

اور انسانی صلاحیت نے نئے نئے گل بوٹے پیدا کیے اور دنیا کا دامن بیش قیمت اور عطر بیز پھولوں سے بھر دیا اور اس کا وہ حکیمانہ اور معجزانہ نظام نہ ہوتا جس نے انسانی فکر و تدبیر اور اخذ و انبساط کی صلاحیت کو پیدا کر دیا اور اگر وہ انسانیت کی اہم ضرورت نہ ہوتی تو نہ اس عظیم فقہ کا کوئی وجود ہوتا، نہ یہ عظیم اسلامی قانون وجود میں آتا، نہ اتنا بڑا اسلامی کتب خانہ پیدا ہوتا۔ جس کے سامنے دنیا کا سارا مذہبی لٹریچر ہیچ ہے۔ اگر علم کی اشاعت کی آپ نے ایسی پُر زور دعوت نہ دی ہوتی تو یہ شجرِ علم زیادہ دنوں تک برگ و بار نہ لا سکتا اور اس کا سایہ تمام دنیا پر ایسا محیط ہوتا کہ عقل انسانی پہلے کی طرح پابہ زنجیر ہوتی اور دنیا روشنی سے محروم''۔

(کاروانِ مدینہ۔ ص:۸۴)

غارِ حرا کی روشنی میں (من غارِ حرا) سعودی ریڈیو سے نشر کی گئی تقریر ہے۔ جس میں مصنف نے خود کلامی کا جادو جگایا ہے۔ اس غار میں سرورِ کائنات پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ یہ اقتباس علمی شان اور ادبی چاشنی سے لبریز ہے۔

''یہیں وہ آفتاب طلوع ہوا جس کی کرنوں نے دنیا پر نور برسایا اور اسے ایک نئی زندگی بخشی، یہ عالم ہر دن ایک نئی صبح کو خوش آمدید کہتا ہے لیکن اکثر و بیشتر نہ اس صبح میں نیا پن پیدا ہوتا ہے نہ کوئی ندرت نہ ہر صبح، صبحِ سعادت۔ ان صبحوں کی آمد سے انسان تو جاگ جاتے ہیں مگر دلوں کی نیند میں ذرا فرق نہیں آتا اور روحوں کی بستی یوں ہی خوابِ غفلت میں پڑی رہتی ہے۔ کیا شمار ہے ایسے تاریک دنوں کا اور ایسی جھوٹی صبحوں کا البتہ اس غار سے حقیقی معنی میں صبح صادق نمودار ہوئی تھی جس کے نور نے ہر چیز کو چمکایا اور اس کی آمد نے ہر شئے کو جگایا اور اسی صبح سے تاریخ کا رُخ مڑا اور زمانے کا رنگ بدلا۔

(کاروانِ مدینہ۔ ص:۳۸)

'عالم نو' (میلاد عالم جدید) تقریر ماہ ربیع الاوّل میں دہلی ریڈیو سے نشر کی گئی، جس میں علی میاںؒ نے رسول ﷺ کی ولادت باسعادت کو دنیا کے لیے نئی زندگی بخشنے والا واقعہ قرار دیا اور بتایا کہ آپ نے ہی انسانیت کو زار و نزار حالت سے نکالا، انسانیت کی سرپرستی کے ساتھ اس کی رہنمائی کا کام انجام دیا اور بتایا کہ رسول اکرم ﷺ کی پیدائش کا دن اسی لیے مبارک دن ہے کہ اس دن دنیا کا سب سے مبارک انسان پیدا ہوا جس نے اس دنیا کو نئی دنیا، نیا ایمان، نئی زندگی عطا کی۔

☆ 'حدیث مدینہ' (فی معهد اسلام) وہ تقریر ہے جو ۱۹۵۱ء میں حجاز و شام سے واپسی پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی تھی، اِس تقریر میں علی میاںؒ نے بچپن سے حجازِ مقدس سے اپنے ذہنی اور قلبی لگاؤ کو بیان کیا ہے، تقریر میں مکہ اور مدینہ کی قدر و منزلت کا احساس دلانے کے لیے نیا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔

> ''جب میں نے حسن ظاہری سے خالی یہ سرزمین دیکھی تو میں نے اپنے دل میں کہا یہ شہر مناظر سے کتنا تہی دست ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ سوچا کہ اس شہر نے انسانیت اور تمدن پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اگر یہ شہر جس کا دامن گلکاریوں سے خالی ہے روئے زمین پر نہ ہوتا تو دنیا ایک سونے کا پنجرا ہوتی اور انسان محض قیدی...... یہی وہ شہر ہے جس نے انسان کو دنیا کی تنگنائی سے نکال کر وسعتوں سے آشنا کیا۔ اگر مکہ نہ ہوتا تو انسانیت ان معانی و حقائق، اخلاق و عقائد اور علوم و فضائل سے تہی دست ہوتی جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ اور اس کا سب سے بڑا حسن ہیں۔ اسی کی بدولت دنیا نے ایمان کی اُس لازوال دولت کو پھر سے پایا جسے لوگ ضائع کر چکے تھے''

(کاروانِ مدینہ۔ ص: ۱۵۰۔۱۵۱)

صورِ زندگی (البعثة المحمدیه) میں بتایا ہے کہ ''بعثت سے قبل انسانیت

ایک سرد لاشہ تھی دنیا کا ذہن شل ہو چکا تھا یہ بعثت محمدی کا کارنامہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات نے انسانیت کے سرد جسم میں گرم خون کی ایک رَو دوڑا دی اور دنیا کو وہ پیغام دیا جو زندگی کی تمام وسعتوں پر حاوی تھا، آپ نے تمام انسانوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر بادشاہِ حقیقی کی غلامی میں داخل کر دیا''۔

کتاب کے آخر میں فارسی اور اُردو کے شعراء عجم کا خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ دراصل اسلام کے عالمی ادب میں فارسی زبان میں نعتیہ شاعری کا سب سے زیادہ سرمایہ ہے اور اس کے بعد اردو زبان میں نعتیہ شاعری کے بیش قیمت نمونے ملتے ہیں۔ شوق و آرزو اور عشق و محبت کی اس ترجمانی کی وجہ جزیرۃ العرب اور مدینہ سے دوری اور ہجر و تصوف بتاتے ہیں۔ اس مضمون میں منتخب اشعار کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے اور اشعار کی عالمانہ تشریح و ترجمانی کی ہے۔

اردو کے مشہور ادیب اور ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی کاروانِ مدینہ کے متعلق اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''پڑھتا گیا اور رائے قائم کرتا گیا کہ یہ تقریر سب سے اچھی ہوگی دوسری کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ پچھلی سے اونچی ہے تیسری پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں سے بہتر ہے اس طرح خوب سے خوب تر تک سفر کرتا چلا گیا۔ آپ کے لیے ذہن میں جو تحسین کا دفتر کھلا وہ فی الحال قابو میں نہیں آتا کہ لکھ کر آپ تک پہنچاؤں۔ کتنے محدود صفحات میں آپ نے بصائر و معارف کا کیسا گراں بہا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے پھر آپ کا جامع فکر انگیز اور دل نشیں لب ولہجہ و پیرایہ بیان!''

(پرانے چراغ۔ ج:۲، ص:۱۷۴۔۱۷۵)

کاروانِ مدینہ (الطریق الی المدینہ) سیرت طیبہ پر دینی عقیدت، جذبۂ وفا اور احساسِ محبت سے لبریز تقاریر و مضامین کا مجموعہ ہے جن کو پڑھ کر دل میں رسول ﷺ سے محبت و عقیدت اور جذباتی لگاؤ میں تازگی اور شگفتگی کا احساس

بڑھتا ہے۔ مصنف عالمِ اسلام اور بالخصوص عالمِ عرب کے نوجوانوں میں رسول ﷺ سے روحانی وجذباتی رشتے کو مستحکم کرنے کے آرزومند تھے۔ ان کا مقصد ذاتِ نبوی ﷺ کی عظمت کو ذہن نشین کرانے کے ساتھ سراپا محبوب ذات سے جذباتی لگاؤ پیدا کرنا تھا کہ عشق رسول ﷺ ہی وہ دولت ہے جس سے دلوں کو گرمی اور سوز و گداز ملتا ہے۔ کتاب میں مغربی تہذیب اور مادّیت کے خلاف پُرزور آواز بلند کرتے ہیں۔ مغربی تعلیم کے اثرات قوم پرستی کی تحریکات اور اس جیسی دوسری دعوتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ایمان ومحبت اور جذبہ ووجدان کا لشکر تیار کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ بعثت محمد ﷺ سے قبل دنیا کی حالت زار وابتر تھی۔ آپؐ نے اسلامی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے افراد کی تربیت کا کارنامہ انجام دیا۔ اقراء کے سبق سے ہی انسان کو علم کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ حق اور انصاف، امانت داری، بے نفسی، خداترسی، ذوقِ عبادت، شوق شہادت جیسی خوبیوں کا احساس پیدا ہوا۔ یہ کتاب علی میاںؒ کے علم ومطالعہ خیالات وجذبات، احساسات وتاثرات کی بہترین ترجمان ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ زاہران ایران سے شائع ہوکر مقبول ہوچکا ہے۔

عربی کتاب پہلی بار مدینة الرسول سے شائع ہوئی تو عرب اصحابِ قلم اور علماء نے اپنی پسندیدگی اور گہرے تاثر کا اظہار کیا۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عرب مدارس وجامعات اور ہندوستان کے عربی مدرسوں میں داخلِ نصاب ہے۔ عربی کے مشہور ادیب، صاحب طرز انشاء پرداز، اسلامی الفکر مصنف استاذ علی طنطاوی نے اپنے منفرد اسلوب میں مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مقدمہ نگار کتاب کی خوبیوں کے اظہار کے ساتھ عربی ادب میں علی میاںؒ کی خدمات کے معترف ہیں۔ لکھتے ہیں:

”میرا اپنے بارے میں اعتماد متزلزل ہوگیا تھا، لیکن برادرم ابوالحسن! جب میں نے آپ کی کتاب ”الطریق الی المدینة“

کو پڑھا تو میں نے محسوس کیا شوق میرے اندر پھر انگڑائی لینے لگا ہے، اور میرے سینے میں پھر وہی تپش ہے، اس طرح پھر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے خالی نہیں ہوا ہے لیکن افکارِ زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد آلود کر دیا تھا آپ کی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کر دیا.........۔

ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اُٹھنے لگا تھا، چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آیا، جس کی لے میں شریف رضیؔ کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے۔

میں نے آپ کی کتاب پڑھی، تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اُس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے لیکن بے ردیف قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا''۔

(کاروانِ مدینہ۔ص:۱۱)

ایمان ومحبت کے پیغام رسانی کے لیے لکھے گئے یہ مقالات ومحاضرات عالمانہ استدلال اور ادبی چاشنی سے پُر ہیں۔علی میاںؒ کے یہ مضامین قلب مومن میں ایمانی چنگاری اور حبِّ رسول ﷺ کے شرارے مشتعل کر دیتے ہیں۔مصنف کے آسان دلنشیں اور دلچسپ اندازِ تحریر نے مضامین کی ادبی شان میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

علی میاںؒ ایک بلند پایہ ادیب، ممتاز ناقد اور محقق تھے۔انھوں نے دنیائے ادب میں اپنی مخصوص پہچان بنائی تھی۔وہ عربی و اردو کے صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔اُن کی تحریروں میں فصاحت، اسلوب کی دل آویزی اور کلام کی بلاغت پائی جاتی ہے، دردمندی، سوزِ دروں اور اخلاص نے اسلوب کو ایک خاص رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ عربی اردو کے شعر و ادب کے ارتقاء اور تاریخ دونوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ یہ ادبی ذوق انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔علی میاںؒ نے اپنے بیدار مغزی اور اعلیٰ

بصیرت سے عربی و اردو ادب میں انسانی زندگی سے متعلق اہم موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ بلاشبہ ان کی نثر میں نیا آہنگ، نیا رنگ اور بانکپن ہے۔ علی میاںؒ کی اسی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے **شیخ محمد المجذوب** نے اپنی تصنیف **علماء مفکرون عرفتھم** میں لکھا ہے:

''شیخ ندوی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ادبی تحریر میں سحر ہے ایک ایسا جادو ہے جو عموماً دوسرے مصنّفین کی تحریروں میں نہیں ملتا''۔

شیخ محمد غزالی بلند پایہ عالم اور مصنف علی میاںؒ کے اسلوب اور زبان کے بارے میں لکھتے ہیں ''ہم نے شیخ کی تحریروں میں ایک بالکل نئی زبان اور نئی روح کا احساس کیا، ان کی اخاذ نظر ان چیزوں پر پڑتی ہے جن کی طرف ہماری نظر نہیں پڑتی''۔

> جس طرح کبھی فلسفہ کے راستے سے الحاد اور تشکیک کا سیلاب مسلمانوں کے علمی وفکری طبقہ میں آتا تھا اس کے بعد سائنس (خاص طور سے علوم طبعیہ) کے راستے سے تعلیم یافتہ طبقہ میں آنے لگا اور کہیں کہیں نفسیات (سائیکولاجی) اجتماعیات (سوشیولاجی) اور اقتصادیات وسیاسیات کے راستے آتا تھا اب بہت سی جامعات اور دانش گاہوں میں ادب کے ذریعہ سے آرہا ہے اور سب سے زیادہ بلادِ عربیہ اس کا شکار ہورہے ہیں''۔
>
> (مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کا فکر و فن اور علی میاںؒ کی اقبال شناسی

بیسویں صدی کی ابتداء میں اقبالؔ کا فن بام عروج پر پہونچ چکا تھا۔ علی میاںؒ اپنی طالب علمی کے زمانے سے کلامِ اقبالؔ کے شیدائی تھے۔ کلام اقبالؔ سے ذہنی وابستگی اور فکر و نظر کی ہم آہنگی نے انہیں اقبالؔ کے اشعار کا عربی ترجمہ کرنے کا حوصلہ دیا۔ انھوں نے اپنے تعلیم و تدریس کے دوران اقبالؔ کے بعض اشعار اور نظموں کا ترجمہ کیا۔ ان کو علاّمہ اقبالؔ سے دو مرتبہ شرف ملاقات بھی حاصل ہوا۔ پہلی بار ۱۹۲۹ء میں اور دوسری بار ۱۹۳۷ء میں۔ پہلی ملاقات میں انھوں نے علاّمہ اقبالؔ کو ان کی نظم 'چاند' کا عربی ترجمہ دکھایا۔ اور دوسری ملاقات میں اقبالؔ سے عربی ترجمے کی اجازت مانگی۔ علامہ اقبالؔ کے کلام کے عربی ترجمے کی تحریک اور اس کی اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''میں نے کلامِ اقبالؔ کو عام طور پر اس لیے پسند کیا کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اُترتا ہے اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ میرے شعور و احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔ سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبّت اور ایمان ہے۔ جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے۔ میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اس لیے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں۔۔۔ اور مغرب کی مادّی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں۔ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیات کے عظیم داعی ہیں...... ہمیں یہ

> بات کھٹکتی تھی کہ ٹیگور، اقبالؔ کے مقابلے میں زیادہ روشناس ہیں۔ ہم اس صورتحال کو اپنی ہی کوتاہی کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اقبالؔ کو متعارف نہیں کرایا۔"

(نقوش اقبالؔ۔ص: ۳۵۔۳۶)

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کے کلام اور پیام پر مبنی علی میاںؒ کے عربی مضامین اور خطابات کا مجموعہ روائع اقبالؔ ہے۔ نقوشِ اقبالؔ کے نام سے مولوی شمس تبریز خان نے علی میاںؒ کی مذکورہ تصنیف کا اردو ترجمہ کیا اور علی میاںؒ نے نظر ثانی کی، روائع اقبالؔ دمشق اور بیروت سے شائع ہوئی، اس کے اردو، انگریزی ترجمے لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہوئے۔

علی میاںؒ نے کتاب کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ "یہ کتاب ان مضامین اور خطابات کا مجموعہ ہے جو عرب نوجوانوں اور عرب ممالک کے فضلاء اور اقبالؔ کے نادیدہ قدردانوں اور اُن کے کلام کے شائقین کے لیے تیار کیے گئے تھے اور ان کا مقصود ان لوگوں کو کلام و پیام اقبالؔ سے آشنا کرنا تھا جو فارسی، اردو سے نابلد ہیں اور جن کے لیے عربی زبان کے سوا افہام وتفہیم کا اور کوئی ذریعہ نہیں"۔

(نقوشِ اقبال۔ص:۱۰)

اقبالؔ کے فلسفیانہ خیالات اور ان کے کلام کی رفعتوں کا ادراک معمولی بات نہیں۔ علی میاںؒ کو عربی، فارسی پر عبور حاصل تھا اور اقبالؔ سے فکری ربط وتعلق رکھتے تھے سنہ ۱۹۵۰ء میں سفر حجاز کے دوران علی میاںؒ نے اقبالؔ کے فکر وفن پر مقالات لکھنے کی ابتداء کی مضامین کو عرب کے علماء فضلا عرب جامعات کے اساتذہ اور طلباء سب ہی نے بہت پسند کیا۔

۱۹۵۶ء میں قیام دمشق کے دوران ریڈیو دمشق سے علی میاںؒ کا ایک مقالہ "محمد اقبال فی مدینة الرسول" کے عنوان سے نشر ہوا، اسی کے بعد رسالہ "المسلمون" دمشق شمارہ۳ جلد۶ میں عربی کے مشہور ومعروف ادیب علی طنطاوی نے

ایک خط کے ذریعہ اقبالؔ کے اشعار کا عربی ترجمہ کرنے پر اصرار کیا اس پیش کش کے بعد علی میاںؒ نے فکر اقبالؔ کے مختلف گوشوں پر مقالات لکھے تقاریر کیں جو عالم عرب کے مجلات میں شائع بھی ہوئیں اور ریڈیو سعودی پر نشر بھی ہوئیں۔ 'روائع اقبال' ان نشری تقاریر اور مقالات کا مجموعہ ہے جو دارالفکر دمشق سے (۱۹۶۰ء م ۱۳۷۹ھ) پہلی بار شائع ہوا جس میں مضامین ومقالات کی تعداد اٹھارہ ہے اور المجمع الاسلامی العلمی کے چوتھے ایڈیشن میں یہ تعداد بڑھ کر اکیس (۲۱) تک پہونچ گئی۔

مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) میرا تعلق اقبالؔ اور اُن کے فن سے (۲) شاعر اسلام اقبالؔ حیات اور خدمات (۳) اقبالؔ کی شخصیت کے تخلیقی عناصر (۴) اقبالؔ اور عصری نظامِ تعلیم (۵) اقبالؔ کا نظریۂ علم وفن (۶) اقبالؔ اور مغربی تہذیب (۷) انسانِ کامل اقبالؔ کی نگاہ میں (۸) مردِ مومن کا مقام (۹) ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (۱۰) اقبالؔ کا پیغام بلادِ عربیہ کے نام (۱۱) مسجد قرطبہ (۱۲) اقبالؔ اور مسئلہ فلسطین (۱۳) مسافر غزنی اور افغانستان (۱۴) طارق کی دعا (۱۵) ساقی نامہ (۱۶) ابوجہل کی نوحہ گری (۱۷) جاہلیت کی بازگشت (۱۸) ایک لمحہ جمال الدین افغانی کے ساتھ (۱۹) اقبالؔ درِ دولت پر (۲۰) شکوہ ومناجات (۲۱) کلامِ اقبالؔ میں تاریخی حقائق اور اشارات۔

نقوشِ اقبال میں شامل مضامین وخطابات کے پس پشت جو مقاصد کارفرما تھے ان کی دوٹوک وضاحت مصنف نے دیباچہ میں کردی ہے۔ ''اقبالؔ اردو فارسی کے شاعر ہیں۔ بندگی خدا اور عشق رسولؐ نے انہیں تحلیل کر کے وہ مرد مومن بنادیا ہے جس کے ہاتھ کے نیچے یہ ساری کائنات ہے''۔

اقبالؔ دنیا کی کئی زبانوں کی شاعری پڑھنے کے ساتھ مختلف ممالک کی تہذیبی اور مذہبی عروج وزوال کے رازداں تھے۔ وہ اللہ کے حضور میں ہر رنگ سے آئے۔ عشق رسولؐ میں وہ صرف آنسو ہی آنسو تھے۔ خدا اور اس کے بندوں میں شیطانی منصوبوں نے دوریاں پیدا کردیں، انسان جغرافیائی حدوں کا قتیل، رنگ ونسل کا

مقتول، شاہانہ اور جاگیردانہ نظام کا بے بس قیدی اور جمہوریت کے پردے میں مشین کا ایک پرزہ بن رہ کر گیا۔ اقبالؔ نے اس کے مسائل کا حل مذہب اور فلسفے میں تلاش کرنے کی ہمت ہی نہیں کی بلکہ بلاشبہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔ علی میاںؒ نے اپنے خطابات میں ایسا عالمانہ اسلوب اختیار کیا ہے جسے شعر میں سہلِ ممتنع کہتے ہیں۔ اوّل تو خود اقبالؔ اپنے پیغام رساں ہیں اردو اور فارسی جاننے والا، انسانی تہذیب کے عروج وزوال کو سمجھنے والا اقبالؔ کو بساط بھر سمجھ سکتا ہے۔ علی میاںؒ کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے وہ ان عربی دانوں کو اقبالؔ کا اردو اور فارسی کلام پہنچانا چاہتے تھے جو صرف عربی جانتے تھے۔ سمجھنے والے اور سمجھانے والے کا مقصد ایک اور صاف تھا کہ اقبالؔ نے کیا کہا؟ کیسے کہا گیا اس کی یہاں ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ شعر کا ترجمہ نگار صرف مفہوم ادا کر سکتا ہے اور کسی حد تک شاعرانہ امیجری بیان کر سکتا ہے۔ علی میاںؒ نے اقبالؔ کے پیغام کو جو دراصل خدا کی آخری کتاب قرآن پاک اور احادیث نبویہ کی شاعرانہ اور بڑی گہری حاشیہ فرسائی ہے۔ اس خوبی سے عربی ترجمہ اور تشریح کی صورت دی ہے کہ ترجمہ سے شعر کی خوبی مجروح نہیں ہوتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی تحریر فرماتے ہیں:

> ''علی میاںؒ صاحب نے اقبالؔ کو عالم عربی کے سامنے کن کن پہلوؤں سے پیش کیا ہے ترجمہ یا ترجمانی جو کچھ بھی ہے سلیس وشگفتہ ہے''

(صدق جدید لکھنؤ۔ ۱۸۔ ستمبر ۱۹۷۰ء)

علی میاںؒ نے کتاب کے پہلے باب میں شاعر اسلام علامہ اقبالؔ کی حیات اور خدمات کو بڑے اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اقبالؔ شہر سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا خاندان کشمیری برہمن (ہندو) تھا۔ کالج میں اپنے استاد میر حسن کی قربت نے انھیں علوم اسلامیہ اور شعر وادب کی طرف متوجہ کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ عربی اور انگریزی میں بی۔ اے۔ کیا۔

یہی زمانہ ہے جب اقبالؔ نے داغؔ کی شاگردی قبول کی۔ اس زمانے میں

''مخزن'' (ادبی جریدہ) میں ان کی نظمیں شائع ہوئیں۔ اقبالؔ نے ایم اے (فلسفہ) کیا اور تاریخ فلسفہ و سیاسیات کے لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں کیمرج میں داخلہ لیا اور تین سال فلسفہ و معاشیات کی ڈگریاں حاصل کر کے کچھ دن اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی جگہ کام کیا۔ میونخ جا کر فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کیا ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ابتداء میں اقبالؔ ایک قوم پرست ہندوستانی تھے۔ نیا شوالہ، ترانہ ہندی، ہندوستان سے محبت کا ثبوت ہیں۔ مغرب کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور اپنے تحقیقی مقالے اور ذاتی ذوق و شوق میں انھوں نے مختلف مذاہب، مارکسزم اور جمہوری نظام کا مطالعہ کیا۔ بڑے غور و فکر اور عمیق مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہونچے کہ قرآن پاک ہی ایسی کتاب ہے جس میں نظام حیات کو سلامتی سے گذارتے ہوئے انسانوں کو اشرف المخلوقات کا درجہ مل سکتا ہے۔ اقبالؔ کے اس دور کا تجزیہ علی میاںؒ نے دوسرے ابواب میں کیا ہے۔

بانگ درا کی اشاعت ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ اردو کے مجموعوں کے علاوہ اور خاص طور پر عمر کے آخری حصّوں میں اقبالؔ نے فارسی میں افکار و خیالات کا اظہار کیا، وہ اس لیے کہ اردو صرف ہندوستان کی زبان تھی اور فارسی، ہندوستانی اردو جاننے والے بھی جانتے تھے اور دیگر اسلامی ملکوں کے لوگ اردو کے مقابلے فارسی جاننے والے کہیں زیادہ تھے۔ فارسی میں اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبورِ عجم جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، مسافر شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ان کے لکچر بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے تھے۔

۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں اقبالؔ نے مسلمانان ہند کی نمائندگی کی، اسپین اور اٹلی کی حکومت کے دعوت پر دونوں ملکوں کا سفر کیا۔ مسجد قرطبہ میں نماز پڑھی اور ''مسجد قرطبہ'' جیسی عظیم نظم کی وہیں تخلیق ہوئی۔ یورپ کے دوران قیام مختلف اہم یونیورسٹیوں نے انھیں لکچر کے لیے مدعو کیا اور جلسے کیے ۱۹۳۳ء شاہ نادر خاں شہید کی دعوت پر افغانستان گئے۔ اس سفر میں ''مسافر'' جیسی نظم تخلیق ہوئی۔ آخر عمر میں اقبالؔ

کوئی امراض نے ضعیف کردیا لیکن زندگی کے آخری لمحوں تک تخلیقات میں اضافہ کرتے رہے۔ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔

علی میاںؒ کا تحریر کردہ اقبالؔ کا یہ مختصر سوانحی خاکہ ۱۹۵۱ء میں سعودی ریڈیو سے نشر کیا گیا۔

(نقوش اقبال۔ص:۵۰)

علی میاںؒ نے ایک مقالہ قاہرہ کی مشہور دانش گاہ میں پڑھا تھا۔ جس میں علامہ اقبالؔ کی شخصیت کے تخلیقی عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے پانچ عناصر کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) یقین کامل اور نبوت ورسالت کے خاتم، مولائے کُل سے شغف ومحبت

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

اقبالؔ کے اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے علی میاںؒ لکھتے ہیں۔

''اقبالؔ اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت راسخ الایمان تھے اور رسول اللہ کے ساتھ ان کی محبّت، شغف اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا اس لیے ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندہ جاوید دین ہے کہ اس کے بغیر انسانیت فلاح وسعادت کے بام عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رشد وہدایت کے آخری مینار، نبوت اور رسالت کے خاتم اور مولائے کل ہیں''۔

(نقوشِ اقبالؔ۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۵۵)

اِسی ایمانِ کامل نے کلامِ اقبالؔ میں جوش، ولولہ اور سوز وگداز کی کیفیت پیدا کی ہے۔ علی میاںؒ فرماتے ہیں:

''اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ دراصل رقت انگیز شعر، عمیق فکر، روشن حکمت، بلند معنویت، نمایاں شجاعت، نادر شخصیت اور عبقریت کا حقیقی منبع وسرچشمہ محبت اور یقین

ہی ہے اور تاریخ عالم میں جو کچھ بھی انسانی کمالات یا دائمی
آثار و نشانات نظر آتے ہیں وہ سب کے سب اسی محبت اور یقین
کے مرہونِ منت ہیں۔ اگر کوئی شخصیت یقین و محبت کے جذبے سے
خالی ہے تو پھر گوشت پوست کی صورت ہے اور اگر پوری اُمت اس
سے خالی ہے تو پھر اس کی وقعت بکریوں اور بھیڑوں کے گلّے سے
زیادہ نہیں ہے اور اسی طرح اگر کسی کلام میں یقین و محبت کی روح
کارفرما نہیں ہے تو پھر وہ ایک مقفیٰ اور موزوں کلام تو ہوسکتا ہے لیکن
ایک زندہ جاوید کلام نہیں بن سکتا''۔

(نقوشِ اقبال۔ص:۵۸)

(۴) اقبالؔ کی شخصیت کو بلندی عطا کرنے والا دوسرا اہم عنصر قرآن حکیم ہے۔
علی میاںؒ کے نزدیک اقبالؔ کے فکروفن پر جتنا گہرا اثر قرآن حکیم نے ڈالا اتنا کسی اور کتاب نے نہیں ڈالا۔ چونکہ اقبالؔ کا ایمان ایک نومسلم کا سا ہے اسلام کی وراثت انھیں ورثے میں نہیں ملی ہے اس لیے ان کے ہاں قرآن کریم سے شغف، دلچسپی اور شعور کے ساتھ تلاوت اور مطالعہ کا ذوق ہمیں نسلی مسلمانوں کے مقابلے زیادہ ہی ملتا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا نہ رازیؒ نہ صاحبِ کشافؒ

علی میاںؒ نے اقبالؔ کے اسی شعر کے حوالے سے اقبالؔ کے فکروفن کو اُجاگر کیا ہے۔ قرآن مجید اقبالؔ کی محبوب کتاب ہے، جس سے ان پر نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا تھا انھیں ایک نئی روشنی، نئی قوت اور توانائی حاصل ہوتی تھی۔ ''اقبالؔ نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور وفکر اور تدبر و تفکّر میں گذاری۔ ان کے والد نے ان سے کہا تھا۔ ''تم قرآن اس طرح پڑھا کرو جیسے قرآن اس وقت تم پر نازل ہورہا ہے۔ اس کے بعد سے اقبالؔ نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی ان پر نازل ہورہا ہے'' علی میاںؒ اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''اقبالؔ نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گذار دی۔ قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے قرآن بولتے۔ قرآن مجید ان کی وہ محبوب کتاب تھی جس سے انھیں نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا۔ اس سے انھیں ایک نیا یقین ایک نئی روشنی اور نئی قوت و توانائی حاصل ہوتی جوں جوں ان کا مطالعۂ قرآن بڑھتا گیا ان کی فکر میں بلندی اور ایمان میں زیادتی ہوتی گئی''

(نقوشِ اقبال۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۶۲)

(۴) علی میاںؒ کا کہنا ہے کہ اقبالؔ کی کتاب زندگی کے صفحات میں خودی، خودداری، خود اعتمادی کے نقوش واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ عرفان نفس ہی کا نتیجہ ہے کہ اقبالؔ کے کلام میں ہمیں فکری گمراہی اور شاعرانہ بے راہ روی بالعموم نہیں ملتیں۔ اقبالؔ کے یہ اشعار ان کے فکر کی پوری ترجمانی کرتے ہیں ؎

اپنے فن میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

علی میاںؒ اقبالؔ کے مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں عرفان نفس اور تعمیر خودی کو اقبالؔ کی شخصیت کی تخلیقی عناصر میں تیسرا اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔

''علامہ اقبالؔ کو خودی کی تربیت اور عرفان نفس پر بڑا اعتماد تھا ان کے نزدیک خود شناسی اور خود آگاہی انسان کو اسرار شہنشاہی سکھلاتے ہیں۔۔۔ اقبالؔ کا تصور خودی خود اقبالؔ میں اس قدر رچ بس گیا کہ ان کی زندگی عرفان نفس کا زندہ نمونہ تھی ان کی زندگی کے اوراق میں ان کی خودی، خودداری، خود اعتمادی کے نقوش بہت ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلا شبہ اقبالؔ نے شکم کے مقابلے میں دل کو ترجیح دی اور دل ہی کو اختیار کیا۔۔۔۔ یہ عرفان نفس ہی کا کرشمہ تھا جس نے اقبالؔ کو ہر قسم کی فکری گمراہی

اور ادبی بے راہ روی سے محفوظ رکھا''

(نقوش اقبال۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۶۳۔۶۴)

(۴) چوتھا عنصر جس نے اقبالؔ کی شخصیت کو بنایا پروان چڑھایا اُن کی شاعری کو نت نئے معانی افکار کی جولانی اور قوت تاثیر عطا کی ''اقبال کی آہ سحر گاہی'' ہے۔ ''اقبالؔ کے نزدیک آہ سحر گاہی زندگی کا بہت ہی عزیز سرمایہ ہے۔ بڑے سے بڑے عالم وزاہد اور حکیم و مفکر اس سے مستغنی نہیں''۔

عطارؔ ہو، رومیؔ ہو، رازیؔ ہو، غزالیؔ ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

نہ چھین لذت آہ سحر گہی مجھ سے نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

جب ساری دنیا محوِ خواب ہوتی تھی تو اقبالؔ اپنے رب کے حضور روتے اور گڑگڑاتے تھے، اِسی چیز نے اقبالؔ کی روح کو نشاط، قلب کو روشنی اور فکر کو غذا عطا کی۔

''اقبالؔ علی الصبح اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے، سفر و حضر، ہر مقام اور ہر کہیں ان کے لیے سحر خیزی ضروری تھی۔۔۔۔اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اس کی تمنا بھی کرتے ہیں کہ خداوند مجھ سے تو جو چاہے چھین لے لیکن لذت آہِ سحر گاہی سے مجھے محروم نہ کر'' ......وہ جوانوں میں اپنی آہ وسوز، اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنّا کرتے تھے۔ اور دعائیں کرتے کہ خداوند یہ میرا سوز جگر اور میرا عشق و نظر آج کل کے مسلم نوجوانوں کو بخش دے۔

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

(نقوش اقبال۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۶۶)

(۵) پانچواں عنصر جس نے اقبالؔ کے فکری اور تخلیقی ارتقاء میں اہم حصہ لیا وہ مولانا جلال الدین رومیؔ کی ''مثنوی معنوی'' ہے۔ علی میاںؒ مثنوی کی خوبیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اس دور جدید میں جب کہ اقبالؔ کو یورپ کے مادی و عقلی، بے روح و بے خدا افکار و خیالات سے سابقہ پڑا اور مادہ روح کی کشمکش اپنے پورے عروج کے ساتھ سامنے آئی تو اس قلبی اضطراب اور فکری انتشار کے موقع پر اقبالؔ نے مولانا روم کی مثنوی سے مدد لی اور مثنوی نے ان کو بہت کچھ سہارا دیا یہاں تک کہ اقبالؔ نے پیر روم کو اپنا رہنما تسلیم کرلیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ عقل و خرد کی ساری گتھیاں جسے یورپ کی مادیت نے اور الجھا دیا اُن کا حل صرف آتش رومی کے سوز میں پنہاں ہے''

(نقوش اقبال۔ ص:۶۷۔۶۸)

علی میاںؒ کی رائے میں اقبالؔ کو یورپ کی مادّی، عقلی اور بے روح و بے خدا افکار و خیالات اور مادّہ و روح کی کشمکش کی صورت میں قلبی اضطراب اور فکری انتشار سے محفوظ رہنے میں ''مثنوی معنوی'' نے بڑی مدد کی ہے، جس کا اعتراف اقبالؔ کے اشعار میں ملتا ہے۔

علاج آتشِ رومی کی سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اقبالؔ اس بیسوی صدی کے خالص صنعتی و مادی دور میں پھر کسی ''رومی'' کے منتظر ہیں۔ ان کے نزدیک مادّیت کا زنگ، عشق کی بھٹّی ہی میں صاف ہوسکتا ہے اور اس کے لیے آتش رومی کی ضرورت ہے

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنے کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

(نقوش اقبال۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۶۷ تا ۶۹)

اقبالؔ کا سوز دروں ہی ان کا نظریۂ علم و فن ہے'' علی میاںؒ فرماتے ہیں۔

''شاعر کی اس آتش نوائی اور مغنی کی ناہید نفسی کا کیا فائدہ جو اپنے
ماحول کو نہ گرما سکے اور نہ کسی دل تک راہ پا سکے، نسیم صبح اور بادِ صبا اگر
چمن کے لیے پیام بہار نہ لائیں تو ان کی مسیحا نفسی کس کام کی؟''۔

(نقوش اقبال۔ص:۹۸)

۲۸ / مارچ ۱۹۵۱ء علی میاںؒ نے دارالعلوم قاہرہ میں اقبالؔ کے فکر و فن پر ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا ''اقبالؔ اور عصری نظام تعلیم'' اس مقالے میں علی میاںؒ نے اقبالؔ کی مغربی نظام تعلیم کی تنقید، عصری دانش گاہوں کا ظلم عظیم اور تعلیم جدید پر اقبالؔ کی نکتہ چینی جیسے اہم مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ اقبالؔ کے پاپوش میں بڑی مغربی یونیورسٹیوں کے ستارے بھی ٹنکے ہوئے تھے اس لیے جب انھوں نے مغرب کے نظام تعلیم کے رخ سے نقاب اٹھائی تو لوگ اقبالؔ کے نظر سے حیلہ سازیٔ فرنگ دیکھنے پر مجبور ہوئے۔

یہ بتانِ عصر حاضر کے بنے ہیں مدرسہ میں　　نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ
گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا　　کہاں سے آئے صدا لاالٰہ الا اللّٰہ

''اقبالؔ کی نگاہیں حال سے زیادہ مستقبل پر تھیں وہ جانتے تھے قوموں اور ملکوں کی تقدیر ان کی آنے والی نسلیں ہوتی ہیں اس لیے وہ ''مغربی تعلیم اور اس کے مجرمانہ کردار سے'' بے باکی سے پردہ چاک کرتے ہیں اور ''تعلیم جدید پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں''۔ اگرچہ اقبالؔ نے مغربی تہذیب اور ثقافت کو قریب سے دیکھا تھا لیکن وہ مغرب اور اس کی تہذیب، ثقافت سے متاثر نہیں ہوئے۔ انھوں نے جرأتمندی سے مغرب پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور پورے تنقیدی شعور کے ساتھ غیر جانبدارانہ تجزیہ کرکے مغرب کی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں:

''اقبالؔ ان باغی ناقدین کی صف اول میں تھے۔ عالم اسلامی نے
اس سو سال میں جدید طبقہ میں شاید ان سے بڑا کوئی دیدہ ور نہیں
پیدا کیا بلکہ وہ عصر حاضر کے مشرق کے سب سے بڑے مفکر و فلسفی

ہیں۔ہم دوسرے تمام مشرقی فضلاء میں مغربی تہذیب پر اقبالؔ
کی طرح گہری نگاہ اور ان جیسا جرأتمندانہ تنقیدی نقطۂ نظر
ڈھونڈنے سے بھی نہیں پا سکتے''۔

(نقوش اقبال۔ص:۱۷)

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیوان ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

کلام اقبالؔ کی تشریح کرتے ہوئے علی میاں ؒ لکھتے ہیں۔

''یورپ میں علم و ہنر کی روشنی تو بہت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بحر ظلمات، چشمۂ حیواں نہیں رکھتا۔اس کی مادّہ پرستی کا یہ حال ہے کہ رعنائی، تعمیر، رونق اور حسن میں گرجوں کی عمارات سے بنکوں کی تعمیرات بڑھی ہوئی ہیں۔اس کی تجارت میں ایک نفع اور لاکھوں کی موت پوشیدہ ہے اور یہ علم وحکمت، یہ سیاست وحکومت جس پر یورپ کو ناز ہے، خالی خولی مظاہر ہیں، جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں، مغربی قائدین بنی آدم کا خون پیتے ہیں اور اسٹیج پر آکر انسانی مساوات اور عدالت اجتماعی کی تعلیم دیتے ہیں۔ بیکاری، عریانی، مے نوشی اور افلاس ہی فرنگی مدنیت کی سرفہرست فتوحات اور کارنامے ہیں۔جو قوم فیضان سماوی سے محروم ہوتی ہے اس کے کمالات کی حد اور اُس کا منتہائے علم، برق و بخارات سے آگے نہیں ہوتا۔جس تہذیب میں مشینوں کی حکومت ہو، صنعت وحرفت ہی کی بادشاہی ہو اور انہی کا

سلسلہ چلتا ہو اس میں دلوں کی موت، احساس مروت اور انسانی شرف وعزت کی ہلاکت یقینی ہے''۔

(نقوشِ اقبالؔ۔ص:۷۵۔۷۶)

مشرقی ممالک میں جس مغرب زدگی کو تحریک اصلاح وتجدید کا نام دیا اس سے اقبالؔ اتفاق نہیں کرتے۔

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

اس لیے علی میاںؒ نے صاف اور واضح انداز میں اقبالؔ کے فکر کی وضاحت اقبالؔ کے قول کی روشنی میں یوں کی ہے۔

''مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرقی اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (Genocide) کے مرادف ہے''۔

(نقوشِ اقبالؔ۔ص:۸۲)

اس مضمون میں مغربی تہذیب وثقافت اور مغربی فلسفہ کے سلسلہ میں اقبالؔ کے نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مردِ مومن کا مقام:

''مردمومن کا مقام'' وہ مقالہ ہے جس میں علی میاںؒ نے اقبالؔ کے انسان کامل اور مردِ مومن کا مختلف انداز سے جائزہ لیا ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبالؔ مغربی فلسفہ اور یورپ کی سیاسی ثقافتی قیادت کی تاریخ اور ترقی کے اسباب مرعوبیت کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔

''اے مردمومن اس کائنات کے تمام مناظر وتمام اجرام فلکی اور اجسام ارضی زوال آمادہ اور فنا پذیر ہیں۔ لیکن تو ان کے درمیان جاوداں ہے تمہارے اردگرد کی ہر شے تمہارے تابع اور ماتحت ہے لیکن تم نے اپنے کو نہیں پہچانا، تم دنیا کے پیچھے کب تک چلتے رہوگے یا تو اسے ٹھکرا

دو یا پھر اسے اپنے آگے جھکا دو، درمیان کی راہ کوئی نہیں۔"

(نقوش اقبال۔ص: ۱۴۰۔۱۴۱)

"اقبال کے اس مردمومن" اور "مسلم مثالی" کو اس کے ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان سارے انسانوں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت اور مردانگی اور روحانی قوّت سے ممتاز ہے.....ایک اس کا وجود انسانی ہے۔ دوسرا اس کا وجود ایمانی ہے......اپنے وجود انسانی میں قانون طبعی کا ویسا ہی تابع ہے جیسے اس کے مثل اور دوسرے انسان.....لیکن اس کا وجود ایمانی اپنے اندر ایک پیام رکھتا ہے جو انبیاء کا پیام ہے زندگی کے بارے میں اس کے کچھ اصول اور اعتقادات ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایک مقصد کے لیے گزرتی ہے......وہ حیات انسانی کے اسرار سربستہ کا ایک راز ہے عالم بقا کے لیے اس کے وجود ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔......اقبال کا مردمومن زندہ جاوید ہے۔ اس لیے وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے"۔

(نقوش اقبال۔ص: ۱۱۸تا۱۲۰)

علامہ اقبال نے جب تاریخ عالم پر ایک نگاہ ڈالی تو انھیں نظر آیا کہ صالح انقلاب ہمیشہ مردمومن کا مرہونِ منّت رہا ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے اس کی مثال اس عالم کے مطلع پر ایک صبح سعادت کی سی ہے وہ انقلاب کا حامل اور زندگی کا پیغامبر ہے۔....

"ایک مردمومن مختلف اور متضاد اخلاق وصفات کا حامل ہوتا ہے جو اس کی طبعی رنگا رنگی اور تنوع پسندی کا آئینہ دار ہوتی ہے اور وہ مختلف ومتضاد صفات دراصل اللہ تعالیٰ کے صفات واحوال کے مظاہر ہیں۔......مثلاً کشادہ قلبی، عفوو درگذر اور حلم وبردباری میں وہ خدا کی صفت غفار کا پرتو ہے اور اسی طرح دین حق کے بارے میں شدت، کفر و باطل پر غصہ وغضب میں اسکی صفت "قہار" کا مظہر ہے اور پاکی وپاکدامنی پاک نفسی صفت قدوس کی

آئینہ دار ہے''۔

(نقوش اقبال۔ص:۱۲۷)

اقبالؔ نے ''اسرار خودی'' میں جلال الدین رومیؔ کے اشعار کے حوالے سے انسان کامل کی تلاش و جستجو کی ابتداء کی ہے۔ علی میاںؒ اسرار خودی میں اقبالؔ کے فکر و فلسفہ کو تلاش کرتے ہیں۔

''اقبالؔ کی نگاہ متجسس کو اس عالم رنگ و بو میں جو اپنے اندر گوناگوں دلفریبیاں اور دلچسپیاں رکھتا ہے صرف درندوں کا بھٹ اور چوپایوں کا جنگل نظر آیا اور اس کی متجسّسانہ نگاہیں اس درندوں او چوپایوں کی دنیا میں کسی انسان کی جویا ہیں............

......اقبالؔ نے اس کھوئے ہوئے انسان کو پالیا اور نہ صرف پایا بلکہ زندگی کی طویل ایام اس کے ساتھ گذارے۔ اقبالؔ کا وہ گمشدہ انسان جسے وہ انسان کامل سے تعبیر کرتے ہیں......ایک سچا مسلم ہے ۔۔۔۔۔۔ اقبالؔ کا مرد مومن دراصل قرآنی نظریہ کا انسان کامل ہی ہے۔

(نقوشِ اقبال۔ص:۱۱۶تا۱۱۸)

دمشق ریڈیو ۱۹۵۶ء کی نشری تقریر ''اقبال فی مدینۃ الرسول '' (''اقبال درِ دولت پر'') میں جس موضوع پر توجہ مرکوز کی وہ کئی وجوہ سے اہم ہے اولاً ایک عرب ملک کے پس منظر میں عشق رسول اور یاد مدینہ منورہ پر گفتگو بالخصوص ایک ہندوستانی کی زبانی نفسیاتی اعتبار سے اپیل سے حامل موضوع ہے۔ علی میاںؒ پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اقبالؔ کی پوری زندگی عشق رسول اور یادِ مدینہ سے معمور تھی'' ۔۔۔۔۔ انھوں نے عالم خیال میں مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیا ہے اور اس تصوّر کے ساتھ وہ قافلۂ شوق کے ہمراہ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں، ذوق حضوری اور شوقِ محبّت میں یہ ریت اس کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے۔ بلکہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ذرہ دل بن کر دھڑک رہا ہے، وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اور نرم روی اختیار کرے۔۔۔۔ عالم تصور میں رسول اللہ کے مواجہ شریف میں حاضر ہوتے اور اپنا حال دل بیان کرتے ہیں، اُمّتِ اسلامیہ اور عالم اسلام کے حالات اور اس کے مسائل اور مشکلات، اس کی آزمائشیں اور امتحانات نیز مغربی تہذیب اور مادّی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے اس کی سپر افگنی اور بے بسی اپنے وطن میں اس کی غریب الوطنی اور خود اپنی قوم میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔۔۔ دنیائے اسلام کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ مسلمان مجھے نہ ملا جو موت سے لرزہ براندام ہونے کی بجائے موت اس سے لرزہ براندام ہو۔"

(نقوش اقبال۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۲۴۷ تا ۲۵۵)

"ارمغان حجاز" کی مذکورہ نظم معنوی و مفہومی تواتر و تسلسل کی حامل ہے اور علی میاںؒ کی تقریر میں اس سے بھرپور انصاف کیا گیا ہے۔

اقبالؔ کے کلام میں خیالات کا ایک عالم ہے۔ چند مضامین میں ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور مصنف کا مقصد بھی نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے ان کی اہم نظموں اور متفرق اشعار سے اسلام کی بنیادی تعلیم اس کی روح اور ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح، مغربی تہذیب اور اس کے علوم وغیرہ کے متعلق اقبالؔ کے خیال کا خلاصہ اور لب لباب پیش کر دیا ہے۔ جس سے اس کے اہم رخ سامنے آتے ہیں۔ اقبالؔ کا نصب العین، ان کے خیالات کی رفعت و گہرائی، ان کی حکیمانہ تعبیریں، ان کے بیان کی سحر آفرینی بجائے خود اعجاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پر علی میاںؒ کی مؤثر، دل نشیں تشریح و تبصرہ نے سونے پر سہاگا کا کام کیا ہے۔

علی میاںؒ نے اقبالؒ کی کئی اہم نظموں کی تشریح اس لہجے میں کی ہے جو ان نظموں

کے شایانِ شان ہے۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس اپنے تمام معتمدین اور اہم ترین شریک کار ساتھیوں کو جمع کر کے ایک مجلس شوریٰ کرتا ہے۔ خود صدارت کرتا ہے۔ تمام مشیر مختلف خطرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آخر میں ابلیس اِس اندیشے کو ظاہر کرتا ہے کہ ابھی تک دنیا کا نظام میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس عصری کامیابی سے ہم کو مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ اشتراکیت سے ہمیں وقتی خطرہ ہے لیکن بنیادی خطرہ اسلام اور مردِ مومن سے ہے۔ اس خطرے کو اقبالؔ نے جس شاعرانہ سوز دروں سے بیان کیا ہے۔ اُسی تخلیقی انداز سے علی میاںؒ نے اس کی تشریح کی ہے۔

"۱۹۳۲ء میں جب اقبالؔ نے مسلمانوں کے فردوس گمشدہ اندلس کی زیارت کی تو مسجد قرطبہ میں بھی حاضر ہوئے، یہ حاضری آثار قدیمہ کے شوقین سیّاح کی نہ تھی بلکہ ایک مردِ مومن اور دردمند وحساس شاعر کی آمد تھی۔ جو ایمان وعرفان کے اس پیکر جمیل اور مظہر جمیل کے حضور میں تھی، یہ زیارت ایک عظیم مسلمان کی مسلمانوں کی ایک عظیم یادگار کے لیے تھی۔۔۔۔۔۔ اقبالؔ نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بیکراں جذبات، پاکیزہ محبت کے احساسات، فن تعمیر کی عبقریت، اسلامی آرٹ کا اعجاز اور اس کی کرامت اس کی سادگی و پرکاری جمال کی رعنائی اور حسن کی یکتائی کا بڑی بصیرت سے معائنہ کیا۔ اس منظر عبرت اثر نے مومن شاعر کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دیے جس کے نتیجے میں وہ لافانی نغمہ دنیا نے سنا جسے ہم مسجد قرطبہ والی نظم میں گونجتا ہوا پاتے ہیں۔ اقبالؔ نے اس عظیم مسجد کو اسلام اور مسلمانوں کی تہذیبی علامت، اشارہ اور رمزکی حیثیت سے دیکھا۔ اس مسجد کے در و دیوار اور نقش و نگار میں انہیں مومن کے اخلاقِ حسنہ اور فضائل وشمائل، عالی ہمّتی، بلند نظری، وسیع القلبی، عالی ظرفی،

سادگی اور نیک مزاجی، بلند طبعی و بلند مشربی، اخلاص وللّٰہیت،
حق پسندی، عزم وثبات، جرأت و بے خوفی اس کی تواضع وخودداری
اوراس کے جلال و جمال کی تصویر کا ایک جامع مرقع نظر آیا۔"

(نقوش اقبال۔ص:۱۶۸۔۱۶۹)

"مسجد قرطبہ" اقبالؔ کی شہکار نظموں میں سرفہرست ہے اقبالؔ کے سوز دروں اور دردِ دل نے اس "مسجد قرطبہ" کے وسیلے سے ایک ایسی شعری مسجد قرطبہ تخلیق کی جو ماہ و سال کی گردش اور اُس کی آلودگیوں سے بے نیاز ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے یاس انگیز اور حسرت خیز موضوع کو پورے رجائی انداز سے پیش کیا ہے۔ طرزِ استدلال خوش آئند اور بشارت آمیز ہے نظم کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اقبالؔ کی اس نظم کے پس منظر کا تاریخی شعور بھی بہت طویل و عریض ہے۔ اس میں اقبالؔ کا نظریہ حیات و کائنات بھی ہے اور فتح اندلس سے زمانہ حال تک کے تاریخی حوادث و انقلابات، فکر و فلسفے اور اہم تحریکات کا ذکر بھی۔ علی میاںؒ نے جو خود ایک عالم دین، مؤرخ اور مفکرِ اسلام ہیں اس نظم کی تشریح میں اپنی تمام صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے اور نظم کو اقبالؔ کی ہشت پہلو شخصیت کا آئینہ دار کہا ہے۔

"اقبالؔ کا نظریہ حیات وکائنات اُن کا فلسفۂ خودی، مردِ مومن کا تخیل، ایمان اور عشق کے بارے میں واضح تصوّرات، ان کا فلسفہ خودی، ان کا نظریۂ شعروادب، فنونِ لطیفہ کے بارے میں اُن کا طرزِ عمل، زندگی کے تخلیقی اور تحریکی عناصر، اوران کے علاوہ بہت سے واضح نظریات اس نظم میں آگئے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ "مسجد قرطبہ" کے آئینے میں ہم اقبالؔ کی ہشت پہل شخصیت کے خدوخال دیکھ سکتے ہیں اوراُن سے مل سکتے ہیں"۔

(نقوشِ اقبال۔ص:۱۸۴)

جس طرح نظم کے مختلف حصّوں میں شاعر نے بڑے حسنِ ترتیب سے اپنے

خیالات کو پیش کیا۔ پوری نظم بتدریج اپنی انتہا اور ارتقاء کو پہنچتی ہے۔ عربی ترجمہ نگار نے بھی اس خوبی کو بڑے حسن سے نبھایا ہے اور نظم میں وحدت واثر اور مجموعی تأثر کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اقبالؔ کی نظم ''ذوق شوق'' کا تعارف علی میاںؒ نے بڑی خوبصورتی سے کرایا ہے۔

''۱۹۳۱ء (۱۳۵۰ھ) کی ایک حسین صبح تھی جب مؤتمر اسلامی کا قافلہ بیت المقدس کی مبارک و منور فضاؤں میں داخل ہوا، تمام ماحول کیف آور اور ہوا روح پرور تھی آفتاب جہاں تاب کی سنہری کرنیں اس طرح ابھر رہی تھیں جیسے وہ نور کے چشمہ سے نکلی ہوئی نہریں ہوں۔''

(نقوش اقبال۔ص:۱۸۵)

ایک عظیم اور خوبصورت نظم کی وجہ تحریک کو جس شاعرانہ نثر سے علی میاںؒ نے متعارف کرایا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سنجیدہ، پُراثر، شگفتہ اور عالمانہ نثر لکھنے کے ساتھ شاعرانہ نثر لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے اور بے شمار مصروفیات کے باوجود ان کی جمالیاتی حس، جس کے بغیر شعروادب کی طرف غور کرنا مشکل ہے متحرک نظر آتی ہے۔ اقبالؔ کی نظموں اور علی میاںؒ کی تشریح کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ان کی نثر میں وہی حسن و جمال سوز دروں اور آتش نوا لہجہ جو اقبالؒ کی نظم کا حسن ہے، ملے گا۔

''ساقی نامہ'' جو مثنوی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس صنف کو جس میں حسن و عشق کی داستانیں ہوتی تھیں، زندگی کی بیداری کا نغمہ پہلی بار اقبالؔ نے پورے شاعرانہ اسلوب سے پیش کیا ہے اور علی میاںؒ کا کمال یہ ہے کہ اس ذراسی علامتی نظم کی تشریح و تفسیر جس شاعرانہ اور عالمانہ اسلوب میں کی ہے خودی و بیخودی کے جو اسرار کھولے ہیں وہ اقبالؔ کی نظم کا نثری حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

علی میاںؒ نے اقبالؔ کی ان اہم نظموں اور متفرق اشعار کا انتخاب عربی میں پیش کیا جس سے اسلام کی بنیادی تعلیمات، دین محمدیؐ کی روح اور ملت اسلامیہ کی

تجدید واصلاح مغربی تہذیب وعلوم وغیرہ کے متعلق اقبالؔ کے افکار وخیالات، عالمِ عرب کے علماء ومفکرین کے سامنے آئیں اور مخاطبین کو متحرک کیا جا سکے۔ ''ذوق وشوق''، ''طارق کی دعا''، ''ساقی نامہ''، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''، ''مسجد قرطبہ'' پر لکھے گئے مضامین اسی انداز کے ہیں۔ اقبالؔ نے مغرب ومشرق کے علمی وفکری سر چشموں سے استفادہ کیا تھا یہ سچ ہے کہ فکر وشعر اقبال کا منظر کافی وسیع ہے۔ کلام اقبالؔ میں خیالات کا ایک وسیع عالم ہے۔ اقبالؔ کے افکار بحر بیکراں کا احاطہ کرنا چند مضامین میں دشوار بھی تھا اور علی میاںؒ کا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا، اگرچہ ان پر بار ہا خامہ فرسائی'' کی جا چکی تھی لیکن علی میاںؒ کی تنقید تشریح اور تبصرے کی سطح دوسرے ناقدین کے مقابلے بہت بلند نظر آتی ہے۔ جسے اقبالؔ کے قدر دانوں کے علاوہ علامہ اقبالؔ کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی محسوس کیا اور علی میاںؒ کو لکھا۔

> ''آپ نے فکر اقبالؔ کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جیسے اغلباً اقبالؔ محسوس کرتے یا چاہتے تھے۔''

(نقوشِ اقبالؔ۔ ص:۱۰)

علی میاںؒ اقبال کے شعر وفکر پر اسلام کے نقطۂ نظر سے ناقدانہ بحث کی ہے جو وقیع بھی ہے اور وزنی بھی۔ علی میاںؒ کی ناقدانہ نظر کا سب سے بڑا ثبوت یہ اقتباس ہے۔

> ''میں اقبالؒ کو کوئی معصوم اور مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام ومجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہنچا ہوا ہوں۔ جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی، عطارؔ اور عارف رومی آداب شریعت کے پاس اور لحاظ اور ظاہر و باطن کی یک رنگی اور دعوت عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں اقبالؔ کے یہاں اسلامی عقیدہ وفلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں

جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔۔۔۔ میں اس کا بھی قائل نہیں
کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم وحقائق
تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں۔۔۔ ان کی نادر شخصیت میں
بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم وفن اور پیغام کی عظمت
سے میل نہیں کھاتے۔“

(نقوشِ اقبالؔ۔ص:۴۰۔۴۱)

اقبالؔ کے کلام اور پیام پر بہتوں نے لکھا ہے اور اپنے ذوق ونظر کے مطابق اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے ان میں جن کو اقبالؔ سے جس قدر فکری ہم آہنگی ہے اسی قدر انھوں نے ان کی بہتر ترجمانی کی ہے۔علی میاںؒ اور اقبالؒ دونوں کا نصب العین اور ان کے خیالات کا سرچشمہ ایک ہے دونوں اسلام کے داعی ومبلّغ ہیں، دونوں کا مقصد ملّت اسلامیہ کی تجدید واصلاح اور اسے مغربی تہذیب کے سحر سے بچانا ہے۔فرق یہ ہے کہ اقبالؔ کی زبان شاعرانہ ہے اور علی میاںؒ کی زبان علمی ومذہبی ہے لیکن دونوں کے دلوں کی آواز ایک ہے۔جس طرح اقبالؔ کے فکر وشعر میں اسلامی تاریخ اور اس کے ذریعہ پیدا شدہ جذبات واحساسات اور تخیلات کو اہمیت حاصل ہے،علی میاںؒ تاریخ وعلوم اسلامیہ پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں اور اقبالؔ کے کلام پر اثر انداز ہونے والے مأخذ کی تفہیم کے بعد فکر وشعر اقبال کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔اسی لیے وہ اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

برصغیر کے نامور ادیب وشاعر مولانا ماہر القادری ’نقوشِ اقبال‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”مولانا علی میاںؒ نے علامہ اقبالؔ کی نظموں اور شعروں کے انتخاب میں بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے،انھوں نے اس خریطۂ جواہر سے سب سے زیادہ تابناک لعل وگوہر چنے ہیں، فاضل مصنف نے جس حُسن ،نزاکت اور دیدہ وری کے ساتھ اشعارِ اقبالؔ کی ترجمانی کی ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شبلیؔ کا قلم،غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش واخلاص اس

تصنیف میں کارفرما ہے۔

(نقوشِ اقبال۔ ص:۱۴)

علی میاںؒ نے فکر و شعر اقبال کے ترجمہ یا ترجمانی کے دوران معتدل اور متوازن انداز اختیار کیا، اقبال کے وہ نظریات جو متنازع فیہ رہے ہیں پیش کرنے میں بھی جارحانہ انداز سے پرہیز کیا، تشریح و ترجمانی میں ایک اچھا تشریح نگار اور ترجمہ کار ایک اچھا شاعر ہو جاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ روشن، پُر امید، حوصلہ مند صبح کی مرقع نگاری میں اس کا اسلوب کتنا کھلا کھلا اور شگفتہ ہوگا۔ مسجد قرطبہ کے صحن میں آنسوؤں سے نم کردار کے تاریخی عروج و زوال میں شاعرانہ مگر اس سے زیادہ فلسفیانہ نظر ڈالنے والے کردار کا کیا اسلوب ہوگا۔ علی میاںؒ کو اردو فارسی عربی زبان پر جو قدرت حاصل تھی وہ اس کا بے جا مظاہرہ نہیں کرتے، یہ بھی ان کے اسلوب کی بنیادی شناخت ہے، انھوں نے اقبال کے احساسات اور تخیلات میں اس قدر ڈوب کر لکھا کہ کہیں کہیں نقش ثانی، نقشِ اوّل سے زیادہ خوبصورت اور تخلیقی ذہن کا کمال نظر آنے لگتا ہے۔ یہاں یہ بات ضرور ہے کہ بعض جگہ اقبال نے ہندوستانی صنم گیری، پیکر تراشی اور مصوّری کو بھی اپنے تخلیقی سرچشموں میں شریک رکھا ہے۔ اقبال کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' کے ابتدائیہ بند کو ذہن میں رکھیے جہاں اس عالم کہنہ پر نئی بہار آرہی ہے۔ علی میاںؒ اس کی تشریح شاعرانہ لہجہ میں کرتے ہیں۔

''موسم گل آگیا، دشت و جبل میں اس کے نقیب پھیل گئے، لالہ و گل نسرین و ریاحین کی حکومت نے اپنا نقشہ جمالیا، پتھروں اور جمادات میں بھی بہار نے زندگی پیدا کر دی دنیا کو فرح و سرور کی بدلیوں نے گھیر لیا تھا، اس نشاط افزا ماحول میں چڑیاں گھونسلوں سے باہر آگئیں، چشمے اور ندیاں سینۂ کوہ سے نکل کر میدانوں میں زندگی کی طرح جھومتی آگے بڑھنے لگیں۔ کبھی دھیرے کبھی تیز، رکتی اچھلتی چٹانوں کو توڑتی کہساروں سے ٹکراتی اور رند کے نغمے سناتی ہوئی

رواں دواں ہیں۔"

(نقوشِ اقبال ۔ص:۲۱۷)

نقوشِ اقبالؔ میں شامل مضامین نئے نہیں ہیں مگر علی میاںؒ نے موضوعات پر جو کچھ کہا بہت خلوص وعقیدت سے پُر ہے۔ علی میاںؒ نے اقبالؔ کے شعر و فکر کا اسلام کے تناظر میں جائزہ لیا، اور کلام و پیام اقبال پر اسلام کے نقطۂ نظر سے ناقدانہ بحث کی ہے۔ ان کی ادبی تنقید عربی و اردو ادب میں صالح اور تعمیری تنقید کے باب میں اہم اضافہ ہے۔

خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اقبالؔ فہمی پر ''نقوشِ اقبال'' ایک اہم تصنیف ہے، جس کا انداز وضاحتی اور تحریکی ہے نقوشِ اقبالؔ کے حرف حرف سے مصنف کی علمیت اور خلوص عیاں ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علی میاںؒ کے طرزِ اسلوب میں جارحیت نہیں ملتی جو بالخصوص تناظر اسلامیات میں اقبالؔ کو پیش کرنے والے دوسرے ادیبوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ علی میاںؒ نے کلامِ اقبالؔ میں پیش کردہ خیالات وتصورات سے عرب ممالک کو متعارف کر کے اقبالؔ کی خواہش کو بھی پورا کیا اور اقبالؔ نے اسلامیات کی جو خدمت انجام دی ہے اس سے بھی عرب اور اسلامی ممالک کے عوام و خواص کو روشناس کرایا۔ جنوری ۱۹۸۷ء میں انھوں نے مدینہ طیبہ کی ادبی انجمن "المدينة العوبى" میں" دورِ اقبال فی توجیه الأ دب و الشعو"، ''شعر وادب کو نیا رخ دینے میں اقبالؔ کا تاریخی کردار'' کے عنوان سے ایک تقریر کی جو بہت پسند کی گئی۔ نقوشِ اقبال اور اس کے بعد اقبالؔ کے پیام و کلام پر شائع ہونے والے ان کے کئی فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین اقبالؔ کے کلام پر نقد و تبصرہ کے ذخیرہ میں اضافہ کر چکے ہیں۔ یہ مضامین ان کی ادب شناسی اور اقبالؔ شناسی کا جامع اور وقیع نمونہ ہیں۔

☆☆☆

ذوقِ تاریخ نویسی کی آئینہ دار مولانا علی میاںؒ کی

تاریخی تصانیف

تاریخ علی میاںؒ کا خاص موضوع رہا ہے، انھوں نے صرف اسلامی تاریخ کا نہیں بلکہ تاریخِ عالم کا عمیق مطالعہ کیا۔ علی میاںؒ کے والد حکیم عبدالحی حسنیؒ باکمال مؤرخ تھے، ان کا تاریخی ذوق، طرزِ فکر اور طرزِ تحریر علی میاںؒ کے لیے رہنما ثابت ہوا، عربی زبان و بیان کی روشنی میں قرآن کریم سے بھرپور استفادہ کیا، قرآن کریم اور علوم دینیہ کی روشنی میں تاریخ عالم کے مطالعہ نے انھیں ایسے رموز و حقائق سے آگاہ کیا اور انھیں ایسی بصارت اور بصیرت عطا فرمائی جس تک ہر کس و ناکس کی رسائی ممکن نہیں۔ علی میاںؒ نے عربی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا تو ادب عربی کا نئے زاویہ سے مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جب تاریخ اسلام اور تاریخ عالم پر نظر ڈالی تو مسلمانوں کے عروج و زوال کی ایسی داستان پیش کی جس میں عام مورخین کی روش سے ہٹ کر ثابت کیا کہ مسلمانوں کے زوال سے دنیا کو کیا نقصان ہوا۔ گویا مسلمانوں کو ایک بازی گر اور غیر فعال کے بجائے مؤثر و فعال عنصر کی حیثیت سے پیش کیا۔

علی میاںؒ نے اسلامی تاریخ کے خدوخال اور فکر و ثقافت کے ان اثرات کا مطالعہ کیا جو انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں رونما ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک ”تاریخ گذشتہ اقوام عالم کا آئینہ ہے عروج و زوال کے اسباب اس میں موجود ہیں اس لیے کوئی بھی عروج اتفاقی طور پر نہیں ہوتا یہ وہ قوانین کائنات ہیں جن کا تعلق اقوام عالم کے اعمال و اخلاقیات سے ہے۔ علم قرآن اور حدیث اسلامی شریعت کے سرچشمۂ اوّل ہیں جو انسانی زندگی کے عروج اور زوال کے اسباب

کی طرف رہنمائی کرتے ہیں حقائق کے افہام وتفہیم کا اصل ذریعہ ہیں''۔

علی میاںؒ مغربی تہذیب اور علوم کے فلسفوں پر گہری ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ان کی کمزوریوں سے خوب واقف تھے، اسی لیے انھوں نے مغربی علوم اور مغربی تہذیب کے سامنے سپر نہیں ڈالا بلکہ ایک عالم دین اور مفکر اسلام کی حیثیت سے عصری، علمی اسلوب میں عصری تعبیرات سے واقفیت کے ساتھ مغرب کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا۔علی میاںؒ کے اس عمل سے مغرب کے علمی تفوق کی تردید کے ساتھ اسلامی علوم کو مغربی تشریح سے آزادی نصیب ہوئی۔ اسی طرح جب انھوں نے اصلاح وتجدید کی تاریخ لکھی تو مصلحین ومجددین کی دلآویز تاریخ بیان کی اور تاریخی شواہد سے اس کے تسلسل کو ثابت کیا۔

علی میاںؒ کی اہم تاریخی تصانیف میں ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر''، ''تاریخ دعوت وعزیمت'' اور ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' ہیں۔

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر)

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کتاب میں علی میاںؒ نے انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کے اثرات کا جدید اور فکر انگیز انداز سے جائزہ لیا ہے۔کتاب عربی میں ۱۹۵۰ء میں مصر کے باوقار تصنیفی ادارہ لجنة التالیف والترجمة والنشر سے ڈاکٹر احمد امین کے مقدمہ کے ساتھ پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی تھی۔اصلاً عربی میں لکھی گئی اس کتاب کے انگریزی، اردو، فارسی، ترکی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ان تمام زبانوں میں اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر عربی کتاب کا تیرہواں ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۲ء میں

دارالقلم کویت سے شائع ہوا، اس میں مصنف کے قلم سے مختلف اشاعتوں کے وقت لکھے گئے تین پیش لفظ شامل ہیں۔ دو عرب اہلِ قلم ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰؒ اور سیّد قطبؒ کے مقدمے ہیں، علی میاںؒ کے قریبی عرب دوست استاذ احمد الشرباصی کے قلم سے بعنوان ''صورة وصفية أخي أبو الحسن'' تعارفی مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ علی میاںؒ نے عرب اور اسلامی ممالک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے اور دعوت وتبلیغ کی ذمہ داریوں کو یاد دلانے کے لیے چند مضامین تحریر کیے تھے جن میں خیرِ امت کے زوال کے اسباب اور مغربی فکر وفلسفہ کے غلبہ کے اسباب پر روشنی ڈالی تھی۔ دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کے اثرات بیان کیے تھے۔ اسلام کی برتری پر یقین کا پیغام دیا تھا، انھیں پہلے سفرِ حجاز میں حج کے بعد مرکزِ اسلام میں طویل قیام کا موقع نصیب ہوا۔ وہاں کے علماء سے جو متعدد ملکوں سے تعلق رکھتے تھے اس موضوع پر تبادلہ خیال کا موقع بھی ملا تھا۔ ماذا خسر العالم تیار تھی اور علی میاںؒ کتاب کی طباعت اور اشاعت کے لیے فکرمند تھے۔ تبلیغی اور دعوتی کام کے سلسلہ میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، آپ نے بعض حضرات سے رابطہ قائم کیا لیکن حوصلہ افزا جواب نہ ملنے پر دل شکستہ اللہ کے حضور میں حاضر ہوئے اور دعا فرمائی۔

''میں سیدھا حرم شریف گیا اور اسی دل شکستگی کے عالم میں ملتزم پر کتاب کی طباعت کے سامان ہونے اور قبولیت کی دعا کی، غالباً اس دعا ہی کا اثر تھا کہ اللہ نے اس کی طباعت کا غیب سے بہتر سے بہتر سامان پیدا کیا اور اس کو وہ مقبولیت عطا کی جو میری کسی تصنیف کو حاصل نہیں ہوئی''۔

(کاروانِ زندگی، ج:۱، ص:۲۶۵)

درکعبہ پر دعا کے بعد مصر کی اعلیٰ مقام تصنیفی ادارے لجنة التاليف والترجمة والنشر سے مراسلت کی۔ انھوں نے کتاب کا مسودہ اس کے ماخذ کی فہرست دیکھ کر فوراً طباعت کی منظوری دے دی۔ علی میاںؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اُن کا بڑا مسرت اور گرم جوشی کا خط آیا، جس میں انھوں نے لکھا کہ کتاب کیا بلحاظ زبان، کیا بلحاظ مواد ہر طرح سے مکمل ہے اور ہماری کمیٹی نے اس کی طباعت کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے یاد ہے میری زندگی میں چند دن جو انتہائی مسرت کے گزرے ہیں ان میں ایک وہ دن بھی تھا جب عزیز محمد رابع سلمہٗ نے مجھے چلتی ہوئی موٹر میں وہ خط دیا، حقیقت میں اس کتاب کی اشاعت نے میرے دعوتی کام میں وہ آسانی اور مشرق وسطیٰ کے علمی دینی حلقہ میں میرے تعارف کا وہ کام کیا جو سیرت سیّد احمد شہیدؒ کی اشاعت نے ہندوستان میں کیا تھا۔ میں جب ۱۹۵۱ء میں مصر گیا تو یہ کتاب وہاں کے علمی و دینی حلقوں میں خوب پھیل چکی تھی اور میرے تعارف کے لیے اِتنا کافی سمجھا جاتا تھا کہ یہ 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' کے مصنف ہیں''۔

(کاروانِ زندگی، ج:۱،ص:۲۶۶)

طباعت کے بعد کتاب پر پہلی نظر پڑنے کا دلچسپ واقعہ کاروانِ زندگی میں تحریر فرمایا ہے:

''یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی لیکن جنوری ۱۹۵۱ء تک مجھے اس کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی، پہلی مرتبہ اس پر نظر پڑنے کا بھی دلچسپ واقعہ ہے، میں نے جنوری ۱۹۵۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں جب مکہ معظّمہ میں طویل قیام رہ چکا تھا مصر کے سفر کا عزم کیا تو شام کو بھی اس پروگرام میں شامل کرنے کا ارادہ ہوا، شامی سفارت خانہ جدہ میں شام کا ویزہ لینے گیا، عزیزان مولوی معین اللہ صاحب ندوی (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) اور مولوی عبدالرشید ندوی جو سال ڈیڑھ سال سے دعوت و تبلیغ اور میرے دعوتی رسائل کو اہلِ علم تک پہونچانے کے لیے مکہ میں مقیم تھے، میرے ساتھ سفارت خانہ گئے، مجھے جب شام کا ویزا مل گیا تو میں نے شامی سفیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، حسن اتفاق سے اس وقت اس عہدہ پر استاد جواد المرابط متعین تھے جو خود فاضل ادیب تھے اور المجمع العلمی العربی دمشق کے رکن، انھوں نے ہم لوگوں کو اوپر بلالیا، اُدبائے مصر اور وہاں کے اہلِ قلم پر بات نکلی تو انھوں نے کہا کہ

ہندوستانی علماء و مصنفین کی تحریر میں ہم کو جو اثر اور دل آویزی محسوس ہوتی ہے وہ ان کے یہاں نہیں پائی جاتی مثلاً میں ابھی مصر گیا تھا وہاں ایک مکتبہ میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" میں لے آیا اور پڑھ کر بہت متاثر ہوا، میرے اندر یہ سن کر ایک بجلی سی دوڑ گئی، اور میں نے بڑے اشتیاق و اضطراب کے ساتھ پوچھا، کیا یہ کتاب آپ کے پاس ہے اور ہمیں دکھا سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں! اور الماری میں سے نکال کر دی، میں نے چند دن کے لیے اُس کو مستعار لے لیا، اپنی کتاب پڑھ کر ایک مصنف کو جو خوشی ہونی چاہیۓ وہ قدرتاً مجھے ہوئی"۔

(کاروانِ زندگی، ج:۱،ص:۲۶۷)

عرب کے دانشور اور علماء کتاب کے مطالعہ کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ بعض علماء کا یہ خیال تھا کہ جس نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا، وہ عالم ہی نہیں۔

جامعۃ القروین (مراکش) میں یونیورسٹی کے معروف استاد ڈاکٹر عبدالسلام الہراس نے علی میاںؒ کو ان کے سفر مراکش (۱۹۷۶ء) کے دوران بتایا کہ ہم لوگ اس دور میں (جب یہ کتاب طبع ہو کر آئی تھی کہا کرتے تھے کہ اس کو پڑھا لکھا آدمی نہیں سمجھنا چاہیے جس نے اس کتاب 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلین' کا مطالعہ نہیں کیا۔

"انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" اسلامی تاریخ کے موضوع پر علی میاںؒ کی بہت اہم تصنیف ہے، جس میں انھوں نے عربوں کو ان کی زبان میں اسلام کی بازگشت کی دعوت دی ہے عالم اسلام ہی نہیں انسانی دنیا میں داعیانہ اور قائدانہ کردار ادا کرنے اور اپنا قدیم منصب سنبھالنے کا پیغام دیا ہے۔

کتاب کے ابواب اس طرح ہیں:

باب اوّل بعثت محمدی سے پہلے باب دوم: بعثت محمدی کے بعد

باب سوم: مسلمانوں کا دورِ قیادت باب چہارم: مسلمانوں کا تنزل

باب پنجم: بین الاقوامی سیادت و قیادت کا مغربی عہد اور اس کے اثرات

باب ششم: مغربی اقتدار میں دنیا کے معنوی خسارے
باب ہفتم: عالم اسلام زندگی کے میدان میں

علی میاںؒ نے تاریخی حوالوں سے بازیافت کی ہے کہ ''جب دنیا میں خدا پرستی کی تعلیم مفقود اور جاہلیت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا تب دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کی مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، تمدنی اور معاشرتی حالت نہایت ابتر تھی۔ اسلام نے پوری دنیا میں لوگوں کے افکار و اعمال میں عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا، خدا فراموشی کو خدا پرستی میں تبدیل کر دیا اور جاہلیت کی تمام خرابیوں کی اصلاح کر کے ایک ایسی امت پیدا کر دی جو نہایت برگزیدہ اور انسانیت کے لیے نمونۂ عمل تھی۔ لیکن جب اس کا زوال و انحطاط شروع ہوا تو قوموں کی قیادت اور امامت اس کے ہاتھوں سے نکل کر اُن مغربی قوموں کے ہاتھوں میں آ گئی جن کا نقطۂ نظر تمام تر مادّی ترقی، نفس پرستی تھا جس کی بنیاد خدا فراموشی اور بہت حد تک خدا بیزاری تھا اس کے نتیجے میں پھر وہی پرانی جاہلیت سامنے آ گئی جس کو اسلام نے ختم کر دیا تھا''۔ علی میاںؒ کا دعویٰ ہے کہ ''یہ نئی جاہلیت علم و تہذیب کے جامہ میں ملبوس ہے خوش نما الفاظ اور نمائشی اصطلاحات کا سہارا لیے ہوئے ہے۔ اس لیے اس کی تباہی اور نقصانات پرانی جاہلیت سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اس طرح اُمّتِ مرحومہ کے زوال سے پوری دنیا اور ساری انسانیت اس خیر و برکت سے محروم ہو گئی جو اسلام لے کر آیا تھا''۔ علی میاںؒ کے نزدیک موجودہ جاہلیت کی لائی ہوئی مشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا کی قیادت مادّہ پرستوں اور خدا بیزار لوگوں کے بجائے خود شناس اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائے مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب مسلمانوں کے اندر اپنی اس مجرمانہ کوتاہی کی تلافی کا جذبہ پیدا ہو جو انھوں نے انسانیت کے حق میں کی ہے، اور خود دنیا کو بھی اپنی اس بدقسمتی کا احساس ہو جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بناء پر دوچار ہونا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ

مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کو عموماً اور عالم عرب کو خصوصاً خداپرستی، اسلامی تعلیمات اور اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوکر دنیا کی اصلاح و قیادت کے لیے کمربستہ ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ یہ کتاب کے ان مباحث کا مختصر خاکہ ہے جو اس کے سات مبسوط ابواب میں نہایت اخلاص، دردمندی، جامعیت و تحقیق، کامل تجزیہ واستدلال اور پورے جوش بیان کے ساتھ دلآویز مؤثر پیرائے میں قلم بند کیا گیا ہے۔ زبان بھی بہت سلیس و شگفتہ ہے۔ کتاب کا بڑا طاقتور اور مؤثر حصہ وہ ہے جس کا عنوان ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم روح العالم العربی'' (محمد ﷺ عربی سے ہے عالم عربی) ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ ''عربوں کو جو کچھ نصیب ہوا وہ سب محمد ﷺ کے قدموں کے صدقہ اور آپؐ کے طفیل میں ہوا، اگر وہ اس نعمت کی ناشکری کرتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت کا انکار ہے اور اُن کو اپنی جاہلیت یاد آتی ہے اور قومیتِ عربیہ میں اپنی ترقی اور سربلندی نظر آتی ہے تو ذرا اس عطیہ کو واپس کرکے دیکھیں اُن کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ یہ گویا علامہ اقبالؔ کے اس بلیغ شعر کی شرح ہے۔

نہیں وجود، حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی

(کاروانِ زندگی۔ حصہ دوم۔ ص:۲۶۲۔۲۶۳)

کتاب کا یہ حصہ جذبات اور عقیدت کے ساتھ حقیقت پسندی کا مظہر ہے۔ علی میاں کو اپنے قلم سے نکلے ہوئے ان الہامی فقروں پر اس درجہ اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح میں تحریر کیا ہے:

''اگر کسی بدعت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو مصنّف یہ وصیت کر جاتا کہ یہ صفحات اس کے کفن میں رکھ دیے جائیں کہ وہ اُن کو اپنے لیے ذریعہ مغفرت اور وسیلۂ شفاعت سمجھتا ہے''۔

(کاروانِ زندگی۔ حصہ اوّل۔ ص:۲۶۳)

کتاب کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں بالخصوص اسلام کے اوّلین مراکز عرب ملک کے لوگوں میں احساس کمتری دور کرنے خودفراموشی ختم کرنے کے لیے یہ کتاب اصلاً عربی میں لکھی گئی اور بتایا گیا کہ دنیا کی تعمیر و تشکیل میں مسلمان مؤثر فعال عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمانوں کے زوال کو ایک قومی حادثہ اور مقامی واقعہ سمجھتے ہیں اور ان کو مطلقاً احساس نہیں کہ یہ کتنا بڑا عالمگیر سانحہ اور انسانیت کی کیسی بڑی بدقسمتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے ہم نہ اسلامی تاریخ کو سمجھ سکتے، نہ انسانی تاریخ کو اور نہ اس دور کی تشخیص کر سکتے جو ابھی تک اس دنیا میں قائم ہے اور نہ اس عالمگیر انقلاب کے صحیح اسباب متعین کر سکتے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں رونما ہوا اور وہ اسلامی انقلاب کے بعد سب سے بڑا انقلاب ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلا انقلاب شر سے خیر کی طرف تھا، یہ خیر سے شر کی طرف ہے۔ پہلا انقلاب بعثت محمدیؐ اور دعوتِ اسلامی کے عروج کا نتیجہ تھا دوسرا انقلاب امت محمدی کے انحطاط اور دعوتِ اسلامی سے تغافل کا نتیجہ ہے''۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۶)

کتاب میں علی میاںؒ نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق اور کھویا ہوا مقام یاد دلایا ہے۔ علی میاںؒ نے مؤرخانہ دیدہ وری کے ساتھ انسانی تاریخ اور اسلامی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا ہے، اسلام کی عالمی اور ابدی پیغام کی حیثیت واضح کی ہے جو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ باقی رہے، پروان چڑھے اور رہنمائی اور قیادت کے فرائض انجام دے۔

عام طور سے مؤرخین، محققین اور اصحاب قلم مسلمانوں کو تاریخ عالم کے

جھروکے سے دیکھتے ہیں، علی میاںؒ نے اس وضع شدہ اصول اور معیار سے بڑی جرأت کے ساتھ انحراف کیا۔ اس روایتی دائرے اور متعین اصول ومعیار سے الگ اپنا راستہ منتخب کیا، قرآن وحدیث، تاریخ عالم اور تاریخ اسلام کے عمیق مطالعہ اور گہرے فہم کے ساتھ یہ بتایا کہ مسلمانوں کے انحطاط وزوال سے دنیا کو کیا نقصان ہوا اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ دنیا میں صرف اسلام کو رہنمائی وقیادت کا منصب ومقام حاصل ہے اور اس پیغام کے حاملین کے لیے عزت وسربلندی لکھ دی گئی ہے۔ مستند تاریخی شواہد کے ساتھ مؤثر اسلوب میں لکھی گئی اس کتاب کا مطالعہ جہاں قاری کو تاریخ کے مختلف ادوار میں لے جاتا ہے وہاں ان تمام امور کی بھی بھرپور نشاندہی کرتا ہے جو انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کی صورت میں دنیا پر مرتب ہوئے، کتاب کے مقدمے میں عرب کے مشہور دانشور ادیب ومفکر سید قطبؒ لکھتے ہیں:

> ''کتاب کا اسلوب یہ نہیں کہ جذبات اُبھار دے یا عصبیت کا جوش پیدا کردے، اس میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا گیا ہے جو بیک وقت وجدان وشعور، فکر ونظر دونوں کو اپیل کرتے ہیں، تاریخی واقعات اور اس عصر کے ماحول ومتعلقات کو ایسے منصفانہ طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، جن میں مصنّف کی روشن دماغی صاف جھلکتی ہے پھر فیصلہ، واقعیت، صداقت اور قلب وضمیر کی بصیرت کے سپرد کردیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کے مباحث کی تمام کڑیاں مربوط اور ایک دوسرے سے پیوست نظر آتی ہیں اور کہیں بھی کسی مسئلہ میں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے میں غیر واقعیت یا تکلف کا ثبوت نہیں ملتا''۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ ص:۴۹)

علی میاںؒ نے عام روش سے ہٹ کر موضوعات کا انتخاب کیا اور جس موضوع پر قلم اُٹھایا اُس کا حق ادا کر دیا۔ یہ کتاب جس فکر انگیز موضوع پر لکھی گئی ہے عہدِ حاضر کا اہم ترین موضوع ہے۔ انسانی تاریخ اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان کے تمام امکانات اور پہلوؤں پر غور کر کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور انھیں علمی و تحقیقی سچائیوں کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ کتاب تاریخ نویسی کا کامیاب نمونہ اس لیے ہے کہ اس میں اسلامی روح کے مطابق اس کے وسیع دائرے میں تمام اصول و کلیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان عوامل کا مربوط و منظم تصور پیش کیا گیا۔ اسلام کے پیغام کی برتری اور ابدیت کا احساس دلاتے ہوئے امت اسلامیہ کو معتدل و متوازن مشوروں سے نوازا گیا ہے۔ سید قطبؒ لکھتے ہیں:

> ''اس تاریخی جائزہ کے وقت کتاب کا پڑھنے والا بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ موجودہ قیادت بدلنے کی سخت ضرورت ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انسانیت کو پھر اسی سرچشمۂ ہدایت پر لا کر کھڑا کر دیا جائے جس ہدایت کا مدعا ہی یہ تھا کہ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف اور جاہلیت سے نجات دلا کر علم و معرفت کی طرف لائے''۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ص:۳۲)

ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین پر سید قطب شہیدؒ نے ایسا مؤثر اور جامع مقدمہ تحریر کیا جس میں کتاب کی پوری روح آ گئی۔ انتہائی فراخ دلی سے کتاب کے محاسن کا اعتراف کیا۔ علی میاںؒ کی تاریخ نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے، ان میں ماضی پر اعتقاد، مستقبل کے بارے میں اُمید اور حوصلہ پیدا ہو، اس دین پر ان کا ایمان و یقین تازہ اور زندہ

ہو جائے جس کا نام تو وہ لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت سے نا آشنا ہیں، ان کا تعلق اس دین سے زیادہ تر نسلی اور موروثی ہے اور انھوں نے اس کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جدید تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو اُن کے وسیع دائرے کے اندر اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے، اس بناء پر نہ صرف یہ کتاب دینی و اجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہیئے"۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص:۳۴)

علی میاںؒ کو اس کتاب سے عالمِ عرب اور عالمِ اسلام میں بے حد شہرت و مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہوئی۔ بقول علی میاںؒ یہ کتاب میرے لیے وزیٹنگ کارڈ بن گئی۔ اس کے مصنّف ہونے کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا جانے لگا۔

اس کتاب کے اردو، انگریزی، فرینچ، اٹالین، ترکی، فارسی اور انڈونیشی زبان میں ترجمے شائع ہوئے۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں:

"اس کتاب کو اتنی مقبولیت ملی کہ میری کسی تصنیف کو حاصل نہیں ہوئی...... اس کا ہلکا سا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک کتاب کے پندرہ کے قریب صرف قانونی ایڈیشن مصر، بیروت و شام سے نکل چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں ایک لاکھ کی تعداد میں دارالقلم کویت نے نکالا، جس کے

۸۰ ہزار نسخے فوراً مملکت سعودیہ، وزارت تعلیم نے خرید لیے،
۲۱ہزار نسخے مکتبة الحرم ریاض نے لیے''۔

(کاروانِ زندگی۔حصہ اوّل۔ص:۲۶۵)

کتاب مصنف کی توقع سے زیادہ مقبول ہوئی، عبداللہ عباس ندویؒ لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے اس کتاب کی پذیرائی وہاں ہوئی جہاں عالمِ اسلام کے چنیدہ علماء، دانشور اور علومِ اسلام (کتاب اللہ اور سنت نبویؐ) کے ماہرین کا مجمع ہے (مراد جامعہ ازہر، مصر)

(میرِ کارواں۔ص:۴۷۹)

''سوانح مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ'' میں مولانا بلال عبدالحیؔ حسنی تحریر فرماتے ہیں کہ اِس وقت تک محتاط اندازے کے مطابق اِس کتاب کے تقریباً سو ایڈیشن نکل چکے ہیں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں''۔ (مطبوعہ ۱۴۲۲ھ، ص:۱۹۱)

کتاب کے انگریزی ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مستشرق سارجینٹ نے جو کیمبرج یونیورسٹی میں ڈاکٹر آربری کے معاون ہیں یہ رائے ظاہر کی کہ ''اگر برطانیہ میں کسی کتاب کی درآمد پر پابندی لگانے کا رواج ہوتا تو میری سفارش یہ ہوتی کہ اس کتاب کے داخلے پر پابندی عائد کی جائے''۔

ڈاکٹر بکنگھم نے (جو لندن یونیورسٹی میں مڈل ایسٹ سیکشن کے چیئرمین ہیں) ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا کہ ''کتاب کو برطانیہ سے شائع ہونا چاہیے کیوں کہ اس صدی میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی جو کوشش بہتر سے بہتر طریقہ پر ہونی چاہیے یہ اس کا نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے''۔

(پیامِ ندوہ۔مولانا محمد الحسنیؒ۔ص:۱۰۹)

علی میاںؒ کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ بدلتی ہوئی انسانی زندگی کے بارے میں وسیع النظر تھے۔تاریخ کا عمیق فہم رکھتے تھے۔زبان وبیان پر کامل قدرت حاصل تھی۔

اصنافِ ادب میں پُراثر اسلوب کے حامی تھے ادب کے پاکیزہ مقاصد کے پُرزور داعی بھی تھے۔ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' علی میاںؒ کی مقبول ترین تصانیف میں اس لیے ہے کہ اس میں انسانی دنیا کی تہذیبی، معاشرتی، اجتماعی اور مذہبی تاریخ کو نئے زاویہ سے جانچ کر مؤثر ودلنشیں اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے تاریخی مواد کی جمع وترتیب میں مصنف کہیں بھی خودرائی یا ضد کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ مسلم، غیرمسلم، قدیم وجدید، مؤرخین ومصنفین کی تصنیفات سے اخذ وانتخاب اور تجزیہ وتقابل کے بعد اپنا مطمحِ نظر پیش کرتے ہیں، فکری اعتبار سے علی میاںؒ اپنے دل کی تڑپ اور فکر کے معراج پر نظر آتے ہیں، جہاں تک تاریخ نویسی کا تعلق ہے تحقیق وتجزیہ کی دنیا میں مصنف کا انقلابی قدم ہے۔ فکرانگیز موضوع، دلکش طرز واسلوب کی وجہ سے کتاب، دنیا کی کئی یونیورسٹیوں اور اہم انقلابی اور تحریکی جماعتوں کے نصاب میں شامل کی گئی۔

رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام (تاریخ دعوت وعزیمت)

رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا شمار علی میاںؒ کی اہم ترین تاریخی تصانیف اور شخصیتوں کے تذکرے میں ہوتا ہے۔ کتاب اصلاح وتجدید کی تاریخ مرتب کرنے کے مقصد سے لکھی گئی تھی اس لیے تاریخ کا پہلو اس میں غالب ہے۔ اِس تصنیف میں اسلامی تاریخ کے ممتاز مجدّدین ومصلحین، اصحاب دعوت وعزیمت کا تعارف اور ان کی بروقت اصلاحی وتجدیدی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علمی کاموں، مصلحانہ ومجاہدانہ کارناموں کی روداد کے ساتھ ان کے اثرات ونتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام عربی میں چار اجزاء اور اردو میں ''تاریخ دعوت وعزیمت'' پانچ حصوں پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

حصہ اوّل: پہلی صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک تاریخ اصلاح وتجدید حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مولانا جلال الدین رومیؒ تک۔

حصّہ دوم: شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی سوانح حیات اور ان کے تلامذہ اور دبستانِ فکر کے فضلاء کا تذکرہ

حصّہ سوم: خواجہ معین الدین چشتیؒ سے خواجہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ

حصّہ چہارم: شیخ احمد سرہندیؒ کی سوانح حیات، عہد اور ماحول

حصّہ پنجم: شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سوانح حیات اور تجدیدی کوشش

علی میاںؒ نے تاریخ دعوت وعزیمت اردو میں لکھی، عربی میں اس کا پہلا حصّہ علی میاںؒ کے قلم سے ہے جب کہ دوسرے حصّہ کے عربی مترجم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی اور تیسرے چوتھے حصّے کے عربی مترجم مولانا محمد سلمان الحسینی ہیں۔ اس تصنیف کو ''تاریخ دعوت واصلاح'' کے نام سے مولانا ابراہیم دامنی اور مولانا قاسم قاسمی نے فارسی میں منتقل کیا۔ ترکی اور انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ اِس کتاب کو مشرق اور مغرب، عالم اسلام اور عالمِ عرب کے ادبی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ علی میاںؒ بیک وقت عالمِ دین، داعی اور مفکر ومحقق تھے۔ دینی اصلاحی تحریکات اور دین کی دعوت وتبلیغ، اصلاح اور تربیت ان کی زندگی کے اہم مقاصد رہے، تاریخ اسلام کی اصلاحی وتجدیدی تحریکوں پر اُن کی وسیع وغائر نظر تھی، اپنی عملی زندگی میں بھی وہ مختلف تحریکات سے وابستہ رہے، تحریکی سرگرمیوں کے آغاز میں انھیں تاریخِ اسلام کی ترتیب وتالیف میں خلا کا احساس ہوا۔

> ''جدید تعلیم یافتہ حضرات کو اسلام کی تاریخ، اصلاح وتجدید کے ربط وتسلسل کا علم بہت ناقص ہے اور ان میں اسلام کی تاریخ اور شخصیات کے متعلق بدگمانیاں اور شکوک ہیں، جو محض ''محدود وغیر معتبر مطالعہ'' کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں یا ''ناقص تعبیر'' اور ''غلط ترجمانی'' کا نتیجہ ہیں۔
>
> اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل اور فکری تاریخ نہیں، جس میں ان تمام شخصیتوں تحریکوں کا تعارف ہو، جنھوں نے عالمِ اسلام پر گہرا اثر

ڈالا، اسلام کی بروقت حفاظت تجدید وتقویت کی خدمت انجام دی،
غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سدباب کیا اور اسلام کے فکری و
عملی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہو، دراصل اسلام کے سلسلہ
دعوت میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب وتالیف میں خلا ہے"۔

(تاریخ دعوت وعزیمت۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ حصہ اوّل، ص:۱۲)

علی میاںؒ نے اس بدگمانی کو تاریخ اسلام اور ادبیات اسلام کا بڑا خلا تصور کیا، اور اس غلط فہمی کو تاریخ نویسی کی غلطی قرار دیا ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں اصلاح اور تجدید کی ضرورت کو واضح کیا اور تاریخِ اسلام میں اس کے تسلسل کا دعویٰ کیا ہے۔ انھوں نے دوسرے مذاہب مسیحیت، ہندومت، بودھ مت کی تاریخ میں تجدیدی کوششوں کی کمی کو ان مذاہب کی تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔ "مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان
خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا اور بدلتی ہوئی
زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے
اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت،
بے غرضی، ایثار اور اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے
ماننے والوں میں اعتماد، جوش اور قوت عمل پیدا کریں"۔

(تاریخ دعوت وعزیمت۔ حصہ اوّل، ص:۲۷)

علی میاںؒ نے تاریخ دعوت وعزیمت کے ذریعہ اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح وتجدید کی کوششوں کو سلسلہ وار ترتیب دیا ہے۔ ہر زمانے کی مخصوص بیماریوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بروقت تشخیص اور علاج کرنے والے مصلحین و مجددین کی دلآویز تاریخ بیان کی ہے۔ انھوں نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا کہ مختلف زمانوں میں مختلف فتنے سر اُٹھاتے رہے کسی زمانے کا فتنہ شرک جلی تھا، کسی زمانے کا

بدعات، جاہلی رسوم، غیر قوموں کی عادات و رسوم کی تقلید اور ان کے شعائر کا اختیار کرنا تھا۔ کسی زمانے کا فتنہ وحدۃ الوجود کا غالی فلسفہ تھا اور کسی زمانے کا فتنہ وحدتِ ادیان کی گمراہ کن دعوت، کسی زمانے کا فتنہ فلسفہ یونان اور عقلیت سے حد سے بڑھی ہوئی مرعوبیت تھا، کسی زمانے کا فتنہ باطنیت و مادّیت اور کسی زمانے کا فتنہ شریعت و فرائض و احکام کی تحقیر، یہ تمام فتنے اپنے اپنے وقت کے خطرناک فتنے تھے۔ اصلاح و تجدید کی تاریخ سے جہاں ان بیماریوں کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کے دور کرنے اور اُس فساد کا مقابلہ کرنے والے نفوس زکیہ کا بھی تسلسل ثابت ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں عالمِ اسلام کے علمی و فکری مراکز اور امت کے نباض اُن سے چوکنا رہے ہیں اور عمرو بن العاصؓ فاتح مصر کی اس وصیت پر عمل پیرا رہے ہیں جو انھوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی۔

''تم ہمیشہ اپنے کو محاذِ جنگ پر سمجھو اور یہ سمجھتے رہو کہ تم سرحد کی حفاظت پر مامور ہو''۔

علی میاںؒ اس بات کے پُرزور داعی ہیں کہ ''ہمیشہ ہر نئے فتنے اور نئے خطرے کے لیے نئی شخصیت اور طاقت سامنے آئی، اور وقت کے سنگین فتنوں پر حقیقت اسلام نے ہی فتح پائی۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لیے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی یا اُس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا یا مادّیت کا سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور اس کو میدان سے ہٹا دیا۔ بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا...... حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ تحریکیں اور سرکاری مذہب، علمی مباحث بن کر رہ گئے جو صرف علمِ کلام، تاریخ اور عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ دین کی یہ جدّ و جہد، انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی اسلام کی تاریخ اور ایسا ہی مسلسل ہے جیسی مسلمانوں کی زندگی''۔

(تاریخ دعوت و عزیمت۔ حصہ اوّل، ص:۲۸)

علی میاںؒ کہتے ہیں کہ اسلام کے بقاء وتسلسل کے لیے غیبی انتظامات کیے گئے ہیں۔

"یہ دین آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ اُمّت آخری اور عالمگیر امت ہے۔ اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس اُمّت کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری اُمّت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی...... ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے زمان و مکان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جناب رسول ﷺ کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کرسکتی ہیں اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے۔ اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا اور یہ اُمّت تاریخِ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے دنیا کی قوموں اور اُمّتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ انتظامِ خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی وہ اس اُمّت کو عطا ہوا"۔

(تاریخ دعوت وعزیمت۔ حصہ اوّل۔ ص:۱۸۔۱۹)

علی میاںؒ نے اسلام کی اصلاح وتجدید کی تاریخ کو سلسلہ وار ترتیب دینے

کی سعی کی، جس کی ترتیب کے ساتھ ہی مسلمانوں کی فکری اور علمی انحطاط وارتقاء کی تاریخ بھی مرتب ہوگئی، اس سلسلہ کی ترتیب سے کئی فائدے ہوئے۔ اسلامی تاریخ اور اس کی اہم شخصیات کے متعلق معلومات یکجا ہوگئیں، نئے ذہنوں میں ''محدود مطالعہ'' اور ''ناقص تعبیر'' اور ''غلط ترجمانی'' کے ذریعہ پیدا کردہ بدگمانی دور ہوئی، نیز اسلام کی قوت نمو اور سچائی پر اعتماد بحال ہوا ہے۔

علی میاںؒ نے 'تاریخ دعوت وعزیمت' کی ابتداً پہلی صدی ہجری کی اصلاحی کوششوں سے کی ہے۔ اس ضمن میں ان جاہلی رجحانات اور اثرات کا ذکر کیا ہے جو خلافتِ راشدہ کے اختتام پر رونما ہوئے۔

''حکومت کا محور جس پر اس کا پورا انتظام گردش کرتا تھا کتاب اور سنت کے بجائے ''عربی سیاست'' اور ''مصالح ملکی'' بن گیا تھا۔ ''تفاخر'' اور ''عربی عصبیت'' واپس آگیا۔ قبائلی غرور، خاندان اور اعزہ پروری ''اعمال اور اخلاق کے محرکات'' بجائے اجر وثواب کے، جاہلی ناموری، مدح وتعریف اور تفوق ہوگئے تھے۔ اس صدی کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں حکومت کا مزاج بدلا اور ''نقطۂ نظر'' دنیا کی حکومت سے ہٹ کر ''خلافت ونبوت'' بن گیا۔ اعمال و اخلاق، تدوین علوم اور احیاء سنّت، تبلیغ اور اشاعت اسلام کی طرف توجہ دی گئی۔ یہ کام حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۱۰۱ھ) کے دورِ خلافت میں انجام پایا''۔

اس کے بعد اصلاحی کوششوں کا سلسلہ حضرت حسن بصریؒ (۱۱۰ھ) نے جاری کیا، جن کے مواعظ اور دینی جدّ وجہد نے اس اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف کا دھارا بدل دیا جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد دھیرے دھیرے زور پکڑ رہا تھا۔

علی میاںؒ نے اس عظیم دینی کام کا ذکر کیا ہے، جس کے نتیجے میں حدیث اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ فن اسماء الرجال کی بنیاد پڑی۔ ان اہم کاموں کو امام ابوحنیفہؒ (م ۱۵۰ھ)، امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ)، امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) امام احمد

بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) اور ان کے شاگردوں اور جانشینوں نے کیا۔

امام احمد بن حنبلؒ کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے ''فتنۂ خلق قرآن'' کا سدباب ہوا۔ ''فتنۂ اعتزال'' کے ردّ کے لیے امام ابوالحسن اشعریؒ (م ۳۲۴ھ) سامنے آئے۔ بحث ومناظرہ، تقریر وتفہیم، تصنیف وتالیف کے ذریعے انھوں نے تجدید کا کام کیا۔ امام ابوالحسن اشعریؒ نے مجتہدانہ دماغ سے معتزلہ کے سحر کو ختم کر دیا تھا۔ اس زمانے میں سمرقند کے مجاہد وامام ابومنصور سمرقندی (م ۳۳۲ھ) اور مصر کے امام طحاویؒ (م ۳۳۱ھ) نے علم کلام اور عقائد کی تدوین کی۔ اس کے بعد علم کلام میں فلسفیانہ استدلال کا ظہور ہوا اور باطنیت کا فروغ ہوا۔ یونانی فلسفہ کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا اور فلسفۂ یونان کے عرب ناقل وشارح کی حیثیت سے یعقوب الکندیؒ (م ۳۵۱ھ)، ابوالنصر فارابیؒ (م ۳۳۹ھ)، شیخ بوعلی سیناؒ (م ۴۲۸ھ) منظرِ عام پر آئے۔ چوتھی صدی کے آخر میں جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل سے دینی عقائد پر بحث وگفتگو کا آغاز ہوا۔ دین کے بنیادی عقائد ومسائل سے باطنیت کے فتنے کی ابتداء ہوئی جس میں قرآن وحدیث کے الفاظ میں معنی ومفہوم کے اعتبار سے ظاہر وباطن کی تقسیم کی جانے لگی جو اسلام کے نظامِ اعتقاد اور نظامِ فکر کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ فلسفہ اور باطنیت کے اسلام کش اثرات کو ختم کرنے کے لیے پانچویں صدی کے وسط میں اسلام کو امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی شخصیت نصیب ہوئی۔ امام غزالیؒ علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل بصیرت اور تمام علوم میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ خداداد ذہانت، جودتِ طبع اور دقّتِ نظر میں فلاسفہ یونان اور قدیم ائمہ فکر سے زیادہ قابلیت رکھنے والے تھے۔ دولتِ ایمان، تفکر، تلاش، تحقیق، ریاضت، عبادت سے اسلام کے حقائق پر غیر متزلزل ایمان رکھنے والے تھے۔ انھوں نے فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کیا اور اسلام کی طرف سے ان بنیادوں پر حملہ کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے زندگی ومعاشرت کا اسلامی واخلاقی جائزہ لیا اور اس کی

تنقید واصلاح کی کامیاب کوشش کی۔ احیاء علوم دین کے ذریعہ انھوں نے وقت کی بڑی ضرورت کو مجتہدانہ انداز میں پورا کیا۔

پانچویں صدی ہجری تاریخ اسلام میں علوم وفنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور اس میں متعدد متبحر علماء پیدا ہوئے۔ بغداد کے دو زبردست داعی سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ (م ۵۶۱ھ) اور عبدالرحمٰن الجوزیؒ (م ۵۹۷ھ) ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے ذریعہ مردہ دلوں کی مسیحائی کی، لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی۔ آپ کے مواعظ میں بے پناہ تاثیر تھی۔ علامہ ابن جوزیؒ دعوت واصلاح کا نمونہ، یکتائے روزگار مفسر تھے۔ وہ بیک وقت محدث، مؤرخ، ناقد، مصنف اور خطیب تھے۔ ان کی ضخیم تصانیف اور علمی کارنامے موجود ہیں بالخصوص ان کی تصنیف "تلبیس ابلیس" بہت مشہور ہے۔

۴۹۲ھ میں صلیبی حملہ آوروں نے بیت المقدس کو فتح کیا۔ چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار اور بدنظمی کا دور تھا۔ عین کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے اُفق پر نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ جیسے دو روشن ستارے نمودار ہوئے۔ ۵۹۳ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا اور صلیبی حملہ آوروں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی وتہذیبی بدنظمی اور مغربی ترک تازوں کی ہوس کا شکار بننے سے صدیوں تک کے لیے محفوظ کردیا گیا۔

ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے اپنے دائرے میں دعوت واصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ ان میں شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلامؒ (م ۶۶۰ھ) سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی صدی میں اسلام کو تاتاری حملہ کی صورت میں نئی آزمائش پیش آئی۔ ۶۵۶ھ میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خاں کی سرکردگی میں تاتاری بغداد میں داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ شام

کے قبضے کے بعد تاتاریوں کا رُخ مصر کی طرف ہوا۔ سلطانِ مصر ملک ظفر سیف الدین قطز نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا اور ان کو شکست فاش دی اور ملک شام سے ان کو خارج کر دیا۔ اس موقع پر ایک عجیب و غریب واقعہ یہ ہوا کہ ان وحشی قوموں نے اسلام قبول کر لیا، جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا ان کے ناموں کا تاریخ کے دفتر میں سراغ نہیں ملتا۔ ۶۰۴ھ میں مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۶۷۲ھ) پیدا ہوئے۔ "مثنوی مولانا روم" نے عالمِ اسلام کے افکار وادبیات پر جو دیرپا اثر ڈالا ہے اسلامی ادب میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور اس سے استفادہ کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس طرح کتاب کے پہلے حصہ میں پہلی صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک کی اصلاح و دعوت کی روداد بیان کی گئی ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر مولانا جلال الدین رومیؒ تک کے مصلحانہ کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت کی دوسری جلد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی سوانح حیات اور تلامذہ اور ان کے دبستانِ فکر کے فضلاء کا تذکرہ ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کے تلامذہ میں حافظ ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ)، ابن عبدالہادیؒ (م ۷۴۴ھ)، ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ)، ابن رجبؒ (م ۷۹۵ھ) نے زبردست علمی کارنامے انجام دیے۔ کتاب کی تیسری جلد میں ہندوستان کے چشتی سلسلہ اور اس کے اکابر شیوخ خواجہ معین الدین چشتیؒ (م ۶۲۸ھ)، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (م ۶۳۳ھ)، حضرت خواجہ فریدالدینؒ گنج شکر (م ۶۶۴ھ)، خواجہ نظام الدین اولیاؒ (م ۷۲۵ھ)، خواجہ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۶ھ) کی حیات اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت کے چوتھی جلد میں مجدد الف ثانیؒ، حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کی مفصل سوانح، ان کا عہد اور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی و انقلابی کارناموں کی تفصیل ہے۔ شیخ احمد سرہندیؒ کا اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا بعد کی صدیوں پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ ان کی اصلاحی و تربیتی خدمات پر

اس حصے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے پانچویں جلد میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) اور ان کے خلفاء کے ذریعہ احیاء دین، اشاعت کتاب وسنت، مقاصد شریعت کی توضیح وتنقیح، تربیت وارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص کے بقاء کی عہد آفریں کوششوں کی روداد ہے۔

تاریخ دعوت وعزیمت کی تالیف بعض پُرجوش اصحابِ قلم کی پیدا کردہ بدگمانیوں کے ازالہ کے مقصد سے کی گئی تھی، جو اسلام کی تاریخ اور اس کی شخصیات کے متعلق پھیلائی گئی تھیں۔ اس کتاب میں ان کے اس خیال کی تردید کی کوشش کی گئی کہ اسلام کی تاریخ اصلاح وتجدید میں ربط وتسلسل نہیں بلکہ بڑے بڑے خلا پائے جاتے ہیں۔ دراصل یہ تاریخ کے سرسری اور ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ یہ طرز تالیف بادشاہوں اور حکومتوں اور ان کے حاشیہ برداروں کے اردگرد گھومنے والا تھا، جس کی وجہ سے اصحاب دعوت وعزیمت کی صحیح تاریخ تشنہ رہ جاتی ہے۔ مؤرخین واصحابِ قلم جب کسی خاص تصویر کو ذہن میں رکھ کر مصلحین ومجددین کو تلاش کرتے ہیں تو اپنی پسند اور امیج کے مطابق نہ پاکر انکار وتکذیب پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور اسے مصلحین کی فہرست میں شامل نہیں کرتے۔ تاریخ کی اس غلط تعبیر وترجمانی سے بہت سے خطرناک نتیجے سامنے آتے ہیں جن میں سب سے اہم یہ کہ یہ کلیہ اسلام کی ابدیت وحقانیت پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔"

(مقدمہ تاریخ دعوت وعزیمت، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

علی میاںؒ نے تاریخ اسلام اور ادبیاتِ اسلامی کے اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے تاریخ نویسی کی غلطی قرار دیا ہے۔ انھوں نے نئے سرے سے اسلامی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ میں صرف مروّجہ تاریخی تصانیف کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ وہ کتابیں بھی علی میاںؒ کے زیرِ مطالعہ رہیں جو کسی کتب خانے میں تاریخ کے گوشے میں نہیں ملیں گی۔ انھوں نے صوفیا کے ملفوظات اور

سفرنامے بھی پڑھے اور طبقات وتراجم کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ وہ جم کر مطالعہ کرنے کا ذوق رکھتے تھے، وہ ایک دقیق النظر مؤرّخ تھے۔ تاریخ سے سرسری نہیں گزرتے تھے بلکہ جب وہ تاریخ پر قلم اُٹھاتے تھے تو اس دور کی تاریخ میں ذہنی فکری اور نظری طور پر سانس لیتے تھے۔ ایک مفکّر اور باذوق مؤرّخ کی طرح صدیوں کی تاریخ میں ڈوب کر لکھنے والے تاریخ نویس تھے۔ ایک کامیاب مؤرّخ کو تاریخ سمجھنے کے لیے جغرافیہ کا جاننا بھی ضروری ہے خواہ تاریخ سیاسی ہو، علمی ہو، دینی، تمدنی ہو یا اصلاحی وتجدیدی ہو۔ علی میاںؒ کی تاریخی تصانیف اس بات کی گواہ ہیں کہ انھوں نے تاریخ کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں ان تمام متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کیا جن کا تعلق تاریخ سے نہیں بلکہ جغرافیہ سے ہے۔

علی میاںؒ کی اس تصنیف سے جو تاریخ اسلام کے اصحاب دعوت وعزیمت اور حاملین فکر پر مشتمل ہے اصلاح وتجدید کی تاریخ کا تسلسل سامنے آتا ہے جو اسلام کے ابدی پیغام، اُس کی صلاحیت اور قابلیت پر اعتماد بحال کرتا ہے۔

عالمِ اسلام کے معروف عالمِ دین، مجاہد اور خطیب، استاد جامعہ دمشق، مجلّہ ''الحضارۃ الاسلامیۃ'' کے رئیس التحریر ڈاکٹر مصطفی السباعی تحریر کرتے ہیں:

> ''تاریخ دعوت وعزیمت'' استاد ندوی کے شفاف افکار، اصلاحی رجحانات ور تاریخِ اسلام میں ان کی فکرِ عمیق کی واضح تصویر اور بیّن دلیل ہے۔ یہ کتاب وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرے گی جس کو ہم شدید طور پر محسوس کررہے تھے''۔

امریکی نومسلم ادیبہ محترمہ مریم جمیلہ لکھتی ہیں:

> ''فی الواقع یہ کتاب (تاریخ دعوت وعزیمت) صاحبِ کتاب کی لیاقت اور قابلیت کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ کتاب بہت مؤثر، جوش اور جذبہ سے بھرپور، اسلام کی تاریخ اور صحیح افکار کی سچی تصویر ہے''۔

الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربيه
(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش)

"الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیہ" (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش) علی میاںؒ کی فکرانگیز اور ایمان افروز کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۵ء میں دارالفکر بیروت سے شائع ہوئی۔ علی میاںؒ نے ۱۹۶۲ء میں ایک بسیط مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الاسلامیۃ (مغربی تہذیب کے بارے میں عالمِ اسلام کا رویہ) یہ رسالہ فروری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوکر ممالک عربیہ کے علمی دینی حلقوں میں پہونچا تو بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھا گیا۔ مصنف نے اسی مضمون میں اضافہ کیا۔ اضافے، تبدیلی اور ترمیم نے مضمون کو ایک کتاب کی شکل دے دی جو "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" کے نام سے شائع ہوئی، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا، عربی، اردو میں اس کے کئی ایڈیشن ترمیم واضافہ کے ساتھ منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

علی میاںؒ نے مسلمانوں میں احساسِ خودی پیدا کرنے اور ان کی شخصیت کو اُبھارنے کے لیے جس سلسلہ کا آغاز "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) سے کیا تھا اس کتاب کے ذریعہ اس کی تکمیل کی گئی، مصنف نے اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کی روئیداد لکھی ہے اس کے نتائج بیان کیے ہیں اور اس معرکہ میں مسلم ممالک کے طرزِ عمل اور موقف کا جائزہ لیا ہے۔

> "میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے...... اور اس سوال کے جواب پر کہ مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں

اور اپنے معاشرے کی موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانے کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس میں کسی حد تک ذہانت، جرأت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشے میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے اور ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے"۔

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش: مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مقدمہ۔ ص:۱۲)

یہ تصنیف ایک اہم فکر انگیز اور توجہ طلب مسئلہ پر لکھی گئی ہے، کتابوں میں اس کتاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہر ایڈیشن کے وقت اس پر نظر ثانی کی جاتی ہے اور ان ممالک کی تبدیلیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے۔ کیونکہ تبدیلی اور ارتقاء کا عمل جاری ہے۔ نئی تحریکیں، کوششیں اور طاقتور فکری و سیاسی عوامل برابر کام کرتے رہتے ہیں۔ علی میاںؒ کے عزیز بھتیجے اور بھانجے اور لائق شاگردوان کی مصروفیات کی وجہ سے ممالک کے انقلابات پر نوٹ لکھتے، جن پر نظر ثانی کر کے شامل کر لیا جاتا۔ اس عرصہ میں مصر، یمن، لیبیا، الجزائر، افغانستان، پاکستان میں دوررس تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ علی میاںؒ نے اس کتاب میں ایک ایک ملک کے رویہ اور اس میں اِس معرکہ کی منزلوں کا جائزہ لیا ہے اور اس کی صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا ہے۔ مغربیت کو عالمِ اسلام کے لیے ایک سوالیہ نشان اور اہم چیلنج قرار دیا ہے۔ علی میاں تحریر کرتے ہیں:

"اس پیچیدہ صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اسلامی ممالک کے تین ہی رویہ ہوسکتے ہیں (۱) خالص منفی اور سلبی رویہ (یعنی مغرب سے لینے کی کوئی چیز یں نہیں اور اس کی ترقیات سے مکمل کنارہ کشی اور بے تعلقی ضروری ہے، یہ رویہ کچھ عرصہ تک سعودی عرب، افغانستان اور یمن کا مغربی علوم اور اس

کے عطیات سے (امکانی حد تک فائدہ اُٹھانے سے) گریز
کار رہا ہے لیکن اس کے بعد پھر اسی تیزی سے اس کو قبول کیا گیا
کہ اس مقاطعہ کی مدت کی تلافی ہوگئی (۲) خالص مثبت اور
ایجابی رویہ (مغربی تہذیب کو کلیۃً قبول کر لینا اور اس کو اپنے
ملک میں جوں کا توں نافذ کر دینا)، اس کے لیے ترکی کی
مثال دی جا سکتی ہے (۳) مغربی تہذیب کے بارے میں
مستقل و مجتہدانہ کردار، مغرب سے استفادہ کے صحیح میدانوں
کا انتخاب اور ان کے حدود کا تعین''۔

(کاروانِ زندگی۔ حصہ دوم، ص:۳۴)

علی میاںؒ کے نزدیک ''پہلا رویہ کوتاہ نظری پر مبنی ہے اس سے فطری قوتوں اور وسائل میں تعطل پیدا ہوتا ہے۔ یہ موقف قانون تکوینی، فطرت انسانی اور کائنات کے مزاج کے سراسر خلاف ہے اس لیے ناقابل عمل اور ناکام ہے، جس نے اس کو اختیار کیا اس نے جلد وہ راستہ چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنانے کا کام شروع کر دیا۔ دوسرا رویہ خالص مثبت اور ایجابی رویہ ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی تہذیب ملک کے رہنماؤں، اربابِ حل وعقد اور علماءِ دین کی مرضی اور خواہش کے خلاف اس ملک اور سوسائٹی پر جبراً قابض ہو جائے گی، عوام گرم جوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کریں گے، ادباء اور اہلِ فکر اس کے لیے راستہ صاف کریں گے اور خیر وشر، مفید ومضر میں تمیز کیے بغیر اس ملک کے باشندے فاقہ زدوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گے، ساری اخلاقی و دینی قدریں اس کے ساتھ فنا ہو جائیں گی۔ یہ رویہ کسی اسلامی ملک اور قوم کے شایان شان نہیں، بلکہ نہایت نامناسب اسلامی تعلیمات وتہذیب سے بغاوت کے مترادف اور معنوی خودکشی ہے۔ تیسرا موقف یہ ہے کہ اسلامی سادگی، تہذیبی، تعلیمی منصوبہ بندی، متوازن عقل اور انتخاب وتمیز (مناسب ردّ وقبول) صحیح دینی روح، بصیرت، دوراندیشی سے کام لے کر صحیح تعلیم

کے مطابق ہمہ گیر، صالح اور ضروری تبدیلی کے لیے صدق دل اور اخلاص کے ساتھ کوشش کی جائے، اسلامی حدود کے مطابق معاشرہ میں مساوات، انصاف قائم کیا جائے۔ امراء میں ایثار کا مادّہ پیدا کیا جائے۔ فقراء میں استغناء اور خودداری اور اپنے گاڑھے پسینہ اور محنت اور قابلیت سے اپنی ضروریاتِ زندگی کے بندوبست کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ تعلیم کو اسلامی عقائد واصول اور عصرِ حاضر کے تغیرات اور علوم و وسائل سے ہم آہنگ کیا جائے اور ایسی ترقی پذیر، عادلانہ، اسلامی سوسائٹی کی تشکیل کی جائے جس میں اسلامی طریقہ زندگی کو اپنے عملی وثقافتی اظہار اور نمو کا پورا موقع دیا جائے۔ علی میاںؒ کہتے ہیں تیسرے موقف کے لیے ''ذہانت، قوتِ ارادی اور صحیح قیادت کی ضرورت ہے اور ایک مرد کامل مطلوب ہے۔ اسی میں اس وقت عالمِ اسلام کی حفاظت، نئے دور کی قیادت اور مسلمانوں کی قوت کا راز پنہاں ہے اور یہی کامیابی کا واحد راستہ ہے''۔

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص:۱۸تا۵۲)

کتاب ''**مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش**'' میں علی میاںؒ نے اس فکری کشمکش کا جائزہ لیا ہے جو اس وقت تمام اسلامی ملکوں میں جاری ہے۔ اس معرکہ آرائی کے نتیجے میں عالمِ اسلام کا برسراقتدار طبقہ اس غور وفکر میں مبتلا ہے کہ اس مغربی تہذیب کے ساتھ وہ کیا معاملہ کرے۔ اس سفر میں کچھ ممالک تو اپنے منزل کی آخری حدود تک پہنچ چکے ہیں اور کچھ اپنے فیصلے کی ابتدائی منزل میں ہیں۔ علی میاںؒ 'کاروانِ زندگی' میں لکھتے ہیں:

> ''مصنف کے نزدیک یہی ایک حقیقی معرکہ اور فیصلہ کن جنگ ہے جو اس وقت تمام ممالک میں جو مغربی تہذیب سے روشناس ہو چکے ہیں پورے جوش وحرارت کے ساتھ جاری ہے اور اپنے شباب پہ ہے، اس کے سوا اور دوسرے معرکے جن کی تصویر آرائی میں زورِ بیان صرف کیا جاتا ہے یا فرضی ہیں یا ذیلی اور ثانوی،

یہی معرکہ ان حکومتوں اور قوتوں کی باہم نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے کہ ایک طرف تجدد پسند یا بقول خود ''ترقی پسند'' حکومتیں ہوتی ہیں، جو مغربی تہذیب پر اور مغربی افکار و اقدار پر ایمان لا چکی ہیں اور ان کی پورے خلوص کے ساتھ وکیل اور علمبردار بن چکی ہیں اور دوسری طرف وہ سادہ دل قومیں اور عوام ہیں جن کی اسلام کے ساتھ وابستگی ختم نہیں ہوئی ہے اور جن میں قرآن و ایمان کی زبان اور ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت اور عشق رسول ﷺ کے تذکرے کے سوا کوئی زبان اور کوئی طریقہ حرارت اور جوش نہیں پیدا کرسکتا، ان میں سے اکثر مسلم حکومتوں کی جنگ بیرونی دشمن کے بجائے خود اپنے ملک اور قوموں سے ہے، جن کو وہ اپنے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ اور ملک کی مزعومہ ترقیات کے راستہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں، ان حکومتوں کے وسائل اور توانائیاں اس جذبہ (ایمانی) کو سرد کرنے اور ان کے خیال کے مطابق اس قدیم ملبہ کو (جو ان کے خیال میں ازکار رفتہ ہی نہیں ملک کی زیب و زینت اور مغرب کے معیار ترقی پر پہونچنے کے راستے میں کوڑا کرکٹ کی حیثیت رکھتا ہے) ہٹانے اور دور کرنے میں مصروف ہو رہی ہیں اور یہ بدقسمت ممالک بے ضرورت ایک اندرونی جنگ، (Civil war) قوت اور وقت کی اضاعت، باہمی بے اعتمادی اور خوف کی فضا سے دوچار ہیں...... شاذ و نادر اس کے برعکس بھی صورت پیش آتی ہے وہ یہ کہ جن ممالک میں کبھی کوئی اسلام پسند قیادت اُبھرتی ہے یا حکومت اسلامی آئین نافذ کرنا چاہتی ہے تو وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں (جو مغربی نظامِ تعلیم کا ساختہ پرداختہ ہے)

سب سے پہلے مخالفت کرتا ہے اور ان کوششوں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہے کہ مغربی نظامِ تعلیم، اسلامی اصول واقدار اور اسلامی ذہن وسیرت سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں ہے اور وہ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے"۔

(کاروانِ زندگی۔ ج: دوم، ص: ۳۲۔۳۳)

علی میاںؒ نے مسلم ممالک کے اس بڑے اور حقیقی مسئلہ کا علمی وتاریخی جائزہ لیا ہے اس سلسلہ میں جتنا کام ہوا ہے اس پر ایک بے لاگ مؤرخ اور ایک حقیقت پسند مفکر کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اسلامی معاشرہ کے لیے اسلامی عقائد واخلاق اور نظریۂ حیات کی پابندی بے حد ضروری ہے، دوسری چیز دعوت وامامت، احتسابِ کائنات بھی اس کا فرض ہے، ترقی کرنے اور زندگی کے رواں دواں قافلے کے ساتھ جانے کے لیے صحیح اور معتدل راہ کی ضرورت ہے۔

کتاب کے آخر میں علی میاںؒ نے ایک بہت ہی مہتم بالشان موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور وہ ہے "عالمِ اسلام کا مردِ کامل" اس کی ضرورت، اہمیت اور اس کے خصائص کے بارے میں علی میاںؒ فرماتے ہیں:

"وہ (اسلام کا مردِ کامل) عالی دماغ، حوصلہ مند انسان جو مغربی تہذیب اور اُس کے تمام نظریات، انکشافات اور قوتوں کے ساتھ خام مال (Rawmaterial) کا سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی اور طاقتور تہذیب کی عمارت تعمیر کرے جو ایک طرف ایمان، اخلاق، تقویٰ، رحم دلی اور انصاف پر قائم ہو تو دوسری طرف اس میں مخصوص ذہانت، قوتِ ایجاد اور جدتِ فکر جلوہ گر ہو۔ وہ مغربی تہذیب کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ وہ تکمیل وترقی کے آخری

مراحل سے گزر چکی ہے اور اس پر آخری مہر لگ چکی ہے اور اب اس میں کسی ترمیم واضافہ کی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اس پر علیحدہ علیحدہ اجزاء کی حیثیت سے نظر ڈالے، جس چیز کو چاہے رد کرے اور جس چیز کو چاہے اختیار کرے پھر اس زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدہ اور اس کے مبادی اور اصول، اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو''۔

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص: ۲۹۸۔۲۹۹)

کویت کے مجلّہ ''المجتمع'' میں علی میاںؒ کی اس کتاب کا تعارف اور تبصرہ علامہ محمد طحان کے قلم سے شائع ہوا، علامہ احمد محمد طحان ایک وسیع النظر صاحب علم ہیں، قدیم وجدید اسلامی لٹریچر پر اُن کی نظر ہے۔ تحریر کرتے ہیں:

''شیخ ابوالحسن علی حسنی اس کتاب میں ہمیں اُس راہ پر لے گئے ہیں جو انھوں نے فکرِ اسلامی کے میدان میں تاریخ کے گہرے مطالعہ اور اس کے علمی تجزیے اور صحیح نتائج حاصل کرنے کے بعد نکالی ہے اس کتاب میں بہت سے ایسے عوامل ومؤثرات، ذہنی شورشوں اور اصلاح حال کے لیے اُبھرتی شخصیات، تنظیموں، انجمنوں، انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کا ذکر علمی وعقلی بنیادوں پر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک سوالیہ نشان ہے اُن سازشوں اور چوطرفی حملوں کا مسلمانوں کے پاس کیا علاج ہے، کیا منفی اثرات کو قبول کر کے بیٹھ جانا اور اسلامی مورچہ کو چھوڑ کر الگ ہوجانا یا اِن حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا؟ پھر یہ سوال کہ موجودہ عصری شکست خوردگی کی ذہنیت کو عام کرنا اور میدانِ عمل سے راہِ فرار اختیار کرنا مصلحت کا تقاضہ؟ اور کیا تعلیم یافتہ طبقہ اس خلا کو پُر کرنے پر قادر ہے؟ اور کیا وہ اس بیسویں صدی میں عملی

طور پر موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے اخلاقیات کی بنیاد پر اور سیاسی اور سوشل (اجتماعیاتی) اور عسکری تنظیم پر قادر ہے؟ اور کیا وہ اپنے محدود وطنیت کے تصور سے آگے بڑھ کر پوری امت کی اصلاح حال کا کوئی ذریعہ بن سکتا ہے؟ اور ان مصنوعی حصار کو توڑ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور قرآن کے سائے میں اپنی شناخت قائم کر سکتا ہے۔

یہ کتاب اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر مصنف کو معاصر علماء کی صف میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے جس کی کاوش کا محور دین کی سلامتی اور ایمان کی قوت ہے...... مصنف کے متعدد امتیازی اوصاف (جو اس کتاب میں جھلکتے ہیں) ایسے ہیں جنھوں نے اسلامی امور کی گتھیاں سلجھانے اور علمی و نقلی بنیادوں پر مسائل کا حل بتانے میں اپنے تمام معاصر علمائے تحقیق میں سب سے بلند مقام پر کھڑا کر دیا ہے"۔

(میرِ کارواں۔ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی۔ص:۵۱۰۔۵۱۱)

"مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں علی میاںؒ نے جس ذہانت، ذکاوت سے متوازن، تحلیل و تجزیہ کیا ہے وہ فکر انگیز اور توجہ طلب ہے اور تمام اہلِ اسلام اور خصوصاً اس کے ذی اقتدار افراد کے لیے بنیادی راہِ عمل پیش کرتا ہے۔ یہ تجزیہ اور اس کے نتیجہ میں کیے گئے نتائج بڑے دور رس ہیں اور ان پر غور و فکر کے ساتھ ساتھ عمل کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب علی میاںؒ کی بہترین تصانیف میں سے ایک ہے۔

علی میاںؒ کی تاریخی تصانیف اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ ایک کامیاب مؤرخ ہیں جن کو تاریخ سے صحیح واقفیت حاصل ہے۔ ان کی نظر ناقدانہ ہے ان کو قوت بیان پر قدرت ہے باریک بینی سے حالات کا جائزہ لیتے ہیں، مؤرخانہ امانت اور ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں۔ ہر ایک تاریخی تصنیف کو پیش کرنے کا پاکیزہ مقصد بھی کارفرما نظر آتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک فنِ تاریخ نویسی، صرف

علمی بصارت اور وسیع مطالعہ اور حوادث کا جائزہ لینے کی صلاحیت اور ان کو بیان کرنے کی قدرت پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دینی بصیرت، بلند مقصد، ایمان وعقیدہ کی چھاپ بھی لازمی ہے۔تقریر ہو یا تحریر علی میاںؒ کا تاریخی ذوق ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔تاریخ اسلام اور تاریخ عالم کے واقعات وحالات سے تحلیل وتجزیہ ان کے مزاج کا بنیادی عنصر ہے ان کے فکر کی روح ہے، فکر واندیشوں کا اظہار ہو یا امید کا پیغام ان کا تاریخی ذوق وبصیرت اور ان کا ادیبانہ قلم ان کو ایک کامیاب مؤرخ کی صف میں نمایاں مقام ومرتبہ عطا کرتا ہے۔

☆☆☆

''ابتدائی استغراق وانہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں، اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے اور جس کو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے لیکن اب بھی اُن (علامہ اقبالؔ) کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوان کے لیے اب بھی ان کو طاقت اور خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں''۔

(مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ)

وسیع النظر عالمِ دین علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے

سفرنامے اور اُن کا منفرد اسلوب

سفر انسانی فطرت کا ایک حصّہ ہے اور سفرنامہ، مسافر کے ذوق وشوق، مقصدِ سفر کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہر زبان کے ادب میں سفرناموں کی خاص اہمیت ہے، یہ وہ صنف ادب ہے جس سے معلومات حاصل ہوتی ہیں، بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے، اچھا سفرنامہ تخلیقی ادب کے لطف وانبساط سے آشنا کرتا ہے، اقوام عالم سے رابطے کا ذریعہ ہے، سفرنامے کا قاری دنیا کے مختلف حصّوں کی تہذیب، جغرافیہ، تمدّنی حالات کے ساتھ انسانی فطرت کی وسعتوں کا مشاہدہ کرتا ہے اس طرح سفرناموں میں تنوع بھی ہوتا ہے اور رنگارنگی بھی۔

سفرناموں سے مختلف ممالک کے سیاسی، جغرافیائی، تمدّنی احوال معلوم ہوتے ہیں ان ملکوں کی مختلف تحریکات اور اہم شخصیات سے واقفیت ہوتی ہے، سفرنامے کے اندر مسافر کی اپنی تصویر نظر آتی ہے خیروشر کو پرکھنے کے اس کے اپنے پسندیدہ اصول ومعیار کا مظاہرہ ہوتا ہے، سفرنامے میں سیاح کے رجحانات وخیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ زمانہ قدیم سے اربابِ علم وفضل نے اپنے اسفار کی روئیداد قلم بند کی ہے۔

گزشتہ زمانے میں سفرنامے عام طور پر علمی، جغرافیائی فوائد اور معلومات پر مشتمل ہوتے تھے اور ان کا مقصد سیروسیاحت، آثارِ قدیمہ اور قابلِ دید مقامات کی عکاسی ہوتا تھا۔ سیاحتی ادب کے سیاق وسباق میں علی میاںؒ کے سفرنامے علمی سفرنامے ہیں اور ان کے ہر سفر کے پس پشت کوئی اہم دینی، علمی، اصلاحی مقصد نظر آتا ہے۔

علی میاںؒ کے جن سفروں کی روئیداد سفرناموں کی شکل میں موجود ہے۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مشرق اور مغرب کے اہم علمی، ثقافتی اداروں، تہذیبی مرکزوں کا بغور معائنہ کیا۔ عالموں، دانشوروں سے لے کر وزراء وسلاطین تک سب سے ملاقات اور تبادلہ خیال کیا بلکہ بے تکلف گفتگو کی۔ ان سفروں کے دوران کسی دن اور کسی لمحے کو لذّت عیش وعشرت میں ضائع نہیں کیا بلکہ ہر جگہ، ہر وقت ملکوں کی دینی، علمی، تعلیمی، اقتصادی، معاشی، تہذیبی ومعاشرتی حالات کو بہ نظرِ غائر دیکھا، خدا کے پیغام کو عام کیا، قوموں اور ملتوں کو دین ومذہب کے معیار پر پرکھا، ملّی امراض کی تشخیص کے ساتھ اس کا علاج تجویز کیا۔ یہ ان کی بصیرت کا کمال ہے کہ دبیز پردوں اور حکومت کی پابندیوں کے باوجود بعض مقامات پر انھوں نے ملکوں کی حیرت انگیز صورت حال کی نشاندہی کی ہے۔

علی میاںؒ کے سفرنامے نہایت معلوماتی اور تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ اُن کے سفرنامے ملکوں کی تہذیب اور تمدن، طرزِ معاشرت، رسم ورواج، طرزِ فکر اور رجحانات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، انھوں نے تاریخی حوالوں کے ساتھ دینی اصلاحی تحریکات، اُن کے عوامل واثرات، ذہنی وروحانی کشمکش کا جائزہ لیا، ملک کے عوام وخواص کی خوبیوں کا ذکر اور کمزوریوں کو بیان کرتے ہوئے بلا تکلّف خطرات واندیشوں کا اظہار کیا اور ایسے مفید مشورے دیے جو اُن کے مطالعہ کا حاصل اور ان کے مقصد کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے سفرنامے، ان کے تجربات مشاہدات، جذبات وکیفیات کی مکمّل ترجمانی کے ساتھ متعلقہ ملک کی فکری تحریکات، سیاسی انقلابات، متنوّع اداروں، جماعتوں، فلسفوں اور شخصیتوں کے تعارف اور آشنائی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

علی میاںؒ کے چھ سفرنامے شائع ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اپنے گھر سے بیت اللہ تک (۲) شرق اوسط کی ڈائری (مذکرات السائح فی الشرق العربی) (۳) نہر کابل سے نہر یرموک تک (من نهر الکابل الیٰ نهر الیرموک) (۴) دو ہفتے مغرب اقصیٰ (مراکش) میں

(أسبوعان فی المغرب الاقصیٰ) (۵) دو ہفتے ترکی میں (۶) بارہ دن ریاستِ میسور میں۔

ہندوستان اور بیرونِ ہند علی میاںؒ نے بے شمار سفر کیے، خودنوشت سوانح کاروانِ زندگی میں تمام سفروں کی مختصر روداد شامل ہے۔ ان سفروں کے دوران کی گئیں تقریریں بھی شائع ہو چکی ہیں، مجموعہ تقاریر میں العرب والاسلام، احادیث صریحۃ فی امریکا، حدیث مع الغرب، نفحات الایمان بین صنعا و عمان، تحفۂ مشرق، تحفۂ بھٹکل، تحفۂ کشمیر، حدیثِ پاکستان قابلِ ذکر ہیں۔

"اپنے گھر سے بیت اللہ تک" علی میاںؒ کے پہلے سفرِ حج کا سفرنامہ ہے۔ اللہ کے گھر کی حاضری کی روداد ہے اس مبارک سفر کی تمنّا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اکثر امین آباد سے تیزی سے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے تانگوں کو دیکھ کر دل میں ارمان اُٹھتا تھا کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب ہم بھی حج کے لیے اسٹیشن جارہے ہوں گے"۔

(کاروانِ زندگی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ حصہ اوّل)

۲۶/جون ۱۹۴۷ء (شعبان ۱۳۶۶ھ) کو لکھنؤ سے اس مبارک سفر کا آغاز ہوا۔ ۹/جولائی (۱۹/شعبان ۱۳۶۶ھ) کو کراچی سے مغل لائن کے اسلامی جہاز سے جدّہ کے لیے روانگی ہوئی۔ علی میاںؒ کی والدہ خیرالنساء بہترؔ، اہلیہ طیّب النساءؒ، چھوٹی بہن امۃ اللہ تسنیمؒ اور بھانجے محمد ثانی حسنیؒ شریکِ سفر تھے۔ یہ قافلہ ۲۹/شعبان ۱۳۶۶ھ (۱۹/جولائی ۱۹۴۷ء) جدّہ پہنچا۔

علی میاںؒ کاروانِ زندگی میں لکھتے ہیں کہ "جدّہ کی بندرگاہ پر قدم رکھتے ہی وہ سرور و کیف حاصل ہوا جو بہت سے خوش نصیبوں کو حرمین شریفین میں حاصل ہوتا ہے۔ والدہ صاحبہ کی قلبی کیفیت اور مسرّت کا عجیب حال تھا"۔

دس دن سمندر کا سفر جس میں دعوت و تبلیغ اور حج کی تربیت کا کام بھی چلتا

رہا، لائبریری ہال میں خواتین کا اجتماع ہونے لگا۔ علی میاںؒ کی بہن نے خواتین میں اپنی حدیث کی کتاب ''زادِ سفر'' (ترجمہ اردو۔ ریاض الصالحین) سے کچھ حصّہ پڑھ کر سنادیا۔ جہاز کی خواتین اُن سے بہت مانوس ہوگئیں اور اُن کو عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھنے لگیں۔

علی میاںؒ جدّہ کے ساحل پر اُترنے کی کیفیت سفرنامے میں بیان کرتے ہیں:

> ''(جدہ کے) درودیوار سے عاشقیت ٹپکتی ہے یہاں نہ بیت اللہ نہ مسجد نبوی، لیکن محبّت کا آئین نرالا ہے جدّہ کی گلیوں سے بھی اُنس ومحبّت معلوم ہوتی ہے''۔

(اپنے گھر سے بیت اللہ تک۔ ص:۲۹)

جدّہ میں رمضان کا چاند ہوگیا، دو روزے جدّہ میں رکھے پھر یہ قافلہ مدینہ منورہ روانہ ہوگیا۔ مضمون میں مدینہ کے راستے کے پُرکیف حال کو بیان کرتے ہیں۔ راستے کے روح پرور مناظر کی دلکش منظر نگاری بھی کرتے ہیں۔

> ''نظر اُٹھا کر دیکھیے دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں کیا عجب کہ ناقۂ نبوی اسی راستے سے گزرا ہو، یہ فضا کی دلکشی یہ ہوا کی مشک بیزی اسی وجہ سے ہے......درود شریف زبان پر جاری ہے دل وفورِ شوق سے اُمڈ رہا ہے۔ عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے کبھی عربی میں گنگناتا ہے کبھی دوسری زبانوں میں......بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی، جس قدر طیبہ قریب ہوتا جارہا ہے ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک لیکن دل کی گرمی بڑھتی جارہی ہے''۔

(اپنے گھر سے بیت اللہ تک۔ ص:۳۲)

آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری کی خوبصورت منظر نگاری کرتے ہیں کوئی جملہ نصیحت سے خالی نہیں۔

"اب آپ ہیں اور مسجد نبویؐ، دل کا کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔ درود شریف پڑھنے کا اس سے بہتر زمانہ اور اس سے بہتر مقام کون ہوسکتا ہے اب بھی شہود و حضور نہ ہو تو کب ہوگا، جنّت کی کیاری میں نماز پڑھیے...... دن میں جتنی مرتبہ جی چاہے حاضری دیجیے اور سلام عرض کیجیے آپ کے نصیب کھل گئے اب کیوں کمی کیجیے۔ مگر ہر بار عظمت و ادب اور اشتیاق و محبت کے ساتھ ...... دل کی ایک حالت نہیں رہتی وہ بھی سوتا ہے اور جاگتا ہے جاگے تو سمجھیے نصیب جاگے .... اس باب میں، دل کی فرمائشیں سب پوری کیجیے کوئی حسرت باقی نہ رہے کبھی صرف آنسوؤں سے زبان کا کام لیجیے کبھی ذوق و شوق کی زبان میں عرض کیجیے۔ درود شریف طویل بھی ہیں مختصر بھی، جس میں جی لگے اور ذوق پیدا ہو، اس کو اختیار کیجیے مگر اتنا خیال رکھیے توحید کے حدود سے قدم باہر نہ جائے"۔

جنّت البقیع کی حاضری اور اس کی تصویر کشی کے ساتھ جاں نثار صحابہ صحابیات کے ایفائے عہد کے ساتھ بقیع کے پیغام کو یاد دلاتے ہیں۔

"آیئے آج بقیع چلیں جو انبیاء علیہ السلام کے مقابر کے بعد صدق و اخلاص کا سب سے بڑا مدفن ہے......

"دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز"......

یہاں چپّہ چپّہ پر ایمان و جہاد اور عشق و محبّت کی تاریخ کندہ ہے۔ ایک ایک ڈھیر میں اسلام کا خزانہ دفن ہے"...... سب کو سلام عرض کیجیے اور فاتحہ پڑھیے پھر ایک لمحہ ٹھہر کر پورے بقیع پر عبرت و تفکر کی نظر ڈالیے اللہ اکبر کتنے سچے تھے یہ اللہ کے بندے جو کچھ کہتے تھے کر دکھایا...... مکّہ میں جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا مدینہ میں اسی کے قدموں میں پڑے ہیں...... آیئے بقیع میں اسلام کی خدمت کا عہد کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں

اسلام ہی کے راستے پر زندہ رکھے اور اسی کے ساتھ وفاداری میں
موت آئے۔ جنت البقیع کا یہی پیغام اور یہاں کا یہی سبق ہے''۔

مدینہ منورہ سے واپسی، احرام باندھ کر مکہ مکرمہ کے لیے رختِ سفر، اب حج کا مبارک رکن ادا کرنے کی باری ہے۔ علی میاںؒ مکہ کے سفر اور حج کے پُر کیف مناظر، اس مبارک سفر کی روداد مومنانہ فراست کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

''جدّہ آیا اور گزر گیا اب شہنشاہِ ذوالجلال کا شہر اور اس کا گھر
قریب ہے۔ باادب! ہوشیار!! مدینہ اگر مرکز جمال تھا تو یہ مرکز
جلال ہے، مدینہ کے درودیوار سے اگر محبوبیت ٹپکتی ہے تو یہاں
کے درودیوار سے عاشقی نمایاں ہے، یہاں عاشقانہ آنے کی
ضرورت ہے۔ برہنہ سر، کفن بردوش، پریشان حال، یہی یہاں
کے آداب میں سے ہے''۔

ایمانی جوش، عبادت کا شوق، امید وخوف، علی میاںؒ نے نہایت پُر اثر اسلوب میں حج کے روح پرور مناظر کو عکس جمیل عطا کیا ہے۔

''آپ کو اس راستہ پر عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپّہ چپّہ کے
مسلمان ایک لباس میں ملبوس، ایک ترانہ بلند کرتے ہوئے ایک
عشق وسرمستی کی کیفیت میں آتے جاتے نظر آئیں گے، تیز قدم
بڑھاتے ہوئے، ننگا سر، اللہ کے سامنے جھکائے ہوئے چلے
جارہے ہیں ان میں امیر بھی ہیں، غریب بھی، سرخ وسفید، شامی و
مغربی بھی، سیاہ فام، حبشی وتکرونی بھی، مرد بھی، عورت بھی لیکن کسی
کو کسی کے دیکھنے اور توجہ کرنے کی فرصت نہیں، بعض اوقات اس
مجمع عشاق کو دیکھ کر قلب پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اور بے
اختیار ان عشاق کے پاؤں پڑنے اور ان کی بلائیں لینے کا جی
چاہتا ہے، اسلام کی محبت جوش مارتی ہے، وطن وقوم کی حد بندیاں

ٹوٹنے لگتی ہیں اور دینی وحدت کا احساس اُبھرنے لگتا ہے''۔
کل ۹ کو عرفات کی طرف کوچ ہے...... پچھلے پہر اللہ نے توفیق دی آنکھ کھل گئی، منیٰ کا عجیب منظر تھا سارا شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا عالم اسلام کچھ سوتا تھا کچھ جاگتا تھا، ہر طرف تجلّیات وانوار کا ہجوم معلوم ہوتا تھا اپنی جگہ پر نہ رہا گیا۔ مسجد خیف کی طرف چلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صبر واستقامت کی یاد بڑی شدت سے پیدا ہوئی۔ خداوندا عشق ابراہیم کا ایک ذرّہ عطا ہو جو ماسویٰ کو جلا دے۔ عالمِ اسلام اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی آواز پر جمع ہے اس میں محبّت کی حرارت پیدا کردے کہ پھر زندہ ہو جائے پھر تیرے لیے اپنی جان ومال کی قربانی پر آمادہ ہو جائے عجب سرور وحضور کا عالم تھا، عجیب ذوق وشوق کا وقت تھا...... بڑی سکینت معلوم ہوتی تھی...... اب منیٰ سے چل چلاؤ ہے سب کا رُخ عرفات کی طرف ہے دن چڑھے یہاں سے چلنا ہے ہر ایک جانے کے اہتمام میں ہے سواریوں کی بھی کشمکش ہے یہی حج کے امتحان کے مواقع ہیں...... لبیک لبیک کی صداؤں کے ساتھ عرفات کی طرف روانہ ہوئے...... لیجیے عرفات آگیا...... انسانوں کا ایک جنگل، جنگل میں منگل، کئی لاکھ انسان دو سلی چادروں میں، شاہ وگدا ایک لباس میں، جہاں نظر کام کرتی ہے خیمے اور شامیانے ہی نظر آتے ہیں جو نظر آتا ہے دو سفید چادروں میں، معلوم ہوتا ہے آج فرشتوں نے اللہ کی یہ زمین بسائی ہے۔ سفید براق نورانی صورتیں، ذکر سے تر زبانیں، لبیک لبیک کی صدا گونجتی ہوئی اور پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی، انسانوں کا اتنا بڑا مجمع لیکن نہ

چپقلش نہ کشاکش، روحانیت اور انابت کی فضا چھائی ہوئی ہے...... عرفات و مزدلفہ کے درمیان خدا کی شان نظر آتی ہے...... ایک میدان میں کئی لاکھ مسافر اُترے ہوئے...... سارا میدان جگمگا رہا تھا۔ مزدلفہ ہنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کیا خیر و برکت کی رات ہے جو وقت مل جائے غنیمت ہے۔

دس ذی الحجہ کو جمرۃ العقبہ کی رمی کی جاتی ہے۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہر عمل پیغمبرانہ اخلاص اور عاشقانہ کیفیت کے ساتھ کیا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان کے ہر فعل کو زندگیٔ جاوداں بخشی اور اس کی یادگار باقی رکھی، آج ان افعال کی نقل میں بھی عشق کی کیفیت اور زندگی و تازگی ہے بشرطیکہ دل محبت و عظمت اور ایمانی کیفیات سے بالکل خالی نہ ہو۔ حج کی ہر چیز میں عاشقانہ کیفیت اور محبوبانہ ادا ہے۔ سعی و طواف تو عشق و جذب کی کھلی نشانیاں ہیں مگر یہ رمی (کنکری مارنا) بھی عجیب پیاری ادا ہے...... سچے عشق کے ساتھ جو چیز کی جائے گی اس پر اہل دل کو پیار ہی آئے گا۔ رمی کرتے وقت دل میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی محبت، اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کا جذبہ اور اپنے دشمن حقیقی سے نفرت کا جوش ہو تو رمی عجب بہار کی چیز ہے، عجب عبادت ہے''۔

آیئے منیٰ کے اس قیام سے فائدہ اُٹھائیں اور ذرا دیر کے لیے عقبہ چلیں جہاں مدینہ کے انصاریوں نے پہلے پہل حضورؐ کے دستِ مبارک پر اسلام کی بیعت کی اس کی حمایت و نصرت کا عہد کیا اور جہاں حقیقتاً ہجرت اور مدنی زندگی کی داغ بیل پڑی، اسلام کی تاریخ میں اور عالم اسلامی کے طویل و عریض رقبہ میں یہ

چند گز زمین بڑی حرمت اور قیمت رکھتی ہے، سچ پوچھیے تو بدر کی فتح کا سنگِ بنیاد یہیں رکھا گیا، تاریخِ اسلام کا افتتاح یہیں ہوا، عالمِ اسلام کی تاسیس یہیں عمل میں آئی۔ یہی وہ موقع ہے جہاں اللہ کے نبیؐ سے یثرب کے بارہ آدمیوں نے چھپ کر بیعت کی اور دینی خدمات پیش کیں۔ اگلے سال اسی جگہ بہتّر (۷۲) مرد اور دو عورتوں نے بیعت کی اور حضورؐ کو اہلِ مدینہ کا پیامِ شوق پہنچایا اور مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تم دین کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے اور جب میں تمہارے شہر میں جا بسوں، کیا تم میری میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل وعیال کے مانند کرو گے۔ مدینہ والوں نے پوچھا ''ایسا کرنے کا معاوضہ ہم کو کیا ملے گا؟'' فرمایا ''جنّت''۔ اہلِ مدینہ نے دریافت کیا ''اے خدا کے رسولؐ ہماری تسلّی فرما دیجیے کہ حضور ہم کو کبھی چھوڑ نہ دیں گے، فرمایا ''نہیں! میرا جینا، میرا مرنا تمہارے ساتھ ہوگا''۔ اس پر اِن حضرات نے بڑے جوش و سرور کے ساتھ بیعت کی۔ یہ جگہ مکہ اور منیٰ کے راستے میں ہے اور جمرہ اُخریٰ سے کچھ دور نہیں، آپ اس سے آتے جاتے گزرے ہوں گے۔ اب اس جگہ مسجد بنی ہوئی ہے دو چار نوافل پڑھ کر آیئے ہم اللہ سے دعا کریں کہ ہم کو اسلام کی خدمت، اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش اور سنت نبوی کے احیاء کی جدّ وجہد کے لیے قبول فرمائے...... (۱۳/ ذی الحجہ رمی جمرات کے بعد مناسک حج مکمل ہو گئے) واپس مکہ معظّمہ میں داخل ہو گئے نماز پڑھیے، طواف کیجیے۔ بیت اللہ کو دیکھیے اور دیکھتے رہیے ہر وقت اس کا نیا جمال اور نئی شان ہے''۔

کعبہ را ہر دم تجلّی فی فزود
ایں از اخلاصات ابراہیم بود

اتنے دن سے اس کو دیکھ رہے ہیں مگر جی نہیں بھرتا، نگاہ نہیں تھکتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس ذاتِ حال کے جمالِ جہاں آرا کا کیا حال اور اس کی دید کی کیا مسرّت اور لذّت ہوگی......
(وطن واپسی کا وقت آگیا) لیجیے جہاز تیار ہے بسم اللہ کر کے سوار ہوئیے واپسی ضرور ہے سفر بیشک وطن کی طرف ہے لیکن یاد رہے کہ واپسی ''اللہ کے گھر'' سے ہے اور آپ حج کی ذمہ داریوں کے ساتھ واپس ہو رہے ہیں نمازوں کا اہتمام، ذکر میں مشغولیت رفیقوں کا خیال، ساتھیوں کے لیے ایثار کا جذبہ، اپنی کوتاہیوں پر ندامت واستغفار پہلے سے زیادہ ہونا چاہیے''۔

(اپنے گھر سے بیت اللہ تک۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

یہ پہلا سفر حج ۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۶۶ھ میں کیا گیا تھا۔ سعودی عرب فقر وافلاس کے دور میں تھا، اِس عصر کی پوری تصویر اِس مضمون ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک'' میں موجود ہے، نیز سرزمین عرب سے والہانہ تعلق، دل سوزی، جذبہ دروں کا عالم، زندگی بھر کی تمنّاؤں کا پورا ہونا نہایت حسین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مضمون پڑھتے جائیے اور ان مبارک مہمانان حرم کے ساتھ ساتھ حرمین شریفین سے روح کی غذا حاصل کرتے جائیے۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں:

''اس سفر کے دواعی میں حج کے علاوہ دعوت وتبلیغ کا کام کرنا بھی شامل تھا، پہلے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، جہاں تین ماہ قیام کیا اور حج کے بعد مکّہ تشریف لے آئے۔ اس وقت آپ کے پاس عربوں کے لیے جو ہدیہ تھا اس میں پہلا رسالہ ''الــــــی

ممثلی البلاد الاسلامیہ" تھا۔ یہ بہت طاقتور اسلوب میں لکھا گیا خطاب تھا۔ یہ تقریر بہت جامع بلیغ اور پُر اثر تھی۔ آخر میں تبلیغی جماعت کا تعارف، میوات میں کام کی نوعیت اور حضرت مولانا الیاسؒ کی مساعی، علمی رسوخ، تعلق باللہ اور اس کے ثمرات کا بیان تھا۔ یہ رسالہ پہلے سفر حج میں ساتھ تھا.....سفر بڑی اُمنگوں کا تھا، دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں چند اہلِ علم سے ملاقات بھی ہوئی اور تبلیغی اجتماعات میں خطاب فرمایا"۔

(پسِ کارواں۔ مولانا عبداللہ عباس ندویؒ۔ ص: ۲۲۹۔۲۳۲)

حرمین شریفین کی حاضری کا مبارک اور یادگار سفر مکمل ہوا۔ سرزمین عرب کا یہ مبارک سفر بڑی آرزوؤں، تمناؤں کا سفر تھا۔ سفرنامہ کا حرف حرف جذبہ و عقیدت سے پُر ہے۔ نہایت سادہ مگر پُر اثر عنوان "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" دل کے تاروں کو چھو لیتا ہے۔ علی میاںؒ کا یہ مختصر مضمون بصیرت و بصارت میں اضافہ کرتا ہے۔ تخلیقی ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ قلم ہمیشہ محتاط رہتا ہے۔ مدارج کا خیال اور ذوق و شوق ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جذبات و کیفیات کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ نہایت پُر اثر اسلوب میں تاثرات بیان کرتے ہیں۔ داستان کی زبان نہایت شگفتہ اور پُر کیف ہے۔

مذکرات السائح فی الشرق العربی "شرق اوسط کی ڈائری" علی میاںؒ کا وہ روزنامچہ ہے جو ۱۹۵۱ء میں شرق اوسط کے (مصر، سوڈان، شام و فلسطین) سفر کے دوران قلمبند کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء، ۱۳۷۳ھ میں اس کا پہلا ایڈیشن جامعۃ الازھر للتالیف والترجمہ والنشر نے شائع کیا۔ مقدمہ جامعہ ازہر کے رکن ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ کے قلم سے ہے۔ ہمارے پیش نظر تیسرا ایڈیشن (طبع شدہ ۱۹۷۸ء، ۱۳۹۸ھ) ہے جس کو مؤسسۃ الرسالۃ بیروت (لبنان) نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں مصنف کے قلم سے ایک

مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ اردو ترجمہ ''شرق اوسط کی ڈائری'' کے نام سے مولانا شمس الحق ندوی نے کیا۔ سفرنامے کے آخر میں لبنان کے تین دن کے سفر کی روئیداد (جو ۱۹۵۶ء میں کیا گیا تھا) ثلاثة ایام في لبنان کے عنوان سے شامل کی گئی ہے۔

علی میاںؒ طالب علمی کے دور سے مصر کے لٹریچر کو دیکھ رہے تھے، مصر کی علمی ادبی مرکزیت سے بخوبی واقف تھے، دوسرے سفر حج کے بعد عربوں میں دعوتی کام کے لیے حجاز میں قیام کیا اور ۱۹۵۱ء میں دعوت تبلیغ کے سلسلے میں مصر اور شرق اوسط کے دیگر ممالک کا دورہ کیا۔ علی میاںؒ کے اس سفر کے رفیق مولوی معین اللہ ندویؒ اور عبدالرشید ندوی تھے۔ تقریباً آٹھ مہینے مصر، شام اور سوڈان میں قیام پذیر رہے، وہاں کے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں گئے، علمی، ادبی اور دینی کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ کتب خانوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں اور آثارِ قدیمہ کی سیر کی، علمی، تعلیمی، دینی واجتماعی حالات کا مشاہدہ کیا۔

علی میاںؒ نے مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے افکار ونظریات، اصلاحی تحریکات فکری وادبی مکاتیب خیال کا بہ نفس نفیس مشاہدہ کیا۔ اہم اشخاص سے لے کر عوام تک سے ملاقات اور گفتگو کی۔ مختلف حلقوں سے تعلق وارتباط کے دوران انھوں نے دینی علمی موضوعات، تعلیمی مسائل اور اصلاحی تحریکات، طریقۂ اصلاح ودعوت پر تبادلہ خیالات کیا۔ اہل مصر کو ہندوستان کے دینی مدارس کی کارکردگی، دینی، دعوتی، اصلاحی تحریکات اور اپنے تجربات سے آگاہ کیا۔ بالخصوص ہندوستان کی مشہور تحریک دعوت وتبلیغ (جس کے بانی مولانا الیاسؒ تھے) کے نظام اصلاح وتربیت سے متعارف کرایا۔ اُن کے سامنے اپنے دعوتی تجربات رکھے۔ یہ ڈائری ان ہی مشاہدات اور تاثرات پر مشتمل ہے۔

علی میاںؒ نے اس سفر میں روزنامچہ لکھنے کا اہتمام کیا۔ ملاقاتوں کی کیفیت تقریروں کے خلاصے، مختلف حلقوں سے تعلق وارتباط دینی، دعوت اور ہندوستان

کے تعارف کی روداد کو محفوظ کیا۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''انسان بروقت اپنی کسی تأثر کو قلمبند کر سکتا ہے لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد محض اپنے حافظہ کی مدد سے اس کی تجدید اور مسرّت والم، انقباض وانشراح کی جو کیفیت اس پر گزر چکی ہے اس کو ریکارڈ کرنا اس کے لیے آسان نہیں''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۱۰)

سفر کے مقصد اور محرّکات کا اندازہ سفرنامہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تحریر روزنامچے کے پہلے صفحے پر ہے، سفر کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جزیرۃ العرب! ہم تجھ سے جدا ہو رہے ہیں مگر اُکتا کر نہیں اور نہ ہمیشہ کے لیے، ہمارا یہ سفر بھی دراصل تیرے ہی رشتے سے اور تیرے اس عزیز خاندان کے افراد کی ملاقات کی غرض سے ہے جو بحر احمر اور بحر روم کے ساحل پر پھیلا ہوا ہے، میں اُن کو تیرا سلام پہنچاؤں گا اور اس بات کا جائزہ لوں گا کہ تجھ سے جدا ہونے کے بعد زمانہ کے دستِ بُرد نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس دعوت و پیغام کی مقدّس امانت کے ساتھ انھوں نے کیا برتاؤ کیا''۔

(شرقِ اوسط کی ڈائری۔ ص:۱۷)

درس وتدریس اور دعوت واصلاح علی میاںؒ کے محبوب مشاغل تھے۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' جیسی کتاب منظر عام پر آچکی تھی اور عالم اسلام، بالخصوص مصر کے علمی حلقوں میں دھوم مچا چکی تھی۔ مصر کے مدارس اور دبستانِ ادب سے آشنائی کے ساتھ ہی انھوں نے مصر کے سفر کا ارادہ کیا تھا۔

سفرنامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک عالم دین، مفکر اسلام کی حیثیت سے وہ مشرق وسطیٰ کے علمی، ادبی، فکری ماحول میں داخل ہوئے اور ہر طبقۂ فکر کے لوگوں سے بے تکلف گفتگو کی۔

جنرل صالح حرب سے گفتگو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ساڑھے نو بجے ہم لوگ ''جميعات الشبان المسلمين'' کے مرکز گئے اور اس انجمن کے صدر عمومی جنرل محمد صالح سے ملے۔ انھوں نے بیان کیا کہ ہماری تقریر (العالم على مفترق الطرق) کا علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہے، انھوں نے ہم لوگوں سے جس انداز میں باتیں کیں وہ ان کے جوش ایمانی، سلامت فکر، دور اندیشی، قومی وملّی جذبات کی آئینہ دار تھیں۔ میں انھیں صرف ایک فوجی جنرل اور مصر کے سربرآوردہ طبقہ کا ایک فرد سمجھتا تھا لیکن معلوم ہوا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، وہ بعض ایسے حقائق کو سمجھتے ہیں جس میں کبھی کبھی علماء کو زحمت پیش آجاتی ہے۔ انھوں نے اسلامی ممالک سے رابطہ قائم کرنے اور اس سلسلہ میں اپنے اسلامی فرض کی ادائیگی میں اپنی اور جميعات الشبان المسلمين کی کوتاہی پر معذرت کی اور کہا کہ وادیٔ نیل کے اتحاد کا مسئلہ ہمارے لیے دردسر بن گیا ہے، انگریزوں نے اس میں ہم کو الجھا رکھا ہے''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ ص:۱۶۲۔۱۶۳)

علی میاںؒ نے اس روزنامچے میں عوام کے نفسیاتی اور اجتماعی اضطراب کو مختلف انداز سے پیش کیا، ایک معمّر بزرگ سے ملاقات اور بات چیت ملاحظہ کیجیے:

''آج اشراق کے بعد مسجد اقصیٰ گیا تا کہ جن دنوں کی ڈائری

نامکمل ہے اس کی تکمیل کروں، مسجد جاتے ہوئے راستے میں
ایک معمّر بزرگ کے پاس سے گزر ہوا، تھوڑی دیر ان کے
پاس ٹھہر کر گفتگو کی، بڑی دلچسپ گفتگو کرنے والے اور
انگریزوں سے سخت غصّہ رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی
کوئی ایسی برائی نہیں جس کا انگریزوں سے تعلق نہ ہو۔ اگر کسی
دن آپ کو معلوم ہو کہ سمندر کی مچھلیوں میں جنگ چھڑ گئی تو
سمجھ جایئے کہ اس جنگ کو بھڑکانے والے انگریز ہیں، اگر
آپ میاں بیوی میں اختلاف دیکھیں تو تصوّر کرلیں کہ اس کا
سبب بھی انگریز ہیں''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۳۲۷)

علی میاںؒ نے بڑی بیبا کی سے علمائے ازہر کو ازہر کا پیغام سنا کر ان کی ذمّہ داری یاد دلائی۔

''میں نے ازہر سے باہر دینی دعوت کے کام کی طرف ان کو
متوجہ کیا اور قوم کے مبادیات کے لیے تیار کرنے اور ان کی
دینی تربیت کرنے پر زور دیا۔ میں نے کہا کہ بعض لوگوں کا
خیال ہے کہ مدارس کی جڑیں اس کے اندر ہیں اور میں سمجھتا
ہوں کہ وہ اس کے باہر ہیں اور عوام کے دلوں میں پیوست
ہیں''۔...... اسلامی ممالک سے آنے والے طلباء کی طرف
توجہ دینا ان کو اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا، ان کی
دینی اخلاقی تربیت کرنا، ان کی اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ
دینا بھی جامعہ ازہر کی ذمّہ داری ہے۔ طلباء کے یہ وفود اور
جماعتیں اسلامی و غیر اسلامی ملکوں سے ازہر کا سفر اس وجہ
سے کرتی ہیں کہ انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ ازہر شریف سے جو

دنیا کی سب سے بڑی دینی یونیورسٹی ہے اور دین کا مرکز ہے ان کو ہر طرح کی تقویت اور رہنمائی حاصل ہوگی لیکن ان کی امیدیں اکثر بار آور نہیں ہوتیں"۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ ص: ۲۰۷)

مفتی امین الحسینیؒ جن کے مجاہدانہ کارناموں کی تاریخ نصف صدی پر محیط ہے، جو عمر بھر مسلمانوں کی محبوب سرزمین فلسطین اور قبلہ اوّل بیت المقدس کے لیے سینہ سپر رہے، ہجرت بھی کی اور غم بھی برداشت کیے، ۱۴ ؍ مئی ۱۹۵۱ء مطابق ۷ ؍ رجب ۱۳۷۰ھ کو علی میاںؒ اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہیں:

"ہم لوگ مفتی امین الحسینی سے ملنے اُن کے دفتر مصر جدیدہ گئے، مصر میں جتنی ملاقاتیں ہوئیں ان میں یہ سب سے دلچسپ اور اچھی ملاقات تھی اگرچہ اس ملاقات نے دل کو زخمی .... اور غموں کو تازہ کر دیا۔ مفتی صاحب نے ایک خصوصی مجلس میں ہمارے ساتھ دیر تک باتیں کیں، انھوں نے جہادِ فلسطین کی تاریخ، یہودیوں کے جارحانہ عزائم حتیٰ کہ مدینہ منوّرہ اور یہودیوں کی پرانی آبادی خیبر تک قبضہ کی خواہش کا اظہار اور علی الاعلان اس کا مطالبہ اور اس کے لیے پورے طور پر تیاری اور آمادگی کا اظہار، مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کا نفاق اور چالبازی ان کے دل میں چھپے ہوئے بلکہ ان کی باتوں اور کردار سے ظاہر ہونے والے جذبات سے متعلق باتیں کیں۔ اور ان ساری مکاریوں کے مقابلے میں مسلم قوم کی سادہ لوحی، بہت جلد دامِ فریب میں آجانے کا ذکر اور عرب حکومتوں کی غلطی اور اس کے انجام اور صیہونی خطرات سے لاپرواہی وغیرہ کا ذکر کیا جو برابر اس کے وجود کو

چیلنج کر رہے تھے۔عرب بادشاہوں کا اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور عیش وتنعّم میں انہماک، المیہ فلسطین کے ذمّہ دار ہونے کے باوجود عرب لیگ کی خاموشی، فلسطین مجاہدین کو ہتھیار سے خالی کردینے اور عرب خطّوں کو یہود کے حوالے کردینے اور غیرت مند بہادر فلسطینی قوم کو جہاد نہ جاری رکھنے..........اور ان کو کچھ فائدہ نہ پہنچانے بلکہ ان کی جگہ پر قابض ہوجانے کی دلخراش حقیقت کو بیان کیا، اور خود جو مصائب جھیلے ان کو بیان کیا اور بتایا کہ انگریزوں نے انھیں کس طرح گھیرا اور انھیں الگ تھلگ ایک جزیرہ نما میں بند کردیا تاکہ وہ قضیہ فلسطین کے بارے میں آزادی کے ساتھ اپنی ذمّہ داری پوری نہ کرسکیں......مصر اور غزہ کے لوگوں سے ملنے جلنے پر پابندی لگادی......غلط اور بے بنیاد باتوں سے بدنام کرنے کی کوشش کی تاکہ فلسطینیوں کا ان پر سے اعتماد اُٹھ جائے......مفتی صاحب کا لہجہ اور باتیں بڑی غمناک اور دردانگیز تھیں وہ تحمّل کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنسوؤں کو روکتے رہے''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ص:۲۴۳۔۲۴۴)

علی میاںؒ تعلیم کے ساتھ تبلیغ ودعوت کی تربیت کے کام کو بہت اہمیت دیتے تھے، انھوں نے اپنے علمی، دعوتی، اصلاحی تجربات کی روشنی میں تبلیغ اور دعوت کے کام کو مدرسے کی تعلیم سے جوڑنے پر زور دیا۔اس سفر میں مولانا الیاسؒ کے طریقہ تبلیغ کو علمی حلقوں میں روشناس کیا، اس کے دوررس فوائد اور اہمیت سے آگاہ کیا۔

''......ہم نے شیخ حسن سے دینی دعوت اور دعوت کے کام کو مدرسہ کی تعلیم سے جوڑنے اور طلبہ کے اپنے اساتذہ کے ساتھ

دیہاتوں میں نکلنے اور عوام میں دعوت اور دینی مبادیات کو پھیلانے کے تجربات بیان کیے اور اس تحریک نے طلبہ میں دینی روح پھونکنے، دعوت کی مشق، قوم سے رابطہ و تعلق، اساتذہ و طلباء میں رابطہ قائم کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں جو فائدہ پہنچایا اس کا ذکر کیا۔ یہ بات ہمارے مدارس سے عرصہ سے ختم ہو چکی ہے۔ دینی مدارس تک میں تعلیم ایک صنعتی کام اور مشینی طریقہ بن کر رہ گئی ہے۔ جس میں روح کا سوز و گداز ہے نہ دل کی تڑپ و بے چینی نہ جذب اندروں نہ احساس،۔ نہ طلبہ و اساتذہ میں روحانی تعلق لیکن یہ سفر اور دعوت کے لیے مدرسہ کی فضا سے باہر جمع ہونا اس روحانی تعلق کو پھر سے بیدار کرتا ہے اور ایک طرف طلبہ کو فائدہ پہنچاتا ہے تو دوسری طرف عوام کو"۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ ص:۳۴۲)

عمان کے ملک عبداللہ سے ملاقات اور تعارف کے بعد علی میاںؒ نے برجستہ شریف رضی کے اشعار پڑھے، جس میں شریف نے ہاشمی النسب ہونے کی بلند مقام سے اپنے کو خلیفہ کا ہمسر قرار دیا اور صرف یہ فرق بتایا کہ آپ پر خلافت کا بار ہے اور میں اس گرانباری سے سبکدوش ہوں۔ علی میاںؒ لکھتے ہیں:

"میں نے کہا وہ حکومت جو اسلامی احکام کو نافذ کرتی ہے۔ دین کو سیاست و نظم و نسق میں جاری کرتی ہے۔ وہ ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہے اور اتنا عزت و احترام حاصل کر لیتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت نہیں حاصل کر سکتی..... حکومت کی دو بنیادی چیزیں ہیں تحصیل مال یا ہدایت و رہنمائی، اسلامی حکومتوں کو اصلاح و ہدایت کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے۔ حضورؐ ہادی اور رہبر بنا کر بھیجے گئے تھے نہ

کہ تحصیل مال کے لیے، آپ کے جدِ امجد سیدنا حضرت علیؓ
اور سیدنا امیر معاویہؓ میں یہی اختلاف تھا۔ حضرت علیؓ چاہتے
تھے کہ خلافت اپنے صحیح ڈھانچے پر قائم رہے بادشاہت میں
نہ تبدیل ہو جائے......۔

''شاہ کا جواب''......شاہ نے میری باتوں کو غور سے سنا پھر اس راہ کی
مشکلات بتائیں اپنی نیک تمناؤں، حکومت کو مضبوط اور لشکر کو قوی بنانے
کے منصوبے کا ذکر کیا اور حکومت کے ترقیاتی پروگرام بتائے''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ ص: ۳۳۴)

''عمان سے قدس'' عنوان کے تحت سفر نامے میں خوبصورت منظر نگاری
کے ساتھ تاریخ نویسی سے بھی کام لیتے ہیں۔

''ہم لوگ خدا کے بھروسے پر ایک چھوٹی سی کار پر سوار
ہوئے، کار ہم کو لے کر سانپ کی طرح لہراتی، مڑتی اور پیچ
کھاتی ہوئی پہاڑی چڑھائیوں اور راستوں پر گزر رہی تھی،
ہم لوگ بحرالمیت یا بحرہ لوط کے قریب سے گزرے، لوگ
کہتے ہیں کہ وہ سدوم نامی بستی کے قریب ہے جس میں قوم
لوط رہتی تھی''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ ص: ۳۱۵)

ایک جگہ اور عمان کے خوبصورت مناظر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''استاد عبداللطیف ابوقورۃ ہم سب کو پہاڑ پر واقع اپنے اس
گھر لے گئے جہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے وہاں ہم لوگوں
نے کچھ اخروٹ کھائے، چائے پی، یہاں سے عمان کی طرف
نظر ڈالی تو وہ روشنی سے اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے انار کا کٹا
ہوا پھل ہے جس کے سرخ دانے پھیلے ہوئے نظر آرہے

ہیں۔ رات کو جن مناظر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں یہ سب سے بہترین منظر تھا''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص:۳۳۱)

شرق اوسط کے اس سفر کے نتائج کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

''آج میری تقریر تھی میں نے اس سفر کے تاثرات اور جن نتائج تک پہنچا تھا...... دو نکات میں جمع کر دیا۔ پہلا نکتہ تو یہ کہ جس طبقہ کے ہاتھ میں ملکوں کی زمام کار ہے اسلام پورے طور سے ان کے حلق سے اترا نہیں، نہ اُس (طبقے) نے اُس کو (اسلام کو) تعلیم و تربیت کے اعتبار سے اچھی طرح ہضم کیا، اور نہ ہی اسلام پر ایک دین اور ضابطہ حیات کی حیثیت سے اس کا ایسا ایمان ہے جیسا کہ مغربی تہذیب کے اصولوں اور اُس کی افادیت پر ہے۔ یہ لوگ اسلام کے اتنے مخلص نہیں جتنے اپنے فوائد و مقاصد کے۔ ...... دوسرا نکتہ یہ کہ ان تمام ملکوں میں مسلم عرب قوم، بیدار مغزی میں بہت کمزور یا بالکل اس سے محروم ہے وہ زندگی کے ابتدائی اور بنیادی اصولوں کو بھی نہیں سمجھ سکتی، نہ دوست اور دشمن میں فرق کر پاتی ہے، بدخواہ، بہی خواہ کو بھی نہیں پہچانتی، نہ دشمن کو برا سمجھتی ہے نہ دوست سے گہرا تعلق رکھتی ہے''۔

(شرق اوسط کی ڈائری۔ ص:۳۵۶)

''شرق اوسط کی ڈائری'' میں معلومات، مشاہدات اور تاثرات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ سفرنامے میں ملک و معاشرے کی ایسی تصویر نظر آتی ہے جس میں فکری تحریکات، سیاسی انقلابات، مختلف ادارے، جماعتیں، برسرِ پیکار فلسفے، متضاد شخصیتیں کاندھے سے کاندھا ملا کر چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اضطراب و بے چینی،

کشمکش وتلاطم کے اس دور کو مصنف نے پُر اثر اسلوب میں پیش کیا ہے۔ افکار و تاثرات میں صداقت اور بیباکی سے کام لیا گیا ہے۔ اسلامی فکر نمایاں ہے دعوت واصلاح کا ذوق غالب ہے۔

☆ ''دو ہفتے ترکی میں'' ترکی کے سفر کی مفصّل روداد ہے۔ علی میاںؒ نے ۱۹۵۶ء میں دمشق میں قیام کے دوران شام سے باہر دو سفر کیے تھے۔ ایک لبنان کا، دوسرا ترکی کا۔ ۲/ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۲/جون ۱۹۵۶ء کو علی میاںؒ ترکی تشریف لے گئے۔ سفرنامے کے پیش لفظ میں ہندوستان اور ترکی کے دیرینہ پُرکشش تعلقات کا ذکر کیا ہے''ترکی سے مسلمانوں کو بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں کے بالخصوص گہرے اور دیرینہ تعلقات ہیں جن لوگوں کو ہندوستان کی خلافت تحریک کا زمانہ یاد ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں سے کیسی شیفتگی اور کیسا والہانہ تعلق رہ چکا ہے اور ترکی کا نام ان کے لیے کس قدر کشش رکھتا ہے۔ اُس وقت اگر چہ میرا بچپن تھا لیکن اس کے نقوش ابھی تک تازہ اور اُجاگر ہیں۔ یوں بھی ترک صدیوں تک اسلام اور کعبہ کے پاسبان اور سلطنتِ اسلامی کا نشان رہ چکے ہیں۔ (دو ہفتے ترکی میں۔ ص: ۷)

علی میاںؒ نے کاروانِ زندگی میں اس سفر کے بارے میں اپنے تاثرات ومشاہدات کا خلاصہ شامل کیا ہے۔ ترکی کی تاریخ اس کے عروج وزوال کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> ''حلب سے حیدر پاشا تک جو ترکی کے حدود کا آخری اسٹیشن ہے Taurus Express سے سفر ہوا، ترکی کے اس دو ہفتے کے سفر میں استنبول (قسطنطنیہ)، انگورہ، قونیہ (حضرت مولانا روم کا مسکن اور مدفن) کی زیارت کی۔ قسطنطنیہ میں جن دوستوں کے یہاں ٹھہرنا تھا...... ان کے اسٹیشن پر نہ پہونچنے سے پریشانی اور سرگردانی کا وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے زیادہ پریشان کن واقعہ اس وقت تک

زندگی میں پیش نہیں آیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی جس طرح مدد ہوئی جس محبت، ضیافت اور گرمجوشی اور اسلامی جذبہ کا اس سفر میں عملی تجربہ ہوا، اس کا بھی مشاہدہ کیا۔ ترکی کی سرزمین رنگ و بُو بھی دیکھی جو خونِ شہداء سے بارہا لالہ زار بنی اور صدیوں تک عالمِ اسلام کی آبرو، یورپ کے صلیبی ملک میں اسلامی میخ، حرمین کی پاسبان، مقاماتِ مقدسہ اور ممالکِ عربیہ کے لیے حصار بنی رہی۔ شکوہ ترکمانی کا بھی نظارہ کیا اور اس غیور ملّت کے شہبازوں اور شاہینوں کو بھی دیکھا، پھر اتاترک کے اسلامی و عربی اثرات کے یکسر مٹا دینے کی باعزم و پُرنظم کوششوں کے نتائج بھی دیکھے۔ رسم الخط بدل جانے سے اسلامی ثقافت سے دوری اور اسلامی کتب خانے سے محرومی کا منظر بھی دیکھا۔''

(کاروانِ زندگی۔ حصہ اوّل۔ ص:۴۳۲۔۴۳۳)

سفر کے دوران راستے کے قدرتی مناظر کی دلکش منظر نگاری کرتے ہیں اور اس قابلِ احترام اسلامی سرزمین کے عظیم الشان تاریخ کو بھی یاد کرتے ہیں۔

''فوزی پاشا کے بعد سے گاڑی کی رفتار بھی تیز ہوگئی اور سرنگیں بکثرت آنے لگیں بعض بعض تو ۸۔۸، ۱۰۔۱۰ میل کی معلوم ہوئیں۔ دونوں طرف سبزہ پوش پہاڑ ہیں، کہیں کہیں پہاڑی چشمے بھی نظر آتے ہیں سبزہ دور تک پھیلا نظر آتا ہے شام ہوگئی ہر طرف خموشی ہے اس خاموش فضا میں ہر چیز خاموش ہے مگر گزرنے والے دیہاتوں اور بستیوں کی مسجدوں کے مینارے سر اُٹھا کر بآواز بلند اعلان کرتے ہیں کہ یہ اسلام کی سرزمین ہے اور داعیانِ اور فاتحان اسلام عرب سے جو پیغام لے کر آئے تھے ہم اس کے امین و منادی ہیں''۔

(دو ہفتے ترکی میں۔ ص:۲۰)

ٹرین کا وقت اچانک تبدیل ہو جانے کی وجہ سے وقت مقررہ سے چار گھنٹے قبل ٹرین (حیدر پاشا جو قسطنطنیہ کا ریلوے اسٹیشن ہے) پہنچ گئی یہاں کوئی متعارف، رفیق

نظر نہیں آیا۔ اشاروں میں بات ہوتی رہی، کوئی عربی زبان جاننے والا تھا نہ کوئی شناسا۔ ''پریشانی اور سرگردانی'' کے عنوان سے اس سفر کی پریشانیوں کو بھی نہایت دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔

علی میاںؒ کے پاس استنبول یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے شامی طالب علموں کے علاوہ شہر کے چند لوگوں کے نام اور پتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی اپنی قیام گاہ پر نہیں تھا۔ بلڈنگ کے ایک انجینئر (جو انگریزی جانتے تھے) نے مشورہ دیا کہ قریب ہی ایک اسلامی دینی ہفتہ وار رسالے کے مدیر ہیں وہ آپ کی مدد کریں گے۔ علی میاںؒ بلڈنگ کے محافظ کامل کے ساتھ اُن کے دفتر پہنچے۔ انھوں نے علی میاںؒ کا تعارفی خط پڑھا۔ نوٹ بک کے نام و پتے پڑھے دو ورق نوٹ بک سے نکالے، ایک ورق پر ایک پتہ نوٹ کیا اور سب اوراق ریزہ ریزہ کر دیے اس اچانک حادثہ پر بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''یہ سب اس طرح آناً فاناً ہوا کہ ہم دیکھتے رہے اور کچھ سمجھ نہ آیا...... آخر یہ کیا حرکت تھی۔ ہم نے اُن سے کہا آپ نے یہ کیا کیا۔ کہنے لگے ''لا یجوز، لا یجوز'' یہی عربی کے دو لفظ تھے جو ہم نے اُن سے اوّل آخر سنے۔ اب اُن سے کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم''

میزبانوں کی تلاش میں دن بھر اشاروں سے باتیں ہوئیں۔ نہ کوئی شناسا نہ کوئی واقف، نہ ہم زبان...... سفرنامے میں اپنی پریشان حالی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس وقت اپنی بے بسی، بے کسی، بے زبانی، بے بضاعتی کا پورا پورا احساس ہوا اپنی حقیقت بالکل عیاں ہوگئی...... وہی ہم ہیں کہ دمشق میں اس کی کوشش کرتے تھے کہ کوئی واقف نہ ملے اور ہم چپکے چلے جائیں پھر بھی متعارفین ملتے تھے ملاقات کرنے والوں سے طبیعت پریشان تھی اور یہاں حالت یہ ہے کہ

''یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری''

ایک آشنا اور ہم زبان نظر نہیں آتا۔ ساری خطابت اور زبان دانی رکھی رہ گئی، پڑھا لکھا، ب وقت کچھ کام نہیں آرہا تھا، اسباب ووسائل سب جواب دے گئے تھے تعارفی خطوط بھی خاک میں مل گئے تھے "اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْءَ" وردِ زبان تھا"۔

(دو ہفتے ترکی میں۔ص:۳۲)

ترکی کے حدود میں داخل ہونے کے بعد مغربی تہذیب کے اثرات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

دو چیزیں خاص طور پر محسوس ہو رہی ہیں اور آنکھوں میں بار بار چبھتی ہیں ایک لاطینی رسم الخط جو ترکی حدود سے شروع ہو گیا دوسرے ہیٹ جو ہر ترک کے سر پر نظر آرہی ہے گاڑی پر جو عرب یا ترک عورتیں سفر کر رہی ہیں وہ سب بالکل بے پردہ اور خالص یورپین معلوم ہوتی ہیں۔

ترکی کے بدلے ہوئے حالات، تہذیب و معاشرت کے مغربی رنگ پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"جمعہ کی نماز جامع بیرم (انقرہ) میں پڑھی۔ امام مسجد شیخ عمر بیلن واعظ بھی ہیں اور پارلیمنٹ کے ممبر بھی۔ شیخ ترکی میں وعظ کہتے تھے ترک نہایت ادب، خشوع وخضوع سے وعظ سن رہے تھے۔

نماز کے بعد شیخ بیلن سے ملاقات ہوئی، اس وقت تک وہ کسی مسجد کے امام اور واعظ معلوم ہوتے تھے عربی لباس، عربی عمامہ باہر نکلے تو عربی لباس اُتار کر کوٹ پتلون اور انگریزی ٹوپی میں جس سے وہ اچھے خاصے کنگ ایڈورڈ معلوم ہوتے تھے۔

ترکی کے علماء کے ساتھ اچھا مذاق کیا گیا ہے، وہ محراب و منبر پر شیخ الاسلام معلوم ہوتے ہیں اور مسجد کے باہر جرمنی کے مستشرق اور کیمبرج کے معمر پروفیسر"۔

(دو ہفتے ترکی میں۔ص:۹۰)

احباب سے ملاقات اور پریشانی کے خاتمے کے بعد سب سے پہلے میزبانِ

رسول مجاہد عالی ہمت حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر مبارک پر حاضری دی، فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد جامع ایاصوفیہ دیکھی جو زیب وزینت، نقاشی اور فن تعمیر کے لحاظ سے قسطنطنیہ کی سب سے بڑی مسجد ہے، گلہانہ پارک اور توپ کاپے کا عجائب خانہ دیکھا۔ سفرنامے میں لکھتے ہیں: ''عجائب خانہ سلاطین ترکی کے عہد کے ذخائر وتحائف کا مجموعہ ہے اور غالباً سونے چاندی، جواہرات مرصع ظروف اور بیش قیمت اشیاء کا اتنا نادر، اتنا بیش قیمت، اتنا کثیر ذخیرہ کسی عجائب خانے میں نہ ہوگا۔
(دو ہفتے ترکی میں۔ ص:۴۹)

سلطان حمید خاں کے قصر یلدز کو باہر سے دیکھا، محل میں اندر جانے کی اجازت نہیں اس کے گرد ایک وسیع وسنگین حصار ہے، وہ ایک قلعہ معلوم ہوتا ہے غالباً قصر میں حکومت کا کوئی محکمہ ہے۔

ترکی کے حمام تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ ۱۱ر جون ۱۹۵۶ کو علی میاںؒ نے خوش سلیقہ اور خوش قرینہ حمام میں غسل کیا۔ جامع سلیمانی کے عجائب خانے میں دوسری صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے مصاحف دیکھے، مصوری، نقاشی اور طلائی کام کے نظر فریب نمونے دیکھے۔

۱۹ر جون کو قصر دولمہ باغیچہ کی سیر کی ''قصر میں داخلے کی عام اجازت نہیں ہے۔ سفیر شام کے ذریعہ اجازت نامہ حاصل کیا گیا۔ قصر کے عملہ کے ساتھ شاہی ایوانوں، نگار خانوں، ملاقات کے کمروں کو دیکھا، قصر کی زیب وزینت عمارت کی وسعت وعظمت کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔...... شاید ہی کوئی بڑا ملک ہو جہاں کا فن یہاں موجود نہ ہو۔ رہبر کا بیان ہے کہ قصر میں مجموعی طور پر چودہ ٹن سونا استعمال ہوا ہے''۔

ترکوں کے سپاہیانہ اوصاف اور سادگی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترکوں کی معاشرت میں صفائی اور سادگی نمایاں ہے۔ یہاں کی معاشرت میں وہ تجمل وشان امارت نہیں دیکھی جو شام میں خاص طور پر ہم ہندوستانیوں کو محسوس ہوتی ہے...... ورزش اور جسمانی تربیت کی طرف رجحان بہت ہے، کھانے کے

اقسام اور ذوق میں شام وترکی میں بہت خفیف سا فرق ہوگا''۔

وزیر اعظم عدنان مندریس کے دورِ حکومت میں ترکوں کے دینی رجحان اور اس وقت کی اہم ضرورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ترکی کی موجودہ حکومت نے محسوس کیا کہ ترکی قوم فطرتاً اور مزاجاً مذہبی ہے، چنانچہ ترک قوم کو کچھ مذہبی آزادی دی ہے اور وہ بندش ڈھیلی کر دی ہے جو کمالی انقلاب کے بعد ملک میں قائم ہوگئی تھی...... اس وقت بڑی ضرورت اس کی ہے کہ ملک میں ایسے ہوش مند بیدار مغز علماء اور دینی قائد ہوں جو پورے دماغی توازن اور حکمت کے ساتھ دینی انقلاب لاسکیں اور دین کو اس طرح پیش کریں کہ وہ ایک زندہ، فعال اور متحرک چیز معلوم ہو جو پیچھے لے جانے کے بجائے ترکی کو آگے لے جاسکتی ہے اور اس کو دنیا میں دوبارہ امامت اور قیادت کا مقام دلاسکتی ہے''۔

(دو ہفتے ترکی میں۔ ص:۷۵)

مولانا جلال الدین رومیؒ کے وطن قونیہ پہنچے۔ ان کے مزار مبارک کی زیارت کی، فاتحہ پڑھی، تاسف کے ساتھ تأثرات تحریر کیے۔

''ہم مولانا رومی کے مزار مبارک کی طرف چلے۔ عمارت کے دروازے پر عجائب خانے کی تختی دیکھی، معلوم ہوا کہ اب یہ مزار و مسجد عجائب خانے میں منتقل ہوگئے ہیں۔ اس لیے کہ کمالیوں کے نزدیک اور کسی چیز میں کوئی معنویت نہیں۔ دروازے سے داخل ہوئے تو مثنوی اور مولانا روم کے متعلق ترکی، فارسی، عربی، انگریزی اور فرینچ میں جو لکھا گیا وہ آثار کے طور پر سجا ہوا تھا۔ افسوس کہ اس میں ہندوستان کی صرف ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔...... حالانکہ شاید ہی کسی اسلامی ملک میں مثنوی اور مولانا پر اتنا کام ہوا ہو جتنا ہندوستان میں ہوا ہے۔

دیر تک ان کی قبر کے پاس بیٹھ کر زمانے کا انقلاب یاد کرتے رہے، کبھی ان کا کلام پڑھتے، کبھی گردوپیش کو دیکھتے تو ہر چیز اجنبی معلوم ہوتی، آثارِ قدیمہ نے ان کے گرد آثار، عجائب وتحائف کا ایک انبار جمع کر دیا ہے اس کو سجا کر دیکھنے والوں کو صلائے عام دی ہے مگر

ہمارے لیے سب سے زیادہ کشش کی چیز خاک کا یہ ڈھیر تھا جس کے اندر علم و حکمت اور عشق و محبت کا خزانہ دفن تھا۔ بار بار اس کو دیکھتے اور یہ شعر پڑھتے

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

(دو ہفتے ترکی میں۔ ص:۹۴)

قونیہ میں سلجوقی عہد کی یادگاروں میں علاء الدین سلجوقی کی مسجد کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علاء الدین سلجوقی کی جامع مسجد......اب بھی شہر کی جامع مسجد ہے۔ نہایت وسیع اور عظیم الشان عمارت ہے، محراب نہایت خوبصورت، پتھر نہایت عمدہ، نقش بہت عجیب اور دیدہ زیب ہیں۔ عثمانی عہد کی مساجد سے اس کا طرزِ تعمیر بالکل مختلف ہے۔ مسجد نہایت دلآویز ہے اور دیر تک رہنے کو جی چاہتا ہے۔

(دو ہفتے ترکی میں۔ ص:۹۷)

سفرنامے میں شہروں کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے اس کی تاریخ بھی سناتے ہیں:

''انگورہ اچھا خوبصورت شہر ہے پانچ لاکھ سے کم ہی آبادی ہے۔ آبادی وفراخی میں لکھنؤ سے ملتا جلتا ہے۔ نئی عمارتیں خوش قطع اور پُرشکوہ ہیں، سرکاری دفاتر ایک بڑی سلطنت کے شایانِ شان ہیں۔ پارلیمنٹ کی عمارت قدیم ہے اور بہت معمولی ہے نئی عمارت جس کی تکمیل میں ابھی کسر باقی ہے شاندار ہے اور جدید طرز کی، شہر کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ وہ رومیوں کے عہد میں بھی عظیم اور مرکزی شہر رہ چکا ہے۔ رومی عہد کے آثار، عمارتوں اور کلیساؤں کے درودیوار موجود ہیں''۔

قونیہ کے قابلِ دید مقامات میں جامع سلطان سلیم اور اس کا نہایت مرتب کتب خانہ بھی دیکھا۔ ''قونیہ'' شہر کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ شہر (قونیہ) نہایت دل آویز ہے۔ دینداری اور اسلامیت میں یہ پوری

ترکی میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اہلِ شہر نہایت خوش اخلاق، کریم النفس، صاحب حمیت اور دیندار ہیں۔ اس کو تصور کا اثر کہیے یا واقعہ کہ اس شہر میں ایک خاص سکینت اور دل آویزی محسوس ہوئی اور جتنا جی یہاں لگا کہیں نہ لگا۔ شہر کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ شہر نہایت خوش وضع، پُر رونق اور اس کے ساتھ پُر سکون ہے۔
(دو ہفتے ترکی میں۔ص:۹۸)

ترکی کے مشہور عالم شیخ حسن بصری سے ملاقات ہوئی۔ لکھتے ہیں:
اتاترک کے متعلق وہ معلومات حاصل ہوئیں جو دوسرے ذرائع سے مشکل سے معلوم ہوسکتی ہیں اور ہمارے بعض قیاسات کی تصدیق ہوئی''۔

ترکی کے مورّخ اسماعیل حامی دانشمند کے بارے میں رقم طراز ہیں:
''وہ عرب اور ترک اتحاد کے حامی ہیں۔ اصلاحی تحریکات، اتحادِ اسلامی کے بڑے موید اور ترکی میں دینی نشاۃ الثانیہ کے خواہش مند ہیں''۔ صوفی منش بزرگ یوسف ضیا قازان جمہوریہ کے سابق صدر مقصودی (سابق پروفیسر تاریخ قانون استنبول یونیورسٹی)، نورالدین طوبجو (استاد فلسفہ استنبول یونیورسٹی)، ڈاکٹر علی جواد باشکیل (پروفیسر تشکیلات اساسیہ حقوق۔ استنبول یونیورسٹی) سے ملاقاتیں ہوئیں۔

عظیم سرزمین ترکی میں سیاحت وزیارت کے دوران علی میاںؒ نے ملک کو دینی، اجتماعی، اخلاقی، علمی اور تاریخی حیثیت سے دیکھا۔ اہلِ حکومت اور مختلف طبقوں کے ممتاز اصحاب سے ملاقات کی۔ ثقہ اور مستند لوگوں سے معلومات حاصل کیں، ترک، عرب، شام اور عراق کے طلبا کو خطاب کیا۔ دلکش قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوئے۔ بے تکلف، سادہ اور پُراثر اسلوب میں مشاہدات اور تاثرات قلمبند کرنے کا اہتمام کیا۔

یہ سفرنامہ ۱۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ نے شائع کیا۔

☆ **دریائے کابل سے دریائے یرموک تک (من نهر کابل الی نهر الیرموک)** یہ سفرنامہ مغربی ایشیاء کے چھ مسلم ممالک یعنی افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق، شرق اردن کے معلوماتی دعوتی سفر کی روداد ہے۔

کتاب ''دار الھلال'' انگورہ کی طرف سے جون ۱۹۷۴ء میں بیروت سے طبع ہوئی۔ اس سفرنامے کا اردو ترجمہ نور عظیم ندوی اور محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی نے کیا ہے۔

۱۹۷۳ء میں رابطة العالم الاسلامي نے عالم اسلام کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا۔ اسی پروگرام کے تحت اطرافِ عالم میں اپنے وفود بھیجے۔ ہندوستان سے علی میاںؒ رابطة العالم الاسلامي کے بنیادی حیاتی رکن منتخب کیے گئے تھے۔ ان کی قیادت میں ایک سہ رکنی وفد ایشیاء کے چھ مسلم و عرب ممالک گیا۔ سفرنامے کے مطابق افغانستان ایران کے دورہ میں شیخ احمد جمال (پروفیسر جامعہ ملک عبدالعزیز) اور ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (استاذ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ) شامل تھے۔ جب کہ آخر کے چار ملکوں کے دورہ میں شیخ احمد جمال کے علاوہ محمد رابع حسنی ندوی وفد میں شامل رہے۔ یہ سفر ۴؍جون ۱۹۷۳ء سے شروع ہوا اور ۲۰؍اگست ۱۹۷۳ء کو ختم ہوا۔

علی میاںؒ کی قیادت میں وفد نے چھ دن افغانستان میں (۴؍جون سے ۹؍جون تک) دس دن ایران میں (۱۱؍جون سے ۲۰؍جون ۱۹۷۳ء تک) پانچ دن لبنان میں (۲۹؍جولائی ۱۹۷۳ء سے ۲؍اگست ۱۹۷۳ء تک) دو دن دمشق میں (۴؍اگست اور ۵؍اگست) پانچ دن بغداد میں (۸؍اگست سے ۱۲؍اگست) اور آٹھ دن اردن میں (۱۳؍اگست سے ۲۰؍اگست تک) قیام کیا۔ افغانستان اور ایران کے دورے سے واپسی پر پانچ ہفتے بیت اللہ اور مسجد نبوی میں گزارے۔

رابطة العالم الاسلامي نے عالم اسلام کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ چنانچہ وفد کے نمائندوں نے دینی اصلاحی تحریکات کے قائدین، مصلحین و مفکرین، حکمران و سلاطین، طلباء و اساتذہ علماء و شیوخ سے ملاقات کی۔ علمی تعلیمی اداروں کا معائنہ کیا۔ مسلمانوں کے مسائل سے واقفیت حاصل کی۔ شہروں کی موجودہ تہذیب و تمدن کا جائزہ

لیا۔ علمی تعلیمی اداروں اور مجلسوں میں تقریر وخطاب اور گفتگو کے ذریعہ تبادلۂ خیال کیا۔ علی میاںؒ نے وفد کے قائد کی حیثیت سے حاصل شدہ معلومات اور تاثرات کو قلمبند کیا تاکہ رابطہ کے ارکان اس سے واقف ہوسکیں۔ بعد میں نظر ثانی اور تاریخی واقعات اور تازہ حالات کے اضافے کے ساتھ اسے سفرنامے کی شکل میں شائع کیا گیا۔

وفود کو یوں بھی حالات کے پورے مشاہدے کا موقع نہیں ملتا۔ چند دن قیام میں ہر جگہ پہنچنا محال ہوتا ہے اور ہر نقطۂ خیال کے نمائندوں سے ملاقات ناممکن ہوتی ہے، نہ تعلیمی و ثقافتی مراکز پر پوری نظر ہوسکتی ہے اور جب سفر کے مراحل مقامی حکومتوں کی رہنمائی میں طے ہوں تو اور بھی مشکل ہوتی ہے۔ پھر جہاں بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کا راج ہو وہاں تو ان کی نظر سے بچ کر کچھ دیکھنا اور سمجھنا بے حد دشوار ہے۔ اس سفرنامے میں علی میاںؒ کی بصیرت نے ان دبیز پردوں سے گزر کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سفرنامے میں ملکوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا، اور ان ممالک کی دینی، علمی، فکری، سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے۔ متعلقہ ممالک کے علمی، ادبی، مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ اور مدوجزر کے ساتھ اپنے مشاہدات و تاثرات اور افکار وخیالات پیش کیے، جن سے ان کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے۔ سفرنامے سے مذکورہ ممالک کے مسلمانوں کی دینی، علمی، تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

سفرنامے کی ابتداء افغانستان کے ذکر سے ہوتی ہے۔ دورہ افغانستان کی روداد میں افغانی خواتین میں جدید تہذیب اور مستشرقین کے افکار کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں "بے پردگی اور معاشرتی قدروں سے بغاوت کو قومی زوال کا پیش خیمہ" قرار دیا اور اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔

علمائے کابل سے گفتگو میں علماء کو ان کی ذمہ داریوں کی یاد دلائی اور

غفلت کے نتیجے میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:

''عوام کو دینی رہنمائی اسلامی تعلیم و تربیت اور دین کے مکمل شعور کے بغیر چھوڑ دینا خطرناک ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ کسی بھی مفسد و ملحد کے لیے تر نوالہ اور خوش گوار گھونٹ ثابت ہو سکتے ہیں اور بڑی آسانی کے ساتھ تباہ کن تحریکوں اور اسلام دشمن افکار و خیالات کا شکار ہو سکتے ہیں''۔

(دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۳۵

بعض اسلامی ملکوں کے دردناک انجام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ تعلیم گاہیں اور فوج دو ایسے میدان ہیں جن پر اسلام دشمن عناصر کو بہت جلد اثر انداز ہونے کو مواقع حاصل ہوتے ہیں، نوجوانوں میں دینی، دعوتی، اصلاحی کام پر زور دیا اور اس کے لیے ''جدید اسلوب'' اور ''جدید زبان'' اور نوجوانوں کی نفسیات کے گہرے مطالعے کے ساتھ اسلامی لٹریچر پیش کرنے کا مشورہ دیا۔

علی میاںؒ تاریخی شہر غزنی کی علمی، تمدنی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں اس کے بعد غزنی کی بربادی کی داستان سناتے ہیں اور عروج و زوال کے آئینے میں غزنی کو عبرت کا مقام بتاتے ہیں۔

افغانستان میں علماء کے اثرات میں روز افزوں کمی محسوس کرتے ہیں۔ افغانستان کی علمی، تہذیبی تاریخ کے آئینے میں موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں اور تغیرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

''اب یہ دینی غیرت اور افغانی خودداری محسوس حد تک کم ہو گئی ہے، ان میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوئی، وہاں بے پردگی کا سیلاب آ گیا۔ مغربی تہذیب کی تقلید اور فرنگیت عام ہو گئی اور وہاں کی زندگی میں کوئی حرکت یا اضطراب نہیں پیدا ہوا۔ اس وقت افغانستان ہپیوں کا بڑا مرکز بنا ہوا ہے کیونکہ حشیش اور دیگر نشیلی

اشیاء وہاں بافراط ملتی ہیں۔ ہم نے خود اُن کو بڑی تعداد میں دیکھا وہ جہاز پر ہمارے ساتھ تھے۔ کابل میں اُترے اور اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ قوم کے اخلاق اور اختلاط مرد وزن پر پڑنے والے ان کے اثرات صاف ظاہر ہیں لیکن یہ تمام باتیں اب وہاں کوئی محسوس کی جانے والی ناپسندیدگی یا بے چینی نہیں پیدا کرتیں اور یہ دینی غیرت اور اسلامی نخوت کے زوال ہی کی دلیل ہے اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ قیادت علماء کے ہاتھوں سے نکل کر سیاست دانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے جو ہر معاملے کو اقتصادیات اور سیاست کی نظر سے دیکھتے ہیں اور صورتِ حال کے سامنے سر جھکا دینا ہی حقیقت شناسی کا تقاضا سمجھتے ہیں''۔

(دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ ص:۴۱۔۴۲)

علی میاںؒ نے کابل یونیورسٹی کے ہال اور افغانستان کے سعودی سفارت خانے کے استقبالیہ جلسے میں تقاریر کیں۔ افغانستان کے عروج وزوال کی تاریخ اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے انھوں نے تین عناصر کی نشاندہی کی جو افراد ہی نہیں بلکہ قوموں کی تشکیل میں زبردست رول ادا کرتے ہیں۔ ۱۔ پیغامِ زندگی۔ ۲۔ خوداعتمادی۔ ۳۔ کارگزاری۔

سفر ایران کے دوران وفد نے تہران، قم، اصفہان، شیراز اور مشہد جیسے تاریخی شہروں کا دورہ کیا۔ ان کے متعدد علماء فضلاء دینی رہنماؤں سے ملاقات کی۔ سفرنامے میں ایران کی تاریخی آثار ومقامات کا ذکر کرتے ہیں۔ امام غزالیؒ، خلیفہ ہارون رشید، سعدی شیرازی جیسے باکمالوں کے قبور کی زیارت کے ذکر کے ساتھ ان کی خوبیوں اور کمالات کا ذکر کرتے ہیں جس سے سفرنامے کی دلچسپی اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایران کا یہ سفرنامہ اس وقت کے ایران کا جائزہ ہے جب اسلامی انقلاب

کا نعرہ بلند نہیں ہوا تھا۔ علی میاںؒ کو سفر کے دوران جن چیزوں نے متاثر کیا اور انہیں جو باتیں ناگوار محسوس ہوئیں، انھیں سفرنامے میں بڑی صداقت، بیباکی اور خلوص سے سپردِ قلم کیا ہے۔ ایران میں انہیں "نیا میدان اور امید کی نئی کرن" دکھائی دیتی ہے اور ایرانیوں کے چند صفات کو پُرزور طریقے سے بیان کرتے ہیں، جن میں جذبۂ اخوت، عالم گیر اسلامی اتحاد وتعاون کا جذبہ، عالم گیر لادینیت کے خلاف متحد ہو کر صف آرائی کی خواہش، اسلامی آثار سے دلچسپی، عربی زبان سے تعلق، قرآن کی بہترین طباعت وکتابت سے دلچسپی، دینی غیرت وحمیت، حسنِ اخلاق، شیریں زبانی، مہمان نوازی، تواضع وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

علی میاںؒ کو اس وقت، ایران میں جو باتیں عقائد واعمال کے اعتبار سے اور جذبۂ عمل کے اعتبار سے ناپسند آئیں انھیں بے کم وکاست بیان کیا ہے۔ مثلاً مسجدوں کے بجائے مقبروں کی اہمیت اور رجوع، مساجد اور گھروں میں ائمہ واہل بیت اور آنحضرتؐ کی تصاویر، ذاتِ محمدیؐ کے مقابلے میں ائمہ اہل بیت سے غیر معمولی تعلق، صحابہ کی بے حرمتی، تلاوتِ قرآن پاک سے بے اعتنائی "ایران کا جمود وانحطاط" وغیرہ۔ مصنف کی بصیرت نے دبیز پردوں سے گزر کر ایران کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔

مشرق ومغرب کے سنگم "لبنان" میں علی میاںؒ کو عیسائیت کی گہری چھاپ نظر آئی۔ لبنان کو اس کی تاریخ کے آئینے میں دیکھتے اور بتاتے ہیں کہ امریکہ نے اس ملک کے فکر وادب پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اس کے وجوہ واسباب بیان کرتے ہیں۔ لبنان کے علمی، ادبی، ثقافتی، تعلیمی اداروں کے معائنہ کے دوران اور وہاں کے علماء وفضلاء سے ملاقات اور گفتگو میں لبنان کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ لبنان کے مسلم عوام مخصوص اور نازک صورتِ حال سے گزر رہے ہیں۔ صیدا اور طرابلس کے دورہ میں وہ مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے علماء وفضلاء کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ فرائض

کی یاد دہانی کرتے ہیں۔ اصلاح وتجدید کی تاریخ کے حوالے سے علماء وفضلاء کو اپنے اہم فریضے سے عہدہ برآ ہونے کی تاکید کرتے ہیں، صبر، ہمت، جرأت، بلند حوصلگی کی تلقین کرتے ہیں۔ اور لبنانی مسلمانوں کو مغربی تہذیب اور عصر حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ علماء کو ثبات واستقلال کا سبق دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف نے سفرنامۂ لبنان میں لبنانی مسلمانوں کے نازک موقف، ان کے مسائل، ان کی ذمّہ داریوں اور اسلام کے ان سے مطالبات پر بڑی احتیاط سے روشنی ڈالی ہے۔

رابطہ العالم الاسلامی کا وفد دو دن دمشق میں رہا۔ سفرنامے میں دمشق کے انقلابات اور اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔ دمشق کے ماضی کو دہراتے ہیں اور حال سے اس کا موازنہ کرتے ہیں۔ ماضی وحال میں زبردست فرق محسوس کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب اور مادّی فلسفوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ''چند نئی تبدیلیوں'' کے عنوان سے اہم تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہیں، مثلاً بے پردگی، جنسی اختلاط، فحش تصاویر واشتہارات، اقتصادی پسماندگی، بدحالی اور گفتگو میں رازداری و احتیاط''۔ علی میاںؒ ایک عالم دین، مصلح ومفکر کی حیثیت سے صبر، استحکام واستقلال کے ساتھ مغربی تہذیب اور مادّی فلسفوں سے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' کے نام اور اس کے ذیلی عنوانات سے مصنف کے ذوقِ لطیف اور تاریخی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ سفرنامے کے نام کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس سفر کا آغاز افغانستان کی دارالحکومت کابل سے اور اس کا اختتام اردن کی دارالحکومت عمان پر ہوا۔ اسی مناسبت سے مصنف نے کتاب کا نام ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' رکھا۔ سفرنامے میں جن چھ مسلم ممالک کی روداد بیان کی ہے، ان کے ایسے عنوانات مقرر کیے ہیں جن کو پڑھ کر قاری کا ذہن فوراً اس

ملک کی تاریخ یا جائے وقوع یا کسی اہم واقعہ کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔

(۱) مجاہدین اور فاتحین کی سرزمین — افغانستان میں

(۲) ذوق جمال اور رعنائی خیال کی سرزمین — ایران میں

(۳) ہارون رشید کا پایۂ تخت — بغداد میں

(۴) شہیدوں اور پاسبانوں کی سرزمین — اردن میں

اسلام کی سیاسی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ میں بغداد کا مقام بہت بلند ہے۔ بغداد نے زمانہ قدیم میں دنیا کے بیشتر حصّہ پر حکمرانی کی اور علوم وفنون کے امام پیدا کیے۔ مصنّف نے بغداد کے دورہ میں سرکاری حکّام سے ملاقات کی، دیوان الاوقاف کے جلسے میں علماء مساجد کے ائمہ واعظین ومشائخ سے ملاقات ہوئی۔ علی میاںؒ نے محسوس کیا کہ:

> ''وقت کے بیشتر حصّہ میں خاموشی چھائی رہی اور اگر کسی نے کچھ کہا بھی تو بس بقدر ضرورت مگر اُن کی خاموشی گفتگو سے زیادہ بلیغ اور صورتِ حال کی عکاس تھی ان کے روشن چہروں کی لکیریں، اُن کی ذہین آنکھوں کی چمک جیسے کہہ رہی ہو اگر یہ پہرے دار موجود نہ ہوتے جو ہماری سانسوں کو گنتے اور ہمارے الفاظ کو ریکارڈ کرتے ہیں تو آپ کے ساتھ ہمارا رویہ کچھ اور ہوتا''۔

(دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ ص:۱۹۲)

اردن کے سفر کے دوران علی میاںؒ کو محسوس ہوا کہ مملکت کو بہت سے چیلنج مسائل اور تضادات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور بڑا نازک اور پیچیدہ دور ہے۔ اردن کے شاہ حسین سے ملاقات کے دوران علی میاںؒ نے ان کو ان کی ذمہ داری یاد دلائی۔

> ''میں نے شاہ حسین کو وہ ذمہ داری یاد دلائی جو فلسطینی پناہ گزینوں، ان کے اور ان کی آئندہ نسلوں کے عقائد کے بارے میں شاہ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں

ہے کہ فلسطینیوں کو عیسائی مبلّغین اور رفیوجی ریلیف کمیٹیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے جو ان کی زبوں حالی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کررہی ہیں‘‘۔

(دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۲۲۴)

اردن کے اسلامی اداروں کا معائنہ کیا، فلسطینی پناہ گزینوں کو دیکھا۔ اردن میں مرکز اسلامی کے استقبالیہ جلسے میں علی میاںؒ نے ایک فکرانگیز تقریر کی۔

’’آپ اسلام کے نازک ترین محاذ اور مسلمانوں کے آخری قلعہ میں رہتے ہیں۔ سیلاب شہر کی فصیلوں تک پہونچ چکا ہے اگر سیلاب فصیلوں کو پار کر گیا تو کوئی بندھ اس کو روک نہیں سکے گا۔ آپ آخری دفاعی لائن پر تعینات ہیں اگر یہ لائن دشمنوں نے پار کرلی تو سارا عالم اسلامی اس کے پیروں تلے ہوگا۔ سارے مسلمانوں کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ ہی ان کی سربلندی وسرخروئی کا سرچشمہ اور ان کی طاقت و عزّت کا بیرومیٹر ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ اپنے اور اپنے ملک کی عزّت وسربلندی کے بارے میں خدا سے ڈریئے، میں تو آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ خدا سے ڈریئے، مسلمانوں کی عزت وناموس اور اسلام کی سربلندی وسرخروئی کے بارے میں، جو آپ کو اوّلین مسلمانوں اور اسلام کے اوّلین علمبرداروں کا نمونہ سمجھتی ہیں۔ خدا سے ڈریئے ان معصوم روحوں کے بارے میں جنھوں نے ابھی عالِم اجسام میں قدم نہیں رکھا ہے جو اللہ کا شکر ادا کریں گی اور آپ کی ممنون ہوں گی۔ اگر آپ نے ان کی مقدس اور قابل احترام چیزوں کی حفاظت کی اور انھیں ایک تابناک ماضی عطا کیا جو

ان کے لیے باعث افتخار ہو جس پر وہ ناز کرسکیں ورنہ بارگاہِ خداوندی میں فریاد کریں گی کہ آپ نے ان کے مقامات مقدسہ کو کھودیا۔ ان کے ماضی کو داغدار کردیا اور ان کے لیے ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہ چھوڑا''۔

''میں اسلام اور مسلمانوں کے مسئلہ کو ایک سمجھتا ہوں، میں پورے عالم اسلام کو ایک ملک سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو پیش آنے والا ہر حادثہ، اور عالم اسلام کی ایک انچ زمین پر بھی دشمن کا قبضہ دردناک المیہ ہے، مجھے ہر جگہ مسئلہ فلسطین نظر آتا ہے اور جہاں بھی جاتا ہوں باچشم نم کھڑا ہوکر عربی شاعر متمم بن نویرہ کے اشعار پڑھنے لگتا ہوں۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا
رفیقی لتذراف الدموع السوافک
و قال ابتکی کل قبر رأیته
لقبر ثوی بین اللوی والدکادک
فقلت له ان الشجا یبعث الشجا
فدعنی فهذا کله قبر مالک

قبروں کے پاس سیلِ اشک بہانے پر میرے رفیق سفر نے مجھے ملامت کی اور اس نے کہا کیا تم صرف اس قبر کی وجہ سے جو لوئی اور دکادک کے درمیان واقع ہے جس قبر کو بھی دیکھتے ہو آنسو بہانے لگتے ہو۔ تو میں نے کہا ایک غم دوسرے غم کو تازہ کردیتا ہے میرے لیے یہ تمام قبریں (میرے بھائی) مالک ہی کی ہیں''۔

(دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۲۳۷۔۲۳۸)

''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' سفرنامہ، ملکوں کا اجمالی جائزہ ہے۔ ملکوں کے محاسن بھی ہیں اور کمزور پہلو بھی۔ علی میاںؒ کے دل کے درد اور ضمیر کی

سرگوشیوں نے سفرنامے کو عبرت اور بصیرت کا مجموعہ بنا دیا ہے۔

اسبوعان فی المغرب الاقصیٰ ''دو ہفتے مغرب اقصیٰ مراکش میں''
علی میاںؒ کے مراکش کے علمی سفر کی روداد ہے۔ سفرنامے کا پہلا ایڈیشن ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء میں مؤسسة الرسالة بیروت سے شائع ہوا ہے۔ علی میاںؒ کے بھتیجے محمد الحسنیؒ مدیر 'البعث الاسلامی' نے سفرنامے کا اردو ترجمہ کیا۔

۱۹۷۳ء میں مراکش کے دارالسلطنت رباط میں ''جمعیة الجامعات الاسلامیہ'' کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی گئی (اب جس کا نام رابطة الجامعات الاسلامیه ہوگیا ہے) یہ تنظیم دنیا بھر کے اسلامی جامعات، یونیورسٹیوں اور اعلیٰ دانش گاہوں کا ایک وفاق ہے۔ علی میاںؒ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے اس کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں علی میاںؒ جب جامعہ اسلامیہ مدینة المنورۃ کی مجلس استشاری میں شرکت کے لیے مدینہ میں قیام پذیر تھے، اس تنظیم کا دعوت نامہ انھیں بھیجا گیا۔ رابطة العالم الاسلامی نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے انھیں اپنا نمائندہ منتخب کر دیا۔

چنانچہ اواخر اپریل آغاز مئی ۱۹۷۶ء میں اپنے رفیق سفر مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ مغرب اقصیٰ مراکش تشریف لے گئے، دو ہفتہ قیام رہا۔ ۱۲رمئی سے ۱۴رمئی تک رابطة الجامعات الاسلامیه کی مؤتمر میں شرکت کی، مراکش کے اس علمی سفر میں عالم اسلام کے مفکرین علماء ادباء، اساتذہ اور طلباء سے ملاقات اور تبادلہ خیال کیا۔ ۵رمئی ۱۹۷۶ء سے ۱۰رمئی ۱۹۷۶ء تک مغرب اقصیٰ کے تاریخی مقامات کی سیر بھی کی، تاریخی شہروں میں دارالبیضاء، مکناس، فاس، رباط، افران کا دورہ کیا۔

علی میاںؒ نے جن کی صحرانوردی اور تاریخی مطالعہ ان کی پہچان بن چکا ہے، ہندوستان واپس آ کر اپنے رفیق سفر مولانا محمد رابع ندوی کے تحریر کردہ اشارات کی مدد سے یہ سفرنامہ مرتب کیا، جس میں مغرب اقصیٰ کے تاریخی، سیاسی، جغرافیائی، علمی و تمدنی احوال تحریر کیے۔ داستان سفر کی زبان نہایت شگفتہ و پُرکیف ہے، جس میں ایمان کی جھلک اور عمل کا ولولہ شامل ہے۔ سفرنامہ میں ایک موقع پر بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

"سمندر کا نظارہ بڑا دلکش تھا ہماری نشست بالکل سمندر کے رُخ
پر اس کے چند گز کے فاصلے پر تھی سمندر کی موجیں ساحل سے
اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں، میں پرانی یادوں اور جذبات کے سمندر
میں غوطہ زن تھا، میری یہی مشکل ہے کہ میرا تاریخی شعور اور
مطالعہ کہیں میرا ساتھ نہیں چھوڑتا وہ اپنے گھنے سائے میرے دل
ودماغ پر ڈالتا رہتا ہے اور کبھی کبھی یہ سائے دلفریب مناظر سے
لطف اندوز ہونے سے باز رکھتے ہیں۔ اقبال نے اپنے اس شعر
میں جو کچھ کہا ہے میرا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

(دو ہفتے مغرب اقصیٰ (مراکش) میں۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ص:۸۳)

اس سفرنامے میں مغرب اقصیٰ کے مجاہدوں کی داستانِ جہاد، ملک کی تاریخ کے اہم موڑ، تغیر وتبدیلیاں، اہم واقعات، حکومت کے عروج اور زوال، تہذیب وتمدن کا ذکر ہے۔ علی میاںؒ کا تاریخی شعور، اقوام عالم کی تہذیب وتمدن کا مطالعہ اور جذبۂ اسلامی سفرنامے کی سطر سطر سے عیاں ہے۔ سفرنامے کی ابتداء میں لکھتے ہیں:

"مجھے مغرب اقصیٰ کی زیارت کا عرصہ سے شوق تھا، اسلامی تاریخ
وتہذیب، علوم اسلامیہ، ادب وشاعری، فن تعمیر سب میں وہ ایک
جداگانہ شخصیت کا مالک اور مستقل دبستانِ فکر ہے۔ یہاں اسلام کو
اپنی اثر انگیزی، کیمیاگری اور اپنی اندرونی صلاحیتوں اور باطنی
قوت کے اظہار کا پورا موقع ملا۔ اس نے بربر جیسی ناقابل تسخیر قوم
کو مسخر کر کے اسلام کی عالمگیر قومیت کا ایسا جزو بنادیا اور اس کو
اسلامی عربی تہذیب میں اس طرح تحلیل کر دیا کہ اس کے ایک فرد
طارق بن زیاد نے پہلی صدی کے آخر میں اسپین اندلس کو اسلامی

قلمرو میں شامل کیا کہ آٹھ سو برس تک مسلسل وہ اسلام کا حلقہ بگوش اور اسلامی تہذیب کے علوم وفنون کا مرکز رہا۔ طارق کے ساتھ بارہ ہزار شہسوار تھے جن میں عرب برائے نام تھے۔ باقی سب بربر تھے۔ شمالی مغربی افریقہ میں عظیم الشان حکومتیں قائم ہوئیں جن کا ڈنکا برقہ طرابلس سے لے کر بحر اطلس کے ساحل اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یورپ میں صدیوں تک بجتا رہا۔ ان حکومتوں میں فاطمیین، مرابطین وموحدین کی طاقتور حکومتیں ''جن کو شہنشاہی کہنا زیادہ صحیح ہوگا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں۔ص:۴۹۔۵۰)

مغرب اقصیٰ کی مختصر تاریخ اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے ذکر کے بعد اس کے علمی، ادبی دبستان کی سیر کرائی ہے اور مشہور قول ''ان المشرق أرض الانبياء والمغرب أرض الأوليا'' مشرق انبیاء کی سرزمین ہے اور مغرب اولیاء کی سرزمین ہے'' کا حوالہ دیتے ہوئے مغرب کے اولیاء اور روحانی پیشواؤں کا پُر کیف انداز میں ذکر کیا ہے۔ علی میاںؒ نے قیام مراکش کے دو ہفتوں میں جس شہر کو دیکھا مختصر علمی، ادبی، سیاسی وتہذیبی تاریخ کے ساتھ سفر نامے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ قابل ذکر مقامات کا تعارف مختصر مگر جامع ہے غیر ضروری تفصیل سے اجتناب کیا گیا ہے۔

علی میاںؒ ایک ایسے ہندوستانی عالم دین تھے جو ہندوستان کی تاریخ ماضی وحال، افراد، مقامات وتحریکات سے خوب واقف تھے بلکہ اس کا ایک حصہ تھے۔ سیر وسیاحت کے دوران کسی جگہ ہندوستان سے مماثلت ومشابہت کا نہایت عالمانہ انداز سے ذکر کرتے ہیں۔ تاریخی شہر فاس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مملکت کا دوسرا بڑا شہر اور مغرب کا اہم ترین روحانی علمی مرکز ہے اس کی حیثیت اس ملک میں اپنی مردم خیزی اور علمی مرکزیت کی حیثیت سے وہی ہے جو ہندوستان کے تحتی براعظم میں دہلی،

لکھنؤ، لاہور اور ملتان کی ہے''۔

(دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں۔ص:۶۲)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''افران مغرب کا گویا کشمیر ہے...... سارا راستہ خوبصورت مناظر سے معمور ہے''

(دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں۔ص:۶۸)

یہ سفر رابطۃ الجامعات الاسلامیۃ کے مؤتمر میں شرکت کے لیے کیا گیا تھا۔علی میاںؒ نے اس کی پہلی نشست میں رابطہ العالم الاسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے ایک مؤثر و بلیغ تقریر کی جو سفرنامے میں شامل ہے۔انھوں نے بتایا کہ نبوت محمدیؐ نے علوم کی دنیا میں انقلابی کردار ادا کیا ہے۔انسانی علوم کی منتشر اکائیوں کو نبوت و تعلیماتِ محمدیؐ نے ایک رشتۂ وحدت میں پرو دیا ہے اور علم سے اشتغال کرنے والے اور عملی زندگی سے کنارہ کش لوگوں کو اپنے خودساختہ حصار سے نکال کر عملی دنیا میں کھڑا کیا ہے اور ان کے کندھوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ڈالی ہے۔

مؤتمر کے مہمانوں کے اعزاز میں شاہ مراکش مولائی حسن ثانی کی طرف سے شاہی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔سفرنامے میں اس دعوت کے شاہانہ طرزِ معاشرت اور ضیافت کا ذکر کرتے ہیں:

''دعوت کا انتظام شاہانہ پیانہ پر ایک باغ میں تھا جو ہمارے شہر لکھنؤ کے سکندر باغ اور بنارسی باغ کے بہت مشابہ تھا، پھولوں کی کیاریاں اور چمن کی روشیں بہار دکھلا رہی تھیں اور ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کی سرزمین بہت زرخیز اور گلریز ہے، ایک عمارت کے صحن میں ہم لوگ بٹھائے گئے شاہی عملہ اپنی خاص وردی میں اس میں سرخ ٹوپیاں اور سفید ڈھیلا ڈھالا لباس شامل ہے اور یہ وردی پوش زیادہ تر

سوڈانی معلوم ہوتے ہیں ان کے افسر بھی نگرانی کے لیے موجود تھے......
کھانے پانچ قسم کے خالص مغربی وضع کے تھے جو بڑے تھالوں میں
لائے جاتے اور ہر پانچ سات آدمیوں کے درمیان جو الگ الگ بیٹھے
تھے رکھ دیے جاتے تھے کھانوں میں بھی صدر نشیں گوشت ہی تھا
تھوڑے کھانے کے بعد وہ تھال اُٹھالیا جاتا تھا اور دوسرا لایا جاتا تھا۔

(دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں۔ص:۹۸)

سفرنامے کے آخر میں نحن الآن في المغرب کے عنوان سے قیام رباط کے دوران لکھا گیا مضمون شامل ہے، جس میں مغرب اسلامی کے ماضی و حال کو پیش کیا گیا ہے۔ مصنف عالم اسلام پر مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات سے رنجیدہ و مغموم ہیں لیکن اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لیے پُرامید بھی ہیں۔ اُن کی دوراندیش حقیقت شناس نگاہ، حقائق سے پردے اُٹھاتی ہے۔ مغرب اقصیٰ کے سیاسی تہذیبی تاریخی صورتِ حال کے جائزے کے دوران بار باران کا قلم اسی مسئلہ کی طرف رُخ کرتا ہے۔

"یورپ کے دہانے پر ہونے کی وجہ سے اس کو مغربی تمدن، مغربی افکار کا مقابلہ دوسرے اسلامی ممالک سے زیادہ کرنا پڑا ہے اس کے لیے زیادہ جرأت وذہانت کی ضرورت ہے۔ یہ بے چینی اور انقلاب کا دور ہے متعدد بیرونی واندرونی طاقتیں اور تحریکیں سرگرم ہیں"۔

مغرب اسلامی کو عصر جدید میں جس فکری معرکہ آرائی کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لکھتے ہیں:

"......آج مغرب اسلامی کو جو معرکہ درپیش ہے وہ تاریخ کے جنگی معرکوں سے زیادہ سخت اور سنگین ہے۔ وہ عہد آخر کے غیر ملکی سامراج اور بیرونی تسلط سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک ہے۔ اس لیے کہ

گذشتہ معرکے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا میدانِ جنگ کی کھلی ہوئی لڑائیاں تھیں جن میں صرف اسلحہ کا استعمال ہوتا تھا اور شجاعت اور جوانمردی، جان و مال کی قربانی فیصلہ کن طاقت تھی اس کے مقابلے کے لیے پوری قوم ایک فردِ واحد کی طرح اُٹھ کھڑی ہوتی تھی اور اس کو کفر و اسلام اور ملکیوں اور سامراجیوں کی جنگ سمجھا جاتا تھا لیکن آج کی لڑائی ایک خاموش اور ٹھنڈی لڑائی ہے بہت عمیق اور پس پردہ، یہ اسلامی طرزِ فکر اور مغربی طرزِ فکر کی (اپنے وسیع تر مفہوم میں) لڑائی ہے"۔

(دو ہفتے مغرب اقصیٰ (مراکش) میں۔ ص:۱۱۱)

علی میاںؒ ایک صاحبِ دل صاحبِ نظر مؤرّخ تھے، اُنھوں نے سفرنامے میں ملک کی تابناک تاریخ بھی دہرائی ہے۔ سوسائٹی کے امراض کی نشاندہی کے ساتھ علاج تجویز کیا ہے۔ اور علماء و اساتذہ اور حکمرانوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے۔ علی میاںؒ کا مقصد سیر و سیاحت یا عیش و لذت پرستی نہیں تھا، عبدالسلام قدوائی ندوی صاحبِ دل سیاح (علی میاںؒ) کے سفرنامے کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"سیاح نے قدم قدم پر دل کے تاروں کو چھیڑنے کی کوشش کی ہے عہد بہار کے گل و گلزار دِکھانے کے ساتھ عہدِ خزاں کے خارزار کی جھلک بھی دکھائی ہے تاکہ ناظرین اپنے عہد کی زبوں حالی کو سمجھیں اور عہدِ رفتہ کے ہمّت آفریں واقعات سے زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنے کی کوشش کریں"۔

(دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں۔ ص:۸)

علی میاںؒ کے سفرنامے نہایت معلوماتی اور تاریخی حیثیت کے حامل ہیں، ان میں ایک طرف کسی ملک کے محل وقوع، وہاں کے مناظر اور دیگر اہم و قابل ذکر چیزوں کا ذکر ہے تو دوسری طرف وہ سفرنامے، ملکوں کی تہذیب و تمدن، طرزِ معاشرت، طرزِ فکر، رجحانات رسم و رواج پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ دینی، اصلاحی تحریکات، عوامل

واثرات اور ذہنی و روحانی کشمکش کا جائزہ لیتے ہیں خوبیوں کے ذکر کے ساتھ کمزوریوں کو بلاتکلّف بیان کرتے ہیں۔ خطرات اور اندیشوں کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے مفید مشورے بھی دیتے ہیں جو ان کے مطالعہ کا حاصل اور ان کے سفر کے مقاصد کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

ان کے سفرنامے ان کے تجربات تاثرات مشاہدات جذبات وکیفیات کی مکمل ترجمانی کے ساتھ ملک کی فکری تحریکات، سیاسی انقلابات، متنوع اداروں، جماعتوں، فلسفوں اور شخصیتوں کے تعارف اور آشنائی میں مددگار ہوتے ہیں۔

سفرناموں میں عالمِ اسلام سے ان کی محبّت مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں فکرواضطراب نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے دینی احساسات، دعوت وتبلیغ سے شغف اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے اُن کی تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جب کسی ایسے مقام کی سیر کررہے ہوں جس کی اسلامی تاریخ انتہائی شاندار رہی ہو اور علماء وشیوخ کا تعلق ہو تو ان کے سفرنامے کا حرف حرف جذبہ وعقیدت سے پُر، لطیف احساسات اور تاریخی سرگوشیوں سے مملو ہوجاتا ہے۔ واقعات اور مشاہدات پر بے لاگ تبصرے میں ان کے دل کی دھڑکن اور ضمیر کی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ علی میاںؒ کا دینی، دعوتی، اصلاحی مشن اور ان کا اصلاحی فکرورجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ خطرات کی نشاندہی، اندیشوں کا اظہار، مشورے اور تجاویز ہر ضمن میں ان کا جذبۂ خدمت اسلام انتہائی متحرک دکھائی دیتا ہے۔

سفرناموں میں اسلام کے عروج وزوال کی داستان قاری کو دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ ایک مؤرّخ، اسلامی ادیب، عالم دین کی حیثیت سے ملکوں کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں، جب کسی ملک کی زبوں حالی پر دل گرفتہ ہوتے ہیں تو قاری بھی اپنے دل پر غم کا بوجھ محسوس کرتا ہے۔ عہدِ رفتہ کے ہمّت آفریں واقعات سنا کر حوصلہ بلند کرتے ہیں اور پُرجوش ولولہ انگیز نصیحتیں گوش گزار کرتے ہیں تو صاحب حوصلہ کا عزم بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ ہمّت، جوش، صبرواستقلال، محنت وقربانی سے

زندگی کی شب تاریک کو صبح روشن میں بدل دیا جائے۔

سفرناموں کی زبان طرز واسلوب میں مصنّف کی عالمانہ بصیرت، مؤرّخانہ دیدہ وری اور مفکرانہ انداز نمایاں ہے۔ عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مدلل تجزیاتی و تقابلی انداز پایا جاتا ہے۔ بے ضرورت تفصیل سے اجتناب ہے افکاروخیالات کے پیش کرنے کے سلسلہ میں سفرنامے میں تقاریر بھی شامل ہیں۔ ان کی دور بینی ذہانت، اخلاص اور عالمانہ شان، جذبۂ خدمت اسلام سفرناموں کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔

علی میاںؒ عربی زبان پر کامل عبور رکھتے تھے اور تاریخ اسلام پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ تاریخی واقعات تجربات کی روشنی میں نتیجہ خیزی کا تجربہ رکھتے تھے۔ خدمت اسلام اور احیاء اسلام ان کی زندگی کے اوّلین مقاصد تھے، اِسی لیے ان کے سفرنامے بھی ان کے مقاصد کی کامیاب نمائندگی کرتے ہیں۔

سفرنامے کی زبان میں عالمانہ شان پائی جاتی ہے۔ قرآن پاک کی آیات موقع ومحل کی مناسبت سے احادیث یا کوئی تاریخی واقعہ بھی تحریر کرتے ہیں۔ عبارت میں عربی، فارسی و اردو کے برمحل وموزوں اشعار فٹ کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی، احادیث، تاریخی واقعات اور اشعار ایسے برجستہ و برمحل ہوتے ہیں کہ پورے مضمون تقریر یا گفتگو کی ترجمانی کردیتے ہیں۔ علی میاںؒ ایک وسیع النظر عالمِ دین تھے اُن کا مطالعہ بہت عمیق تھا۔ ان کی تحریروں میں عالمانہ سنجیدگی، ادبی شگفتگی اور کلاسیکل بانکپن جمع ہوگیا تھا۔ سفرناموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بیک وقت داعیانہ جذبہ، خلوص، جوش کے ساتھ بے تکلف اور پُرزور اسلوب لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ سفرناموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مسافر کی فکرونظر، وسیع اور کشادہ ہے۔ ملک و ملّت ہی نہیں عالمِ انسانیت کی اصلاح وتعمیر کا جذبہ موجزن ہے، اس لیے ان کے یہ سفرنامے بیک وقت علمی، ادبی، روحانی، اخلاقی تربیت کا اہم کام بھی انجام دیتے ہیں۔

☆☆☆

اولوالعزم مکتوب نگار کے مکاتیب کا علمی رنگ

مکتوب نگاری ایک ایسا فن ہے جس سے تہذیب انسانی کے ہمہ گیر تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے لیکن اس کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جن کی تکمیل سے یہ فن، ادب کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ جاتا ہے۔ خط کی ادبی اہمیت کسی تخلیقی کارنامے سے کم نہیں کیونکہ خط سے زیادہ سچّا اور خالص ادب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اس میں آزادی کے ساتھ تنقید بھی کی جاسکتی ہے جو کسی اور تصنیف سے ممکن نہیں۔ اس میں مکتوب نگار کی آواز سنائی دیتی ہے، اس کی شخصیت، خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے۔

خط سے علمی و معلوماتی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات خط، تاریخ نگاری، سوانح نگاری کے لیے مواد فراہم کرتا ہے۔ یہ خط جب کسی عالمی مسئلہ کے حل کے لیے لکھا جائے یا کسی خاص مقصد کے پیش نظر تحریر کیا جائے تو اس کی وسعت اور آفاقیت بڑھ جاتی ہے گویا مکتوب نگاری کا فن جتنا محدود و مختصر ہے اتنا ہی وسیع و بیکراں بھی۔ حد سے زیادہ شخصی ہونے کے ساتھ یہ آفاقی اور اجتماعی تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ اسی لیے اسے ادب کے زمرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ خط و کتابت کی اقسام بہت ہیں نجی، عوامی کے علاوہ اس کے ذریعہ دعوتی و اصلاحی، علمی نیز سیاسی، سماجی، دفتری، تجارتی ہر طرح کے کام لیے جاتے ہیں۔ نجی خطوط میں انسان جیسا خلوت میں ہوتا ہے ویسا ہی مکتوب کے آئینہ میں نظر آتا ہے۔

دعوتی، اصلاحی مکتوبات سے انسانیت کو بڑا فائدہ ہوا ہے اس کی مثالیں ہمہ گیر ہیں۔ دربار نبوّت سے لے کر خلفاء، صحابہ، تابعین، حکماء، علماء، امراء، سلاطین، واعظین، قائدین سب نے خطوط کے ذریعہ دعوت و اصلاح، تبلیغ و ارشاد

کا خوب کام کیا ہے۔

''اسلام سے قبل تحریر کی صلاحیت رکھنے والے لوگ تقریباً نہیں تھے۔ تحریری سلسلہ اسلام کے آنے پر شروع ہوا مکتوبات کا پہلا باقاعدہ مجموعہ حضرت علیؓ کے خطوط کا ہے جن کی رہنمائی میں مکتوب نگاری کا سلسلہ شروع ہوا اور مکتوبات کے ذریعہ وہ مہتم بالشان خدمات انجام دی گئیں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ خلافت اموی کے اختتام تک اس فن نے ترقی کر کے پیشے کی حیثیت اختیار کر لی۔ دوسری صدی میں امام مالکؒ کا خط ہارون رشیدؒ کے نام اور امام لیثؒ کا خط امام مالکؒ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تیسری چوتھی صدی ہجری میں ویلمیوں، ساسانیوں، سلجوقیوں کے دورِ حکومت میں انشاء پردازوں نے اپنے عربی وفارسی کے خطوط ومراسلت کو جمع بھی کیا اور ادب کے خزانے میں اضافہ کیا۔ علماء وصوفیا میں امام غزالیؒ کی مکتوبات نے جو دیرپا اثر قائم کیا وہ کسی صاحب معرفت اور ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔'' مکتوبات کے سلسلہ میں ہندوستان کا نمبر کسی سے پیچھے نہیں۔ دنیا میں تصوّف کے دھارے جب تک بہتے رہیں گے شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ اور مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات روحانی پیاسوں کی پیاس بجھاتے رہیں گے۔''

(خطوط ومراسلت کا ادب: کاروانِ ادب ۱۹۲۲ء)

ہر زمانے کے حسّاس طبیعت رکھنے والے صاحب دل حضرات نے مکتوبات کے خزانے میں اضافے کیے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ علی میاںؒ

نے سلاطینِ عرب، اکابر علماء، شیوخ، ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں اور عرب اور اسلامی دنیا کے عالموں، شاعروں اور مفکرین کو وقتاً فوقتاً خطوط لکھے ہیں۔ عزیز اقارب اور شاگردوں کے نام لکھے گئے خطوط بھی ایک قیمتی خزانہ ہیں۔ سلاطین عرب کے نام لکھے گئے چند خطوط اور تقاریر میں کیف ینظر المسلمون الی الحجاز اور بین الجبابه والهدیة (شاہ سعود کے نام لکھا گیا خط) جو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، اس کے علاوہ کاروان زندگی میں شامل ہندوستان سیاسی رہنماؤں کو اردو میں لکھے گئے خطوط ہیں۔ ان خطوط میں علی میاںؒ نے ملکی اور ملّی مسائل پر نہایت مؤثر اسلوب میں اظہارِ خیال کیا ہے، خطوط میں تجربات پر مبنی قیمتی مشورے اور تجاویز ہیں۔ مکاتیب یورپ کے نام سے ایک مجموعہ خطوط ہے۔ یہ مکاتیب پُر از معلومات ہیں، ان میں ایک جہاں دیدہ عالمِ دین کے قلم سے یورپ کے حالات پر تنقید اور تبصرہ بھی ہے۔

علی میاںؒ کے بھانجے مولانا محمد ثانی حسنیؒ کے صاحبزادے مولانا محمد حمزہ حسنی (مدیر رسالہ "رضوان" لکھنؤ) نے علی میاںؒ کے مکتوبات کے جمع و ترتیب کا کام ان کی حیات مبارکہ میں شروع کر دیا تھا اور مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی پہلی جلد سن ۲۰۰۱ء میں اور دوسری جلد سن ۲۰۰۲ء میں سید احمد شہید اکیڈمی دارِ عرفات رائے بریلی سے شائع ہوئیں۔ پہلی جلد 320 صفحات اور دوسری جلد 502 صفحات پر مشتمل ہے۔ مکتوبات کا تیسرا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ یہ علمی مکتوبات مشائخ، بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام ہیں۔

مفسر قرآن عبدالکریم پاریکھ صاحب کے نام لکھے گئے علی میاںؒ کے مکاتیب "علی میاں صاحبؒ کے خطوط" کے نام سے ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئے۔ اِس مجموعہ مکاتیب میں ۲۲۰ خطوط ہیں، جو ذاتی اور نجی خطوط کے زمرے میں آتے ہیں۔ اِن خطوط میں عصرِ حاضر کے مسائل اور مشکلات تحریک پیامِ انسانیت اور اِس سلسلہ میں عبدالکریم پاریکھ صاحب کی خدمات

کا ذکر ہے۔ کام کے سلسلے میں مشورے اور تجاویز ہیں، تحسین آمیز دعائیہ کلمات سے بھی نوازا گیا ہے۔

مکتوبات کا مختصر مجموعہ ''حجاز مقدس اُمیدوں اور اندیشوں کے درمیان''

کیف ینظر المسلمون الی الحجاز والجزیرۃ العرب المجمع الاسلامی العلمی ندوۃ العلماء لکھنؤ، طبعة الثانیة ۱۹۹۱ء ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ خطوط کے اس مجموعے میں آٹھ مکتوب اور پانچ تقریریں اور مقالات شامل ہیں۔ ان تقاریر اور خطوط کا موضوع ذی اقتدار طبقے کو ان کی ذمہ داریوں کی نشاندہی اور یاددہانی کرنا تھا۔ موضوع اور مقصد کی یکسانیت کی وجہ سے عرب مما لک میں کی گئی چند تقاریر کو بھی کتاب کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔

علی میاںؒ نے شیخ مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کو اس مجموعہ خطوط و تقاریر کی مقبولیت کے بارے میں تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، یہ خط علی میاںؒ کے مرکزِ اسلام میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کی فکر، دردمندی، بے چینی اور دوراندیشی کا مظہر ہے۔

''کیف ینظر المسلمون الی الحجاز و الجزیرۃ العرب'' الحمدللہ بہت مفید ثابت ہورہا ہے، بادشاہ کے ایک چچا جو اِس پورے خاندان میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور فیصل کے زمانے میں وزیر مال رہ چکے ہیں، کو کہیں سے یہ رسالہ مل گیا، پڑھ کر بہت خوش ہوئے کسی سلسلہ میں بمبئی تک آئے تھے، وہاں سے لکھنؤ آنے کی کوشش کی، جہاز کا نظام ٹھیک نہیں بیٹھا، وہاں سے ایک خط خصوصی طور پر بھیجا کہ جب ریاض آنا ہو، مجھ سے ضرور ملو، میں نے تمہاری وہ کتاب پڑھی، بہت خوش ہوا۔ نوجوانوں کی عالمی تنظیم جو وزارتِ تعلیم کے ماتحت ہے اس کی طرف سے ہزار نسخوں کی فرمائش آئی تھی میں نے لکھ دیا کہ یہ کتاب عام اشاعت کے لیے نہیں ہے، خصوصی لوگوں کو دینے کے لیے سو دو سو نسخے مہیا کیے جاسکتے ہیں۔ وہ آپ کو کسی ذریعہ سے پہونچ جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ شیخ عبدالعزیز بن باز (رئیس دارالافتاء) بھی

اس کی اشاعت چاہتے ہیں ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پانی سر سے اونچا ہورہا ہے۔ دارالافتاء کے پرچہ ''الدعوۃ'' میں اب ٹیلی ویژن، جنسی فلموں، عریاں تصویروں اور بے پردگی کی کھلی تبلیغ پر تنقیدی مضامین آنے لگے ہیں یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ ایسے موقع پر اِس کتاب سے بہت کام لیا جاسکتا ہے کہ اس میں لوگوں کو اپنے جذبات کی ترجمانی نظر آئے گی اور بات آگے بڑھے گی ورنہ میرے نزدیک یہ منصوبہ طے شدہ ہے کہ حرمین شریفین حجاز اور جزیرۃ العرب کو اب اس حدتک متمدن، ترقی یافتہ اور مغربی بنادیا جائے کہ کسی کو پھر ان باتوں کا احساس باقی نہ رہے۔ اور ''نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری'' کا معاملہ ہو۔ یہ سب اوپر کے اشاروں سے ہورہا ہے اور ہم لوگ مطمئن ہیں کہ اس ملک کی طرف سے ہر ملک میں اشاعت اسلام اور اسلامی اداروں کی مدد ہورہی ہے اور فیاضی کے ساتھ امداد دی جاتی ہے گویا سیاست یہ ہے کہ دنیا میں اسلام پھیلے اور اسلامی کوششوں کی مدد کی جائے اور مرکزِ اسلام میں اسلام کی بیخ کنی ہو۔ یہ منصوبہ بڑی ذہانت اور دور بینی کے ساتھ بنایا گیا ہے اور شاید توفیق الٰہی سے چند ہی آدمیوں کو اس خطرہ کا احساس ہے''۔

(مکتوبات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (اوّل) مرتبہ: مولانا محمد حمزہ حسنی۔ ص: ۴۵۶۔۴۵۷)

سلاطین، وزراء اور اہالیانِ سلطنت کو خطوط لکھنے کے اسباب اور ان کے پس پشت کارفرما جذبات وعوامل کے متعلق علی میاںؒ نے کتاب کے مقدمہ میں وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''حجاز وحی کی اوّلین منزل، اسلام کا سرچشمہ، دعوتِ اسلامی کا منبع، اسلام کا دائمی مرکز اور کھرے کھوٹے کو معلوم کرنے کی کسوٹی ہے جس سے اسلامی زندگی، اسلام کی عالمگیر تعلیمات کی صداقت، ہر زمانے میں اُن کے ابدی اور قابلِ عمل ہونے کی صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے اسلامی معاشرہ کے

جلال و جمال کی نمود ہے اس لیے اسلامی دعوت کو (اس کے عالمگیر و آفاق گیر ہونے کے باوجود) ایک مرکز کی ضرورت ہے جو اس کے قابلِ عمل اور زمین پر نافذ ہونے کے لیے ایک میزان و معیار کا کام دے اور اِن تمام شہروں اور آبادیوں اور معاشروں کے لیے اُسوہ اور مثال بن سکے جو اس پیغام پر ایمان لائے ہیں اور اِس عقیدے اور دعوت کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں .... اللہ تعالیٰ نے عرب اور اسلام پھر حجاز اور امت اسلامیہ، پھر حرمین شریفین اور مسلمانوں کے قلب و نظر کے درمیان ایک ابدی ربط پیدا کر دیا اور ان کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا .... اِن مقامات مقدسہ کی اس اہمیت اور ان کے عالمی ہدایت کا سرچشمہ اور اسلام کی قوّت و عظمت کا معیار ہونے کے سبب ہر جگہ اور ہر زمانے کے علماء اور مفکرین و قائدین یہاں پیش آنے والے حوادث و حالات اور رجحانات کے سلسلہ میں بہت حسّاس رہے ہیں .... مرکزِ اسلام سے دور دراز مقامات پر رہنے والے مسلمانوں نے بھی اپنے مخصوص حالات میں گھرے ہونے کے باوجود، اس مرکز کی مخالف اسلام طاقتوں کے غلبہ سے حفاظت و صیانت کو اپنا مقدس ترین فرض اور سب سے بڑی ذمّہ داری قرار دیا ہے اور اسے ہر وطنی مسئلہ اور قومی و ملکی مصلحت پر ترجیح دی ہے .... مسلمانوں اور جزیرۃ العرب کے درمیان اس ایمانی اور جذباتی تعلق سے قطع نظر، جزیرۃ العرب ہی حرمین شریفین اور حجاز کی محافظ و مضبوط فصیل ہے۔ اسے اس وجہ سے بھی، اجنبی مداخلت اور ان خارجی و داخلی اثرات و تحریکات

سے پاک ہونا چاہیے جو اس مقدس جزیرہ کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے جزیرۃ العرب کو مختلف ادیان و مذاہب کی کشمکش کا آماجگاہ بننے سے بچانے کی جو تاکید فرمائی گئی ہے اس کا تعلق صرف حجاز سے نہیں بلکہ پورے جزیرہ نمائے عرب سے ہے۔ اس بیسویں صدی کے آغاز میں مرکز اسلام حجاز اور حرمین شریفین کے حالات میں کچھ ایسی ابتری واقع ہوئی کہ یہ بلادِ مقدسہ بھی (شرفائے مکّہ بالخصوص شریف حسین کے دورِ حکومت میں) برطانوی اثرات کے تابع ہوگئے، امن مفقود ہو گیا، جہالت اور ناخواندگی نے ہر طرف اپنا سایہ پھیلایا، عقائد میں فساد آ گیا............ بالآخر خدائے حکیم و رحیم کی قدرت ظاہر ہوئی اس نے آل سعود کو اصلاحِ حال، قیام امن، سڑکوں کی تعمیر، ملک کی خوش حالی، عوام کی تعلیم، ایک مضبوط حکومت اور بیدار مغز انتظامیہ کے لیے کھڑا کیا۔

(حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب: اُمیدوں اور اندیشوں کے درمیان۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ص: ۸تا۱۹)

حجاز کے سفروں میں علی میاںؒ کو مرکز اسلام میں اسلامی معیاری معاشرے کی کمی کا شدت سے احساس ہوا جس کے ذریعہ ہر زمانے میں مسلمان، طاقت، اعتماد، جوش اور جذبہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ ایک عربی النسل عجمی عالم دین اور مفکرِ اسلام کی نظر سے جب انھوں نے جزیرۃ العرب پر نظر ڈالی تو ان کو شاہ ولی اللہؒ دہلوی (م۔۱۱۷۶) کی اپنے اخلاف کو کی گئی وصیت یاد آئی، جس میں انھوں نے ہندوستانیوں کو عربی نسب، عربی زبان پر فخر و امتیاز کے ساتھ عربوں کے عادات و اطوار پر جمے رہنے کی تلقین کی تھی۔

"ہم ہندوستانی غریب الدیار ہیں کیونکہ ہمارے آباء و اجداد یہاں

آ کر بس گئے تھے۔ عربی نسب اور عربی زبان ہمارا فخر و امتیاز ہے۔ اس لیے کہ وہ ہمیں سید المرسلین ﷺ سے قریب کرتی ہے۔ اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ ہم بقدر امکان اگلے عربوں کی عادات و روایات سے خالی نہ ہوں جن میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ عجمی رسوم اور ہندوانہ عادات کو اپنے (اسلامی) معاشرے میں پھیلنے کا موقع نہیں دینا چاہیے.......... ہم میں خوش بخت وہی ہے جسے عربی زبان، صرف و نحو اور ادبیات سے حصہ ملا اور قرآن و حدیث سے واقف ہوا۔ ہمارے لیے حرمین شریفین کی حاضری اور ان کے ساتھ تعلق خاطر بھی ضروری ہے۔ یہی ہماری سعادت کا راز ہے اور وہ کم نصیب اور محروم ہے جو ان سے روگردانی کرتا ہے۔"

(المقالہ الوضعیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

علی میاںؒ کو وہ جزیرۃ العرب جس سے ہر باشعور، حساس مسلمان کو امیدیں وابستہ ہیں، بے یقینی، تشویش، انارکی، انتشار اصولی اور اعتقادی کشمکش اور بے شمار اندیشوں سے گھرا نظر آیا۔ تب ایک عالم دین اور خادم ملت کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دیا۔ سلاطین وقت کو اسلام اور نبوت محمدیؐ کے دامن کو مضبوطی سے تھامنے کی ضرورت اور اہمیت سے آگاہ کیا۔ نہایت بے باکی اور صاف گوئی سے حکمراں طبقہ کو ان کی عظیم ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ علی میاںؒ نے اصحاب اقتدار میں دعوت دین کے کام کو کرنے کے لیے حضرت مجددالف ثانیؒ کا طریقہ اختیار کیا۔ نصیحت آمیز خطوط لکھے جن میں حکمت اور ہمدردی کے انداز میں ملک میں پھیلی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے، عرب سلاطین کو دین کے تحفظ اور مرکزِ اسلام کے تقاضوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ضرورت کے مطابق تعمیری ترقیاتی طریقہ اپنانے کی تلقین کی ہے۔ بلادِ مقدسہ کے لیے غیرت و حمیت اور اخلاص و محبت کے جذبہ کے ساتھ

دوراندیشی پر مبنی بیش قیمت مشورے دیے ہیں۔

علی میاںؒ کے یہ خطوط سربراہان مملکت، وزراء، امراء اور عرب والیان ریاست کے نام ہیں۔ مکتوب نگار ایک عالم دین، مفکر اور داعی ہیں۔ والیان ریاست، امراء و سلاطین کو جس وقار و دبدبہ کے ساتھ مکتوب تحریر کرتے ہیں اس کا اندازہ کچھ ان کے خطوط سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ مخاطب کے مقام اور مرتبہ کا خیال رکھتے ہوئے نہایت سادہ القاب و آداب اور دعائیہ جملوں کے ساتھ مکتوب کا آغاز کرتے ہیں۔

شاہ سعود بن عبدالعزیز ولی عھد المملکة العربیة السعودیة کے نام لکھے گئے ایک خط میں ''بلاد مقدسہ کے حکمرانوں کے لیے مسلمانوں کے جذبات اور تمناؤں کا اظہار اور اُن سے وابستہ اُمیدوں کا ذکر کیا ہے اور اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کے مسلمانوں کی نظر عالم اسلام کی طرف ہے۔''

''آج عالمِ اسلام کی سب سے بڑی ضرورت اس حکومت کی ہے جو اسلام کی صحیح نمائندگی کرتی ہو اور جو دعوت و ہدایت اور خدمت و خیر خواہی کی اساس پر قائم ہو کیوں کہ اسلام ذہنوں پر اپنا اثر اس وقت ڈال سکتا ہے اور لوگوں کی جستجو کی پیاس بجھا سکتا ہے جب روئے زمین پر کوئی علاقہ ایسا ہو جہاں اسلامی زندگی اور اسلامی ثقافت و معاشرے کے نمونے اور دعوت و تعلیم کے نتیجے دیکھنے میں آئیں .... عالمِ اسلام کے ساتھ انسانی دنیا کو بھی ایسی مثالی حکومت کی ضرورت ہے جس کا شعار اور نصب العین ہدایت اور اصلاح کے بجائے ٹیکس وصولی اور زراندوزی نہ ہو کیوں کہ آج کی زار و نزار انسانیت کی کچھ مدد ایسی ہی حکومتیں کرسکتی ہیں جو دین و اخلاق، احترامِ انسانیت روح کو مادہ پر، اخلاق کو املاک پر اور انسان کو مال و منال پر کھلی ترجیح دیتی ہوں''۔

(حجازِ مقدس اور جزیرۃ العرب اُمیدوں اور اندیشوں کے درمیان، ص: ۲۸۔۲۹)

اس مجموعہ خطوط میں مرحوم شاہ فیصل کے نام تحریر کیے گئے دو خطوط شامل

ہیں۔ پہلے خط میں شاہ فیصل کو نہایت خلوص اور سادگی سے ”ولی عہد معظم رئیس الوزراء حفظ اللّٰہ ورعاہ ،دوسرے خط میں 'جلالۃ الملک فیصل المعظم حرسہ اللّٰہ ورعاہ' جیسے مختصر اور سادہ القاب سے مخاطب کیا ہے۔علی میاںؒ کو شاہ فیصل مرحوم کا اعتماد حاصل تھا، انھوں نے رابطہ عالم اسلامی کے ممبران کو عالمِ اسلام اور بلادِ مقدسہ کے بارے میں گفتگو کی آزادی دے رکھی تھی ،علی میاںؒ کو کئی بار شاہ موصوف سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ ”ان خطوط کو پیش کرنے اور ذمہ داران مملکت سے زبانی گفتگو کے موقع پر ہمیشہ خوش اخلاقی ،کشادہ دلی اور صبر وتحمل اور اس خندہ جبینی سے ہی سابقہ پڑا جو بات کرنے والے کو ہمت دلاتی اور صراحت اور مزید لب کشائی پر آمادہ کرتی ہے،اس معاملہ میں شاہ فیصل شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑھے ہوئے تھے اپنے فطری اسلامی اخلاق ،عربی طبیعت اور قائدانہ صلاحیت کے سبب انھوں نے راقم الحروف کو تحریر وتقریر کی مکمل آزادی دے رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ بغیر کسی حجاب اور تذبذب کے اُن سے اپنے دل کی بات کہہ دیتا تھا“۔

(حجازِ مقدس اور جزیرۃ العرب اُمیدوں اور اندیشوں کے درمیان ،ص:۲۴۔۲۵)

جلالۃ الملک امیر فیصل بن عبدالعزیز کو بلادِ مقدسہ کی منفرد حیثیت اور اس کے تحفظ کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔معاشرے کی بے راہ روی اور اس کے اسباب وجوہات بیان کرتے ہیں۔ یہ خط بلاد مقدسہ کے لیے غیرت اور حمیّت اور اخلاص ومحبّت کے جذبہ کے ساتھ لکھا گیا تھا۔اس خط میں نقیش پرور سیاست کی ناکامی کے حقائق واسباب وجوہات بیان کرتے ہوئے اس کی تاریخی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں۔

”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی کی خوش گوار اور آرام دہ بنانے والی چیزوں کو اپنانے اور مغرب کے پیچھے چلنے والی متمدن دنیا کی تقلید میں جدید

ذرائع ابلاغ، آزاد و بے قید نشریاتی پروگراموں اور مغربی زندگی کے مظاہر کو اختیار کرنے میں (جن کا تعلق ملک کی حقیقی ترقی و استحکام سے نہیں ہے) کوئی حرج نہیں ہے اس سے عوام کی بے چینی کا علاج ہوتا ہے اور وہ غلط ڈھنگ سے سوچنے سے بچ جاتے ہیں (مگر مجھے معاف رکھا جائے) کہ میں تاریخ اور تجربہ کی روشنی میں اس سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ میرے ناقص خیال میں یہ کوئی علاج نہیں کہ سمندر کا کھاری اور نمکین پانی تو پیاسے کو سیراب کرنے کے بجائے اس کی پیاس اور بڑھا دیتا ہے صحیح علاج اسلام کے عدل اجتماعی کا قیام، ملک کی صنعت اور تجارت کی ترقی، رزق حلال کی فراہمی، خودکفیل بنانے کے وسائل، کارخانوں کی تعمیر، زندگی کی ضرورتوں کا سستا ہونا اور جائز سہولتوں کی فراہمی ہے۔......

میں اس فرد کی حیثیت سے (جو اپنے دین و دانش علم و ثقافت بلکہ تہذیب و آدمیت میں تمام تر اس ملک کا زیر بار احسان ہے) آپ کو آپ کی ہمت بلند اور اہلیت ارجمند کا واسطہ دیتا ہوں اور اللہ کی عطا کردہ اس جاہ و منصب اور اثر و نفوذ سے کام لینے کی درخواست کرتا ہوں) آپ اس کے ذریعہ عمومی اور خصوصی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں اُبھرنے والے اس خطرے کا مقابلہ کریں اور عرب و مسلمان ممالک کی شخصیت کی حفاظت، فکری رہنمائی، رائے عامہ، صحافت ونشریات، علوم وفنون کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے اپنی پوری قوت اور توانائی لگادیں جس کے سبب قوم اور نوخیز نسلوں کے دل و دماغ میں ایمان، دینی جوش وخروش اسلامی غیرت وحمیت اور اخلاق وفضائل سے دلچسپی پیدا ہو اور فسق وفجور اور رزائل سے نفرت بیٹھ جائے اس طرح ان کے ذہنوں میں اسلامی اقدار راسخ ہوکر انھیں ان محترم اور عظیم ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے قابل بنائیں جن کی توقع دنیا کے سارے مسلمان اُن سے رکھتے ہیں دعوت و جہاد کا جو موقع اور میدان اللہ نے آپ کو عطا کیا ہے وہ ہر ایک کو ہر جگہ، ہر وقت میسر نہیں آتا"۔

(حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب اُمیدوں اور اندیشوں کے درمیان، ص: ۳۶ تا ۳۸)

شاہ فیصل مرحوم نے ہمیشہ علی میاںؒ کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ علی میاںؒ، شاہ فیصل کے نام دوسرے خط میں جدید وسائلِ تمدن، آلاتِ تفریح اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے سلسلہ میں احتیاط کی تلقین کرتے ہیں اور ان خطرات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جو ان وسائل کے غیر محتاط استعمال سے رونما ہوتے ہیں۔

''عوام کے لیے اسبابِ عیش کی فراوانی ان کے جائز و ناجائز مطالبات کی تکمیل اور آرام و راحت کا ہر سامان مہیا کرنے کا تجربہ بنوامیہ و بنوعباس سے لے کر آج تک کے جملہ اسلامی ممالک اور اسلام کی طویل تاریخ میں ناکام رہا ہے اور یہ سیاست (جس میں یہ سمجھا گیا کہ عوام کے اضطراب و بے چینی اور نوجوانوں کی حوصلہ مندی کو ملکی مسائل اور سیاسی حالات پر غور کرنے کے بجائے لذتوں اور مسرتوں اور زندگی کے لطف کی طرف موڑا جاسکتا ہے) ہمیشہ ناکام رہی ہے اور اس نے قوموں کو شکر و احسان مندی اور قدر دانی پر آمادہ نہیں کیا بلکہ جن معاشروں پر نعمتوں کی بارش کی گئی اور گویا جنت ارضی اُن کے قدموں میں ڈال دی گئی وہی سب سے زیادہ کفرانِ نعمت، احسان فراموشی، ناشکری اور رحم دل اور فیاض حکمراں خاندانوں کی مخالفت پر کمربستہ اور پہلی فرصت میں بغاوت پر آمادہ ہوگئے انھوں نے حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیا اور اپنے محسنین کے ساتھ وہ بدترین معاملہ کیا جسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے یہ لذت کوشی اور موقع پرستی مادّیت کی فطرت رہی ہے..... ہر جگہ ایسی کہانی ایسا ڈرامہ ہے جو تاریخ کے تمام ادوار میں دُہرایا گیا ہے۔ امویوں اور عباسیوں کے اخیر دور اور مشرقی و مغربی حکومتوں کے ساتھ یہی ہوا۔ مصر و شام میں یہی ہوا، ماضی قریب میں عراق میں یہی کچھ ہو چکا اور سوڈان میں کچھ دنوں پہلے ہی انقلاب ہوا ہے ان ملکوں میں رعایتوں اور سہولتوں اور عیش و آرام اور تفریح و دل بستگی کے سامانوں کی فراوانی نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ عوام نے ہر سرپھرے کو خوش آمدید کہا اور پہلی فرصت میں

انقلاب برپا کردیا۔''

(حجازِ مقدس اور جزیرۃ العرب اُمیدوں اور اندیشوں کے درمیان، ص:۴۳)

شاہ فہد بن عبدالعزیز نائب وزیر اعظم کو تحریر کردہ خط میں ''جدید تمدن و خوش حالی کی وجہ سے دینی رجحان کو کمزور اور عیش پسندی کو ملک و ملت کے لیے خطرناک بتاتے ہیں اور اسلامیت کی آخری سرحد کی حفاظت تاریخ اسلام کے قائدین کی مثال دے کر مرکز اسلام کے شایانِ شان باصلاحیت قائد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

''خدا کا شکر ہے کہ اس ملک کا سربراہ وہ سعودی خاندان ہے جو توحید، دین خالص اور صدرِ اسلام و کتاب وسنت کی طرف رجوع کی دعوت کا علمبردار بن کر اُٹھا تھا اس لیے ہمیں یہ اُمید کرنے کا حق ہے کہ وہ اس ملک کو خطرات سے بچانے کی امکانی کوشش میں کوتاہی نہیں کرے گا اس عظیم مملکت کو ایسا ہی شخص بچا سکتا ہے جو خطروں کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہو جائے اور اس راہ میں اپنی لذت و راحتِ نفس کی مرغوبات کو قربان کردے۔ ایمان و جہاد کی سعادت، اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول اور مجاہدین و مجددین کے طلائی سلسلہ میں شمولیت سے بڑھ کر کون سی لذت اور مسرت ہو سکتی ہے...... آں جناب کے لیے اگلوں میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور پچھلوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی ذات ایک مثالی نمونہ ہے۔ یہ دونوں حضرات اسلام پر جب مشکل اور نازک وقت آیا تو اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے کردار نے دو زمانوں کے درمیان خطِ فاصل بن کر تاریخ کا دھارا موڑ دیا اور وقت کے معاشرہ کو ایک نیا رُخ عطا کیا، یہ ایسے اقدامات تھے جن پر جن و ملک نے مبارکباد کہی اور اللہ نے انھیں بقائے دوام سے نوازا، اور آنے والی نسلوں نے اُن کے کارنامے دیکھے۔''

(حجازِ مقدس اور جزیرۃ العرب اُمیدوں اور اندیشوں کے درمیان، ص:۵۴)

علی میاںؒ نے ۱۹۷۰ء میں ایک خط اپنے دوست شیخ محمد سرور الصبان

سابق سکریٹری جنرل رابطہ العالم الاسلامی کے نام لکھا جس میں سعودی حکومت کی ثقافت ونشریات کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس خط میں سعودی معاشرے کو ایک نئے معاشرے میں تبدیل کرنے کی منصوبہ بند کوشش اور اس کے نتائج پر گہرے تشویش کا اظہار کیا اور مشورہ دیا کہ منصوبہ بندی مسجد الحرام کے مقاصد کے مطابق ہونا چاہیے۔

سعودی عرب کے وزیر تعلیم حسن بن عبداللہ آل شیخ کے نام مکتوب میں عرب طلباء کی تعلیم وتربیت کے لیے نصاب تعلیم کی اصلاح اور اساتذہ کے انتخاب میں احتیاط پر زور دیا۔ اس بات پر زور دیا کہ عرب اور مسلم مملکتوں میں نظامِ تعلیم کی تشکیل، گہرے غور وفکر اور خاص منصوبہ بندی کی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ جو اسلام کے عقیدے اور پیغام کے مطابق ہو کیونکہ تعلیم ہی ملک ومعاشرے کی تعمیر وتشکیل نو کرتی ہے۔ شیخ عبداللہ السالم الصباح امیر کویت کے نام خط میں ''عرب قومیت کی پُرزور مخالفت کرتے ہیں اور امراء خلیج کو دینی وحدت وِمکمل سالمیت کی حفاظت کی ذمہ داری یاد دلاتے ہیں۔ دین محمدی کی کامل پیروی کو نجات کا راستہ بتاتے ہیں۔

عراق اور کویت کی جنگ کے بعد مملکت سعودی عرب کے امیر فہد بن عبدالعزیز کے نام ایک مخلصانہ خط لکھا، جس میں علی میاںؒ نے وقت کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے اخلاص وانابت پر پورا اترنے والا معاشرہ بنانے کی پُرزور دعوتِ فکر دی۔

علی میاںؒ کے یہ خطوط ان کی علمی دعوتی کوششوں کا نقش اور عالم اسلام کی دینی علمی تحریکات کے سلسلے میں ان کے مشاہدے کی تصویر ہیں۔

علی میاںؒ کے بھانجے مولانا محمد رابع حسنی ندوی (ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء) علی میاںؒ کے علمی کاموں سفر وحضر کے سب سے معتبر گواہ ہیں، اُن کے خطوط کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

”متعدد ملکوں کے سربراہوں کو اپنے اپنے ملکوں کے حالات کو بہتر بنانے اور اسلامی تقاضوں کو اہمیت دینے اور ان کا تحفظ کرنے کی نصیحتیں کیں۔ یہ نصیحتیں جن خطوط کے ذریعہ کیں، اُن کو دیکھ کر مولاناؒ کی خوش اسلوبی اور حکمت عملی دور اندیشی اور مسائل کی سمجھ اور اسلوب کلام کی خوبی سامنے آتی ہے۔

(عہد ساز شخصیت، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ص:۱۳۰)

مکتوبات حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی حصہ اوّل، دوم، مرتبہ: مولانا سیّد محمد حمزہ حسنی ندوی

پہلا مجموعہ مکاتیب ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں علی میاںؒ کے ۱۴۵ مکتوبات ہیں، برادرِ اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے نام ۵۸ خطوط، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کے نام ۵ مکاتیب، مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے نام ۹ خطوط، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے نام ۳ خط، مولانا حکیم سیّد حسن مثنیٰ ندوی امروہویؒ کے نام ۳۳ مکتوبات اور مولانا سید ابوبکر حسنی کے نام ۳۷ خطوط شامل ہیں۔ مکتوبات ابوالحسن علی ندوی حصہ اوّل کے آخر میں ”مکاتیب یورپ“ کو بھی شامل کرلیا گیا ہے، جس میں عزیزوں، شاگردوں کے نام ۱۰ خطوط ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے نام مکاتیب ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان تحریر کیے گئے ہیں۔ خطوط سے پہلے ڈاکٹر عبدالعلیؒ کا مختصر تعارف ہے۔ مکاتیب میں جن عمائدین علمائے کرام کا تذکرہ ہے حاشیے میں ان کا مختصر تعارف شامل ہے، اِن تعارفی کلمات نے مکاتیب کو زیادہ معلومات افزا، دلچسپ اور مفید بنا دیا ہے۔

علی میاںؒ، عربوں میں تبلیغ دین کے کام کے لیے تبلیغی تحریک کے اکابرین کے مشورے سے حجاز مقدس تشریف لے گئے، انھوں نے ممالک عربیہ کے مسلمانوں اور خاص کر ان کے خواص تک تبلیغ دین کا کام پہنچانے کے لیے کچھ

رسائل تحریر فرمائے تھے۔ علی میاںؒ کے چند شاگردوں نے رسائل کو عوام وخواص کے حلقوں میں پہنچایا۔ ۲۱؍ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ کو بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے نام خط میں علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

مولوی معین اللہ اور مولوی عبدالرشید صاحبان نے توقع سے کہیں زیادہ بہتر کام کیا، درجنوں آدمیوں کو پہلے سے تعارف اور ملاقاتوں کا مشتاق بنا رکھا تھا، مصر، شام، ترکی اور مغرب اور حجاز و نجد کے اچھے اچھے اہلِ علم اور صاحبِ فہم پہلے سے منتظر تھے۔......رسائل کا جس طرح خیر مقدم ہوا اور لوگوں نے جس مسرت کا اظہار کیا وہ ہمارے حوصلہ، استحقاق اور کتابوں کی حیثیت سے بہت بلند تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو خیر کی پیاس ہے اس طرز کی چیزیں بہت کم ہیں......سب سے زیادہ جو رسالہ مقبول ہوا "بین الصورة والحقيقة" ہے۔"

اس خط میں حجاز کے اہلِ قلم اور ادیبوں سے ملاقات کے ذکر کے بعد حجازی ادب کی بنیاد کو امید افزا انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔

"حجاز کے ایک مقبول ادیب شیخ احمد عبدالغفور العطار (بانی روزنامہ 'عکاظ') نے جو بڑے انشا پرداز اور مصنف ہیں ہماری دعوت کی، بڑے بڑے ادبا کو ملانے کے لیے مدعو کیا مکہ کے نامور نوجوان ادیب اور صاحب قلم جمع ہوگئے......اللہ تعالیٰ نے اس موقع کی غیبی مدد فرمائی، ادب کے مقصد اور مسلمان ادباء بالخصوص ممالک عربیہ کے اہلِ قلم اور حاملین ادب کے فرائض اور ذمہ داریوں کے متعلق بہت کچھ کہنے کی توفیق عطا فرمائی، جس کی اہلیت نہ تھی اور نہ جس کی توقع تھی بڑے بڑے بلند خیال اور روشن دماغ جمع تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ سب غیر معمولی طریقہ پر مطمئن اور متاثر ہوئے اور اس روز کی مجلس سے بیحد مسرور ہوئے، جلد دوسرے اجتماع کی فرمائش کی......اگر یہ ادباء اور ان کی طاقتیں صحیح رُخ پر پڑگئیں اور انھوں نے ادب سے نوجوانوں میں دینی روح پیدا کرنے اور دین کا کام پہونچانے کا پیغام لینا شروع کردیا، مصری

ادبیات کی تقلید ترک کر کے صحیح معنی میں حجازی ادب کی بنیاد رکھی تو نوجوانوں میں انشاء اللہ بڑے اچھے انقلاب کی توقع ہے اور اس کی وجہ سے اس طبقہ کے تاثر کی اُمید ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہے''۔

(مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (اوّل) ص: ۵۷تا۵۹)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے نام خط میں ترکوں کی اسلام سے محبت کی چشم دید گواہی دیتے ہوئے سفر کا دلچسپ حال تحریر کیا ہے۔

''ترکی کا سفر ایک دیرینہ آرزو تھی اللہ تعالیٰ نے اس سفر میں یہ آرزو پوری کی۔ اگر چہ وقت کم رہ گیا تھا اور دو ہفتہ سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی پھر بھی دل نہ مانا اور اس عزیز سرزمین کی زیارت ہوگئی جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا اور جو حالات معلوم ہوئے وہ میرے لیے خلافِ توقع تھے اگر چہ یہ سن چکا تھا کہ ترکی کی لادینیت اور اسلام سے بے تعلقی کی جو روایات بیان کی جاتی ہیں ان میں بڑا مبالغہ ہے لیکن ترکوں کی دینداری کے جو مناظر آنکھوں سے دیکھے اور اسلام سے ان کا جو شغف اور گہرا تعلق دیکھنے میں آیا اس سے ایک طرف اس کا اندازہ ہوا کہ اسلام کی اس قوم کے دلوں میں کیسی مضبوط اور گہری جڑیں تھیں جو اتاترک کی کوہ کنی اور تیشۂ زنی کے باوجود قائم ہیں، دوسری طرف اسلام کی اندرونی قوت اور حیات پر ایمان بڑھ گیا جو اِن تمام صدموں کو برداشت کر لے گیا اور ترکی میں ایک زندہ مذہب کی طرح موجود ہے اور اپنے سابق اقتدار کی طرف آنے کے لیے بے چین ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کسی اسلامی ملک کے مسلمانوں کو اسلام سے شاید اتنا دلی لگاؤ اور اس کا اتنا ادب واحترام نہ ہو، جتنا ترکوں کو ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ اس سفر میں بالالتزام روزنامچہ لکھتا رہا ہوں، اس میں یہ سب مشاہدات وتاثرات آگئے ہیں آپ کے لیے شاید اس سے زیادہ موزوں کوئی تحفہ نہ ہوگا''

(مکتوبات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (اوّل)، ص: ۱۹۵)

علی میاںؒ کے ان خطوط سے اُن ملکوں اور علاقوں کی تصویر سامنے آتی ہے جو اسلام کا گہوارہ تھے لیکن قومی علمی تہذیبی اضمحلال کی وجہ سے تہذیب ومعاشرت اور علمی ادبی روایات تبدیلی کے دور سے گزر رہی تھیں۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے نام مکہ مکرمہ سے خط تحریر فرمایا جس میں حرم شریف کی رونق اور بہار کا اپنے خاص انداز میں ذکر فرمایا ہے جو نہایت مؤثر اور دلچسپ ہے۔

''مکہ معظمہ میں جو دن گزرتا ہے غنیمت بلکہ نعمت معلوم ہوتا ہے، قطعاً یہاں سے جانے کا جی نہیں چاہتا، جدہ اور طائف میں دونوں جگہ تجربہ ہوا، طبیعت یکساں نہیں رہتی، کچھ توحش محسوس ہوتا ہے کبھی بے کیفی اور بدمزگی، لیکن یہاں وحشت کا کیا ذکر، اسباب اُنس سب جمع ہیں، روحانی بھی اور حسی بھی۔ ان اسباب اُنس کا سب سے بڑا مرکز بلکہ اصل مرکز حرم شریف ہے جہاں برکت، سکینت، فضیلت، طواف وعبادت اور شہر کے تمام اہلِ علم وفضل، مفسرین، محدثین، ادباء، خطباء سب مل جاتے ہیں خصوصاً مغرب سے عشاء تک کا وقت خاص رونق اور بہار کا ہوتا ہے یہاں دراصل نہ کسی دارالاجتماع کی ضرورت ہے نہ کسی تفریح گاہ کی، روحانی، ذہنی اور حسی ہر طرح کی کلفت حرم شریف میں داخل ہوکر دور ہو جاتی ہے۔ ہر طرح کے آدمی سے تعارف ہو جاتا ہے مدارس وکلیات کے اساتذہ وطلباء، مصری علماء، حجازی ادباء، عام اہلِ شہر حرم میں کسی نہ کسی جگہ مل جاتے ہیں، اکثر کی نشست گاہیں مقرر ہیں''۔

(مکتوبات ابوالحسن علی ندوی۔ مرتبہ: حمزہ حسنی ندوی)

مولانا سید محمد حمزہ حسنی کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''پہلی جلد میں وہ مکتوبات شامل کیے گئے ہیں، جو پہلے سفر حج اور شرق اوسط کے دعوتی اور علمی سفر کے دوران لکھے گئے تھے، ان خطوط میں اس دور کی اہم دینی، علمی اور سیاسی شخصیتوں سے ملاقات اور تبادلہ خیال کا بیان ہے.........

مکاتیب یورپ:

رسالہ "المسلمون" کے ایڈیٹر، ایک دینی تحریک کے قائد ڈاکٹر سعید رمضان نے یورپ میں زیرِ تعلیم مسلمان طلباء کی دینی اور فکری رہنمائی کے لیے جینوا (سوئزرلینڈ) میں ایک مرکز قائم کیا تھا۔ شروع ہی سے علی میاںؒ اس اسلامک سینٹر کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کے رکن تھے۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں رفیق سفر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ہمراہ جینوا تشریف لے گئے، اسلامک سینٹر کی میٹنگ میں شرکت کی، اس کے بعد پیرس، لندن اور اسپین کا سفر کیا۔ ان ممالک سے آپ نے اپنے عزیزوں برادرزادہ محمد الحسنی، محمد ثانی حسنی ندوی، محمد رابع حسنی اور معین اللہ ندوی اور ابوالعرفان ندوی کے نام خطوط تحریر فرمائے، جو مکاتیب یورپ کے نام سے مکتبہ اسلام سے شائع ہوئے۔

یہ مکاتیب یورپ کے معاشرے، علمی اور قومی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان دس مکاتیب میں ان ملکوں کی تاریخی، دینی اور اخلاقی حالت کی صحیح تصویر سامنے آگئی ہے۔ مشہور تاریخی مقامات کا دلچسپ تقابلی انداز میں تذکرہ ہے۔ مکاتیب ہلکے پھلکے لیکن پُر از معلومات ہیں اور ایک عالمِ دین کے قلم سے یورپ کے حالات اور اُن پر ناقدانہ تبصرہ بھی ہے۔ چند مکاتیب کے اقتباسات مکتوب نگار کی فکر ارجمند اور دلِ دردمند کے مظہر ہیں۔ لندن سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"لندن دیکھا بعض مشہور چیزوں کو دیکھ کر حیرت و مایوسی ہوئی بعض کو دیکھ کر تاثر و وقعت، قصر بکنگھم بہت معمولی معلوم ہوا، لکھنؤ کا گورنمنٹ ہاؤس زیادہ شاندار، ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ جو وزیر اعظم کا دائمی محل اور دفتر اور گویا برطانیہ کا دارالحکومت ہے باہر سے بڑا حقیر اور معمولی۔ لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کہیں زیادہ شاندار اور وسیع۔ اندر سے سنا ہے کہ کروڑوں روپے حال میں اس کی مرمت و آرائش میں صرف ہوئے ہیں، انگریز قوم حد درجہ کی قدامت پسند اور روایات پرست ہے، ان دونوں مکانوں کو ان کی قدامت

وتاریخ کی وجہ سے جان سے لگائے ہوئے ہے۔
میوزیم بڑے شاندار، معمور اور مفید پائے۔ نیچرل ہسٹری میوزیم، سائنس میوزیم، البرٹ میوزیم اور ویسٹ منسٹر، ایبے کا گرجا دیکھا جو تاج پوشی کی جگہ اور مشاہیر کا مدفن ہے...... البرٹ میوزیم کا اسلامک سیکشن بھی خوب ہے''۔

(مکاتیب یورپ، ص: ۳۵)

کل آکسفورڈ کا سفر تھا یونیورسٹی دیکھی اور ازہر کی طرح تلاش کرتے رہے کہ جس کی شہرت سنی تھی کہاں ہے عجیب نظام ہے، کالج ۲٦ ہیں، سب اقامت گاہیں بالکل عربی مدارس کی طرح حجرہ نما کمرے، ہر کالج میں التزاماً Chapel یعنی چھوٹا گرجا، عیسائی رسوم و روایات و شعائر کا بڑا اظہار ٹیٹوریل (Tutorial) نظام ہے یعنی تھوڑے تھوڑے طلبہ ایک ایک استاد کے سپرد ہو جاتے ہیں، وہ رہنمائی کرتا رہتا ہے، اساتذہ کے لیکچروں میں شراکت ضروری نہیں، آج کیمبرج کا پروگرام ہے۔ آکسفورڈ میں صدر شعبۂ عربی پروفیسر Beeston سے خصوصی ملاقات ہوئی، کیمبرج میں ڈاکٹر آربری سے وقت مقرر ہوا...... اب انشاء اللہ ۲۰/اکتوبر کو اسپین روانگی ہے شاید دس دن کا دورہ ہو۔ یہ سفر ذاتی طور پر بہت مفید ہوا۔ اس ملک کو دیکھنا ہی چاہیے تھا۔ ''شنیدہ کہ بود مانند دیدہ'' کسی نے صحیح کہا ہے، خوبیاں اور خامیاں مشاہدہ بن گئیں مغربی تہذیب سے مایوسی اور بُعد بڑھ گیا، اس پتھر میں جونک لگنا بڑی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دور سے بڑی خوش گمانی ہوتی ہے، یہاں تو بالکل مشینی و مصنوعی زندگی ہے۔ قدرت الٰہی ہی کچھ انتظام کرسکتی ہے کہ یہ لوگ کسی اور بالاتر حقیقت پر غور کریں''۔

(مکاتیب یورپ۔ ص: ۳۸۔۳۹)

لندن کا قیام ۱۹۔۲۰ روز رہا...... مصروفیت کے لحاظ سے، یہ وقفہ نسبتاً کارآمد تسلی بخش رہا۔ انگلستان میں مقیم سلیم الطبع اور صاحب طلب عنصر سے

ارتباط پیدا ہوا، علمی اور تعلیمی مرکزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا کسی قدر موقع ملا، مغربی تمدن کو ذرا قریب سے اور اہلِ مغرب کو ان کے درمیان رہ کر سمجھنے کا موقع ملا۔ برٹش میوزیم، لائبریری، اور انڈیا آفس لائبریری کا بھی کچھ اندازہ ہوا (اندازہ اس لیے کہ استفادہ کے لیے مہینوں کی مدت درکار ہے)۔ بعض ممتاز مستشرقین وفضلاء سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ اپنے موضوع پر بعض نئی کتابیں جو نہیں مل سکی تھیں دستیاب ہوئیں۔ اور ان سے ضروری معلومات اور مفید اقتباسات حاصل کیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک دو اچھے خطاب اور اظہارِ خیال کے موقع ملے۔ ذاتی طور پر قیام مفید و پُر از معلومات رہا، ساری عمر دور سے سنا کیے اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور صورتِ حال اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آگئی اور کسی کے تخیل آرائی اور مبالغہ آمیزی کی گنجائش نہیں رہی''۔

(مکاتیب یورپ، ص: ۴۱۔۴۲)

مکاتیب یورپ میں مکاتیب کی زبان سادہ، اور پُراثر ہے۔ یہ مکاتیب مکتوب نگار کے ذاتی تجربات، علم کی گہرائی، مصلحانہ اور مجاہدانہ خیالات اور جذبات کے عکاس ہیں۔ یہ خطوط نہایت مؤثر اور معلومات افزا بھی ہیں۔

مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، دوم، میں ۲۹۴ مکاتیب ہیں، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے نام ۲۶۶ مکتوبات، مولانا وصی اللہ فتح پوریؒ کے نام ۱۶، اور مولانا محمد احمد پھولپوریؒ کے نام ۱۲ مکاتیب ہیں۔ ان مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خورد اپنے بزرگ کو کس طرح خطاب کرتا ہے۔ خطوط سادگی، صداقت سے پُر، تصنع اور تکلف سے پاک ہیں۔ عاجزی بے بسی کے اظہار کے ساتھ اصلاح طلبی کی خواہش ہے۔ علی میاںؒ کے یہ مکتوبات بزرگوں کی آپس کی مراسلت کے ذریعہ بزرگوں کی زندگی کی

جھلکیاں بھی پیش کرتے ہیں۔ ایسی خوبیوں کے حامل ہیں کہ ان کو پڑھ کر اللہ کے بندوں کے دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔

مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (دوم) کے مقدمے میں ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ نے علی میاںؒ کی مکتوب نگاری کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان کے خطوط کو مراسلت کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے:

"آپ کے پیشِ نظر جو مجموعہ ہے وہ وقت کے ایک برگزیدہ شخص کے خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے بڑوں کے نام لکھے تھے، اس میں آپ مراسلت کا اعلیٰ ترین نمونہ پائیں گے کہ ایک خورد اپنے بزرگ کو کس طرح خطاب کرتا ہے جہاں کوئی تکلّف، تصنّع اور بناوٹ کا گزر نہیں، جس کو پڑھ کر صرف قلم پکڑنا نہیں آئے بلکہ مرشد اور مسترشد کے درمیان کس درجہ سادگی اور صداقت کے ساتھ مراسلت ہوتی ہے اس کا بھی نمونہ ہے"۔

مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی حصہ دوم سے چند مکاتیب کے اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔ یہ خط شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کو دائرہ شاہ علم اللہ سے ۲۳ رفروری ۱۹۵۰ء کو لکھا گیا ہے۔ اس وقت علی میاںؒ سیرت سید احمد شہیدؒ لکھ رہے تھے۔

"آج کل سیرت شہید کی تکمیل میں مشغول ہوں قلمی مسودات کی جو کئی ہزار صفحات میں ہیں۔ تلخیص و اقتباس کر رہا ہوں۔ عجیب و غریب حالات نظر سے گزرے۔ جب کوئی خاص خبر دیکھتا ہوں تو جناب یاد آتے ہیں کہ کبھی موقع ہوتا تو سناتا۔ بالاکوٹ کا واقعہ جو اس پوری جدّ و جہد کا انجام ہے آج ہی ختم کیا ہے۔ طبیعت پر ان واقعات سے کئی دن حزن غالب رہا۔ ایمان کو قوت، یقین و عشق رضا و

جنّت کے شوق، بلند ہمتی اور عمل اور دوسری طرف مسلمانوں کی بے حسی اور ناقدری کے عجیب واقعات دیکھے جس سے طبیعت پر بڑا اضمحلال طاری رہا۔ دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ اس کام کو تکمیل تک پہنچائے۔ کتاب مکمل اور مرتب ہو جائے اور مقبول و موثر ہو.......... سہارنپور آنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد موقع نصیب فرمائے اور کچھ دن یکسوئی کے آپ حضرات کی خدمت میں گزر جائیں کہ زندگی کا کچھ لطف آئے۔“

(مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (دوم) ص: ۹۴۔۹۵)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کی محبت اور اُنسیت اور دونوں حضرات کے مابین باہمی اعتماد و احترام بے مثال تھا، اپنی عربی تصانیف پر علی میاںؒ سے بااصرار مقدمات تحریر کرواتے تھے۔ علی میاںؒ نے آٹھ بصیرت افروز مقدمے حضرت شیخ کی مختلف تصانیف پر تحریر فرمائے۔ ایک خط میں علی میاں رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں ”اس سے پہلے کے مکتوب گرامی میں جناب والا نے اپنی تصانیف کی اشاعت اور تقدیم کے بارے میں میری ناچیز خدمات کا تشکر اور دعائیہ الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا تھا۔ میں نے اپنی تحریرات کے متعلق لکھا تھا مجھے اللہ کے یہاں اُن سے اچھی اُمیدیں ہیں اور جب بھی اپنی ناکارگی اور بے بضاعتی کے احساس کا طبیعت پر غلبہ ہوتا ہے تو اس خیال سے تسکین حاصل کرتا ہوں کہ اللہ کے ایک مقبول و محبوب بندہ کی مسرت کا ذریعہ بنا اور اس کے محبوب ترین عمل میں لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گیا“۔

(مکتوبات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (دوم) مرتبہ مولانا محمد حمزہ حسنی ص: ۳۷۹)

۲۹/ مئی ۱۹۵۸ء کو حضرت مولانا وصی اللہ فتح پوریؒ کو لکھا گیا مکتوب،

مکتوب نگار کی شخصیت، خیالات اور احساسات کا ترجمان ہے۔

"جناب والا کے اس ارشاد گرامی کو بار بار بڑے فخر و سرور
کے ساتھ پڑھا کہ جو حضرات میرے پاس آمد و رفت
فرماتے ہیں ان میں غالبًا سب سے زیادہ قلب کا رجحان
جناب کی طرف ہوتا ہے۔ یہ جملہ میرے لیے بشارت عظیم
اور سرمایہ تسکین ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

مولانا وصی اللہ فتح پوریؒ کو علی میاںؒ سے خصوصی تعلق تھا۔ علی میاںؒ پرانے چراغ میں لکھتے ہیں:

"نوازشوں میں محض بزرگانہ نہیں بلکہ مادرانہ شفقت کی جھلک
نظر آتی تھی جو نائبین رسول کا امتیاز ہے"۔

امریکہ میں مسلم طلباء کی مشہور تنظیم ایم .ایس .اے کی دعوت پر علی میاںؒ ۱۹۷۷ء میں امریکہ تشریف لے گئے، شیخ طریقت محمد احمد پھولپوریؒ کے نام لکھے گئے مکتوب میں سفر کی مختصر روداد ہے، مقصد سفر کی کامیابی کا ذکر ہے، آنکھ کے آپریشن کی فکر کا اظہار ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھا گیا یہ مکتوب، مکتوب نگار کے فکر، ذوق اور طرزِ اسلوب کا مظہر ہے۔

"میں ۲۷ رمئی کو امریکہ پہونچ گیا تھا، میرے بھانجے عزیزی محمد رابع سلمہٗ اس سفر میں میرے ساتھ ہیں۔ ۲۰ رجون سے شمالی امریکہ اور کناڈا کا دورہ شروع ہوا، تقریباً پندرہ مقامات پر جانا ہوا کہیں دو روز کہیں ایک روز ٹھہرنا ہوا، ہر جگہ کئی کئی جلسے اور نشستیں ہوئیں، لوگوں نے بڑے ذوق وشوق اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ الحمدللہ دین کی صحیح بات پیش کرنے کی توفیق ہوئی اور مغربی تہذیب اور مادّیت پر تنقید۔ اب کل انشاء اللہ نیویارک واپس جاؤں گا۔ ۸۔۱۰ دن رہ کر فلاڈلفیا میں جو وہاں سے قریب ہے امریکہ کا مشہور سرجن دائیں آنکھ کا آپریشن کرے گا، اس کے بعد ایک مہینہ یہاں اور رہنا

پڑے گا۔ٹانکے کٹنے کے بعد اگست کے شروع میں انشاء اللہ روانگی ہوگی۔

(مکتوبات مولانا ابوالحسن علی ندوی دوم،مولانا محمد حمزہ حسنی۔ص:۴۹۵)

فروری ۱۹۷۹ء میں متحدہ عرب امارات میں ملکہ برطانیہ کا دورہ ہوا، برطانیہ کے جھنڈے لگا کر شہر کو سجایا گیا،حکومت نے ملکہ کے استقبال میں کروڑوں درہم خرچ کردیے،علی میاںؒ جو اس زمانے میں دعوت و اصلاح کے سلسلہ میں متحدہ عرب امارات کے دورے پر تھے،شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کے نام مکتوب میں دردمندی اور دل سوزی کا اظہار فرماتے ہیں:

''ہم لوگوں کا سفر بہت طویل ہوگیا، جدہ سے دوحہ جانا ہوا، جہاں دو تین کے بجائے پانچ دن ٹھہرنا پڑا۔دوحہ سے دبئ آئے،شارقہ میں بھی کچھ زیادہ وقت صرف ہوگیا لیکن الحمدللہ یہ سب قیام کارآمد ثابت ہوا،سات آٹھ تقریریں اس پورے علاقے میں ہوئیں۔ حالات بڑے تکلیف دہ، تشویشناک ہیں، دولت نے اپنا پورا اثر دکھلایا ہے اور مغربیت سر سے پاؤں تک مسلط ہے۔ملکہ برطانیہ کے آنے پر اسلام اور مسلمانوں کی اور بھی رُسوائی ہوئی، اللہ تعالیٰ ہی اصلاح کی کوئی صورت پیدا فرمائے،عرب تو دین سے بہت ہی دُور ہوتے جارہے ہیں''۔

(مکتوبات مولانا ابوالحسن علی ندوی دوم،مولانا محمد حمزہ حسنی۔ص:۴۵۸)

''مرشد روحانی مصلح امت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی عرف عام علی میاں صاحب کے خطوط مفسّر قرآن عبدالکریم پاریکھ کے نام''

۳۹۳صفحات پر مشتمل یہ ضخیم مجموعہ مکاتیب ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا، جس میں مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کے نام علی میاںؒ کے ۲۲۰ خطوط ہیں، یہ خطوط ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۹ء کے درمیان وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔

ابتداء میں ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے مقدمہ شامل ہے۔ مقدمہ نگار تحریر فرماتے ہیں:

''ان خطوط میں جو سب کے سب ذاتی اور نجی ہیں عصر حاضر کے مسائل، پیامِ انسانیت کی دعوت اور خاص طور پر اُن کاوشوں کا ذکر ہے جن میں مولانا پاریکھ صاحب نے اپنے شیخ و مرشد کی رفاقت اور نیابت میں اہم خدمات انجام دیں''۔ (علی میاں کے خطوط، ص: XX1)

مولانا عبدالکریم پاریکھؒ علی میاںؒ کی تحریک پیامِ انسانیت کے داعی، ترجمان اور خاص مقربین میں تھے۔ اس کے علاوہ ان کے مجاز طریقت تھے۔ علی میاںؒ اور پاریکھ صاحب کے درمیان خاص نسبت و تعلق تھا۔ علی میاںؒ نے اپنے خطوط میں ''محبی، احبّ، احب الاحباب، محبّی فی اللہ جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ سے روحانی اور طبعی تعلق اور مناسبت ہے اس میں الحمدللہ انحطاط نہیں ترقی ہے...... ایک اور خط میں رقمطراز ہیں'' واقعہ یہ ہے کہ اپنے سارے اہلِ تعلق میں جو تعلق اور مناسبت آپ سے ہے شاید کسی سے نہیں۔ آپ کو اپنے لیے ایک عطیہ خداوندی سمجھتا ہوں اور مسلمانوں کے لیے بھی مخلص رہبر اور قرآن کا ترجمان اور وقت کے تقاضے کے مطابق داعی، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور آپ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے''۔

علی میاںؒ اپنے دعوتی کاموں میں مولانا عبدالکریم پاریکھؒ پر بے حد اعتماد رکھتے تھے۔ ایک خط میں اس اعتماد کی جھلک نظر آتی ہے۔

''اس وقت ہمارے دعوتی کاموں میں بالخصوص اس کام میں جو اَب صرف میرے ہی دل کا تقاضہ اور دماغ کا مطالبہ رہ گیا ہے آپ ہی قوتِ بازو اور واحد ترجمان ہیں۔ شاید ہی کوئی اور اس کی اہمیت اور ضرورت سمجھتا ہو جو آج نہیں تو کچھ عرصہ بعد لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کام میں مسلمانوں کی تاخیر کتنے سنگین نتائج کی حامل اور زرّیں موقع کھونے کے مرادف ہے۔ مسلمان

سیکولر ملک میں ان ہی خطوط پر ملک کو بھی بچا سکتے ہیں اور اپنے دین کا بھی جھنڈا بلند کر سکتے ہیں''۔

(علی میاں کے خطوط مفسر قرآن عبدالکریم پاریکھ کے نام، ص: ۱۲۵)

کاروانِ زندگی میں ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں اور حکمرانوں کے نام خطوط

علی میاںؒ نے ہندوستان کے حکمرانوں کو بھی خطوط لکھے۔ اُن کا نظریہ قوم و وطن صاف تھا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سچا محبِّ وطن بننے کی تلقین کرتے تھے، جب حکمراں طبقے سے مخاطب ہوتے تو اقلیتوں کے حقوق اور تحفظِ شریعت کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ یہ اُن کی دلی تمنّا تھی اور وہ اس کے لیے برابر جدّ و جہد کرتے تھے۔

> ''حب الوطنی اور ابراہیمی محمدی تہذیب میں کوئی تضاد نہیں۔ ہم کو ملک کی تعمیر و ترقی میں حصّہ لینا چاہیے۔ ہم کو اپنی قابلیت، دیانت داری، انتظامی لیاقت، صداقت، استقامت اور سیرت کی بلندی اور پختگی کا ثبوت دینا چاہیے۔ ہم اس طرح ملک کی خدمت کریں کہ ہماری افادیت محسوس ہو اور ہمارے وجود کو اس ملک کے لیے ضروری اور خیر و برکت کا موجب سمجھا جائے۔

(اسلام مکمل دین مستقل تہذیب۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ ص: ۲۶)

علی میاںؒ نے ہمیشہ اپنے ملک، قوم اور مسلم اقلیت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھا۔ ہندوستان کے حکمرانوں سے ملاقات کے وقت یا خط کے ذریعہ ملک کی خرابیوں کو دور کرنے کی نصیحت کی اور اقلیتوں کے حقوق اور شریعت کے تحفّظ کی طرف بطورِ خاص توجّہ دلائی۔ ہندوستان کے مختلف وزراءِ اعظم کو جو خطوط لکھے ان میں ملکی و ملّی مسائل پر بڑی جرأت و بیباکی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان پر تشویش کا اظہار بھی کیا اور ان کے تدارک کے لیے مشورے بھی دیے۔ اس کے

علاوہ انھوں نے اپنے دورِ نوجوانی میں ڈاکٹر امبیڈکر سے ملاقات کے بعد اپنے بڑے بھائی حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کو خط لکھا جو ان کی خود نوشت سوانح عمری کا رواں زندگی میں بھی شامل ہے اس خط میں ڈاکٹر امبیڈکر سے ملاقات کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس خط میں علی میاںؒ نے ہندوستانی مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے چند مشورے بھی دیے ہیں۔

۱۹۷۶ء میں علی میاں کی ملاقات دہلی میں ہندوستان کی اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ہوئی۔ اس موقع پر ایک خط ان کو پیش کیا جو اندرا گاندھی نے ان کے سامنے ہی پڑھا اور اس پر گفتگو کی۔ اس خط میں علی میاں نے ملک میں نافذ ایمرجنسی میں ہو رہے تشدد سے عوام میں بے چینی اور بے اعتمادی کی فضا اور اس کے وجوہات پر تفصیل سے اظہار خیال اور اپنے طور پر مسز اندرا گاندھی کو ان حالات اور واقعات کی اطلاع کی جن سے علی میاں کے خیال میں ان کو لاعلم رکھا گیا تھا۔

دسمبر ۱۹۶۶ء کو علی میاںؒ نے مجلس مشاورت اور مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ڈاکٹر سید محمود کو ایک خط تحریر کیا۔ جس میں ملک میں درپیش حالات اس سے پیدا شدہ صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اندیشوں اور مشوروں کا وضاحت سے ذکر کیا۔ علی میاںؒ نے اس امر پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا کہ مجلس مشاورت کے قیام سے ہندوستان کے مسلمانوں میں اعتماد اور آزادانہ کردار کا احساس پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنی تمام ملّی، تشخصات اور تہذیب و ثقافت اور مکمل آزادی کے ساتھ اس ملک میں رہ سکتے ہیں۔

۱۹۸۴ء ماہ اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں علی میاںؒ نے ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نام ایک اور مفصل خط لکھا اس خط میں ملک کے اندرونی حالات، فرقہ وارانہ تشدد، پورے ملک میں ہندو انتہا پسندوں کی شورشوں کا ذکر کیا۔ احیائیت کے اس خطرے سے آگاہ کیا جو ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اخلاقی و انتظامی انتشار کا ذکر کرتے ہوئے یہ باور کرایا

کہ سب سے بڑی سیاست خلوص ہے۔ جذبۂ خلوص کے حامل اور اس کے قائل کو ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

۱۹۸۶ء میں علی میاںؒ نے اس وقت کے وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی کو شکریہ کا خط لکھا کیونکہ راجیو گاندھی نے مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ سے ذاتی دلچسپی لی تھی اور اخلاقی جرأت کے ساتھ پارلیمنٹ میں اسے پاس کروا دیا تھا۔ علی میاںؒ نے بحیثیت داعی اور عالم دین، محبّ وطن ہندوستانی کے، ملک کی قیادت و رہنمائی اور انتظامیہ کے سلسلہ میں ایسے مخلصانہ مشورے دیے جو ملک کی بقا اور سالمیت کے لیے ضروری تھے۔

علی میاںؒ نے چندر شیکھر کو ہندوستان کا وزیر اعظم منتخب ہونے پر خط لکھا اور مبارکباد دی۔ نیز ملک کی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے مفید مشورے دیے۔ جن میں انسانی اخلاق، سچی حب الوطنی، عوامی روابط پر زور دیا۔ ذرائع ابلاغ میں ذمہ داری سے کام لینے اور مسلم پرسنل لاء میں خواہ مخواہ مداخلت جیسے مسائل پر اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا۔

یکم جولائی ۱۹۹۱ء کو نرسمہا راؤ وزیر اعظم ہند کے نام خط لکھا۔ مبارکباد دینے کے بعد اپنے معروضات اور مخلصانہ مشورے پیش کیے۔ ملک کی بقاء اور ترقّی کے لیے صحیح جمہوریت، ہندو مسلم اتّحاد، ملک میں اخلاقی اور انتظامی انتشار کی طرف فوری توجہ کی ضرورت پر زور دیا۔ صاف گوئی سے مسلمانوں کے پرسنل لاء میں مداخلت سے بچنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کی نفسیات پر روشنی ڈالی۔

۲۵ر اپریل ۱۹۹۷ء کو اندر کمار گجرال کو وزیر اعظم بننے پر مبارکباد دی۔ وزیر اعظم کو فیکس کے ذریعہ ارسال کردہ پیغام میں علی میاںؒ نے دعا کی ہے کہ خدا انتی طاقت دے کہ وہ ان تمام لوگوں کے دکھ درد کو دور کر سکیں جو اُن سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ علی میاںؒ نے اپنے پیغام میں امید ظاہر کی کہ نئے وزیر

اعظم کے قیادت میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور عدم تشدد پر یقین رکھنے والی طاقتیں مضبوط ہوں گی اور جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا۔

علی میاںؒ نے تمام مکتوبات بہت طاقتور اُسلوب اور جرأت مند لہجے میں لکھے ہیں۔ یہ مکتوبات نہ صرف پُر از معلومات ہیں بلکہ انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسلامی جذبات، مجاہدانہ خیالات اور احساسات خطوط کی شان ہیں۔ یہ خطوط اپنے بلند مضامین، دینی حقائق، دردمندی، اخلاص اور مکتوب نگار کے بلند عزائم کی وجہ سے ایک گرانقدر اضافہ ہیں۔

علی میاںؒ عربی زبان پر کامل دسترس علوم اسلامیہ نیز کتاب وسنت میں صحیح اور عمیق فہم رکھتے تھے۔ اسلامی تاریخ اور دنیا کی تاریخ پر ان کی معلومات وسیع تھی۔ اپنے مکتوبات میں کبھی وہ کتاب وسنت کی روشنی میں مشکلات کی عقدہ کشائی کرتے نظر آتے ہیں اور کبھی وہ اسلامی تاریخ کے جانبازوں کے کارناموں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ دائمی کامیابی محمد ﷺ کے طریقہ کو مضبوطی سے تھامنے سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ مکتوبات میں داخلیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ یعنی اس میں وہ اپنے دل کی سچی کیفیت بلاتصنع کاغذ پر اتارتے چلے جاتے ہیں۔ مکتوبات میں اخلاص اور دردمندی کا جذبہ موجزن ہے۔ ان میں عالم عرب اور عالم اسلام کے لیے رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ ان کا موضوع دینی و اخلاقی ہے اس لیے قلب و اخلاق پر اثر کرتا ہے۔ ان با مقصد خطوط کی نمایاں خصوصیت صاف گوئی، بے ریائی ہے۔ علی میاںؒ کے عرب علماء اور والیان سلطنت کو لکھے گئے خطوط ادب کے وہ جواہر پارے ہیں جو عالم عرب کے حالات کا آئینہ ہیں۔ ایک ہندی نژاد، عربی ادیب کے جذبات واحساسات اور نظریات کا مجموعہ ہیں۔ مکتوب نگار نے اپنے اعلیٰ پایہ مشن اور مفید مقاصد کے تعلق سے یہ مکتوبات تحریر کیے۔ ان میں حرمین کی حرمت وعظمت، شریعت کے احکامات، اقامت دین اور حق و

باطل کے امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ جیسے اہم نکات پر زور دیا ہے۔

اسلامی روح اور مقاصد کے حامل اِن مکتوبات سے مکتوب نگار کے یقین اعتماد، قوت ایمانی، حمیّت اسلامی، بلادِ مقدسہ میں دین کی سربلندی کی فکر، بے چینی و بے کلی کا احساس ہوتا ہے۔ مکاتیب، مکتوب نگار کے اعلیٰ دینی فہم، بصیرت، بصارت کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب لکھنے والا سارے عالم اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے متفکر، سرگرم وکوشاں ہے۔

مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی نے مکتوبات کے آئینہ میں علی میاںؒ کے طرزِ فکر اور اندازِ تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> ''حضرت مولاناؒ نے عرب ممالک اور یورپ کے اس دور کے علماء، ادباء، مفکروں، سیاست دانوں، اسلامی دعوت و تربیت کے ذمہ داروں، انجمنوں، تحریکوں (اسلامی غیر اسلامی) اور تعلیمی اداروں (جدید و قدیم) کے جو حالات لکھے اور ان پر جو جچا تلا تبصرہ کیا تھا وہ بالکل درست ثابت ہوا اور ملّی، قومی امراض کا جو علاج تجویز کیا تھا وہ آج بھی اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں مرض کی تشخیص بھی ہے اور دوا بھی۔''

(مکتوبات ابوالحسن علی ندویؒ (اوّل) مرتبہ مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی، ص:۴)

علی میاںؒ اسلامی جوش کے ساتھ مغربی تہذیب اور جدید تمدن کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور دین کے احیاء کے لیے اپنی ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھاتے ہیں چنانچہ مکتوبات سے ان کے مجاہدانہ کردار اور قائدانہ صلاحیت تدبر اور دور اندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خطوط علی میاںؒ کے زورِ قلم، قوّتِ بیان اور حسنِ انشا کے نمونے ہیں۔ علی میاںؒ کے بلند ذوق سلیم اور زبان پر کامل قدرت نے مکتوبات کی ادبیت اور قوّتِ تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔ مکتوبات کی زبان عالمانہ واضح اور مدلل ہے۔ مناسب و برمحل جملے وفقرے، قرآن وحدیث، سیرت طیبہ

اور واقعات صحابہ کے برمحل استعمال سے بلند پایہ عالموں کے مکاتیب کا علمی رنگ صاف جھلکتا ہے۔ یہ مکتوبات ان کے سالہا سال کے احساسات و تجربات کا نچوڑ ہیں۔ ان میں عالم عرب و عالم اسلام کے لیے فکر مندی کا برملا اظہار ہے۔ جس سے بناوٹ کا رنگ نہیں اصلیت، سچائی اور خلوص ظاہر ہوتا ہے۔

علی میاںؒ نے روسا، امراء، سلاطین، ممتاز علماء اور مشائخ وقت سے خط و کتابت کی۔ مشاہیر کے قلم سے ان کے خطوط کے جواب رسائل الاعلام کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ جوابی خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم عرب میں علی میاںؒ کو بلند مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ ان کی بات میں وزن و وقار تھا۔ عالم اسلام کے حکمراں، علماء انہیں اسلام کا سچا بہی خواہ سمجھتے تھے اور ان کی رائے پر اعتبار کرتے تھے۔ برصغیر کے مشائخ، علماء، مشاہیر بھی علی میاںؒ کی سادگی، اخلاص، للّٰہیت، عالمانہ بصیرت و بصارت کے معترف تھے۔ ان کی علمی، تعلیمی، دعوتی، اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کے قدردان تھے۔ مشائخِ وقت اُن سے احترام و محبت سے پیش آتے تھے۔ اُن کے خطوط کے منتظر رہا کرتے تھے۔

علی میاںؒ کا منفرد اسلوب مکتوبات میں بھی جھلکتا ہے اس منفرد اسلوب نے جس میں علوم و معارف اور دعوت اور اصلاح کا ذخیرہ موجود ہے۔ انہیں زبان و ادب کی دنیا میں ایک بلند ادبی مقام عطا کیا ہے۔ یہ مکتوبات بھی اُسی منفرد اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔

☆☆☆

خاندانِ علم اللّٰہی کے چشم و چراغ

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی امتیازی شان

جنگ عظیم اول ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کا پر آشوب زمانہ علی میاںؒ کی نشو ونما کا ابتدائی دور تھا نئی نئی تحریکات کا اُبھرنا، ہندوستان کی آزادی کی جدو جہد کا زور پکڑنا، اندرونی خلفشار کا ملک کی اقتصادیات پر اثر انداز ہونا، گرانی، بے اطمینانی کا دور دورہ، قحط کے آثار بیماریوں کا زور، باقاعدہ عملی کام کرنا یا کسی تحریک میں شامل ہونا بھی دشوار تھا، علماء کی جماعت، مسلمانوں کو بے دینی اور جہالت سے محفوظ رکھنے کے لیے کوشاں تھی، ندوۃ العلماء کے فضلاء بیدار مغزی اور زمانہ شناسی کے ساتھ اسی کام کی تکمیل کے لیے برسر پیکار تھے، علی میاںؒ کے والد مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، علمی، تحقیقی اور تنقیدی انداز کے بنیادی لٹریچر کی تیاری کی جارہی تھی، علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ مغربی علوم و ادب سے مرعوبیت کے خاتمے کی کوشش کر رہے تھے، نئے نظام اور نصاب تعلیم کی منصوبہ سازی کا عمل جاری تھا، تصنیف و تالیف اور تعلیم کے لیے اردو یا انگریزی کے بجائے عربی زبان کا انتخاب کیا جاچکا تھا، تا کہ عالم اسلام اور عالم عربی میں صحیح دینی جذبات اور خیالات پرورش پاسکیں، مسلمان مادّیت و مغربیت کے طلسم اور اقتدار سے محفوظ رہیں اور ایمان و عمل صالح کے ذریعہ خلافت اور نیابت الٰہی کے مستحق بن سکیں۔ یہ تصویر اس معاشرے کی ہے جس میں بیسویں صدی کی عظیم المرتبت عبقری شخصیت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذہنی وفکری ارتقاء ہوا۔

شاہ علم اللہ کی عبادت وریاضت، مجاہد کبیر سید احمد شہیدؒ کی تجدید و اصلاح،

جہاد و سرفروشی کا جذبہ، افراد خاندان کا علمی، دینی، تصنیفی ذوق بالخصوص علی میاںؒ کے خاندان میں دینی علوم کا نسل در نسل منتقل ہونا ایسے حقائق ہیں جن کی اہمیت مسلّم ہے۔ ''اکثر علم کئی کئی نسلوں کی آبیاری کے بعد برگ و بار لاتا ہے اور علم و عمل یعنی علمی بصیرت اور جہاد کا جذبہ بہت کم بیک وقت ایک خاندان میں جمع ہوتا ہے'' (خواجہ احمد فاروقی)۔ یہ امتیاز علی میاںؒ کے خاندان حسنی و حسینی کو حاصل ہے، علی میاںؒ نے خاندان کے خاموش علمی، تصنیفی اور مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی، والد کے تصنیف اور تالیف اور علمی ذوق کی وجہ سے علماء وادباء، اہل کمال کی آمد و رفت کا سلسلہ تھا، ۹ برس کے ہی تھے کہ والد دنیا سے چل بسے، اب ایک غمگین مگر ہوشمند ماں کے آغوش تربیت میں تعلیم کی ابتداء ہوئی، جامع صفات بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کی شفقتیں اور خصوصی توجہات شامل رہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دینی و علمی ماحول میں نشو و نما ہوا۔ خوش نصیب ایسے کہ علوم اسلامیہ اور فنون ادبیہ کی تکمیل علمائے عباقرہ اور یکتائے روزگار اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی۔ برادر اکبر حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کو جہاں بھی علم و عرفان کی شمعیں جلتی ہوئی نظر آئیں اپنے برادر عزیز کو وہاں بھیجا علی میاںؒ وہاں جاکر صحیح معنوں میں شمع کے پروانے بن جاتے، علمی دینی روحانی مجلسوں میں شریک رہنے والے خوش نصیب نوجوان نے ''ایسی مجلسیں دیکھیں جن میں خالص علمی گفتگو ہوتی تھی اور شروع سے آخر تک علم کا تذکرہ ہوتا تھا''۔ جلیل القدر روحانی مربیوں سے فیض حاصل کیا۔ اس پوری علمی، روحانی فضا نے علی میاںؒ کے قلب و جگر کو گرمایا اور علمی روایات ان کی شخصیت کا جزو بن گئیں۔ ''خاندان علم الٰہی جس نے میدان عمل میں سرفروشی کی روایت قائم کی تھی جب حالات نے کروٹ بدلی اور فکری جہد و سعی، دعوت و عزیمت کا دور آیا اور جہاد بالسیف کی جگہ جہاد بالقلم نے لی تو مشیت ایزدی نے اسی خاندان کی عبقری شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ عرف علی میاںؒ سے یہ کام لیا''۔ ۲۳ سال کی عمر میں مجاہد کبیر سید احمد شہیدؒ کی سیرت و سوانح مرتب کی، ان کے جذبۂ جہاد سے بہت متاثر ہوئے، یہ تاثر تاحیات قائم رہا۔

علی میاںؒ ایک صاحب طرز ادیب، بلند پایہ نقاد اور عربی و اردو ادب میں

منفرد اسلوب کے مالک تھے اس اسلوب کی بنیاد قرآن کریم اور علوم اسلامیہ ہیں قرآن کریم کے عمیق مطالعہ نے ان کے قلب وجگر میں حرارت پیدا کردی تھی اور وہ اس وحی ربانی کے اسرار وحکم کی لذت سے بہرہ یاب ہوگئے تھے اسی کو انھوں نے اپنا موضوع سخن بنایا، فیض قرآن نے انھیں تاریخ اسلامی کے گہرے مطالعہ کی طرف مائل کیا۔ ذہن وفکر کی وسعت عربی زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت نے ان کے دائرہ عمل کو وسیع کردیا۔ انھوں نے سرزمین عجم میں رہتے ہوئے حجازی 'لے' کو اپنے فکروخیال کے اظہار کا ذریعہ بنایا، اسلامی تاریخ قرآن وحدیث اور اقوام عالم کی تہذیب وتمدن کی تاریخ کے تجربات کی روشنی میں مسئلہ کا حل تلاش کرتے، وقت کے نازک اور پیچیدہ مسائل پر اُن کا قلم بڑی جرأت سے خبردار کرتا، آنے والے خطرات کی نشاندہی کرتا، مفید مشورے دیتا اور واضح اسلوب میں اپنا مقصد بیان کردیا کرتا تھا۔ ان کے طرزِ استدلال میں انفرادیت پائی جاتی تھی۔ تحقیق واستدلال کے ساتھ تحریکِ دعوت، اصلاحی جوش، صالح انقلاب کا شوق شامل ہوجانے سے ان کی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگئی تھی۔ دعوت دین، تعلیم وتربیت، اتحادِ ملت اور اصلاح معاشرہ ان کے خاص محاذ تھے۔ انھوں نے مشرق سے مغرب تک دینی فکر عام کرنے، اور صحیح جذبات، فکروعمل کو بیدار کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ تقریباً ۶۵ سال کا تصنیفی تجربہ رکھنے والے علی میاںؒ برصغیر، عالمِ اسلام اور عالمِ عرب میں ایک عظیم داعیِ دین، مصلح، امامِ وقت اور مجددِ فن تسلیم کیے گئے۔

علی میاںؒ کی پہلی قدردانی عالمِ عربی نے اُس وقت کی تھی جب دنیائے عرب کے ممتاز رسالہ ''المنار'' مصر نے اُن کا مضمون شائع کیا، اُس وقت علی میاںؒ کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ علی میاںؒ کی پہلی علمی تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' سب سے پہلے قاہرہ جیسے علمی وادبی مرکز سے شائع ہوئی۔ ان کے اعزاز میں سب سے پہلا تعارفی جلسہ عالم عربی میں منعقد کیا گیا، سب سے پہلا تعارفی مضمون احمد عبدالغفار العطار نے لکھا جو رسالہ ''الحج'' مكة المكرمة ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا،

سعودی ریڈیو سے نشر ہوا۔ اس مضمون میں ۳۸ سالہ نوجوان عالم دین، ملت کے سفیر کبیر علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد سے بھرپور مثالی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔

''موجودہ عہد میں ایک ایسے متبحر عالم کی ضرورت ہے جو ترقی علم، دقت نظر، بیداریٔ ضمیر، آزادیٔ فکر کے ساتھ پیکر تہذیب وثقافت اور کشادہ قلب ہو اور وہ دین کو اس زاویہ سے دیکھتا ہو جس سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دیکھتے تھے...... ایسے عالم کی ضرورت ہے جو عقیدہ کی صحت و پختگی، اعمال کی درستگی، پاکبازی اور راست بازی، پاکدامنی اور شرافت کے ساتھ مجسم اخلاق، منکسر المزاج، عالی ہمت، بلند حوصلہ ہو، مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہو...... موجودہ تہذیب وکلچر زمانے کے تقاضوں اور آداب سے واقف ہو علوم وفنون اور اس کی تاریخ وحقائق پر اس کی نظر ہو، زندگی اور انسانیت کی حقیقت کو سمجھنے والا ہو اور اس بات پر اس کا ایمان ویقین ہو کہ وہ دنیا کے لیے نہیں دنیا اس کے لیے بنائی گئی ہے وہ آخرت کے لیے عدم سے وجود میں لایا گیا ہے۔...... یہ جلیل القدر عالم اور داعی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے معروف ہیں انھیں رفعت شان اور عظمت ابھی سے حاصل ہے جب کہ ان کی عمر کوئی زیادہ نہیں...... اپنی عمر کی ۳۸ ویں منزل میں ہیں...... ان کی زندگی دین کی خاطر اللہ کی رضا کے حصول کے لیے محنت ومشقت سے پُر ہے...... دین پر عمل پیرا رہنے کے ساتھ دعوتِ خیر اور اصلاح امت کے جذبہ سے اُن کا دل معمور ہے۔ آپ فکر ارجمند اور دلِ دردمند رکھتے ہیں۔ یہ وہ عظیم ہستی اور جوہر نایاب ہے اور یہ وہ عبقری انسان ہیں جن کے دل میں انسانیت کا درد کوٹ کے بھرا ہوا ہے ایسے پارسا دین دار ہیں کہ جنھیں دیکھ کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنھوں نے راہِ خدا میں جان ومال کی قربانی دی اور انتہائی صبر وتحمل سے کام لیا۔ ان سب کے ساتھ اپنے کو حقیر ونا کارہ اور اپنے جہد ومساعی کو کم گردانتے ہیں، مولانا اپنے سلف کے ہی راستے پر ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی عبقریت اور شان امتیازی میں ہمارے نزدیک شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں یہ وہ عظیم شخصیت ہیں جو پیدا تو ہندوستان میں

ہوئے اور شہر لکھنؤ میں پروان چڑھے مگر عربی زبان جو اس ملک کی پردیسی زبان ہے اس پر انھیں ایسی قدرت اور عبور حاصل ہے کہ وہ جب بولتے ہیں تو اہلِ زبان بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اندازِ تحریر اور اسلوب نگارش ایسا ہے جو انھیں ماہر انشا پردازوں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ فصیح اللسان، نادرہ روزگار اور عبقری زمانہ ہیں......اُن کو ہم جس ناحیہ سے دیکھتے ہیں عظیم اور مثالی پاتے ہیں، ان کی دینداری، پاکبازی، تقویٰ وطہارت کو لیں وہ صاف طور پر نمونہ اسلاف نظر آتے ہیں۔

(ترجمہ۔ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی)

علی میاںؒ نے اسلامی تاریخ کے خدوخال اور فکر وثقافت کے ان اثرات کا مطالعہ کیا جو انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں رونما ہوئے تھے، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے عنوان سے ان کی یہ تصنیف ۱۹۵۱ء میں مصر سے چھپی، موضوع اور مواد کے لحاظ سے انھیں کامل اعتماد تھا۔ کتاب مصر اور عرب کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی کیونکہ عربی زبان میں ایک غیر عرب کے قلم سے اپنے موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب تھی ۔ یہ کتاب علی میاںؒ کی بصیرت، تبحر علمی، زبان و بیان پر قدرت کا امتحان تھی، مصر بلکہ عرب ممالک میں ادیبوں کی کہکشاں موجود تھی، مذہبی اور ادبی تحریکوں کا زور تھا۔ ہر جگہ علی میاںؒ کی یہ تصنیف پڑھی گئی۔ علی میاںؒ مصر وشام کے اہل قلم حضرات کے ردّعمل کے منتظر تھے، کتاب کو علمی، ادبی حلقوں میں سراہا گیا، مصر وشام کے جرائد نے تعریف کی، کتاب خود مصنف کے توقع سے زیادہ مقبول ہوئی، کتاب اور مصنف کتاب کی عرب و اسلامی ممالک کے ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی مصنف نے عرب ممالک کا دورہ کیا علماء ادباء سے تبادلہ خیال کیا، عرب و اسلامی ممالک کے موقر علمی ادبی تنظیموں کے رکن بنائے گئے ہر سال علمی سفروں کا سلسلہ شروع ہو گیا، علی میاںؒ عربوں کے جوش، ولولہ سے ان کے علمی و ادبی ترقی سے مسرور ہوئے لیکن ان کی کمزوریوں اور خامیوں سے اُداس بھی ہوئے چنانچہ عربوں کی خامیوں کو بڑی بے باکی اور جرأت سے بیان کیا۔ مستقبل کے خطرات سے آگاہ کیا امید افزا پیغام سے حوصلہ بڑھایا۔

عالمِ اسلام اور عالم عربی کے علمی حلقوں میں اُن کی تصانیف ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ اخوان المسلمین کے علمی حلقوں میں علی میاںؒ کی زبردست پذیرائی ہوئی، قائد اخوان مرحوم شیخ حسن البناءؒ کے انتقال کے بعد اخوانی نوجوانوں کو جس خلاء کا احساس ہونے لگا تھا علی میاںؒ کی تصانیف کے پُراعتماد، طاقتور علمی اسلوب نے اخوانیوں کے دھڑکتے دلوں کی ترجمانی کی اور ان کو سلامت طبع، عقل سلیم، فکر مستقیم اور اعتدال و توازن کی راہ دکھائی۔

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی رفعت علمی کے معترفین اور سچے قدردانوں میں اضافہ ہوتا رہا، تاریخی علمی اعزازات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے عالم عربی کے علمی وتہذیبی مرکز دمشق یونیورسٹی میں مدعو کیا گیا، ۱۹۸۰ء میں فیصل ایوارڈ دیا گیا جو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کا بنیادی حیاتی رکن اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس استشاری کا رکن منتخب کیا گیا، محاضرات کے لیے مدعو کیا گیا۔ علی میاںؒ فرماتے ہیں ''سب سے بڑا اعزاز اس وقت حاصل ہوا اور میری زندگی کا یادگار دن وہ تھا جب کعبۃ اللہ کے کلید بردار نے کلید باب کعبہ دے کر کہا'' آپ جس کو چاہیں کعبہ کے اندر لے جاسکتے ہیں، تکیہ رائے بریلی کے یتیم کے لیے وہ لمحہ بھی یادگار تھا جب حرم مکی کے خطیب نے اپنے جمعہ کے خطبہ میں اس کی کتاب سے اقتباسات پیش کیے''۔

وقت گزرتا گیا علی میاںؒ کا کاروانِ زندگی حسن رفتار کے ساتھ منزل کی طرف رواں دواں رہا، آپ نے ۸۷ سال کی عمر پائی۔ مختلف الخیال اصحاب فضل وکمال کے درمیان مقبول رہے، محبوب خاص و عام کا درجہ ملا، ملکوں کے سلاطین، وزراء، بڑے عہدے دار، اہلِ علم وفضل، طلباء اور عوام میں ان کے معتقدین کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کرگئی۔ عالمِ اسلام میں بلند مقام ومرتبہ حاصل ہوا، کئی علمی اعزازات اور ان کے ساتھ خطیر رقم پیش کی گئی، انعامات کی رقم کو رفاہی اداروں، علمی کام کرنے والوں، پیغامِ اسلام کی حفاظت کرنے والوں کے درمیان تقسیم فرمادیا کرتے، اپنی ذات پر

خرچ نہیں کرتے تھے۔

امتیازی شان رکھنے والے علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے اعتدال پسند مذہبی قائد تھے، ان کو محبوب العلماء، محبوب المشائخ اور مجموعہ حسنات جیسے القاب سے یاد کیا گیا۔ تمام اساتذہ، اکابرینِ دین، مشائخِ وقت آپ سے والہانہ محبت، مخلصانہ اور عاشقانہ اُنسیت کا معاملہ فرماتے تھے۔ آپ کی شخصیت مشرق و مغرب، عرب و عجم پورے عالمِ اسلام کی محبوب شخصیت تھی، علمائے کرام، مشائخ عظام، مشاہیر اُمت، قائدینِ ملت اور سربراہانِ مملکت سب آپ کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ کو محبوب رکھتے تھے، آپ کی شخصیت پر اعتماد کرتے تھے، آپ کی ہمہ گیر مقبولیت کی ۲۱ویں صدی میں دوسری مثال نہیں ملتی۔

کثیر الجہت جامع کمالات شخصیت کے مالک علی میاںؒ کی دینی، دعوتی، علمی، ادبی فتوحات کا ایک سلسلۂ دراز ہے ان کی فکر، جدّ و جہد اور دعوت کا دائرہ صرف ہندوستان اور برصغیر تک محدود نہیں تھا بلکہ پورے عالم اسلام تک پھیل گیا تھا مشرق میں ملیشیا، انڈونیشیا تک اور مغرب میں افغانستان، ایران ترکی، مصر، الجزائر اور مراکش تک، بلکہ یورپ و امریکہ میں مقیم ہندوستانی مسلمانوں کی سوسائٹیاں ان کے فکر و عمل کے دائرے میں تھیں۔ عالم عربی میں علی میاںؒ کی تصنیفات کی اشاعت اور مقبولیت چپہ چپہ پر ہوئی وہ دانش گاہوں سے لے کر عدالتوں اور جیل خانوں تک میں پڑھی گئیں۔ ہوا کے دوش پر بھی قسطوں میں ان کو عوام تک پہنچایا گیا اور ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ عربی میں تقریباً دوسو (۲۰۰) اور اردو میں تین سو (۳۰۰) تصانیف، تقاریر، خطبات ان کے خیالات کے ترجمان ہیں۔ اُن کی اکثر عربی کتابوں کے ترجمے، اور اردو کتابوں کے عربی ترجمے ان کے عزیز شاگردوں، بھتیجوں اور بھانجوں نے کیے۔ اس کے علاوہ انگریزی، اٹالین، فرنچ، جرمن، ترکی، انڈونیشی اور فارسی اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔

علی میاںؒ ایک بیدار مغز اور زمانہ شناس عالم دین، مفکر اور داعی تھے۔ وہ

زمانے کے کارواں سے بچھڑے نہیں تھے۔علمائے سلف کا احترام کرتے تھے،ان کے مسلک سے ہٹ کر نتیجہ نہیں نکالتے تھے،مسائل کا حل جدید انداز، جدید طرزِ فکر کی روشنی میں نکالتے تھے۔ جدید دریافت اور معلومات سے استفادہ کرتے تھے، ان کا اسلوب قدیم و جدید کا دلکش امتزاج ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں قدیم و جدید تعلیم یافتہ طبقات میں یکساں طور پر مفید و مؤثر ثابت ہوئیں۔ان کی ہر تصنیف کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس تصنیف کی شدید ضرورت تھی۔

علی میاںؒ سیاسی بصیرت رکھتے تھے، انھوں نے سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر کبھی اسلامی طرزِ فکر اور رجحان کو قربان نہیں کیا۔مسلم ممالک کے حالات کا جائزہ لے کر معاشرے کی تلخ تصویر پیش کی۔اسلام کی عظمت اور برتری ثابت کی،حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کا سبق دیا۔حکمت و موعظت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، وہ جدید معلومات اور ترقیات کے مخالف نہیں تھے بلکہ اسلامی اصول و اقدار کے تحت ردّ و قبول کا مشورہ دیتے تھے۔مغربی تہذیب، مغربی علوم اور اُس کے فلسفوں پر گہری اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔اُنھوں نے مغربی افکار و نظریات کا ایک عالم دین اور مفکر اسلام کی حیثیت سے جائزہ لیا،مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا،مغربی تہذیب سے متاثر ہونے کے بجائے جذبہ دینی کو متحرک کرنے کا پیغام سنایا،اسلامی دعوت کے بنیادی اصول اور طریقہ کار کے مطابق دعوت و تبلیغ کے لیے وہ سب طریقے استعمال کرنے کی تلقین فرمائی جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کیے تھے نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لانے کی تجویز پیش کی جو عصر جدید نے پیدا کردی ہیں۔وہ زمانے کی ضرورت اور تقاضے کو اوّلیت دیتے ، اعتدال اور توازن قائم رکھنے کے لیے طریقہ کار میں تبدیلی کو لازمی قرار دیتے تھے۔

''حضرت مولانا ہمیشہ باطل پرست قوتوں کے حریف رہے،خواہ وہ ''مغرب پرستی'' کے لبادہ میں سامنے آئی ہوں یا ''قومیت عربیہ'' کے نعرے کے جلو میں اُبھری

ہوں۔ یا ثقافتی لاؤلشکر کے ساتھ حملہ آور ہوئی ہوں یا کسی زہر آلود تحریک کے سہارے آگے بڑھی ہوں۔ انھوں نے دعوتی جذبہ، علمی صلاحیت، عصری واقفیت، مؤلفانہ جرأت و اعتماد کے ساتھ ان طاقتوں سے مقابلہ کیا اور فکر اسلامی کے پرچم کو بلند کیا''۔

(میرِ کارواں۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی)

اسلامی تاریخ ایسے داعیان حق علماء اور مجاہدین کے ذکر سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اربابِ حکومت کے روبرو کلمہ حق پیش کیا۔ علی میاںؒ کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون، شہادت کا جوش اور جہاد کا شوق رکھتا تھا۔ اسی لیے جرأت، حوصلہ مندی اور جذبہ ایمان ان کی کامیابی کی کلید بن گئی تھی۔ علی میاںؒ کی حیات کے بے شمار واقعات ایسے ہیں جو علمائے سلف کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ملک و قوم کی تعمیر و ترقی سے علیحدگی اور رجحانات اور جذبات سے بے خبری کا الزام اُن پر نہیں لگایا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے ملک ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں سے، عرب و اسلامی ممالک کے سربراہانِ مملکت سے ملکوں کے حالات و مسائل پر جرأت کے ساتھ گفتگو کی۔ ہمیشہ اصلاح حال، ملک کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی تلقین کی۔ ''اُن کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مخاطب کے لیے اس کے مقام و حیثیت کے لحاظ سے مناسب اسلوبِ کلام اختیار کرتے تھے۔ اگر بات میں تنقید کا پہلو ہوتا تب بھی اُن کا انداز محبانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا اُن کی تلخ بات بھی برداشت کرلی جاتی تھی''۔

(عہد ساز شخصیت۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی)

دارالعلوم ندوۃ العلماء ایک آفاقی اسلامی اسلوب، دعوت، تربیت اور فکر کا نام ہے۔ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۹۹ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستہ رہے آپ کا دورِ نظامت (۱۹۶۱ء سے ۱۹۹۹ء) ندوۃ العلماء کا دورِ زرّیں کہا جانے کا مستحق ہے۔ علی میاںؒ کے انقلابی اقدامات سے دارالعلوم کو خاص وقار اور اعتبار حاصل ہوا، لفظ 'ندوی' (جو دارالعلوم سے انتساب کی علامت ہے علی میاںؒ کے نام کا حصہ ہے) تمام ندوی برادری کے لیے باعث شرف و امتیاز ہو گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہی نہیں علی میاںؒ

سے نسبت کا نشان بن گیا۔

علی میاںؒ کو اہلِ زبان کی طرح عربی زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ اُنھوں نے ہندوستان میں رہ کر عربی زبان و ادب کی خدمت کی اور اس کے زندہ اور باصلاحیت زبان ہونے کا عملی ثبوت پیش کیا۔ عربی زبان کے علمی خزانے کو تلاش کرنے میں عربی زبان دانی کی صلاحیت سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ ندوۃ العلماء کے لیے عربی زبان و ادب کے نصاب کی اصلاح میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے فکر و عمل سے ندوۃ العلماء میں دعوت و عزیمت کی رفتار میں اضافہ کیا۔ دارالعلوم کے طلباء کے لیے تیار کردہ نصابی کتب نے عالمِ عربی میں بھی مقبولیت حاصل کی، علی میاںؒ نے ان نصابی کتب میں عربی زبان و ادب کے کتب خانے سے ایسے نادر ہیرے جواہرات منتخب کر کے پیش کیے، جن کی بلیغ تعبیرات پر انسان جھوم اُٹھتا ہے، اس کے ذہن و فکر میں وسعت پیدا ہوتی ہے، اندھی تقلید کے بجائے خود اعتمادی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے عرب و دیگر اسلامی ممالک کے ماہرین تعلیم نے علی میاںؒ کے اس انتخاب کو ادب کا بہترین انتخاب قرار دیا، عرب ممالک کی دینی درس گاہوں، کالجوں اور جامعات میں داخلِ نصاب کیا گیا۔

عبقری شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو علومِ اسلامیہ کا دائرۃ المعارف کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا، ان کی ذات میں علوم و معارف کی ایک وسیع دنیا آباد تھی، جس میں علمی، فکری، دعوتی، اصلاحی رنگ غالب تھا۔ اس کے حدود میں درس و تدریس، تصنیف و تالیف، اشاعت کتاب و سنت، شریعت کے اسرار اور مقاصد کی وضاحت، آنے والے عقلی دور کی رعایت، اسلامی علوم و افکار کا تحفظ، اسلامی تہذیب، سیاسی، فکری تبدیلیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ، ملت کے تحفظ و تشخص کے بقاء کی ممکنہ کوشش، مسلمانوں کی جدید نسل کو ذہنی، فکری، تہذیبی اور دینی ارتداد سے بچانے کی فکر، بلاتفریق مذہب و ملت، پیامِ انسانیت کا درس، علم و ادب میں مجتہدانہ فکر و نظر شامل ہے۔

بڑے فنکار وہ ہوتے ہیں جو صرف اپنی ترجمانی کرتے ہیں لیکن سب سے بڑے

وہ ہوتے ہیں جن کے دل سب کے لیے دھڑکتے ہیں، علی میاںؒ اپنے سینے میں وسیع اور کشادہ دل رکھتے تھے، اُن کی نظر وسیع اور فہم عمیق تھا، اس سے بھی بڑھ کر ان کا راسخ اور طاقتور ایمان، انسانیت کے احترام کا جذبہ، اسلام کی خدمت میں ان کا اخلاص اور اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مر مٹنے کا شوق، علم وبصیرت کی بنیاد پر قائم تھا۔

علی میاںؒ کی فکر انگیز ادبی، تاریخی تصنیفات، ان کے سفرنامے سیرت وسوانح پر ان کا وسیع کتب خانہ اور اُن کے خطوط علم وادب کی دنیا کے لیے سعادت کا نشان ہیں۔ عربی زبان کی اداشناسی، برجستگی، روانی اور قدرت نیز موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے علی میاںؒ کی تصنیفات ہندوستان کے گلشنِ اردو اور دبستان عربی اور عالمِ عربی کے ادبی سرمایہ میں بھی منفرد اور جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے تحقیق وتنقید کو گلے ملا کر اپنی علمی ادبی کارناموں میں وزن ووقار پیدا کیا۔ ان کا اصل سرمایہ افتخار علمی، ادبی، دعوتی، تاریخی، سوانحی، اصلاحی تصنیفات ہیں جو معاصر عالمی عربی، عالمی اردو لٹریچر میں انفرادیت کی حامل ہیں۔

اُن کو تحریر ہی نہیں تقریر پر بھی ملکہ حاصل تھا۔ اُن کی تقاریر بڑی مؤثر، دلکش ہوتی تھیں، سامعین کے احساسات کو چھو لینے والی۔ جب وہ تقریر کرتے تو الفاظ کا ایک سمندر دماغ سے زبان پر آنے کے لیے بے چین اور بے قرار ہوتا تھا۔ بات فکر انگیز، چھوٹے چھوٹے جملوں میں انداز نہایت پُر اثر، دل سے نکلی بات لوگوں کے دلوں پر دستک دیتی تھی۔ دعوت دین کی مخلصانہ تڑپ بلکہ بے کلی، بے چینی نے اُنھیں پُر کشش بنا دیا اور اہلِ زبان کو مجبور کیا کہ وہ نہ صرف یہ کہ اُن کے تفکر کا اعتراف کریں بلکہ ان کے افکار وخیالات کو حرز جاں بنائیں اور اس کی تائید ومدح میں رطب اللسان ہوں۔

عالمِ عرب میں سب سے پہلے ان کے پیش کردہ اسلامی ادب کے تخیل کو عملی شکل میں لانے کے لیے قدم اُٹھایا گیا رابطة الادب الاسلامی العالمیه کی تنظیم حرم مکی کے سائے میں ہوئی اور اب اس کا سایہ ملیشیا سے مراکش تک پھیل گیا ہے۔ علی میاںؒ اپنی تحریروں کے توسط سے عربی زبان کے مصنف کی حیثیت سے ہی منظر عام پر نہیں آئے

بلکہ عربی زبان میں ایک خاص اسلوب کے موجد کہلائے ان کے اُسلوب میں زبان و بیان کی شگفتگی اور فکر وجدان کی بلندی پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے۔ان کا ادبی ذوق ان کے علم اور فکر پر حاوی نہیں ہوتا، انھوں نے عربی اور اردو نثر نگاری کو ایسا لہجہ دیا جس میں ’’ ابن تیمیہؒ کا جوش ، امام غزالیؒ کا تصوف وفلسفہ ، امام احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی حکمت ودانائی، سید احمد شہیدؒ کی جانفشانی اور دلسوزی اور علامہ اقبالؒ کے سوز وساز کی گونج سنائی دیتی ہے‘‘۔

علی میاںؒ ایک باکمال عالمِ دین ، فاضل محقق ،سوانح نگار اور مؤرّخ تھے،اُن کا ذہن وفکر بہت وسیع تھا دینی علوم پر کامل دسترس رکھتے تھے،جس موضوع پر قلم اُٹھاتے، اُس کے بارے میں پورا اسلامی کتب خانہ کھنگال لیتے ، بنیاد اگرچہ قرآن پاک اور احادیث نبویہ کو ہی بناتے ،تاہم مواد ضروری مستند مآخذ سے حاصل کرتے ،خواہ وہ مخالفین اور مستشرقین کے خیالات اور تصنیفات ہوں یا دیگر مذاہب کی کتابیں،علی میاںؒ کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں ۔علمائے اسلام نے اس مسئلہ کو کس انداز سے دیکھا ہے وہ بھی ان کے پیشِ نظر رہتا، زمانے کی عقلی سطح کے مطابق تشریح وترجمانی کے مقصد کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ان کا طریقہ کار سنجیدہ سلجھا ہوا خیر خواہی پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ ایسا طرزِ بیان اختیار کرتے جو تمام ضروری معلومات کو مہیا کرتا، مسئلہ کی وضاحت کرتا، جمود اور تقلید کی فضا کو صاف کرتا، اسلام اور اسلامی علوم کے ذخیرے کو زندگی میں منتقل کرتا، معاصر نسلوں اور دماغوں کو ایسے فیصلہ کن نتائج پر پہنچاتا جس سے طبیعت میں انشراح پیدا ہوتا، وہ اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ اُن کا زمانہ نئے دلائل ، نئے استدلال اور نئے اجتہاد کا طالب ہے۔اُن کو اپنے مقصد سے والہانہ عشق تھا کسی ایسے موضوع کو زیر بحث نہیں لاتے تھے جو اُن کے مقاصد جلیلہ سے متصادم ہو،اُن کی زبان، اُن کا قلم پُر اعتماد، طاقتور اور علمی اسلوب میں اسلام کی دینی روح کی صحیح تعبیر وترجمانی کے لیے وقف تھا۔تصنیف خواہ تاریخی ہو یا ادبی،اس کا موضوع سیرت وسوانح ہو یا کسی سفر کی روداد، خطوط ہوں یا تقاریر، ان کا یہ طرزِ فکر ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔علی میاںؒ

کے زرّیں خیالات اُن کا پُر اثر اسلوب اور اُن کا پُر اعتماد لہجہ عالمِ انسانیت بالخصوص دینی، دعوتی، تجدیدی و اصلاحی کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم وافکار کے سب سے بڑے ترجمان ونمائندہ اور تحریک ولی اللّٰہی کے روحِ رواں علی میاںؒ ایک عہد ساز، عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ ''وہ صرف ایک راہ کے راہی نہیں، متعدد شاہراہوں کے رہنما ہیں، عصرِ حاضر کی زبان میں، دعوت دین کے میدان میں، اسلام پسند ادیبوں کی پہلی اجتماعی کوشش کے سربراہ کی حیثیت سے، ادبِ اسلامی کے قواعد وضع کرنے کے اعتبار سے اور ادب کے سرچشموں کی نشاندہی کرنے والے رہنما کی حیثیت سے، ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں''۔

(مقدمہ نظرات في الأدب)

علی میاںؒ نے اپنے علمی نظریات تازہ خیالات جدید تحقیقات کو طاقتور علمی اسلوب اور پُر اعتماد لہجے میں پیش کیا۔ انھوں نے عربی، اردو ادب کو ایک ایسا لہجہ دیا جس میں اسلامی فکر ورجحان، جوش، خلوص، حکمت اور دانائی، دلسوزی و دردمندی یکجا نظر آتی ہے، اُن کا اسلوبِ تحریر برصغیر اور عالمِ عرب میں مقبول ہوا۔ جید علماء وادباء نے ان کی مساعی کا صمیم قلب کے ساتھ اعتراف کیا۔ اہل قلم انشاء پردازوں نے اس مخصوص اسلوب، طرزِ فکر کی تقلید کی اور اسلامی رجحانات کے حامل انشاء پردازوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی۔ عرب ممالک کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے لے کر علماء وفضلاء تک نے ان کی تصنیفات کو قدر کی نظروں سے دیکھا۔ عالمِ عرب میں وہ شخص پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جس نے ''شیخ ہندی'' کی تصانیف نہ پڑھی ہوں۔ علمی حلقوں میں ان کی ہر نئی تصنیف کا پُر جوش استقبال کیا جاتا۔ بلاشبہ ہندوستان کے باکمال عربی، اردو مصنّفین کی جتنی مختصر فہرست بنائی جائے ہندوستان کی عبقری شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے بغیر نامکمل رہے گی اور ترتیب ومراتب کے لحاظ سے بھی ان کا نام اتنا پیچھے نہیں رہے گا جتنا تاریخ کے لحاظ سے ان کا زمانہ پیچھے ہے۔

عبقری شخصیت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی

ہند و بیرونِ ہند علمی اداروں سے وابستگی

۱۔ ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ)	(۱۹۶۱ء)
۲۔ رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم (دیوبند)	(۱۹۶۱ء)
۳۔ المجمع اللغۃ العربیہ دمشق کے مراسلاتی ممبر	(۱۹۵۶ء)
۴۔ صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ	(۱۹۸۳ء)
۵۔ رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (سعودی عرب)	(۱۹۶۲ء)
۶۔ رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ (سعودی عرب)	(۱۹۶۳ء)
۷۔ سابق وزٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی (شام)	(۱۹۵۶ء)
۸۔ سابق وزٹنگ پروفیسر جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ)	(۱۹۶۳ء)
۹۔ صدر، بورڈ آف ٹرسٹیز اسلامک سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی (انگلینڈ)	(۱۹۸۳ء)
۱۰۔ صدر مرکز دراسات الاسلامیہ آکسفورڈ	(۱۹۸۳ء)
۱۱۔ بانی وصدر، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ)	(۱۹۵۹ء)
۱۲۔ صدر، دینی تعلیمی کونسل (اُتر پردیش)	(۱۹۶۰ء)
۱۳۔ بانی وصدر ''تحریک پیامِ انسانیت'' ہند	(۱۹۵۱ء)
۱۴۔ بانی وصدر عالمی رابطہ ادب اسلامی	(۱۹۸۴ء)
۱۵۔ صدر المجمع العلمی البحوث الحضارة الاسلامیہ (لکزمبرگ)	(۱۹۸۵ء)
۱۶۔ صدر مجلس عاملہ شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ)	
۱۷۔ رکن المجمع العلمی العربی دمشق (شام)	(۱۹۵۷ء)
۱۸۔ رکن مجلس عاملہ رابطة الجامعات الاسلامیة رباط (مراکش)	(۱۹۷۳ء)
۱۹۔ رکن المجمع اللغة العربیہ، عمان (اردن)	(۱۹۸۰ء)
۲۰۔ رکن نیشنل فاؤنڈیشن فار ٹرانسلیشن ریسرچ اینڈ اسٹڈیز (تیونس)	
۲۱۔ رکن انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا (سوئزرلینڈ)	(۱۹۶۰ء)
۲۲۔ رکن مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ)	
۲۳۔ رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت (لبنان)	
۲۴۔ رکن مؤسسة آل بیت (اُردن)	(۱۹۸۰ء)

☆☆☆

عبقری شخصیت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی علمی قدر دانی

علی میاںؒ ایک ایسی نادرۂ روزگار، مجموعۂ کمال ہستی کا نام ہے جن کی عبقری شخصیت کسی اعتراف، شہادت یا ثنا خوانی کی محتاج نہیں ہے۔ ظاہر پرستی، نام ونمود اور شہرت سے بے نیاز رہنے والے علی میاںؒ نے تواضع، انکساری، تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ عظیم الشان علمی، دینی ملی خدمات انجام دیں۔ آپ کی جدوجہد کا مرکز دعوتِ دین، تعمیر ملت اور اصلاحِ امت تھا۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ ان مقاصد جلیلہ کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ انھیں امتیازی کارناموں کے ذریعہ اللہ نے انفرادی شان عطا کی۔ علی میاںؒ کی مثالی شخصیت کے امتیازات، ان کی علمی وفکری میراث کو معاصرین، مشائخ، اساتذہ وتلامذہ برصغیر، عالمِ اسلام اور عالمِ عرب کے جید علماء اور دانشوروں نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس محبوب خاص وعام ہستی کی علمی قدردانی کرنے والے اداروں اور افراد نے اپنے نام، اعزازات اور زرّیں خیالات کو علمی تاریخ کا حصہ بنالیا ہے۔

عالمِ ربانی

☆ علامہ شیخ یوسف القرضاوی

عالمی شہرت یافتہ عالمِ دین، تحریک اخوان المسلمین کے عظیم داعی، باکمال خطیب علامہ یوسف القرضاوی کو علی میاںؒ سے خاص تعلق تھا۔ شیخ اصلاً مصری ہیں عرب علماء میں ان کو خاص احترام حاصل ہے۔ ''نغمہ ہندی کی حجازی لے پر'' رسالہ ''قیمة الاسلامية بين الامم ودورها فى العالم'' میں بلند کلمات تحریر کیے ہیں۔

''شیخ ابوالحسن علی حسنی عالمِ ربانی ہیں، عالم باعمل ہیں، علم پر عمل کے ساتھ خیر کی تعلیم دیتے ہیں اس کی طرف بلاتے ہیں، علمائے سلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''عالم ربانی وہ ہے جو اپنے علم پر عمل پیرا ہو اور اسی کی تعلیم دے اُسی کی طرف بلائے''۔

شیخ ابوالحسن علی حسنیؒ حکیمانہ انداز میں دعوتِ دین کا کام کرنے والے ایسے داعی ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے ہیں، عصرِ حاضر کے مسلمانانِ

عالم کے لیے ان کی ذات مثالی ہے ان کے طریقۂ دعوت میں تجدیدی انداز پایا جاتا ہے، اُن کے مزاج میں رقت اور نرمی ہے۔ یہ اُن کے ایسے فضائل ہیں جو صرف انبیاء کرام کے وارثین اور نائبین رسول ﷺ اور دین کے تجدیدی کام کرنے والوں کے حالات و واقعات میں ہی ملتے ہیں، تعلق مع اللہ اور عشقِ رسول کے ساتھ اُنھیں فکرِ سلیم، مؤثر اندازِ گفتگو، دعوت کی گرم جوشی اور عمل کی درستگی سے نوازا گیا ہے۔

اُن کا اعتدال و توازن، اسلامی حلقوں میں معروف زبان زد عام ہے، انھیں صفات اور خوبیوں نے اُن کی باتوں کی تاثیر کو دوبالا کر دیا ہے، تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی کتابوں کا پیاسا بنا دیا ہے وہ ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ مسلمانوں کے مختلف الخیال جماعتوں اور تحریکوں اور مکاتب فکر میں قبولیت عام حاصل ہے، حتیٰ کہ جو شخص اُن کی رائے اور نظریہ سے اتفاق نہیں رکھتا وہ بھی اُن کی قدردانی پر مجبور ہے، ان کا مدّاح، ان کی وسعت قلبی اور خوبیوں کا معترف ہے...... شیخ ندوی عالمانہ، حکیمانہ، پُراثر اسلوب، طاقتور اور پُر اعتماد لہجے میں نوجوانوں کو اپنی فکر اور دردِ دل اور علم کا نادر تحفہ پیش کرتے ہیں جو عقلوں کو جِلا بخشتی ہے۔ ایمانی حرارت سے دلوں کو گرما دیتی ہے وہ (نوجوان) آپ کی (علی میاںؒ) ذات میں مسلمان کی شان، مومن کی صداقت، صحابہ کا صبر و ثبات، زہد و استغنا کی طاقت، علم کا وقار اور اس داعی کی روح پاتے ہیں جس کی عبادت کا خلوص تقرب اِلی اللہ کا ذریعہ بنتی ہے۔

علامہ شیخ یوسف القرضاوی طالب علمی کے زمانے میں علی میاںؒ سے ۱۹۵۱ء میں مصر میں پہلی بار ملے تھے تب اُن کی تقریریں سنی تھیں، اس وقت علی میاںؒ مشرق وسطیٰ کا ایک داعی اور زائر کی حیثیت سے سفر کر رہے تھے۔ شیخ یوسف قرضاوی، علی میاںؒ کی اس زمانے کی تقاریر کے بارے میں لکھتے ہیں ''تقریر کیا تھی معلوم ہوتا تھا • وسلا دھار پانی برس رہا ہے، قادر الکلامی، جادو بیانی کا نمونہ، جو بہت دن بعد دیکھنے میں آیا۔ عربی زبان کی شیرینی و حلاوت، مقرر کے جذبۂ ایمان کی حرارت کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی کہ شعلہ و شبنم کا امتزاج نظر آ رہا تھا۔ یہ دل کی وہ

زبان ہے جس کے لیے کبھی ترجمانی کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس کو سننے سے زیادہ محسوس کیا جاتا ہے''۔

شیخ ابوالحسن علی حسنی نے دنیا کا سفر اللہ کے لیے کیا ہے تقریر وتحریر، تبادلۂ خیال، پندوموعظت، ارشاد ورہنمائی ہر طرح سے دعوتِ اسلام کا حق ادا کرتے ہیں، انھوں نے عزیمت کو اپنا شعار بنائے رکھا، حق کی صدا لگاتے ہیں کسی جگہ پہنچ جائیں اس شعار میں فرق نہیں آتا، خلوص سے بے لوثی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ اُن کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ باکمال اہلِ قلم، مؤقر اصحاب رائے کے ساتھ ساتھ اپنے سے کم عمر ادیبوں سے بھی اپنی تصانیف پر تنقید کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اپنی تحریر پر تنقید کا برا نہیں مانتے بلکہ حضرت عمرؓ کے اس اسوہ پر عمل کرتے ہیں فرمایا کرتے تھے ''اللہ تعالیٰ اُس آدمی پر رحم فرمائے جو مجھ کو میرے عیوب سے باخبر کردے''۔ شیخ ندوی میرے پسندیدہ انسان ہیں، اُن سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔ ان کے اخلاص، اُن کے تعلق مع اللہ، اُن کے زہد اور تقویٰ، اُن کے پاکیزہ خیالات اور صفائی باطن کی وجہ سے میں ان کو بے حد پسند کرتا ہوں، جو شیخ ندوی کو جانتا ہے اور اُنھیں پہچانتا ہے وہ اُن سے محبت کرتا ہے''۔

(قیمة الاسلامیة بین الامم ودورها فی العالم. شیخ یوسف القرضاوی)

علی میاںؒ کی عالمانہ بصیرت

☆ جامعہ ازہر مصر کے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود

''آپ نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کر رکھی ہے اور اپنے شب وروز ایک مخلص اور متقی مسلمان جیسے گزار رہے ہیں۔ آپ نے پاکیزہ اسلوب وکردار اور فکر انگیز اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اسلام کی آواز کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلایا ہے نیز دور دراز ممالک کے اسفار کے ذریعہ آپ نے اسلام کی اشاعت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور لوگوں کی رہنمائی ورہبری فرمائی''۔

ایک مخلص مومن

☆ مفتی امین الحسینی فلسطین کے مفتی اعظم، ایک عالم دین اور عظیم مجاہد

’’آپ کو مومن مخلص کی شان کے مطابق مرض کی تشخیص اور اس کے لیے دوا تجویز کرنے کی سعادت کی توفیق (منجانب اللہ) حاصل ہوتی ہے، اللہ سے دعا ہے کہ امت کے اندر آپ جیسے مخلص علماء کی تعداد کو بڑھائے اور اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔‘‘ (آمین)

کتابیں بیش قیمت سرمایہ

☆ عظیم المرتبت اسلامی ادیب، جامعہ ازہر کے استاد ڈاکٹر احمد الشرباصی

شیخ ابوالحسن علی کو کتب بینی کا بے حد شوق ہے، کتابیں اُن کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہیں، ان کو پیش کیا جانے والا بیش بہا تحفہ وہ کتاب ہے جو انھیں دی جائے اور انھیں خوش کر دے، ان کا گھر کتابوں سے مزین ہے لیکن وہ ساری کتابیں ان کے ذہن کا جزو بن چکی ہیں ان کی تصانیف کی بحث، جائزہ و تحقیق اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انھوں نے رات رات بھر پڑھا ہے‘‘۔

آسمانی نغمہ، بے ردیف قافیہ کی شاعری

☆ عالم عربی کے صف اوّل کے مشہور صاحب قلم، ادیب، ہائی کورٹ شام کے سابق جج استاد علی طنطاوی

’’میرا اپنے بارے میں اعتماد متزلزل ہو گیا تھا لیکن برادرم ابوالحسن! جب میں نے آپ کی کتاب ’الطریق الی المدینۃ‘ کو پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ شوق میرے اندر پھر انگڑائی لینے لگا ہے اور میرے سینے میں پھر وہی تپش ہے اس طرح پھر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے بالکل خالی نہیں ہوا ہے لیکن افکارِ زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد آلود کر دیا تھا۔ آپ کی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کر دیا۔

ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اُٹھنے لگا تھا چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ

سے نظر نہیں آیا جس کی لے میں شریف رضی کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے، جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے لیکن بے ردیف قافیہ کی شاعری''۔

(پیش لفظ۔ الطریق الی المدینة۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

سیرت وکردار کی بلندی

☆ شیخ محمد المجذوب ملک شام کے ایک جید عالمِ دین اور جامعۃ اسلامیہ مدینہ منورہ میں استاد تھے، گراں قدر تصنیف ''علماء و مفکرون عرفتھم'' میں علی میاںؒ کی تصنیف وتالیف کی خصوصیات اور دنیا سے بے نیازی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''شیخ ندوی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ادبی تحریر میں ایک سحر ہے ایک جادو ہے جو عموماً دوسرے مصنّفین کی تحریروں میں نہیں ملتا......۔

................حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اس نیک بندے کے اخلاص کو قبول فرمالیا ہے.....شیخ، جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی مجلس انتظامی کے تاحیات رکن ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی بھی جامعہ سے ایک پیسہ نہیں لیا اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کبھی کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوں حالانکہ اس کمیٹی میں شرکت کی غرض سے ان کو بارہا آنا پڑا مجھے تمام علماء امت میں اُن (شیخ ابوالحسن علی) جیسے عظیم زاہد کی مثال نہیں ملتی۔ دنیا سے بے نیازی اس کمزور ونحیف جسم کی خصوصیت ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جس کی بناء پر وہ معاشرہ کی خرابیوں پر اُنگلی اُٹھانے اور اس کی اصلاح میں پورے طریقے سے لگے ہوئے ہیں۔ نہ کسی غلط کو صحیح کہتے ہیں نہ کسی حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں آپ کی گفتگو کانوں میں رس گھولتی ہے اور آپ کی باتوں میں ایسی حقیقت بھری ہوئی ہے کہ اس کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا''۔

علمائے سلف کا نمونہ

☆ محدث جلیل، ممتاز مفکر اور داعی شیخ ابوالفتاح ابوغدہ (استاد حدیث جامعہ محمد بن سعود، ریاض)

''آپ نے عالی مرتبہ علمائے سلف کی یاد تازہ کردی، آپ الحمدللہ ان اسلاف

کرام کی یاد دلانے کا بلند نمونہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا فرمادی ہے اور اللہ کی محبت کے سبب انھیں لوگوں میں محبوب بنادیا ہے، آپ کا اس اعلیٰ نمونہ کا ہونا تعجب خیز نہیں...... گھنے سایہ دار درخت کی شاخیں تازہ ہری بھری اور شاداب ہی ہوا کرتی ہیں وہ ہر وقت اپنی عطر بیزی سے ماحول کو معطر کرتا رہتا ہے...... اللہ تعالیٰ نے آپ کو قلم کی طاقت، تحریر کی تاثیر اور اخلاص کی دولت سے نوازا ہے۔ آپ کی باتیں نوجوانان ملتِ اسلامیہ کے دلوں کی کنجی، اُن کے ارادوں اور ہمتوں کی بیداری اور کامیاب مہم جوئی کا وہ پیغام ثابت ہوتی ہیں جس سے امت مسلمہ کا پہلا قافلہ بہرہ ور تھا''۔

علمی قدر و قیمت کا اعتراف

☆ ملک شام کے جلیل القدر عالم، ادیب اور مؤرخ، علم اللغۃ والنحو کے امام جامعہ دمشق کے استاد شیخ **محمد بهجة البيطار**

''میں نے پوری کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ ڈالا، کتاب میں ایسے نوادر اور فوائد موجود ہیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ میرا قلم ان فوائد و نوادر کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ پاک و برتر ہے وہ ذات جس نے آپ کو فصیح و شستہ عربی زبان لکھنے کی قدرت عطا کی۔ آپ کے اندازِ تحریر میں عجمیت کا شائبہ تک نہیں۔ خدا کا شکر ہے اور ستائش ہے کہ آپ کو بہترین تصنیفی صلاحیت اور تحقیق کا وہ امتیاز بخشا جو اس بے راہ روامت کے لیے مفید و مناسب ہے''۔......

..........صدیق مکرم۔ آپ جب بھی یاد آئے یا دوست احباب میں آپ کا تذکرہ ہوا تو میں نے آپ کی وسعت علمی، ادبی کمال، دلکش گفتگو، آپ کا اپنے ہم نشیں کو اپنے گراں قدر خیالات، پسندیدہ معلومات سے مستفید فرمانے کا تذکرہ کیا''۔

منارۂ نور

☆ صاحب قدرت اسلامی مضمون نگار، ماہر مسلم صحافی، اخوان المسلمین کے ترجمان رسالہ الدعوۃ کے اجراء کرنے والے شیخ صالح عشماوی

''آپ نے ہم لوگوں میں ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو مٹ نہیں سکتے۔ وہ

یادیں چھوڑی ہیں جو بھلائی نہیں جاسکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے علم واخلاق کریمانہ سے ہم لوگوں کو گرانبار کردیا۔ ہمیں آپ کے اندر باعمل علمائے سلف اور مومنین مخلصین کا عکس نظر آیا۔ اللہ آپ کو اسلام کا نمائندہ اور مسلمانوں کے لیے منارۂ نور کی حیثیت سے تادیر باقی رکھے عمر دراز فرمائے''۔

روحانی غذا

☆ مجاہد، عالم، خطیب شیخ محمد محمود الصواف (معتمد ملک فیصل، سعودی وزرائے تعلیم کے مشیر)

''آپ کے گراں قدر ہدیہ (اسمعی یا مصر) سے مشرف ہوا، آپ کی اس عنایت پر شکر گزار ہوں، دل سے آپ کی صحت و سلامتی اور درازیٔ عمر کی دعا نکلتی ہے کہ لوگ اس روحانی غذا سے فیضیاب ہوتے رہیں جو آپ نے عربی جوانوں کو پیش کی ہے۔ کاش مصر سنتا، کاش کہ عالمِ عربی، جس سے آپ بہت زیادہ خوش گمان ہیں وہ بھی سنتا، آپ نے اس سے جو کچھ کہا وہ سمجھتا اور یاد رکھتا۔ وہ آپ کی نصیحتوں کو حرزِ جاں بناتا تو کامیاب و بامراد ہوتا، خوش بختی اس کا دامن تھامتی۔ لیکن افسوس عالمِ عربی کو اس کے سربراہوں اور حکام نے ضائع کردیا اور اُسے غلط راستے پر ڈال دیا''۔

ناقابلِ فراموش رہنما

☆ عالمِ اسلام کے معروف عالم، ادیب اور انشاء پرداز ڈاکٹر عبدالباسط بدر
(استاد عربی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ)

مولانا ابوالحسن علی نے ثابت کردیا کہ وہ صرف ایک راہ پر نہیں متعدد شاہراہوں پر ہمارے لیے راہ نما ہیں۔ عصری حاضر کی زبان میں، دعوتِ دین کے میدان میں، اسلام پسند ادباء کی پہلی اجتماعی کوشش کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے، اور ادبِ اسلامی کے قواعد کے وضع کرنے کے اعتبار سے اور اُس کے سرچشموں کی نشاندہی کرنے کے لحاظ سے، ان کی رہنمائی ناقابل فراموش ہے۔

تاروں کی جھرمٹ میں آفتاب

منفرد صاحبِ قلم، صاحبِ طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

علی میاں'' مرحوم نہیں ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں اور خدا کرے خدمتِ دین و

ملت کے لیے مدتوں اس خاکداں کو زندہ و سرسبز رکھیں۔ سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں لیکن علم و فضل میں، سنجیدگی و فکر میں، اخلاص میں، اخلاق وتقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت وطاعت میں، میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل، رائے بریلی کے سیدزادے، خاندان کے اور لوگوں سے بھی واقف ہوں باپ اور بھائی کا کیا کہنا دونوں نورٌ علی نور، پاک صاف، طاہر مطہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) سے بنے ہوئے دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابل قدر و قابلِ فخر یہ ان تاروں کے جھرمٹ میں آفتاب، ندوہ اور دیوبند ماشاء اللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا، اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے (اور انھیں میں مائیں اور دادیاں شامل ہیں) اخلاق وروحانیت کا سبق لیا، ذکاوت و فطانت کے پتلے پہلے سے تھے، چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے، انگریزی بھی بقدر ضرورت تحصیل کرلی اور عربی ادب و انشاء میں تو ہندوستان اور عالمِ اسلام میں نام پیدا کرلیا ہے، خود اردو شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق رکھتے ہوئے، شامی اور مصری صحافت پر بھی سیر حاصل نظر کرلی، تقریر و حکایت میں ملکہ، روانیِ تحریر سے بھی زائد......، ندوہ جیسے بڑے دارالعلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ، ابھی یہاں، ابھی وہاں اور مقالات وتصانیف ہیں کہ ساتھ ہی کھٹا کھٹ نکلتی چلی آرہی ہیں۔

زندگی قابلِ داد بھی ہے قابلِ رشک بھی

اتنے کام مختلف اپنے سر لے رکھے ہیں کہ کوئی ان کی مفصل فہرست ہی بنالے تو یہی ایک کمال ہے۔

(معاصرین۔ص:۲۱۷۔۲۱۸۔مطبوعہ ادارہ انشاء ماجدی کلکتہ)

زندہ جاوید شخصیت

☆ مولانا سعید احمد اکبرآبادی (سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مولانا علی میاںؒ کو دیکھو بلادِ مشرق سے لے کر یورپ اور امریکہ تک ان کے علم سے منور اور ان کے قدموں میں گرنے کو تیار ہے۔ مولانا علی میاںؒ جن پر ہزاروں پروفیسران قربان کیے جاسکتے ہیں وہ زندہ جاوید ہیں، ان کا کام دائمی ہے پوری دنیا ان

کی تعریف میں مدح سرا ہے۔

ہندوستان کے حجازی خطیب ☆ شورش کاشمیری

مولانا ہندوستان کے حجازی خطیب ہیں عرب ادیب وخطیب ان کی عربی زبان دانی پر رشک کرتے ہیں بعض اسلامی عربی مسائل پر ان کی تجزیاتی کتابیں، عصری وسیاسی مسائل پر ان کی تقریریں، ادب وخطابت کا عظیم سرمایہ ہیں اور ان سے کئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں مثلاً اظہار کا طریق، اسلوب کا رنگ، الفاظ کا استعمال، معانی کا جماؤ، سلاست کا نکھار، متانت کی چاشنی اور ایجاز واختصار کی رونق''۔

ملت کے سفیر کبیر

☆ پروفیسر رشید احمد صدیقی (سابق پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جس خاندان کے چشم وچراغ ہیں وہ صدیوں سے اب تک غیر منقطع طور پر مذہب واخلاق، رشد وہدایت، تصنیف وتالیف اور زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے، ان حسنات کی جلوہ گری ان کی شخصیت ہی میں نہیں علمی، ادبی، دینی خدمات میں بھی ملتی ہے۔ عربی زبان وادب نیز تحریر وتقریر میں موصوف کو جو غیر معمولی درک حاصل ہے اور عالمِ اسلام کے دینی ثقافتی مسائل پر جیسا عبور ہے، اس کے سبب سے موصوف کے فرمودات کو ہندوستان ہی نہیں باہر کے ممالک اسلامیہ میں جو وزن اور وقعت حاصل ہے وہ موجودہ ہندوستان کے شاید ہی کسی عالمِ دین کے حصّہ میں آئی ہو، اس بناء پر سید صاحب کو ملّت کا سفیر کبیر بننے کا حق پہونچتا ہے''۔

خدمتِ اسلام کے لیے وقف ☆ مولانا ماہر القادری

حضرت مولانا علی میاںؒ نہ صرف برصغیر ہندوپاک بلکہ تمام عالمِ اسلام میں شہرت ومقبولیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحبِ تقویٰ مفکر اور عالمِ دین ہی نہیں بلکہ ان کی انشاء پردازی کی سارے عرب میں دھوم ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی خدمتِ اسلام کے لیے وقف ہے۔ سفر ہو، حضر ہو، جلوت ہو یا خلوت، ہر عالم میں اللہ تعالیٰ

کے دین کی خدمت ہی میں کسی نہ کسی عنوان سے منہمک رہتے ہیں''۔

صاحبِ نظر بھی اور صاحبِ قلم بھی

☆ مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر اعلیٰ ماہنامہ 'الفرقان') علی میاںؒ کے اہم ترین رفیق اور معاصر)

''ہماری اس دنیا میں ایسے بہت کم لوگ پیدا ہوئے ہیں جن کو اللہ کی طرف سے ذہن ثاقب بھی ملا ہو اور دلِ روشن بھی۔ جو اِس دوڑتی ہوئی اور کروٹیں بدلتی ہوئی دنیا کے حالات و مزاج اور اس کے نت نئے تقاضوں سے پورے باخبر ہوں، دینی اور ایمانی حقائق کے بارے میں وارثین انبیاء کی طرح صاحب یقین بھی...... اللہ کے ایسے بندے جو اِن دونوں صفتوں کے جامع ہوں اس عاجز نے غالباً اتنے بھی نہیں دیکھے ہیں جتنی کہ اپنے ہاتھ میں انگلیاں ہیں لیکن جو دو چار دیکھے ہیں ان میں ایک ذاتِ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بھی ہے۔ اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے وہ صاحبِ نظر بھی ہیں اور صاحبِ قلم بھی وہ اپنے علم اور معلومات کے لحاظ سے جدید بھی ہیں اور ایمان و یقین اور رسوخ فی الدین اور طرزِ زندگی کے لحاظ سے قدیم بھی۔ ان کی ذات مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی۔

(ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ، شبان ۱۳۷۳ھ)

محبوبِ خاص و عام

☆ پروفیسر آل احمد سرور (ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی)

''مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نام آتا ہے تو احترام و عقیدت اور خلوص و محبت کا ایک سمندر موجیں مارنے لگتا ہے۔ مولانا نہ صرف برصغیر بلکہ عالمِ اسلام کی ایک ایسی بلند و بالا شخصیت ہیں جو اپنے علم و فضل، فکر روشن، گداز قلب، پاک سیرت اور دلنوازی کی وجہ سے محبوب خاص و عام ہیں۔ مولانا مفکر بھی ہیں، مصنف بھی مؤرخ بھی، معلّم بھی اور ادب کا ایسا رچا ہوا ذوق رکھتے ہیں کہ ان کی تحریر و تقریر میں حکمت کے ساتھ شعریت کی آب و تاب بھی جلوہ گر رہتی ہے''۔

عطر مجموعہ

☆ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (ایڈیٹر معارف اعظم گڑھ)

مولانا علی میاںؒ نہ صرف علم کی آبرو ہیں بلکہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے عطر مجموعہ ہیں۔

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
ان کی ادا دل فریب ان کی نگہ دلنواز

وہ اپنی گفتار کی شان اور کردار کی آن میں اُن بزرگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو دین کے برہان رہے ہیں۔ وہ ایام کے مرکب کبھی نہیں بنے بلکہ اس کے راکب بن کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُن کی قلم کی گل افشانیاں بہت سی کتابوں میں ظاہر ہو چکی ہیں۔ ان میں نغمہ عشرت بھی ہے اور نالۂ ماتم بھی، سرمایۂ گداز بھی ہے اور نوائے درد بھی۔ وہ جب کوئی چیز اردو میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے پر یہ اثر طاری ہوتا ہے کہ وہ اس کے ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن کر رہے ہیں۔ عربی میں لکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث سوز و سازِ زندگی بیان کر رہے ہیں۔ شام کے مشہور ادیب نے لکھا ہے کہ وہ ان کی عربی نثر میں کھویا ہوا نغمہ پاتے ہیں اور بے ردیف و قافیہ کی شاعری بھی''۔

خاص اسلوب کے موجد

☆ مولانا محمد اشرف (صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پیشاور)

''مخدوم و محترم حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی جلالت شان، علمی و ادبی خدمات، دینی دعوتی سرگرمی کی بناء پر عرب و عجم میں یکساں مقبول اور عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان کی کتابیں متعدد مشرقی اور مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکی ہیں۔ اردو، عربی دونوں زبانوں میں یکساں مہارت اور عبور ہے عربی میں ایک خاص اسلوبِ نگارش کے موجد ہیں۔ یہ طرز عربی ادب عالیہ کی ایسی صنف ہے جس میں دینی علوم و کمال، فصاحت و بلاغت کے ساتھ عمدہ

زبان میں جدید اور قدیم طبقہ کے سامنے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

علی میاںؒ کی زبان میں عذوبیت وحلاوت، درد وسوز، بلندی فکر، داعیانہ ولولہ، عاشقانہ جذبہ، مؤرخانہ تحقیق، عالمانہ احتیاط، حکیمانہ دانش، ادیبانہ رعنائی، ساحرانہ تاثیر پائی جاتی ہے، وہ خود سراپا سوز ودرد ہیں ان کا خمیر محبت اور نرمی سے عبارت ہے، علم وتقویٰ نے اُن سے فروغ پایا ہے اور جامعیت علوم کی مسند ان سے مزین ہے مشرق ومغرب کے دینی وعصری تقاضوں اور جدید طبقہ کے نبض آشنا ہیں ان کی تحریر دل کے اندر اُتر جاتی ہے اور بیک وقت دل ودماغ دونوں کی تسلی کا سامان مہیا کردیتی ہے''۔

قندیل رہبانی

☆ پروفیسر خلیق احمد نظامی (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا کاروانِ زندگی جب حرکت کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک قندیل رہبانی ہے جس کی ضوفشانی نے دور دور تک گزرگاہوں کو روشن کردیا ہے۔

یک چراغ ہست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

علی میاںؒ، مہتمم بالشان خاندانی روایات کے امین اس کی بصیرت افروز علمی کارناموں کے پاسبان، اس کے روح پرور مسلک دعوت وعزیمت کے ترجمان ہیں ان کے علمی تبحر، بلند اخلاق اور سوز دروں میں خاندان کی مقناطیسی قوت کچھ اس طرح کام کررہی ہے کہ بے اختیار زبان پر آتا ہے۔

تو نخل خوش ثمر کیستی؟ کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

مثالی زندگی، اعلیٰ کردار

☆ پروفیسر محسن عثمانی (صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی)

ان کی (علی میاںؒ) ذات میں مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی، علم وادب کا

سکون بھی ہے اور تحریک و اجتماعیت کی گرمی محفل بھی فکر کی تابانی بھی ہے اور انشاء کی درخشانی بھی۔ وہ اُن سے بھی مخاطب ہوتے ہیں جو اورنگ نشین سلطنت ہیں اور ان کو بھی پیغام انسانیت دیتے ہیں جو برادرانِ وطن ہیں یہی جامعیت کا کمال ہے جو اُن کی شخصیت کا امتیاز ہے۔

مولانا کی عالمی مقبولیت اور شہرت کا راز صرف علم کی وسعت، تصانیف کی کثرت، عربی اردو زبانوں پر قدرت اور اسلوب کے جمال میں پوشیدہ نہیں...... اُن کے کاموں اور کارناموں کا دائرہ آفاق گیر ہے۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ، پیرانہ سالی، عبادت و ریاضت ان سب کا تقاضہ سکون اور خلوت نشینی چاہتا ہے لیکن یہ روحِ جہاد ہے جو اُن کو خلوت سے نکال کر جلوت میں لاتی اور سرگرم سفر رکھتی ہے۔ قرطاس و قلم کی بساط سے لے کر کارزارِ عمل تک خدا اور خلقِ خدا دونوں کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے شب و روز ہمہ وقت مشغول رہنا اور پوری دنیا کو اپنی جولان گاہ بنا لینا، اور اپنی مثالی زندگی اور اعلیٰ کردار سے انسانوں سے بلا اختلاف مسلک و مذہب محبت کا باج اور عقیدت کا خراج وصول کرنا معمولی درجہ کی بات نہیں، انھیں کا کام ہے جن کے حوصلے بلند ہوں''۔

علی میاںؒ کی وفات کے بعد چند عرب علماء کے تاثرات

☆ شیخ عمر بن محمد السبیل (امام و خطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

''شیخ ابوالحسن علی ندویؒ نے دعوتِ الی اللہ کے میدان میں بڑا مجاہدہ کیا اور عالمِ اسلام میں اسلامی پرچم کو بلند کیا۔ وہ عصرِ حاضر کے علماء اور مصلحین کے درمیان علم و عمل، اخلاص و للّٰہیت اور اسلوبِ دعوت میں امتیازی شان رکھتے تھے''۔

☆ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ (مفتی عام، سعودی عرب)

شیخ ابوالحسن علی ندوی اپنی خالص اسلامی دعوت اور برصغیر میں اس کے دوررس اثرات کی وجہ سے مشہور و مقبول ہوئے، اس دعوت کے خوش گوار نتائج

سامنے آئے۔ مولانا مرحوم کی بے شمار تصنیفات میں جو اسلام کی خدمت کے جذبہ اور اس کے لیے درد و تڑپ سے مالا مال ہیں۔

شیخ ابوالحسن علی ندوی کی شاندار خدمات

☆ شیخ صیام۔ امام مسجد اقصیٰ فلسطین

شیخ ابوالحسن علی ندویؒ صرف ہندوستان کے ہی عالم نہیں تھے بلکہ اسلامی دنیا میں ان کا ہر طرف چرچا تھا۔ اُن کی قرآن فہمی، علم حدیث سے متعلق واقفیت، سیرت نگاری اور اسلامی ادب کے میدان میں اُن کی شاندار خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے احوال کا ذکر عرب دنیا میں علی میاںؒ کے ذریعہ ہوتا تھا۔ عرب کے علماء اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان وہ رابطہ کا کام انجام دیتے تھے۔

☆ ڈاکٹر عبداللہ صالح عبید (جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی)

علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک طویل عرصہ تک مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور اسلام کے اصل پیغام اور اس کی صحیح روح سے دنیا کو متعارف کرایا اور پوری حکمت و دانائی کے ساتھ دین حنیف کی دعوت دیتے رہے۔ اس راہ میں سلف صالحین کے اسوۂ حسنہ کو برابر مشعل راہ بنائے رکھا اپنی آخری سانس تک قرآن و سنت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

☆ استاد انوار الجندی (اسلامی الفکر ادیب و ناقد)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی انھیں بیدار کیا، انھیں اپنے حقیقی منصب اور ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت دی اور انھیں یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اعزاز و سربلندی اسلام کی بدولت عطا کی اور قرآن نے انھیں دنیا کی قیادت کے لیے تیار کیا ہے۔

☆ ڈاکٹر محمد عبدہٗ یمانی (سابق وزیر الاعلام، سعودی عرب)

شیخ ابوالحسن علی ندویؒ دین کے معاملے میں بڑے حساس اور غیرت مند تھے اس میں نہ کبھی نرمی برتی اور نہ مداہنت سے کام لیا اور نہ اللہ کے معاملے میں کبھی کسی کی

پرواہ کی بلکہ اسلام پر جب بھی کوئی حملہ ہوا اور اس پر آنچ آئی تو آپ پوری قوت اور پامردی کے ساتھ اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے اور اسلام کی طرف سے بھرپور دفاع کیا اور اس کا دنداں شکن جواب دیا اور اپنے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آنے دی"۔

☆ عبداللہ الطنطاوی (عمان):

میں نے ابوالحسن علی ندویؒ کو زہد وتقویٰ کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر پایا۔ لوگوں کی زبانیں پرہیزگاری اور خداترسی کے کلمات سے تر رہتی ہیں لیکن ان کے دلوں کا حال کچھ اور ہی ہوتا ہے اُن کے دل اُس کیفیت سے یکسر خالی ہوتے ہیں جس کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن شیخ ابوالحسن زہد وتقویٰ کے پیکر تھے وہ باعمل علماء کی حسین لڑی کا ایک نہایت خوبصورت موتی اور امت کا بچا ہوا خزانہ تھے۔

☆ ڈاکٹر احمد عثمان تو یجری (رکن مجلس شوریٰ۔ سعودی عرب)

شیخ ابوالحسن علی ندویؒ دعوت و اصلاح کے اماموں میں سے ایک امام تھے۔ ان کے اندر بیک وقت زہد وورع، جہاد و سرفروشی اور فکر وادب کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ علامہ کی زندگی دعوت إلی اللہ، خدمتِ اسلام اور اشاعتِ خیر کے لیے ایک جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اٰتِ هِمْ بِفَضْلِكَ اَفْضَلَ مَا تُوتِيَ مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ

(آمِيْن يَا رَبَّ الْعَالَمِيْن)

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات ورسائل ۔ ایک نظر میں

نمبر شمار	عربی تصنیفات	صفحات	سن اشاعت
۱	الاجتهاد و نشأة المذاهب الفقهية	۳۴	۱۹۸۳ء
۲	احاديث صريحة في أمريكا	۸۵	۱۹۷۸ء
۳	أحاديث صريحة مع اخواننا العرب والمسلمين	۱۱۱	۱۹۸۳ء
۴	إذا هبت ريح الايمان	۲۴۰	۱۹۸۹ء
۵	ارتباط مسير الإنسانية	۱۴	۱۴۱۶ھ
۶	الأركان الأربعة في ضوء الكتاب والسنة	۳۰۳	۱۳۸۷ھ
۷	أريد أن أتحدث الى الاخوان	۵۲	۱۳۷۱ھ
۸	إزالة أسباب الخذلان أهم من إزالة آثار العدوان	۲۸	۱۳۸۸ھ
۹	أزمة ايمان و أخلاق	۱۵	۱۳۷۶ھ
۱۰	أزمة هذا العصر الحقيقية	۲۷	
۱۱	أسبوعان في المغرب الأقصىٰ	۱۵۵	۱۹۸۱ء
۱۲	الإسلام: أثره فى الحضارة وفضله على الانسانية	۲۱۴	۱۹۸۵ء
۱۳	الإسلام فوق القوميات والعصبيات	۱۹	۱۳۸۱ھ
۱۴	الإسلام في عالم متغير	۱۶	۱۹۷۷ء
۱۵	الإسلام في عالم متغير- بحوث الإسلامية قيمة	۹۳	۱۹۷۸ء
۱۶	الإسلام والحكم	۲۹	
۱۷	الإسلام والغرب	۳۲	۱۹۸۳ء
۱۸	الإسلام والمستشرقون	۱۴۰	۱۴۰۲ھ

١٩	اسمعيات		
٢٠	اسمعوها مني صريحة أيها العرب!	٢٧	١٣٧٧هـ
٢١	اسمعي يا إيران!	٤٠	١٩٧٣ء
٢٢	اسمعي يا زهرة الصحراء!	١١	
٢٣	اسمعي يا سوريه!	١٩	
٢٤	اسمعي يا مصر!	١٦	١٩٩٠ء
٢٥	أسوة حسنة	١١٦	
٢٦	أضواء على الحركات والدعوات الدينية والإصلاحية	٥٨	١٩٩٥ء
٢٧	أكبر خطر على العالم العربي	٣٩	١٩٩١ء
٢٨	إلى الإسلام من جديد	٢٢٤	١٩٨٧ء
٢٩	إلى الراية المحمدية أيها العرب!	١٢	
٣٠	إلى شاطئ النجاة	٣٢	١٩٥٠ء
٣١	إلى قمة القيادة العالمية	١٣	
٣٢	إلى ممثلي البلاد الإسلامية	٢٠	١٩٤٧ء
٣٣	الإمام الحسن البصري	٣٢	١٣٩٨هـ
٣٤	الإمام الممتحن أحمد بن حنبل	٣٩	
٣٥	الإمام عبدالقادر الجيلاني		
٣٦	الإمام الشهيد حسن البنا	٢٤	
٣٧	الإمام الذي لم يوف حقه من الانصاف والاعتراف	٧٥	١٤٠٩هـ
٣٨	الإمام البخاري و كتابه صحيح البخاري	٢٨	١٩٩٣ء

۳۹	الأمة الإسلامية وحدتها و وسطيتها و آفاق المستقبل	۲۸	۱۹۸۹ء
۴۰	أمريكا و أوربا و إسرائيل	۴۸	
۴۱	إن في ذلك لذكرىٰ لمن كان له قلب	۱۶	۱۹۵۵ء
۴۲	أهمية الحضارة في تاريخ الديانات و حياة أصحابها	۳۰	۱۹۷۹ء
۴۳	أهمية نظام التربية والتعليم في الأقطار الإسلامية	۲۱	۱۳۹۵ھ
۴۴	بين الإنسانية و أصدقائها	۲۴	۱۹۵۰ء
۴۵	بين الجباية والهداية	۲۰	٭
۴۶	بين الدين والمدنية	۱۲۵	۱۹۴۲ء
۴۷	بين الصورة والحقيقة	۲۰	۱۴۰۰ھ
۴۸	بين العالم و جزيرة العرب		
۴۹	بين نظرتين	۲۴	۱۹۹۰ء
۵۰	تأملات فى القرآن الكريم	۱۱۴	۱۹۹۱ء
۵۱	التربية الاسلامية الحرة فى الحكومات والبلاد الاسلامية	۱۸۶	۱۹۷۶ء
۵۲	ترجمة السيد الامام أحمد بن عرفان الشهيد	۳۹	۱۳۵۰ھ
۵۳	ترشيد الصحوة الاسلامية	۴۲	۱۴۰۹ھ
۵۴	تضحية شباب العرب قنطرة الى سعادة البشرية	۱۴	
۵۵	تعالوا نحاسب نفوسنا و قادتنا	۲۸	۱۳۸۸ھ
۵۶	التفسير السياسي للاسلام	۱۷۳	۱۹۷۹ء
۵۷	ثورة في التفكير	۱۸	
۵۸	جوانب السيرة المضيئة في المدائح النبوية الفارسية والأردية	۲۴	۱۴۰۹ھ

۵۹	حاجة البشرية الى معرفة صحيحة و مجتمع اسلامي	۸۵	۱۴۱۳ھ
۶۰	حاجة العالم الى الدعوة الاسلامية	۳۶	
۶۱	حاجة العالم الى مجتمع اسلامى مثالي أفضل	۲۷	۱۹۹۰ء
۶۲	الحاجة الى التركيز على جانب حاسم	۳۲	۱۴۱۳ھ
۶۳	حديث مع الغرب	۱۲۴	۱۹۶۷ء
۶۴	الحضارة الغربية الوافدة	۵۰	۱۴۰۵ھ
۶۵	حكمة الدعوة و صفاة الدعاة	۳۵	۱۹۸۹ء
۶۶	خليج بين الاسلام والمسلمين	۲۴	۱۴۹۵ھ
۶۷	الداعية الكبير شيخ محمد الياسؒ الكاندهلوي و دعوته	۱۱۴	۱۹۹۰ء
۶۸	دراسة للسيرة النبوية من خلال الأدعية المأثورة المروية	۴۰	۱۹۷۸ء
۶۹	درس من الحوادث	۲۴	۱۳۹۹ھ
۷۰	دعوة و تاريخ	۱۴	۱۹۵۶ء
۷۱	الدعوة الاسلامية في العصر الحاضر	۲۴	۱۹۸۷ء
۷۲	الدعوة الاسلامية الهند و تطوراتها	۴۴	۱۹۸۶ء
۷۳	الدعوة الى الله حماية المجتمع من الجاهلية	۳۶	۱۹۹۱ء
۷۴	الدعوة والدعاة مسؤلية و تاريخ	۷۹	
۷۵	دورالإسلام الاصلاحي في مجال العلوم الإنسانية	۷۴	۱۴۰۸ھ
۷۶	دورالإسلام في تقدم البلاد التي دخلها	۲۴	
۷۷	دورالإسلام في نهضة الشعوب	۲۶	۱۹۷۰ء
۷۸	دور الأمة الاسلامية في انقاذ البشرية و اسعادها	۳۵	۱۹۹۳ء
۷۹	دور الجامعات الاسلامية في تربية العلماء	۴۱	۱۹۸۷ء

۸۰	دور الحديث في تكوين المناخ الاسلامي وصيانته	۳۶	۱۹۸۹ء
۸۱	دور المسلمين القيادي والاجتهادي في الهند	۲۸	۱۹۷۵ء
۸۲	ربانية لا رهبانية	۹۰	۱۹۶۶ء
۸۳	رجال الفكر والدعوة في الإسلام (۱. ۵)	۱۶۱۰	
۸۴	رحلات	۸۰۰	
۸۵	ردة ولا أبابكر لها	۳۲	۱۹۸۰ء
۸۶	رسالة التوحيد	۱۵۶	۱۳۱۴ھ
۸۷	رسالة سيرة النبى الأمين الى انسان القرن العشرين	۳۴	۱۳۹۸ھ
۸۸	روائع اقبال	۲۴۸	۱۳۹۸ھ
۸۹	روائع من أدب الدعوة في القرآن والسيرة	۱۳۶	۱۴۰۱ھ
۹۰	الزكوٰة	۱۴۴	
۹۱	سياسة التربية والتعليم السليمة	۳۴	۱۳۸۸ھ
۹۲	السيرة خاتم النبيين ﷺ للأطفال	۳۵۵	۱۴۱۵ھ
۹۳	السيرة النبوية	۵۵۴	۱۳۹۷ھ
۹۴	شاعر الإسلام الدكتور محمد اقبال	۸۸	
۹۵	شخصيات و كتب	۲۴۷	۱۴۱۰ھ
۹۶	الصراع بين الايمان والمادّية	۱۲۳	۱۳۹۰ھ
۹۷	الصراع بين الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية	۲۲۷	۱۳۸۸ھ
۹۸	الصلاة		
۹۹	الصوم		
۱۰۰	صلاح الدين الأيوبي	۷۷	۱۴۰۹ھ

۱۰۱	صورتان متضادتان	۱۲۵	۱۴۰۵ھ
۱۰۲	الطريق إلى السعادة والقيادة للدول	۲۲۴	۱۴۰۲ھ
۱۰۳	الطريق إلى المدينة المنوّرة	۱۳۱	۱۴۰۷ھ
۱۰۴	عاصفة يوجهها العالم السلامي والعربي	۶۴	۱۳۹۹ھ
۱۰۵	العاقبة للعرب المسلمين	۲۸	
۱۰۶	العرب والإسلام	۱۵۲	۱۴۰۰ھ
۱۰۷	العرب يكتشفون أنفسهم	۳۹	۱۴۰۰ھ
۱۰۸	العقيدة والعبادة والسلوك	۲۳۲	۱۴۰۳ھ
۱۰۹	على الخشبة (للأطفال)	۳۴	
۱۱۰	عمر بن عبدالعزيز	۴۷	
۱۱۱	العوامل الأساسية لكارثة فلسطين		
۱۱۲	غارة التتار على العالم الاسلامى	۴۶	۱۳۹۴ھ
۱۱۳	فاستخف قومه فأطاعوه	۸	
۱۱۴	الفتح للعرب المسلمين	۳۵	۱۴۱۰ھ
۱۱۵	فضل البعثه المحمدية على الانسانية	۴۵	۱۴۰۰ھ
۱۱۶	في رحاب الدعوة	۲۳۱	
۱۱۷	في ظلال البعثة المحمدية	۱۶	۱۴۰۰ھ
۱۱۸	في مسيرة الحياة (۱.۳)	۱۰۹۴	۱۴۱۰ھ و۱۴۰۷ھ
۱۱۹	القاديانية ثورة على النبوة المحمدية والاسلام	۲۹	
۱۲۰	القاديانة مؤامرة خطيرة و ثورة على النبوة المحمديه	۲۹	
۱۲۱	القادياني والقاديانية	۱۸۱	۱۳۷۹ھ

۱۲۲	قارنوا بين الربح والخسارة	۳۲	۱۳۸۷ھ
۱۲۳	القرأة الراشدة للأطفال (۱ـ۳)	۳۸۲	
۱۲۴	القرن الخامس عشر الهجرى الجديد	۸۴	۱۴۱۲ھ
۱۲۵	قصص من التاريخ الاسلامى للأطفال	۱۴۴	۱۴۱۲ھ
۱۲۶	قصص النبيين للأطفال (۱ـ۵)	۸۶۱	۱۴۰۳ھ
۱۲۷	قصة كتاب يحكيها مؤلفه	۳۶	۱۴۱۳ھ
۱۲۸	قيمة الأمة الاسلامية بين الأمم	۵۰	۱۴۱۶ھ
۱۲۹	كارثة التعصب اللغوي والثقافي	۳۰	۱۹۷۸ء
۱۳۰	كارثة العالم العربي الحقيقة و أسبابها	۳۸	۱۴۱۳ھ
۱۳۱	كتاب مفتوح الى رجال الصحافة	۱۳	
۱۳۲	كلمة عن أدب التراجم والحديث عن الكتب	۲۰	
۱۳۳	كلمة تحية و ترحيب	۲۰	۱۳۹۵ھ
۱۳۴	كيف توجه المعارف في الأقطار الاسلامية	۲۰	
۱۳۵	كيف دخل العرب التاريخ	۳۸	۱۴۰۰ھ
۱۳۶	كيف يستعيد العرب مكانتهم اللائقة بهم	۴۰	۱۴۱۱ھ
۱۳۷	كيف ينظرون الى الحجاز والجزيرة العربية	۱۳۷	۱۴۱۱ھ
۱۳۸	المأساة الأخيرة في العالم العربي	۲۰	۱۴۱۰ھ
۱۳۹	المأساة الفلسطينية في بيروت	۱۶	
۱۴۰	ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين	۲۶۴	
۱۴۱	المجتمع الاسلامي المعاصر فضله و قيمته	۳۸	
۱۴۲	محاضرات فى الفكر والدعوة (۱ ـ ۳)	۱۹۷۶	

۱۴۳	محمد رسول الله ﷺ الرسول الأعظم	۵۴	
۱۴۴	مختارات من أدب العرب (۱-۲)	۳۳۶	
۱۴۵	المدخل الى دراسات الحديث	۹۴	۱۴۱۵ھ
۱۴۶	مدخل الى الدراسات القرآنية	۱۸۰	
۱۴۷	المدو والجزر في تاريخ الاسلام	۹۵	۱۴۰۰ھ
۱۴۸	مذكرات سائح في الشرق العربي	۴۰۴	۱۴۰۳ھ
۱۴۹	المرتضىٰ (سيرة علي بن أبي طالب رضى الله عنه)	۳۶۸	۱۴۰۹ھ
۱۵۰	مستقبل الأمة العربية الاسلامية بعد حرب الخليج	۳۸	۱۴۱۱ھ
۱۵۱	المسلمون تجاه الحضارة الغربية	۸۱	۱۴۰۷ھ
۱۵۲	المسلمون في الهند	۲۷۰	۱۴۰۸ھ
۱۵۳	المسلمون و دورهم	۵۱	
۱۵۴	المسلمون وقضية فلسطين	۱۹۵	۱۳۸۸ھ
۱۵۵	مصادر العلوم الاسلامية	۱۶	۱۹۷۸ء
۱۵۶	مصدر الفقه الكتاب والسنة		
۱۵۷	مطالبة القرآن الانقياد التام والاستسلام الكامل	۳۳	۱۴۱۰ھ
۱۵۸	مع الاسلام	۶۵	۱۳۹۳ھ
۱۵۹	معقل الانسانية		
۱۶۰	المعهد العالى للدعوة والفكر الاسلامى	۷۶	
۱۶۱	مقالات اسلامية فى الفكر والدعوة (۱-۲)	۱۱۰۰	
۱۶۲	مقالات حول السيرة النبوية		
۱۶۳	مقدمات	۳۲۰	

۱۶۴	مكانة المرأة في الاسلام		
۱۶۵	ملة ابراهيم و حضارة الاسلام	۳۲	
۱۶۶	من أعلام المسلمين و مشاهيرهم		
۱۶۷	من الجاهلية الى الاسلام	۵۰	۱۳۷۸ھ
۱۶۸	من دون أحد	۲۴	
۱۶۹	من غار حراء	۱۶	
۱۷۰	من النجوم الى الأرض		
۱۷۱	من نفحات القرن الأوّل	۲۸۳	
۱۷۲	من نهر كابل الىٰ نهر اليرموك	۲۵۵	۱۴۱۰ھ
۱۷۳	منهج أفضل في الاصلاح للدعاة و العلماء	۳۲	
۱۷۴	مواساة أم مساواة	۳۵	
۱۷۵	موقف العالم الإسلامى تجاه الحضارة الغربية	۱۲۰	۱۳۸۲ھ
۱۷۶	موقف المسلمين ازاء أسلافه الجاهلين	۴۸	
۱۷۷	مولانا جلال الدين الرومي	۶۴	
۱۷۸	النبوة والأنبياء في ضوء القرآن	۲۷۱	۱۳۸۷ھ
۱۷۹	النبوة هي الوسيلة الوحيدة للمعرفة الصحيحة	۲۷	۱۴۰۸ھ
۱۸۰	النبي الخاتم ﷺ	۹۴	۱۳۹۴ھ
۱۸۱	النبي الخاتم والدين الكامل	۴۵	۱۴۰۷ھ
۱۸۲	نحن الآن في المغرب	۳۱	۱۴۱۱ھ
۱۸۳	نحو تكوين مجتمع اسلامي جديد	۳۲	۱۴۱۰ھ
۱۸۴	ندوة العلماء. تاريخها و رسالتها	۸	

١٨٥	نصائح و توجيهات للشباب المسلم	٨٠	
١٨٦	ندوة العلماء مدرسة فكرية شاملة	٨	
١٨٧	نظامان الهيان للغلبة والانتصار	٣٩	
١٨٨	نظام التربية والتعليم في الأقطار الإسلامية	٤٧	١٩٧٥ء
١٨٩	نظرات في الأدب	١٢٣	١٤١١ھ
١٩٠	نظرات في الأدب النبوي	١٢٨	
١٩١	نظرات في الجامع الصحيح للامام البخاري	٤٣	
١٩٢	نظرات في الحديث	١٩٥	
١٩٣	نظرة جديدة الى التراث الأدبي العربي	١٨	
١٩٤	نظرة مؤمن واع الى المدنيات المعاصرة الزائفة	٣١	١٤١٣ھ
١٩٥	نفحات الإيمان بين صنعاء و عمان	١٠٩	١٤٠٥ھ
١٩٦	هلال رمضان يتكلم		
١٩٧	وأذن في الناس بالحج	١١٢	١٤٠٠ھ
١٩٨	واقع العالم الاسلامي	٥٤	١٤١٥ھ
١٩٩	وامعتصماه!!!	١٨	١٤٠١ھ

علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی اردو تصنیفات

نمبر شمار	اردو تصنیفات کے نام	صفحات	سن اشاعت
۱	اللہ اکبر	۱۰	
۲	آئندہ نسلوں کے لیے اسلام کی ضمانت	۳۲	۱۹۸۵ء
۳	آج آپ سید احمد شہیدؒ کی دعوت کے امین بن رہے ہیں	۲۲	
۴	آخری نبی ﷺ، آخری امت، آخری شریعت	۱۹	
۵	آخری نبی ﷺ کے دربار میں	۱۸	
۶	آدمیت سے بغاوت	۱۹	
۷	آزاد اسلامی ملک میں اہل بصیرت واصحاب غیرت کی ذمہ داری	۱۵	
۸	آنکھوں کی سوئیاں	۱۲	
۹	اپنے گھر سے بیت اللہ تک	۱۲۷	۱۹۹۰ء
۱۰	اپنے کو نیلام کی منڈی میں نہ پیش کیجیے	۲۱	
۱۱	ارکان اربعہ	۳۸۴	۱۹۸۱ء
۱۲	اجتہاد اور فقہی مذاہب کا ارتقا	۲۸	
۱۳	ارادۂ الٰہی اور اسباب مادی	۳۴	
۱۴	اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے	۲۴	۱۹۷۸ء
۱۵	اسلام کا تعارف	۱۷۰	
۱۶	اسلام کے تین بنیادی عقائد: توحید، رسالت، آخرت	۱۶۳	
۱۷	اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں	۳۶	۱۹۹۰ء
۱۸	اسلام میں عورت کا درجہ و مقام	۳۲۶	

۱۹	اسلام کے قلعے اور علماء ربانین کی ذمہ داریاں	۷۰	
۲۰	اسلام کے معاشرتی وخاندانی نظام اور ملی تشخص کی حفاظت میں خواتین کا کردار	۱۲	
۲۱	اسلام ایک مکمل دین، مستقل تہذیب	۳۹	۱۹۸۸ء
۲۲	اسلام اور مغرب	۳۰	۱۹۸۲ء
۲۳	اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین	۸۸	۱۴۰۳ھ
۲۴	اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر	۴۸	۱۴۰۹ھ
۲۵	اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل میں حدیث کا بنیادی کردار	۴۵	۱۴۰۲ھ
۲۶	اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت	۲۴	۱۴۱۰ھ
۲۷	اسلام کی زکوۃ کی اہمیت	۱۰۳	
۲۸	اسلامی تہذیب اور مثالی وحدت	۱۸	
۲۹	اسماء حسنٰی	۲۴	
۳۰	انسان کامل اقبال کی نگاہ میں	۱۶	
۳۱	انسانیت کے زوال کا سبب	۱۳	
۳۲	انسانی شرافت وعظمت	۱۲	
۳۳	انسانی فضائل اور انسانی خدمات میں خواتین کا حصہ	۱۶	
۳۴	اصلاح واستفادہ سے کوئی مستغنی نہیں	۴۲	
۳۵	اصلاحیات	۱۷۶	۱۹۸۹ء
۳۶	الاعلام بمن فی الھند من الأعلام کا تعارف	۱۶	
۳۷	اقوامِ عالم کے درمیان امتِ اسلامیہ کا حقیقی وزن	۲۹	

۳۸	امتِ اسلامیہ کا مستقبل خلیجی جنگ کے بعد	۲۴	۱۹۹۱ء
۳۹	امت کی بقا اور عقیدۂ ختم نبوت	۲۶	
۴۰	امت کے وفود آقا کے حضور میں	۳۲	
۴۱	امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کے انقلابی اثرات	۲۴	۱۹۹۲ء
۴۲	امت مسلمہ کی دوہری ذمہ داریاں	۲۲	۱۴۱۰ھ
۴۳	انسان کی تلاش	۱۵	
۴۴	انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار	۲۴	
۴۵	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	۴۰۰	
۴۶	انسانیت کی صحیح گرہ کشائی	۱۰	
۴۷	انسانیت کے محسن اعظم	۳۲	۱۹۸۹ء
۴۸	انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی وتعمیری کردار	۷۸	۱۹۸۸ء
۴۹	انسانی شرافت وعظمت	۱۱	
۵۰	ایک اہم دینی دعوت	۷۲	
۵۱	ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے؟	۲۴	۱۹۸۱ء
۵۲	ایک عزیز ترین دوست اور پُر زور خطیب وداعی اسلام ڈاکٹر سعید رمضان	۱۰	
۵۳	ایمان کا دعویٰ اور حقیقت ایمان	۱۹	
۵۴	بارگاہ نبوی میں	۱۸	
۵۵	بارہ دن ریاست میسور میں	۶۲	۱۳۹۲ھ
۵۶	بچوں کے لیے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۲۰۸	

۵۷	پہ بائز	۵۶	۱۹۹۶ء
۵۸	پاجا سراغ زندگی	۲۰۰	۱۹۷۲ء
۵۹	پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے	۱۰	
۶۰	پرانے چراغ حصّہ اوّل	۳۶۴	۱۹۷۵ء
	پرانے چراغ حصّہ دوم	۴۳۲	۱۹۸۰ء
	پرانے چراغ حصّہ سوم	۳۰۰	۱۹۹۴ء
۶۱	پندرہویں صدی ہجری۔ ایک تاریخی جائزہ	۶۴	۱۹۸۰ء
۶۲	پیامِ انسانیت	۸۸	۱۹۹۱ء
۶۳	تاریخ دعوت وعزیمت (جلد اوّل تا پنجم)	۲۰۸۰	
۶۴	تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کا کردار	۲۴	
۶۵	تبلیغ دین کے لئے ایک اہم اصول	۱۶	
۶۶	تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب	۱۵۲	
۶۷	تبلیغی تقاریر	۱۳۴	
۶۸	تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصّہ	۲۴	۱۴۱۰ھ
۶۹	تحریک پیامِ انسانیت	۲۱	
۷۰	تحفظ شریعت کے لیے مسلمانوں کا اتحاد	۲۰	
۷۱	تحفۂ انسانیت	۲۳۲	۱۹۹۲ء
۷۲	تحفۂ بھٹکل	۱۰۴	۱۹۸۹ء
۷۳	تحفۂ پاکستان	۸۷	
۷۴	تحفۂ دکن	۸۴	۱۹۸۲ء

۷۵	تحفۂ دین ودانش	۱۱۰	۱۹۸۷ء
۷۶	تحفۂ کشمیر	۱۰۴	۱۹۹۴ء
۷۷	تحفۂ مشرق	۶۸	۱۹۸۴ء
۷۸	تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ	۶۸	۱۳۹۹ھ
۷۹	تذکرہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	۴۰	
۸۰	تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ	۱۴۴	
۸۱	تذکرہ مولانا ڈاکٹر عبدالعلی	۱۲۱	
۸۲	تذکرہ مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت	۳۲۸	۱۹۷۹ء
۸۳	ترکی کی مجاہد ملت اسلامی	۳۰	
۸۴	تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک	۱۷۴	۱۴۰۹ھ
۸۵	تعلیم ودعا	۴۰	
۸۶	تکبیر مسلسل (مجموعۂ خطبات وتقاریر دینی تعلیمی کونسل)	۷۸۴	
۸۷	تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات	۱۴۴	۱۹۸۶ء
۸۸	جاہلیت کسی عہد کا نام نہیں	۱۵	
۸۹	جب ایمان کی بادِ بہاری چلی	۲۷۱	۱۹۸۶ء
۹۰	جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے	۲۴	۱۹۷۸ء
۹۱	جزیرۃ العرب اور عالمِ انسانیت: ایک مکالمہ، ایک پیام	۲۰	
۹۲	جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ	۱۸	
۹۳	جو لوگ ظالم ہیں ان کی طرف مت جھکو	۲۲	
۹۴	جو علم خدا کے نام کے بغیر ہو وہ انسانیت کی تباہی کا سبب بنے گا	۱۰	

۹۵	جہاد افغانستان کا تاریخی پس منظر	۱۸	
۹۶	جہادِ زندگی اور انبیاء علیہم السلام کا راستہ	۲۴	
۹۷	جہدِ مسلسل (مجموعہ خطبات وتقاریر مسلم پرسنل لا بورڈ)	۴۱۱	
۹۸	حالات کا نیا رُخ	۱۶	
۹۹	حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان	۱۱۱	۱۹۷۹ء
۱۰۰	حج کے چند مشاہدات واحساسات	۵۶	٠
۱۰۱	حدیث پاکستان (دعوت فکروعمل)	۱۸۵	
۱۰۲	حرمین شریفین کے بیرونی مقیمین کی ذمہ داریاں وحقوق	۳۱	۱۹۸۶ء
۱۰۳	حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی	۱۲	
۱۰۴	حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی حفاظت دین اور قیادت مسلمین کے آثار ومراکز	۲۱	
۱۰۵	حقیقت اسلام اور صورتِ اسلام	۱۰	
۱۰۶	حکومت کی تبدیلی سے سبق اور آئندہ کے لیے صحیح طریقۂ کار	۱۶	
۱۰۷	حیات مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ	۴۳۰	۱۹۸۸ء
۱۰۸	خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری دنیا کے لیے رحمت	۱۰	
۱۰۹	خدمت دین وعلم کے دائمی اور ابدی امکانات	۱۶	
۱۱۰	خطبۂ صدارت راجستھان دینی تعلیمی کانفرنس ٹونک ۱۹۶۱ء	۱۶	
۱۱۱	خطبۂ افتتاحیہ ۱۹واں آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن ۱۹۷۳ء	۱۹	
۱۱۲	خطبۂ افتتاحیہ آل انڈیا مسلم پولیٹکل کنونشن (دہلی)	۸	۱۹۷۰ء
۱۱۳	خطبۂ استقبالیہ اجلاس تعلیمی ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۹۷۵ء)	۱۹	

۱۱۴	خطبۂ صدارت ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس لکھنؤ (۱۹۷۵ء)	۲۳	
۱۱۵	خطبۂ صدارت پیامِ انسانیت لکھنؤ (۱۹۸۰ء)	۲۴	۱۹۸۰ء
۱۱۶	خطبۂ صدارت صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس، بہرائچ (۱۹۸۲ء)	۱۲	
۱۱۷	خطبۂ صدارت علاقائی دینی تعلیمی کانفرنس بستی (۱۹۸۳ء)	۱۳	
۱۱۸	خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم مسلم پرسنل لا بورڈ، کلکتہ (۱۹۸۵ء)		
۱۱۹	خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اجلاس بمبئی (۱۹۸۶ء)	۳۱	
۱۲۰	خطبۂ صدارت صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس، بنارس (۱۹۸۶ء)	۲۰	
۱۲۱	خطبۂ صدارت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ	۳۸	
۱۲۲	خطبۂ استقبالیہ دینی تعلیمی کونشن لکھنؤ (۱۹۸۹ء)	۱۶	
۱۲۳	خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اجلاس کان پور (۱۹۸۹ء)	۳۸	
۱۲۴	خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اجلاس دہلی (۱۹۹۱ء)	۲۴	
۱۲۵	خطبۂ صدارت دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش لکھنؤ، اجلاس (۱۹۹۲ء)	۱۶	
۱۲۶	خطبۂ افتتاحیہ اتحاد ملت کانفرنس، حیدرآباد (۱۹۹۲ء)	۱۸	
۱۲۷	خطبۂ صدارت علاقائی دینی تعلیمی کانفرنس، مرادآباد (۱۹۹۲ء)	۱۶	
۱۲۸	خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اجلاس جے پور (۱۹۹۳ء)	۲۳	
۱۲۹	خطبۂ صدارت دینی تعلیمی کونسل، نجیب آباد (۱۹۹۴ء)	۲۰	
۱۳۰	خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اجلاس احمد آباد (۱۹۹۵ء)	۲۸	
۱۳۱	خطبۂ صدارت ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس، مرادآباد (۱۹۹۶ء)	۲۰	۱۹۹۶ء
۱۳۲	خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اجلاس بمبئی (۱۹۹۹ء)	۱۴	
۱۳۳	خطبۂ صدارت انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل ٹکنالوجی	۱۶	

۱۳۴	خطرۂ ارتداد اور اس کا حل	۳۲	
۱۳۵	خلفائے اربعہ	۴۷	
۱۳۶	خلفائے راشدین	۲۵	
۱۳۷	خواتین اور دین کی خدمت	۸۸	
۱۳۸	دارِارقم کا احسان انسانی دنیا پر	۲۴	
۱۳۹	دارالعلوم ندوۃ العلماء	۳۲	
۱۴۰	دریائے کابل سے دریائے یرموک تک	۳۰۴	۱۹۷۶ء
۱۴۱	دستورِ حیات	۲۴۰	۱۹۹۳ء
۱۴۲	دعائیں	۱۴۸	
۱۴۳	دعائے خیر البشر		
۱۴۴	دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے	۱۳	
۱۴۵	دعوت ایمان اور پیامِ انسانیت	۱۷	
۱۴۶	دنیا میں آنے والے انسان: چمن کے پھول یا کانٹے	۳۱	۱۹۸۱ء
۱۴۷	دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں	۲۹	
۱۴۸	دو روزے	۲۰	
۱۴۹	دو ہفتے ترکی میں	۱۱۵	
۱۵۰	دو ہفتے مغرب اقصیٰ مراکش میں	۱۲۰	
۱۵۱	دین حق اور علماء ربانی شرک وبدعت کے خلاف کیوں	۵۶	۱۴۰۲ھ
۱۵۲	دین حق اور دعوتِ اسلام	۲۴	
۱۵۳	دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار	۲۰	

۱۵۴	دیارِ غیر میں رہنے والے مسلمانوں سے خطاب	۱۶	
۱۵۵	دین اسلام کا اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں	۱۱۱	۱۹۷۵ء
۱۵۶	دین اسلام کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات	۵۰	
۱۵۷	دین پر عمل کرنے کی برکتوں کو دیکھنے کے لیے دنیا سفر کر کے آتی تھی	۱۸	
۱۵۸	دین اور علم کا دائمی رشتہ	۱۳	
۱۵۹	دین اور علم کی خدمت اور ایمانی تقاضے کی اہمیت	۴۸	
۱۶۰	ذکرِ خیر (مرحومہ والدہ محترمہ کی سوانح حیات)	۱۴۰	۱۹۷۲ء
۱۶۱	ذہنی و اعتقادی ارتداد: ایک اہم مسئلہ	۲۶	
۱۶۲	رمضان المبارک کا پیغام ہندوستانی مسلمانوں کے نام	۳۲	
۱۶۳	رمضان اور اس کے تقاضے	۵۶	
۱۶۴	رمضان المبارک مومن صادق کے لیے حیات نو	۲۲	
۱۶۵	روزہ کا حکم	۱۴	
۱۶۶	روشنی کا مینار	۱۶	
۱۶۷	زبان و ادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت	۱۸	
۱۶۸	زکوٰۃ کا صحیح مصرف	۱۶	
۱۶۹	زمانہ کا حقیقی خلا	۲۲	
۱۷۰	زندگی کے کرشمے	۸	
۱۷۱	زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو	۲۴	
۱۷۲	سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی بے صبری اور بے اعتمادی	۳۲	
۱۷۳	سپاس نامہ و پیغام	۱۱	

۱۷۴	سوانح محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ	۱۹۲	
۱۷۵	سوانح حیات حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ	۳۵۲	۱۹۹۴ء
۱۷۶	سوانح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ	۳۲۰	۱۹۸۲ء
۱۷۷	سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم	۳۶۳	
۱۷۸	سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں کے آئینہ میں	۴۸	
۱۷۹	سیرت نبوی اور عصر حاضر میں اس کی معنویت وافادیت	۲۴	
۱۸۰	سیرت نبوی کے مطالعہ کی دعوت	۲۸	
۱۸۱	سیرت کا پیغام موجودہ دور کے مسلمانوں کے نام	۹	
۱۸۲	سیرت سید احمد شہیدؒ (جلد اول، دوم)	۱۱۷۶	۱۹۳۹ء
۱۸۳	سیرت وکردار کی تبدیلی کی ضرورت	۱۸	
۱۸۴	شرعی عائلی قوانین کے بارے میں مسلمانوں کا غیر جانبدارانہ احتساب اور دعوت فکر وعمل	۲۴	
۱۸۵	شریعت اسلامی مسلمانوں کے لیے دستورِ حیات	۲۲	
۱۸۶	شرق اوسط کی ڈائری (۱۹۵۱ء کا سفرنامہ)	۵۱۴	۱۹۸۴ء
۱۸۷	شرق اوسط میں کیا دیکھا؟	۹۴	
۱۸۸	شفاخانہ رحمت کا مظاہرہ	۲۰	
۱۸۹	شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	۲۵	
۱۹۰	صحبتے با اہلِ دل	۳۷۶	۱۹۹۲ء
۱۹۱	صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی	۱۲	
۱۹۲	صنعتی اور سائنسی علوم کی تعلیمی افادیت واہمیت	۱۴	

۱۹۳	صورت وحقیقت	۴۰	
۱۹۴	طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور اس کی ذمہ داریاں	۴۸	
۱۹۵	طاقت کا اصل مرکز نصرتِ ایمانی	۲۴	
۱۹۶	عالمِ عربی کا المیہ	۲۰۰	
۱۹۷	عالمِ عربی کا تازہ المیہ	۸	
۱۹۸	عالم عربی کے لیے سب سے بڑا خطرہ	۳۲	
۱۹۹	عالم عرب کا سب سے اہم مسئلہ	۱۴	
۲۰۰	عالم عربی اہل مغرب کی آماجگاہ	۱۶	
۲۰۱	عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟	۴۸	۱۹۶۴ء
۲۰۲	عصر جدید کا چیلنج	۳۷	
۲۰۳	عصر حاضر کا جدید چیلنج اور اہم مدارس کی ذمہ داریاں	۱۵	
۲۰۴	عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح	۱۲۸	۱۹۷۸ء
۲۰۵	علماء ربانی، ان کا منصب اور ان کے کام کی نوعیت	۳۴	
۲۰۶	علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری	۱۶	
۲۰۷	علم واسم کے رابطہ کی ضرورت وافادیت اور میری چند محسن کتابیں	۱۵	
۲۰۸	علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں	۱۶	۱۴۰۲ھ
۲۰۹	علم اسلام سے اور جہالت جاہلیت سے جڑی ہے	۸	
۲۱۰	علم حدیث ایک بیش بہا خزانہ	۲۲	
۲۱۱	عورت اقبالؔ کے کلام میں	۱۷	
۲۱۲	عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ان کی ذمہ داریاں	۴۷	

۲۱۳	عید الفطر کا پیغام	۱۲	
۲۱۴	غارِ حرا سے طلوع ہونے والا آفتاب	۱۷	
۲۱۵	غلطی کو غلطی تسلیم نہ کرنا خطرناک ہے	۱۴	
۲۱۶	فسادات اور ہندوستانی مسلمان	۱۶	
۲۱۷	قادیانیت اسلام اور نبوت محمدیؐ کے خلاف ایک بغاوت	۴۸	
۲۱۸	قادیانیت: تحلیل وتجزیہ	۱۹۲	۱۹۸۸ء
۲۱۹	قادیانیت کا ظہور، اس کا دعویٰ اور دعوت، اور اس کے مؤید وسرپرست	۲۹	
۲۲۰	قرآن کا مطالبہ	۳۱	
۲۲۱	قرآن مجید کے ساتھ عشق وشغف کی داستانیں	۱۳	
۲۲۲	قرآن مجید میں آپ کا تذکرہ	۱۲	
۲۲۳	قرآنی افادات	۵۶۸	
۲۲۴	قرآن کریم نے عورتوں کو کیا مرتبہ دیا	۲۵	
۲۲۵	قصہ دو باغ والے کا	۱۸	
۲۲۶	قصص الانبیاء (۱-۴)	۲۲۵	
۲۲۷	قیمتی نصائح	۱۱	
۲۲۸	کاروانِ ایمان وعزیمت	۱۷۵	۱۴۰۴ھ
۲۲۹	کاروانِ زندگی جلد اوّل تا ہفتم	۳۱۶۰	
۲۳۰	کاروانِ مدینہ	۱۹۲	۱۹۷۸ء
۲۳۱	کسی ملک ومعاشرہ کے لیے سب سے خطرناک بات	۱۵	
۲۳۲	کلمۂ حق	۱۰	

۲۲۳	کل مسلمان اور مکمل اسلام	۳۱	
۲۲۴	لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ	۳۲	۱۴۰۰ھ
۲۲۵	مالیات کا اسلامی نظام	٦٧	
۲۲٦	مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی	۱۱	
۲۲۷	محبت فاتح عالم	۸	۱۳۹۴ھ
۲۲۸	محسنِ عالم	۴٦	۱۴۱۲ھ
۲۲۹	مدارس ومکاتب کا قیام سب سے ضروری چیز	۱٦	
۲۴۰	مدارس ومکاتب سائنس کا حکم رکھتے ہیں	۱۳	
۲۴۱	مدرسہ کیا ہے؟	۲۸	
۲۴۲	مذہب وتمدن	۱۱۲	۱۴۰۱ھ
۲۴۳	مسلمانوں پر ایک نظر اور قلب پر تین اثر	۱۴	
۲۴۴	المعهد العالي للدعوة والفكر الاسلامي، ضرورت	۴۸	
۲۴۵	مذہب یا تہذیب	۱٦	
۲۴٦	المرتضیٰ	۴٦۴	۱۹۸۹ء
۲۴۷	مردِ خدا کا یقین	۳۱	
۲۴۸	مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں	۵٦	۱۴۱۱ھ
۲۴۹	مسلمانانِ ہند کے لئے صحیح راہ عمل	۹۲	۱۴۰۷ھ
۲۵۰	مسلمانانِ بھٹکل سے صاف صاف باتیں	۳۲	
۲۵۱	مسلمان غیر اسلامی ماحول میں	۱۰	
۲۵۲	مسلمانوں کے مسائل وجذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے	۴٦	

۲۵۳	مسلم پرسنل لا بورڈ: خدمات و سرگرمیاں	۳۰	
۲۵۴	مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت واہمیت	۲۴	۱۴۰۶ھ
۲۵۵	مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش	۳۴۴	۱۹۹۸ء
۲۵۶	مسلم مشاورتی اجتماع کا خیر مقدم	۱۶	
۲۵۷	مسلمان کی شان امتیازی	۳۲	
۲۵۸	مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی	۱۹۶	۱۹۸۱ء
۲۵۹	مطالعۂ حدیث کے اصول ومبادی	۸۵	
۲۶۰	معرکۂ ایمان ومادّیت	۱۳۲	
۲۶۱	مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں	۱۸۷	۱۹۷۳ء
۲۶۲	مغربی میڈیا کا چیلنج اور اہلِ علم کی ذمہ داریاں	۱۶	
۲۶۳	مقامِ انسانیت	۸۰	۱۳۹۴ھ
۲۶۴	مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ	۱۴۴	۱۹۵۲ء
۲۶۵	مکاتیب یورپ	۶۴	
۲۶۶	ملت کا تحفظ، تحریک نفاذ شریعت اور غلبۂ اسلام	۲۳	
۲۶۷	ملتِ اسلامیہ کا مقام وپیغام	۲۶۱	
۲۶۸	ملت کے نوجوان اور ان کی ذمہ داریاں	۲۴	
۲۶۹	ملت اسلامیہ ہند کا تاریخی کردار	۲۹	
۲۷۰	ملت ومعاشرہ کا سب سے خطرناک مرض ظلم وسفاکی	۳۲	
۲۷۱	ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لیے اصلی خطرہ	۳۵	
۲۷۲	ملک کا خطرناک رُخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری	۳۰	

۲۷۳	ملک کا معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر ہے	۳۲	
۲۷۴	ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ	۱۶	
۲۷۵	ملک کی نازک صورت حال اور ایک محب وطن کی ذمہ داریاں	۲۲	
۲۷۶	ملک وملت دونوں خطرے میں	۱۸	
۲۷۷	ملک کے موجودہ حالات اور ہماری ذمہ داریاں	۱۲	
۲۷۸	مناقب اور مدح صحابہ کے جلسوں کا پیغام	۳۱	
۲۷۹	منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین	۲۸۶	۱۹۷۵ء
۲۸۰	موجودہ حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے راہِ عمل	۱۲	
۲۸۱	موجودہ عالم اسلام کے لیے فیصلہ کن محاذ اور مرکزی میدان عمل	۲۴	
۲۸۲	مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت	۳۲۸	
۲۸۳	مولانا سید طلحہ صاحب ایم.اے	۳۴	
۲۸۴	مولانا محمد اختر صاحب	۱۴	
۲۸۵	میری علمی ومطالعاتی زندگی	۵۴	
۲۸۶	نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں	۱۳۹	
۲۸۷	نبوت کا اصلی کارنامہ	۲۴	۱۹۹۲ء
۲۸۸	نبی خاتم اور دین کامل	۴۵	۱۴۰۷ھ
۲۸۹	نبی رحمت ﷺ	۷۱۰	۱۹۸۸ء
۲۹۰	ندوۃ العلماء ایک دبستانِ تحریک، ایک رہنما تعلیمی تحریک	۵۲	
۲۹۱	نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی فکر کیجیے	۲۱	
۲۹۲	نشانِ راہ	۳۱	۱۴۰۰ھ

۲۹۳	نشانِ منزل	۱۰	
۲۹۴	نقوشِ اقبال	۳۲۵	
۲۹۵	نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	۴۰	۱۴۱۲ھ
۲۹۶	نیپال میں طلبہ علوم دینیہ اور عامۃ المسلمین سے خطاب	۲۴	
۲۹۷	ہدایت و تبلیغ کی اہمیت (برما کی تقریر)	۵۰	
۲۹۸	ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجیے	۲۴	۱۹۴۹ء
۲۹۹	ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ	۲۴۰	۱۹۹۲ء
۳۰۰	ہندوستانی مسلمان: ایک نظر میں	۱۲۸	۱۴۰۵ھ
۳۰۱	یہ اخلاقی گراوٹ کیوں	۲۰	
۳۰۲	یورپ، امریکہ اور اسرائیل	۳۲	
۳۰۳	یقیں مردِ مسلماں کا	۳۲	

بصد تشکر و امتنان

☆ فہرست کتب (عربی و اردو) ماخوذ از ''حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ عہد ساز شخصیت'' مصنفہ مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی

☆ مولانا سیّد محمد رابع حسنی (ناظم ندوۃ العلماء و صدر، دارِ عرفات رائے بریلی) اور مولانا سیّد محمود حسن حسنی ندوی (نائب مدیر تعمیر حیات) حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کے اعزازات کے فوٹو، شجرہ نسب کے فراہم کرنے پر شکریہ بصد اکرام و احترام

☆☆☆

شجرہ نمبر ۱ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ؒ کا شجرہ نسب

ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنھم ـــــ امیر المومنین علی مرتضیٰ ـــــ حسن مجتبیٰ

حسن مثنیٰ ـــــ عبداللہ المحض ؒ ـــــ محمد ؒ صاحب النفس الزکیہ ـــــ محمد عبداللہ الاشتر ؒ

محمد ثانی ؒ ـــــ حسن ؒ الاعور الجواد نقیب الکوفہ ـــــ ابو محمد عبداللہ ؒ ـــــ قاسم ؒ ـــــ محمد ؒ

ابوالحسن ؒ ـــ حسن ؒ ـــ عیسیٰ ؒ ـــ یوسف ؒ ـــ رشید الدین احمد ؒ ـــ امیر قطب الدین محمد المدنی ؒ

سیّد امیر نظام الدین ؒ ـــــ قاضی رکن الدین ؒ ـــــ صدر الدین ؒ ـــــ قیام الدین ؒ

علی ؒ ـــــ احمد ؒ ـــــ زین الدین ؒ ـــــ صدر الدین ؒ ـــــ امیر قطب الدین محمد ثانی ؒ

قاضی علاء الدین ؒ ـــــ قاضی محمود ؒ ـــــ قاضی احمد ؒ ـــــ محمد معظم ؒ محمد اسحٰق دیکھئے شجرہ نمبر ۲ پر

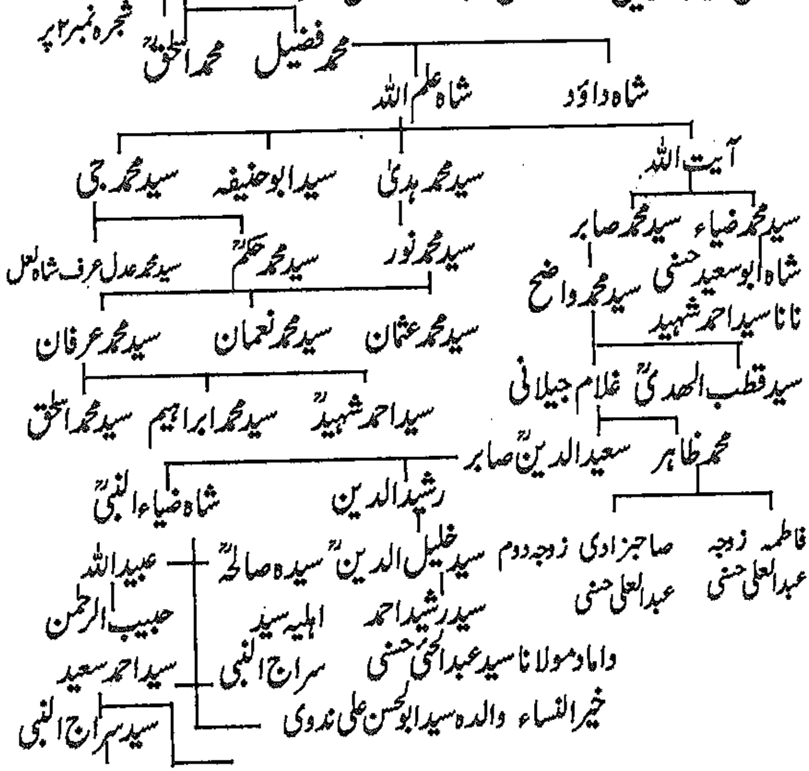

شجرہ نمبر ۲ شجرہ نمبر ۱ سے آگے

محمد اسحٰقؒ

سید تاج الدین — دیوان خواجہ احمدؒ جد امجد حضرت

سید ہدایت اللہ خواجہ سید احمد نصیرابادی

عبدالرحیم خویش حضرت شاہ علم اللہ قاضی امین سید اللہ — قاضی سید محمد شامل

محمد تقیؒ — قاضی سید محمد یقین

حضرت مولانا محمد امین اکھا

محمد صلاح الدینؒ — محمد شاہؒ — میاں — سید محمد مقیم

اکبر شاہؒ

نورالدینؒ — علی محمدؒ — مولانا سید محمد معین حسنی

زین العابدین — عبدالعلی حسنی داماد محمد ظاہر حسنی — مولانا سید امین حسنی

محمد طٰہٰ — دختر زوجہ خواجہ احمدؒ — سیدہ طیب النساء

نانی مولانا ابوالحسن علی

مولانا سید امین نصیرابادی — سید فخرالدین حسنیؒ

شمس النساء اہلیہ مولانا محمد طلحہ حسنیؒ — سید محمد صابر — سید محمد نعیم

دادا سید محمد مسلم حسنیؒ

فاطمہ بی بی زوجہ محمد یوسفؒ

مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ — سید محمد یقین

سید محمد یامین — دادا مولانا ابوبکر حسنیؒ

سید محمد خالد حسنی سید ابوالحسن علی حسنی — حسنی امتہ العزیز اہلیہ رشید احمد

حکیم سید محمد یامین

(امتہ اللہ عائشہ (مترجمہ زادسفر)

ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ — دادا سید یامین حسنی

(باقی شجرہ نمبر ۳ پر) سید محمد ثانی حسنیؒ سید محمد رابع حسنی سید محمود حسن محمد واضح حسنی

سیدہ امامہ زوجہ سید حسن — سید محمد حمزہ حسنی — سیدہ آمنہ زوجہ عبداللہ حسنی جعفر مسعود حسنی

سید سعید احمد سید رشید احمد — سیدہ میمونہ زوجہ حمزہ حسنی — سیدہ ہاجرہ زوجہ جعفر مسعود حسنی

شفاء — سید محمد امین — طیبہ اہلیہ سید منصور حسن

سید عبدالحئی

شجرہ نمبر۲ سے آگے — ڈاکٹر سید عبد العلیؒ — شجرہ نمبر۳

سیدہ سکینہ زوجہ محمد واضح رشیدؒ — سیدہ خدیجہ زوجہ محمد ثانی حسنیؒ

سیدہ فاطمہ زوجہ سید محمد طاہر حسنیؒ — سیدہ رقیہ زوجہ سید محمد رابع حسنیؒ

محمد اسحٰق حسینی — سیدہ مریم — سید محمد الحسنیؒ

سفیان

محمد صہیب حسنی — سید محمد سلمان الحسینی — سید عبد اللہ حسنیؒ — حافظ محمد الحسنیؒ

شعیب — خطیب — عثمان — یوسف — عمار عبد العلیؒ

حبیب — خنساء — سارہ زوجہ فیصل حسینی — سلیمان — بشریٰ — حسنیٰ — زہرہ

علی — حفصہ — عائشہ — اسماء زوجہ سید محی الدین — یونس — بلال عبد الحی حسنیؒ — فاطمہ — محمد زکریا

سندس — باسم — قاسم — بسمہ — صفیہ زوجہ سید حسن مظاہری — زینب — ابو الحسن علی — یحیٰ — خولہ

یحیٰ — خدیجہ — عبد العلی

معاذ — سعد — سیدہ حمیرا زوجہ سید مسلم حسنیؒ

حمزہ — سیدہ زہرہ — سید حسین — عفیفہ — حبیبہ — جویریہ زوجہ

ڈاکٹر سید احمد الحسنی — سیدہ طاہرہ — عمر — عادل — مسعود حسن حسنی

حذیفہ — معاذ

صالحہ اہلیہ حافظ سید — بریرہ اہلیہ معاذ حسنی — سیدہ شیما زوجہ محمود حسن حسنی

محمد امین حسنی — ملیحہ اہلیہ رشید احمد حسنی — سیدہ سعدیہ زوجہ عمیر حسنی

بتول اہلیہ — محمد

سید محمد یوسف حسینی — رشدہ — سید حسن — سید محمد صفوان — سید محمد حماد

فاطمہ — سیدہ عائشہ اہلیہ عبد الباری — شمامہ زوجہ زبیر حسینی — سید محمد ثانی — سید حسنین

حسین

زینب — فاروق — سودہ — سید منصور — سید محمود حسن — سیدہ حمیرا — سید محمد عمر

سکینہ

ابو الحسن علی — سید مسعود حسن

سید عبد اللہ — حمنہ — لبابہ — امامہ

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے
شجرہ نسب کے مأخذ

۱۔ اعلام الہدیٰ	سید محمد نعمانؒ
۲۔ گلشن محمودی	عبدالشکورؒ
۳۔ سیرت علمیہ	سید فخر الدین خیالیؒ
۴۔ سیرت السادات (نسب نامہ)	سید فخر الدین خیالیؒ
۵۔ تذکرۃ الابرار	مولانا سید عبدالحی حسنیؒ
۶۔ سیرت سید احمد شہیدؒ	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
۷۔ خانوادۂ علم اللہؒ	مولانا محمد ثانیؒ